دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جون 2018

PDF

نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول

Jasoosi Digest June 2018

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی **30** تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

قرشی
شربت فولاد
اب تھکنا کیا....!
Qarshi
SHARBAT
FAULAD
شربت
فولاد
آئرن ٹانک
پوری فیملی
کے لیے

جلد 48 • شمارہ 06 • جون 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

ہنستی مسکراتی..... دل لبھاتی
کہانی کے دلچسپ موڑ......

ہمارے معاشرے کی سوچوں اور احساسات
کے تاریک اور روشن پہلوؤں کی دردناک تصویر

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا
ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے
شریف آدمیوں کی غنڈاگردی

شطرنج کی بساط پر بکھرے مہروں کی کامیابی
اور ناکامی کا کھیل..... سرورق کا تیکھا رنگ

باصلاحیت..... باوفا..... مسیحا کو پیش
آنے والے بے وفا لمحات کی بے وفائی

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسین • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی
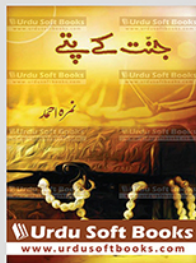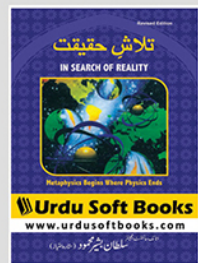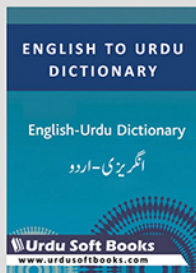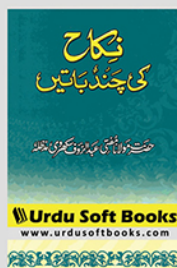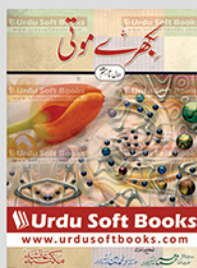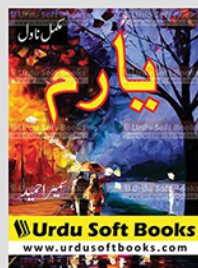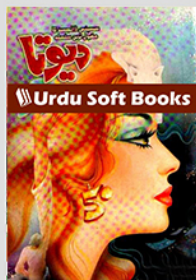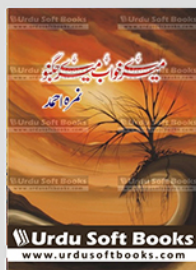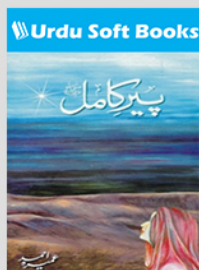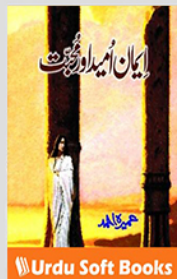
عزیزانِ من......السلامُ علیکم!

رمضان المبارک کی دلی مبارکباد کے ساتھ جون 18ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ سبزی، گوشت، مرغی، سب کچھ ہی رمضان کی آمد سے ذرا پہلے یکا یک مہنگا کردیا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گراں فروشوں کو یکسر آزاد کردیا گیا ہو۔ انہیں غریب لوگوں کی نارسائی پر ترس آتا ہے نہ سفید پوشوں کی مجبوریوں سے کوئی ہمدردی ہوتی ہے۔ رمضان المبارک میں شیطان کو قید کردیا جاتا ہے لیکن ایسے لوگ اپنے ناپسندیدہ اعمال و افعال سے اس کی بھرپور پیروی میں معروف رہتے ہیں۔ ان حرکتوں کے انسداد کے لیے بنائے ہوئے صوبائی اور علاقائی ادارے سوئے رہتے ہیں۔ رمضان کے دوسرے، تیسرے عشرے میں انگڑائی لے کر چند روز کے لیے بیدار ہوتے ہیں۔ چھاپوں اور جرمانوں کی خبریں اور تصویریں چھپواتے ہیں پھر سال بھر کے لیے آرامِ خاص میں چلے جاتے ہیں۔ ہر سال یہی ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی کیونکہ بڑے رہنما بڑے مسائل میں دست و گریباں ہوتے ہیں۔ انہیں عوام کے ان زمینی مسائل کا ادراک ہوتا ہے نہ احساس۔ اس بار بہت سے شہروں اور دیہات میں ایک طرف بجلی کا بحران ہے تو دوسری طرف پانی کی قلت۔ متاثرہ شہروں میں شاید کراچی سرفہرست ہے۔ دعوے بہت کیے جارہے ہیں، نتائج سامنے نہیں آرہے۔ ہر شخص حیران و پریشان ہے کہ موسم کی شدت میں یہ ماہِ مبارک کیسے گزرے گا۔ ہمارے تقریباً تمام رہنما سیاسی بخار میں مبتلا ہیں۔ الیکشن کی آمد آمد ہے۔ ان کے لیے اس وقت نشستوں اور پھر اقتدار کا حصول ہر مسئلے پر مقدم ہے۔ بالعموم ووٹ بوریوں میں بھر کر نہیں لائے جاتے، ہمارے اور آپ کے ایک ایک ووٹ سے بوریاں یا ڈبے بھرتے ہیں۔ ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر، سوچ سمجھ کر ووٹ دیں گے تب ہی عشروں سے بگڑا ہوا ہمارا انتظام درست ہوسکے گا۔ بصورتِ دیگر یہ بگاڑ روز بروز بڑھتا ہی جائے گا۔

عالمی بازار میں نیوز پرنٹ کی گرانی اور کمیابی، ڈالر کی قدر میں اضافے اور مقامی بازار میں اس کاغذ کی نایابی سے مجبور ہو کر صفحات میں کچھ کمی کی گئی ہے تاکہ ہمارے معزز قارئین کی جیب پر بار نہ ہو۔ امید ہے کہ خسارے پر قابو پانے کی اس کوشش میں قارئین بھرپور تعاون فرمائیں گے۔

☆☆☆☆

راولپنڈی سے عاصم شہزاد کے اعتراضات ”سرورق پر ایک آنکھ والی دوشیزہ دیکھ کر میں تو ڈر ہی گیا۔ پھر تھوڑا غور کیا تو پتا چلا کہ یہ محترمہ کا سائڈ پوز ہے۔ ہم نے چین کی سانس لی اور پہلی کہانی رقابت و رفاقت پر آگئے۔ کرب، ضد اور لالچ سے لتھڑی یہ کہانی پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اختتام غیر متوقع تھا۔ خیر ہم نے بھی سانسیں درست کیں اور...... پانی پہ سفر کرنے لگے مگر یہ سفر اتنا دلچسپ ثابت نہ ہوا جتنی ہمیں توقع تھی۔ جیکسن نے انتقام لینے کے لیے خود حفاظتی کا انوکھا انداز اپنایا۔ اس کہانی میں پولیس کو بہت مجبور اور بے بس دکھایا گیا جو تھوڑا حقیقت سے دور لگا۔ روشن مستقبل پڑھ کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔ منظر امام نے معاشرے کے منفرد پہلو کو منفرد انداز میں پیش کیا۔ انگارے پر پہنچے۔ شاہ زیب عرف ایسٹرن کنگ عرف وقاص بالآخر والس وٹے کو فرار کروانے میں کامیاب ہوگیا۔ مشکل لمحات اتنی آسانی سے گزر گئے۔ کبھی کبھی طاہر صاحب بھی کمال ہی کردیتے ہیں۔ تھائی لینڈ سے یورپ اور پھر یورپ سے پاکستان اور پھر رحیم یار خان کہانی میں تیزی آتی جارہی ہے۔ بس تاجور کا ذکر کہانی کو بریک لگا دیتا ہے۔ انیق کہانی کو دلچسپ بنا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لاڈلے آوارہ گرد ایک بار پھر بری درندے کے ہتھے چڑھ گئے۔ جے جی کو ہارا اور شہزی کے درمیان ہونے والا ایکشن سین پڑھ کر وہ مزہ نہیں آیا جو آنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد تو ساری قسط سمجھاتے مناتے...آر کیالوجی...... اسپیکٹرم' لولوش کی تعریف پہ ہی گزر گئی۔ کہانی میں ٹھہراؤ آرہا ہے اور ہمیں نہیں لگتا کہ شہزی اتنی جلدی کیلی فورنیا جا پائے گا۔ ہم بھی روڈلف اور ڈاکٹر صاحب کے چھیتے کو متوقع پنگے کے ساتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گئے اور پیسے کے کھیل کو نظر انداز کرتے ہوئے سرِ دوزن پر پہنچ گئے۔ اعتزاز کی دوسری کہانیوں کی طرح اس کی یہ کہانی بھی تیز ترین تھی۔ لالچ دھوکے اور اندھے انتقام کے گرد گھومتی اس کہانی کا انجام توقع کے عین مطابق تھا۔ خونِ وفا...... سطر در سطر چونکا دینے اور حالات کے دوش پر سسپنس کی انگلی پکڑے آگے بڑھنے والی یہ کہانی واقعی سرورق کا بہترین رنگ ثابت ہوئی۔ انسان اپنے لاشعور میں کیسے کیسے راز رکھتا ہے، یہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتا۔ اسی خیال کے ساتھ ہم بھی آگے بڑھے اور چند ضمیر فروش نظر آگئے بہرحال ملاقات ضروری تھی۔ پیسے اور جسم کے لالچ سے اکثر انسانیت سوز واقعات جنم لیتے ہیں۔ آخری صفحات پر پولیس اور مجرموں کے درمیان ہونے والی ہنگامہ آرائی بناوٹی سی لگی۔ پولیس کبھی بھی عام شہری کو ایسے خطرناک مشن پر لے کر نہیں جاتی۔ بہرحال ایک بامقصد پلاٹ تھا ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں ہر کہانی میں ہوتی ہیں۔“

ایم اقبال سینٹرل جیل میانوالی سے لکھتے ہیں ”4 مئی 10 بجے کے قریب جاسوسی ملا تو ایسا لگا جیسے تپتے صحرا میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آگیا، ٹائٹل کی نازنین کو دیکھا جو آدھا چہرہ لیے ایسے لگ رہی ہے جیسے نیلے بادلوں کے ہالے میں آدھا چاند نظر آرہا ہو۔ جھیل سی گہری آنکھیں، ساغر میں چمکتے دمکتے ہونٹ، مختصر یہ کہ ہماری حسن شناس نظر نے اس حسینہ کو حسن کی سند عطا کی اور سیدھا دوستوں کی محفل میں پہنچے جہاں سعدیہ قادری براجمان تھیں۔ اچھا تبصرہ تھا ویلڈن۔ آگے سیف خان بھی ہر کسی کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف نظر آئے۔ شاہین اشفاق کی پسند ناپسند اچھی لگی۔ شاہد ذوالفقار آپ بھی ہماری طرح انگلش ناول نہیں پڑھ سکتے۔ مجھے تو ان کے نام تک یاد نہیں رہتے ہیں ہماری بھی ادارے والوں سے گزارش ہے کہ کم از کم پہلے صفحات پر انگلش کہانی نہ ہو پلیز۔

عبدالجبار رومی کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ رہا۔ عائشہ مرزا آپ کو بھی ہماری طرح حسینہ کی آنکھیں پسند آئیں..... لگتا ہے آپ بھی میری طرح حسن کی خلیب ہیں، تبصرہ اچھا رہا۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے اپنی اپنی جگہ محفل کی رونقیں بڑھا رہے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی پسندیدہ انگارے پڑھی، جوکہ تاجور اور شاہی کی جدائی کے بعد بالکل بھی مزہ نہیں دے رہی۔ تاجور کے بعد شاہی کی ویران زندگی میں کوئی حسین چہرہ آجائے تو پھر کہانی بن جائے گی۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی جہاں شہزی نے ایک بار پھر سے جی کو ہارا کو خوب رگیدا اور ملکہ حسن کی رفاقت میں اس کے گھر تک آگئے، آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ کہانی بالکل سلوموشن چل رہی ہے، رنگوں میں پہلا رنگ سرور اکرام کی خونِ وفا پڑھی جہاں اشعر، حجاب کے پیچھے مہذب ڈاکو کا عرف سردار کو ملا اور حجاب کو لے کے سیدھا نواب رشید کی حویلی جا پہنچا۔ دوسرا رنگ جام منظم سلیم کی ضمیر فروش پڑھی جہاں مکرانی اور شاقی سکندر کے ساتھ مل کر چیف کی کمانڈ میں بچوں کے اعضا کا مکروہ کاروبار کرتے تھے۔ شاکر نے حالات کا مقابلہ کر کے ناصر یزدانی کا قاتل چیف اور اس کے سارے گینگ کا صفایا کرا دیا تھا۔ ثانیہ بھی سکندر جیسے شخص سے محفوظ رہی، کہانی اچھی رہی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی مردوزن پڑھی، جہاں روبینہ اور زاہد دونوں ایک دوسرے کو شکاری ملے اور اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ عمران قریشی کی جونک پڑھی جہاں وقاص صائمہ کے حسنِ ادا کے آگے فہمیدہ جیسی وفادار بیوی کو چھوڑ کر پھنس گیا اور دونوں ایک دوسرے سے جان چھڑاتے چھڑاتے آدم خور کتوں کے شکار بن گئے۔ روبینہ رشید کی رقابت ورفاقت پڑھی جہاں تیموری اپنے بھائی وقار سے غداری پڑھ کر 20 طبق روشن ہو گئے۔ ثمینہ اپنا سب کچھ لٹا کر اور بیٹی کو مروا کر بھی 20 سال چپ رہی جب بات بیٹے پر بنی تو ملزم کو اپنے انجام تک پہنچا دیا۔ صدف اور احمد کی نوک جھوک کہانی کی جان تھی۔ کہانی اولین صفحات کا حق صحیح طرح ادا نہ کر سکی، گزارے لائق تھی۔"

فیصل آباد سے عائشہ مرزا کی تجبیہ "ٹائٹل پسند آیا سوائے عمارت کے۔ ذاکر انکل کو اللہ پاک مکمل صحت یابی عطا فرمائے، آمین۔ اداریہ پڑھ کر ایک ہی لفظ زبان سے پھسلا۔ "کاش۔" محفل میں سعدیہ صاحبہ آپ کی دعا پر دل سے آمین۔ سیف صاحب شاعری سمجھنے کے لیے شاعر ہونا ضروری نہیں۔ آئیے بڑے احمد فراز۔ اشفاق صاحب کی سفینہ مرگ پر رائے پڑھ کر حیران رہ گئی۔ اشفاق صاحب یہ کہانیاں بچوں کے لیے نہیں ہوتیں۔ آپ نہ سر کھپائیں۔ ساگر صاحب کا نام تبصرے سے زیادہ پسند آیا۔ ایمانے آپ کا تبصرہ مزے کا تھا۔ طلعت صاحب اور شاہد صاحب کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ ایم اقبال صاحب آپ دیواروں کو تکنے کے بجائے مطالعے کو ترجیح دیتے اور پھر تبصرہ بھی کرتے ہیں جو ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ آپ کا ذوق قابلِ ستائش ہے۔ منشی صاحب! میں بزرگوں کی آمد پر کھڑے ہونے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ سب سے پہلی کہانی رقابت ورفاقت بہت زبردست اسٹوری تھی۔ صدف کا کردار پسند نہیں آیا۔ اس نے گھر کی صفائی اور ڈرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ پہلا رنگ خونِ وفا سسپنس سے بھرپور کہانی تھی پڑھ کر مزہ آیا۔ آخر میں ہونے والے پے در پے انکشافات نے آنکھیں نم کر دیں۔ دوسرے رنگ میں ضمیر فروشوں کے چہروں سے نقاب ہٹایا گیا۔ خوف زدہ کر دینے والی تحریر تھی۔ اب اتنا بھی کیا لالچ کہ معصوم بچوں پر رحم نہ آئے۔ انگارے کی یہ قسط کافی تیز رفتار تھی۔ اب مادام باناوانی کی باری ہے اوپر جانے کی۔ اچھی قسط رہی۔ چھوٹی کہانیوں میں روشن مستقبل بہت سوں کے کام آئے گی جو نک کر کام نہیں کرتے یا دوسروں کو کرنے نہیں دیتے۔ گمشدہ لڑکی اور جونک کافی دلچسپ تھیں۔ تہلکہ نے بیچ میں چونکا دیا۔ تی زبردست جمال دستی صاحب۔ پیسے کا کھیل اچھی لگی۔ یہ پیسے کی بیماری جو اب پاکستانی پولیس بلکہ ہر کسی میں پائی جاتی ہے غیر ملکیوں سے ہی لگی ہے۔ وصلی صاحب نے اس دفعہ مختصر کہانی پیش کی مردوزن اچھی رہی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب سے گزارش ہے کہ آوارہ گردی چھوڑ کر کچھ اور لکھیں تاکہ جو آوارہ گردی میں شروع سے شامل نہیں ہو سکے، وہ دل برا نہ کریں۔"

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی خوشی و سرشاری "مئی کا ماہنامہ جاسوسی 30 اپریل کو صدر بازار پشاور میں یٰسین خان سے وصول کیا 3 ماہ کے بعد پھر حاضرِ خدمت ہیں۔ کچھ معروفیت ایسی رہیں کہ اپنی محفل سے دور ہے اللہ پاک کا لاکھوں کروڑ مرتبہ شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے کیوٹ اور پیارے سے بیٹے محمد زین علی سے نوازا۔ (بہت مبارک باد وصول کیجیے ہماری طرف سے) سرورق کو جو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ دوشیزہ ایسی کہ جیسے آسمان پر بادلوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا ہو، کیا کہنے ذاکر انکل آپ کے، ساتھ میں خوب صورت بنگلا اور گاڑی بھی اچھا تاثر دے رہے تھے۔ پسٹل بدست آدمی جاسوسی کی نمائندگی کر رہا تھا۔ آپ کا اداریہ پڑھا، حکومت کو کوئی بات بتانا یا سمجھانا ایسے ہے کہ جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔ اس ملک خداداد میں کس چیز کی کمی ہے، ہر چیز کے وسائل ڈیمانڈ سے بڑھ کر ہیں۔ شرط یہ ہے کہ کوئی مخلص انسان کے پاس حکومت ہو وہ آئے گا ہمارے نیک عمل اور نیک نیت کے ساتھ ورنہ جیسے عمل ویسا بدلہ چلتا رہے گا۔ محفل میں سعدیہ قادری صاحبہ اچھے تبصرے کے ساتھ... حق دار بنیں، بہت بہت مبارک ہو۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ کہانیوں میں روبینہ رشید کی رقابت ورفاقت اچھی رہی۔ انسان اگر کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا تہیہ کرے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے جیسے کہ احمد فاروق نے کیا تو اپنے باپ اور اس کے قاتل تک پہنچا بے شک دوسرے کرداروں کی بھی مدد حاصل رہی۔ تیمور چنگیزی آخر کار اپنے انجام کو پہنچا۔ تنویر ریاض کی پانی پر سفر بھی اچھی رہی۔ بریڈ کا کردار بہت ہی عمدہ رہا اور جمی اویسٹی کو موت کے چنگل سے بچایا۔ محمد یاسر اعوان کی خود حفاظتی کے کیا کہنے، پڑھ کر مزہ آگیا کہ بدلہ لینے والے اس طرح بھی بدلہ لیتے ہیں جس طرح جیکسن نے کیا ویری ویلڈن۔ منظر امام کی روشن مستقبل ایک اصلاحی تحریر تھی جس میں انسان کو خود پر بھروسا کرنے کو کہا گیا ہے۔ عکس فاطمہ کی گمشدہ لڑکی بھی بیسٹ رہی۔ ایلن نے سب کو بے وقوف بنایا پھر مجرموں کو نہ بتا سکی جانسن کے تو مزے ہو گئے۔ انگارے پر پہنچے تو بہت سی ہنگامہ خیزیوں کو لے کر تشریف فرما تھے۔ مغل صاحب کہانی بہت ہی زیادہ اسپیڈ پکڑ گئی ہے۔ جان ڈیرک اور والس وائے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے ہیں تو ادھر موراناں میں باناوانی موجود یقینی طور پر انیق کو اسی نے ٹرانس میں لیا ہوا ہے۔ نسرین منصور کی انوکھا ہتھیار بھی اچھی رہی۔ باپ کو مارنے کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا۔ ڈیزی اور گراہم نے لالچ بری بلا ہے مروا دیا نا۔ شاکر لطیف کی مکار بھی عمدہ رہی۔ بھٹی صاحب کی آوارہ گرد بھی تیزی سے آگے جا رہی ہے۔ سے جی کو ہارا کی قید پھر وہاں سے رہائی پھر یاسمین اور اس کے باپ کا مشن آخر میں پتا نہیں اب کیا کیا ہونے والا ہے۔ تمکین رضا کی پیسے کا کھیل اچھی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

رہی۔ اعتزاز سلیم وصلی سخت موضوع پر اچھی تحریر لائے۔ مردوزن کی یہ کہانی شروع سے آخر تک رہے گی۔ عمران قریشی کی جونک بھی اچھی رہی جو کچھ صائمہ اور وقاص نے بویا وہی کاٹا ہے۔ جمال دستی کی تہلکہ میں رائٹر کی موت پر تاثرات اتنے اچھے کیوں نہ ہوتے۔ جب وہ خود ہی آخری تاثرات کا سامان کررہا تھا۔ سرور اکرام کی خون وفا بھی اچھی رہی۔ تمام کردار اپنی جگہ عمدہ تھے اینڈ بہت عمدہ تھا۔ جام مظہر سلیم کی ضمیر فروش اچھی رہی۔ خالد مکرانی سے شروع ہوکر عدنان زبیری تک پہنچی جو کہ ایک ملک دشمن اور غدار تھا اور اپنے انجام کو پہنچا۔ ناصر یزدانی اور مکرانی کی موت کا دکھ ہوا۔"

اوکاڑے سے تفسیر عباس بابر کی تفصیل "مدت طویل محفلِ یاراں بادِ بہاراں سے دوری کی وجہ گردش حالات کی مجبوری تھی' دوستوں کے مسلسل یاد کرنے کی وجہ سے اس دفعہ حاضر ہونا ضروری جانا۔ ان تمام دوستوں کا شکریہ جنھوں نے یاد رکھا اور خدا ان کو بھی سلامت رکھے جو بھول گئے۔ دن دگنی رات چگنی ترقی وکامرانی کی راہ پر گامزن جاسوسی اس دفعہ بھی معیار پر پورا اترا۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں سعدیہ قادری براجمان تھیں۔ مبارک باد۔ سیف خان، ایمانے زارا اور عبدالجبار رومی نے بہت اچھا لکھا۔ تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ لیکن کچھ خاص مزہ نہیں ایا۔ کہانی پر مغل صاحب کی گرفت کافی کمزور رہی۔ للکار اور دیوی جیسی لازوال تحریریں لکھنے والے مغل صاحب لگتا ہے اب جیسے بوڑھے ہوتے جارہے ہیں۔ سرور اکرام کی خونِ وفا مزہ دے گئی۔ تجسس وسسپنس سے بھرپور تحریر تھی۔ تہلکہ اور مردوزن دونوں ملتی جلتی تحریریں تھیں۔ روشن مستقبل آج کے حالات روزگار کو عیاں کرتی ایک اچھی تحریر تھی۔ آوارہ گرد بس بھاگے جارہی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اب کہانی کو انجام کی سمت موڑ دیا جائے۔ مکار، انوکھا ہتھیار اور گمشدہ لڑکی بہترین تحریریں تھیں۔"

وہاڑی سے منشی محمد عزیز میئے کا سُرور "خطوط کی محفل میں سعدیہ قادری نمایاں نظر آئیں، مبارک باد۔ ایمانے زاراشاہ، پرویز لانگاہ، کوثر اسلام، طلعت مسعود اور شاہد ذوالفقار کے تبصرے بھی بھرپور تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جام مظہر سلیم کی ضمیر فروش پڑھی۔ میرے خیال میں مظہر صاحب کی جاسوسی میں یہ پہلی انٹری ہے۔ (جی ہاں) معصوم بچوں کا اغوا اور برین واشنگ اس رنگ کا بنیادی اور مرکزی خیال ہے اور یقینا مظہر سلیم نے اپنی اس تحریر کے ساتھ بھرپور پیغام دیا ہے۔ اس تحریر کے آخر میں عدنان زبیری کو چیف کے روپ میں پڑھ کر یقینا قاری چونک اٹھتا ہے اور یہی جاسوسی کی انفرادیت اور خاصیت ہے۔ جسے مظہر سلیم نے مدِنظر رکھا اور ایک کامیاب رنگ جاسوسی کے صفحات پر بکھیر دیا۔ سرور اکرام کی تحریر نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ انکی کہانیاں رنگ کے طور پر نہیں جچتی ہیں۔ عجیب فلمی سی کہانی لگ رہی تھی۔ انگارے کی یہ قسط خاصی سنسنی خیز تھی۔ شاہ زیب نے والس کو رہا کروا ہی ڈالا اور پھر یورپ وغیرہ سے ہوتا ہوا بالآخر جنوبی پنجاب کے ضلع رحیم یار خان تک پہنچ گیا جہاں انیق کی بے گناہی کے آثار مادام ہاناوانی کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔ بقیہ شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

رانا بشیر احمد ایاز کی احسان پور ضلع رحیم یار خان سے بیزاری، برہمی "اجاڑ لمحوں کی داستان کہو تو سنائیں تم کو' کے مصداق پھر سے اپنی داستانِ غم سنانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر سے اپنی بزمِ دوستاں میں داخل ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ (پھر سے اپنی محفل میں اجازت کیسی؟) سرورق پر بابر عباس صاحب ہاتھ میں پستول بلکہ پانی والا پستول لے کر نہ جانے کس کو ڈرانے کی ناکام کوشش کرتے نظر آئے۔ اوپر موجود آنٹی نما حسینہ ان کو جھکی نظر سے گھورتی نظر آئی۔ اپنی محفل میں قدم رکھا تو کراچی سے سعدیہ قادری بیٹھی تھیں۔ ویری نائس سعدیہ جی۔ عمدہ اور جامع تبصرہ رہا آپ کا۔ کوئٹہ سے سیف خان، لاہور سے اشفاق شاہین، طلعت مسعود پرویز لانگاہ بھی بہت اچھے رہے۔ عبدالجبار رومی انصاری کے والد صاحب کا سن کر دلی افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور آگے کی منازل آسان فرمائے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے رقابت ورفاقت کے ساتھ روبینہ رشید موجود تھیں۔ یہاں پر میں نہایت افسوس کے ساتھ اپنے خط لکھنے کی وجہ بھی بتاتا چلوں کہ اتنے اتنے عرصے بعد مجھے جس چیز نے دوبارہ خط لکھنے پر مجبور کیا ہے، وہ ہے پہلے نمبر پر اشاعت کا مسئلہ۔ پہلی کہانی صرف بوریت کے سوا کچھ اور نہ تھی۔ بے جان پلاٹ، رائٹر کی کہانی پر کمزور گرفت اور الجھے ہوئے کردار۔ نہ وقار کا کوئی بیک گراؤنڈ دکھایا نہ تیمور کا اور نہ ہی احمد فاروق کا۔ جاسوسی لینے کی وجہ مغل اعظم صاحب کی شاہکار تحریر انگارے اور دوسرے نمبر پر منظر امام صاحب کی منفرد تحاریر ہیں۔ انگارے میں ایسٹرن نے جان پر کھیل کر نہ صرف والس وائے اور اس کی بچی کو ڈیتھ اسکواڈ کے شیطانوں سے بچایا بلکہ فیکساری گینگ کا بھی جینڈ بجادیا۔ مغل اعظم کی سابقہ تمام ہیروئنوں کی طرح تاجور بھی پیا دیس کو سدھاری۔ جہاں پردارج نے اپنی اصلیت دکھانی شروع کردی ہے۔ انیق اب ایسٹرن کے ساتھ سجاول کے لیے بھی گلے کی ہڈی ثابت ہورہا ہے۔ ایسٹرن پھر لوٹ کے پاکستان آگیا ہے اور آتے ساتھ ہی ایسٹرن کی ہمارے رحیم یار خان میں دھانسو انٹری۔ ویلکم ایسٹرن ٹو رحیم یار خان۔ لوجی انیق بھی ادھر کا ہی نکلا۔ شیطانی عمل کی ماہر ہاناوانی کی یہاں پر موجودگی کافی تشویشناک ہے۔ منظر امام کی روشن مستقبل نے جاسوسی کے شمارے کے 70 روپے ضائع ہونے کے غم کو مکمل طور پر زائل کردیا۔ بہت شاندار کہانی رہی۔ ویلڈن منظر امام۔ سرورق کے پہلے رنگ نے پھر وہی بوریت اور بیزاریت طاری کردی۔ کہانی میں صرف اتفاقات کی بھرمار رہی۔ وہی دقیانوسی جنگلی ڈاکو، قدیم حویلی، خوب صورت لڑکی کا باپ گینگ کا سردار، سرور اکرام صاحب نے سارے موڈ کا سوا ستیاناس ماردیا۔"

شعیب الرؤف، سیف الرؤف کی فیصل آباد سے گزارش "تقریباً ڈیڑھ سال کے وقفے کے بعد ایک بار پھر حاضر ہیں محفلِ جاسوساں میں۔ سب سے پہلے بات کرتے ہیں سرورق کی۔ سرورق میں ایک ظالم اور پاگل شخص جس نے اتنی گرمی میں بھی جیکٹ پا اپر پہنا ہوا تھا، ایک معصوم اور غمزدہ بی بی کو پستول دکھا کر اس سے کارچھین رہا تھا جو اس بے چاری نے اتنی مشکل سے پاکٹ منی جمع کرکے دس روپے کی لی تھی ظالم شخص اپنے کھلونے توڑ کر دوسروں سے نہیں چھینتے، عقب میں موجود مکان خوبصورت منظر پیش کررہا تھا اب چلتے ہیں تبصروں کی طرف سب سے اوپر سعدیہ قادری براجمان تھیں، سعدیہ باجی کبھی کبھار ایسا ناٹک بھی ہونا چاہیے ورنہ قارئین کہانیاں چھوڑ کر ٹائٹل گرل کو ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ ایمانے زاراشاہ آپ کو مارچ میں گدھے کے سر سے سینگوں کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

طرح غائب کیا گیا لیکن آپ مئی میں پھر نمودار ہوگئیں، آپ کو پرویز لانگاہ کی 1980ء کی تصویر کا کیسے پتا؟ شاید آپ 1950ء کی ہیں، اچھا تبصرہ تھا، لگی رہیں۔ لانگاہ صاحب آپ سرورق کو چھوڑا کریں سیدھا کہانیوں کی طرف جائیں۔ سرورق پڑھنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ عبدالودود عامر جلدی پرچہ ملنے پر خوشی سے جھومتے نظر آئے۔ صوابی سے کوثر اسلام نے گاڑھی اردو سے تبصرے کا آغاز کیا لیکن بعد میں لائن پر آگئے، کوثر اسلام آپ نے اکرم سیال کو صحیح مشورہ دیا۔ طلعت مسعود اس میں چیخ نکلنے کی کیا بات ہے۔ ٹائٹل گرل نے کون سا آپ کو چک وڈلیا تھا۔ شاہد ذوالفقار کی بات سے اتفاق ہے، ابتدائی کہانی اور سرورق کے رنگ میں خالص اپنا اردو ادب ہی اچھا لگتا ہے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ شفقت محمود، اسد عباس اور دوسرے پرانے تبصرہ نگاروں کی کمی محسوس ہوئی۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف، ابتدائی صفحات پر روبینہ رشید کی رقابت و رفاقت اچھی کہانی تھی۔ میرا خیال تھا صدف کے بستر پر جونکیں احمد فاروق چھوڑتا ہوگا لیکن یہ واضح نہ ہوسکا۔ خود حفاظتی ایک بہترین کہانی تھی جیکسن کے انتقام کا انداز دل کو بھا گیا۔ منظر امام کی روشن مستقبل میں زیادہ غلطی روشن مستقبل کی ہی تھی، وہ ہر کسی کے پیچھے لگنے کے بجائے ایک کام تسلسل کے ساتھ کرتا تو چائے خانہ نہ کھولتا۔ اب اپنی پسندیدہ اور جاسوسی کی ٹاپ کہانی کی طرف آتا ہوں۔ انگارے میں رضوان ٹی کی غیر متوقع اور سنسنی خیز آمد نے خاصا حیران کردیا شاہ زیب نے وانس وائے کی رہائی کا مشن بخیر و عافیت مکمل کرلیا کہانی بہت تیز رفتاری سے جاری ہے شاہ زیب جھٹ پٹ ہی کبھی ڈنمارک کبھی تھائی لینڈ اور کبھی پاکستان پہنچ رہا تھا انیق کے لیے اندازہ تو تھا کہ اسے چپنا ناٹر کیا گیا ہے لیکن یہ سوچ رہا تھا ٹیکساری گینگ یا ڈیتھ اسکواڈ کا ایک اور خطرناک روپ ہے لیکن وہ ہوا جس کا سوچا ہی نہیں تھا دیکھتے ہیں اب شاہ زیب مادام ہاناوانی پر کیسے قابو پاتا ہے۔ مکار میں کچھ کہانی پڑھ کر ہی اندازہ ہوگیا تھا قاتل ڈکسن ہے اور وہ تفتیش کا رخ لارڈ کے بیٹوں کی طرف موڑ رہا ہے۔ آوارہ گرد بھی اپنے نام کے مطابق چل رہی ہے۔ اعتزاز وصلی کے قلم میں روز بروز نکھار آرہا ہے۔ عمران قریشی کی جونک میں وقاص کے انجام پر دکھ ہوا لیکن یہ مکافات عمل ہے۔ جمال دتی کی تہلکہ بیچ میں تہلکہ تھی۔ قرار صاحب تو بہت خونخوار نکلے لیکن فکر نہ کریں قرار صاحب سے ڈر کر ہم کسی رائٹر سے ملاقات کا موقع ضائع نہیں کریں گے۔ مجھے پتا ہے جاسوسی ڈائجسٹ کے رائٹر بہت اچھے ہیں۔ سرورق کے پہلے رنگ میں بہت سے واقعات کو غیر متوقع پایا۔ دوسرے رنگ میں جام مظہر سلیم کا نام دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی اور فوراً انہیں مبارکباد کا میسج بھیجا جو بھی مجھ سے ملاقات کرتا ہے جاسوسی کا رائٹر بن جاتا ہے (میں خود پتا نہیں کیوں ابھی تک نہیں بنا) مدیر صاحب سے میری گزارش ہے کہ قینچی کو میرے تبصرے سے دور رکھیں بیچارہ بہت کمزور دل ہے برداشت نہیں کرپائے گا۔ اب تک کے لیے اتنا ہی کافی، اگر مزید تفصیل میں گیا تو قینچی کا خطرہ بھی بڑھ جائے گا۔ اگلی بار پھر حاضری کی کوشش کروں گا۔ سب دوست دعاؤں میں یاد رکھیں۔"

کھیوڑہ سے شفقت محمود کی دھیمی دھیمی باتیں "ایک سال کے طویل عرصے کے بعد حاضری ممکن ہوئی۔ مصروفیت کے باعث محفل تو چھوٹ گئی لیکن جاسوسی سے ناتا نہ ٹوٹ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بار پھر خط لکھنے کو دل مچل پڑا۔ مئی کا پرچہ خواجہ چکری اخبار فروش نے زبردستی پکڑا دیا حالانکہ میرا ارادہ کچھ دن بعد لینے کا تھا۔ خیر رسالہ ہاتھ لگا تو پھر آپریشن تو تیغی ہونا تھا۔ سرورق کے دھنک رنگ دلوں کے تار چھیڑتے محسوس ہوئے۔ پستول بدست سیکرٹ ایجنٹ گولی چلانے کو پر تول ہی رہا تھا کہ مجھے سرورق سے بھاگنا پڑا خطوط کی محفل کی صدارت اس بار سعدیہ قادری کے ہاتھ میں تھی۔ مادام پوری رعنائیوں سے مسندِ صدارت پر جلوہ افروز تھی۔ مبارکباد۔ طلعت مسعود، ثانیہ مہر، سیف خان اور منشی عزیز ے کی حاضری جاندار تھی۔ باقی تبصرے افسوس کہ نہ پڑھ سکا۔ کہانیوں میں رفاقت و رقابت کافی سنسنی خیز رہی۔ چھوٹی بچی کی چیکار اور دوہرے قتل کی۔ خوف سے لہو جمانے والی کہانی نے رونگٹے کھڑے کردیے۔ اس کے بعد انگارے نے دھوم مچائی ہوئی ہے شاہی فل ایکشن میں ہے اور ٹیکساری گینگ کا تیا پانچا کردیا ہے۔ ٹیکساری گینگ کی سنگینی کو مغل صاحب نے بہت خوفناک انداز میں بیان کیا ہے۔ جان ڈیرک کے گماشتے موت کے فرشتے بنے ہوئے تھے آخر کار ان کی سنگینی کا سورج غروب ہوگیا ہے۔ شاہی امید ہے اب چین کی زندگی گزارنے کی کوشش کرے گا البتہ تا۔ جورکی بے وفائی اس سے دامن گیر ہے اور ہاناوانی کی پنجاب آمد اور انیق کی خونیں کارروائیوں نے دل دہلا دیا ہے۔ اب پتا نہیں شاہی انیق کو ہاناوانی کے ٹرانس سے کیسے نکالے گا۔ آوارہ گرد مجھے ہمیشہ سے دلچسپ محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ یہ مانا کہ اس میں رومانیت کا فقدان ہے لیکن اس کا معلوماتی پہلو آپ نظرانداز نہیں کرسکتے۔ شہزی آج کل منیلا میں لڈیاں ڈال رہا ہے اور سے جی کو ہارا جیسے بدنامِ زمانہ ایجنٹ سے مقابلے کے بعد ڈاکٹر جمشید کی بیٹی کی رہائش پر فروکش ہے۔ یہاں اب شہزی روڈلف کے ساتھ الوداعی مصافحے کے بعد اپنی راہیں جدا کرنا چاہتا ہے اور خالص عابدو کی رہائی کے لیے امریکا یاترا کا خواہشمند ہے لیکن یہاں اب نئی کہانی جنم لے رہی ہے۔ قلوپطرہ کے متعلق تو یہ پڑھا تھا اس نے آسان موت کو گلے لگایا تھا۔ جب دشمن کی افواج دروازے پر پہنچ گئی تھیں اور یہ بلیک مامبا کے ڈسے سے راہی ملکِ عدم.... ہوئی تھی۔ اس نے اپنے کئی قیدی مختلف آسان طریقے سے موت کے گھاٹ اتارے اور اس میں سب سے آسان طریقہ یہ سانپ کا ڈسنا ہی تھا۔ دوسری جانب انگوٹھی کہ جس سے انتہائی تیز کرنٹ نکلتا تھا اور مدمقابل کے دماغ اور سر کی نسیں سن کردیتا تھا۔ تیسری دلچسپ بات" میاں بیوی کسی دوسرے سیارے سے آکر زمین پر آباد تھے۔ بنت نیل کی یہ تاریخی اہمیت جاننے کے لیے میں تو بہت بے چین ہوں اور یہی چیز مجھے آوارہ گرد سے جوڑے ہوئے ہے۔ اعتزاز سلیم وصلی کی کہانی مردو زن بھی جاندار رہی۔ رنگوں میں سرور اکرام نے اخیر کردی جبکہ مظہر سلیم ضمیر فروش کے ساتھ ٹاپ پر رہے۔ مظہر سلیم نے ایک ایسے المیے کو کہانی کے رنگ میں ڈھالا کہ جس نے گزشتہ دو سال میں پاکستان تک خوف طاری کیا ہوا تھا۔ شاکر جیسے مضبوط کردار نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔ اللہ پاک مظہر کو کامیابی عطا فرمائے، آمین۔"

نارووال سے سید ذیشان حیدر کاظمی کا خدشہ "شبانہ اعظمی کی آنکھوں جیسی ٹائٹل گرل، باریک کمان جیسے ابرو اچکائے اور سرخ ہونٹ نیم وا کیے پستول بردار انکل کو بہت معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اکلوتی آنکھ میں ایک ہی پیغام واضح تھا کہ میرا نشانہ کبھی نہیں چوک سکتا۔ نکتہ چینی میں سعدیہ قادری کی انہونی دعا تو ہر پاکستانی کے دل کی تمنا ہے۔ سعدیہ جی نے بابر عباس کے سابقہ باؤنسرز ایک ہی جھٹکے میں اٹھا کر باؤنڈری سے

باہر پھینک دیے۔ بابر انکل چینی نکتہ چینی کے سب سے سینئر ممبر ہیں اس لیے نیو کمرز تبصرہ نگاروں اور رائٹرز کو اپنے پریشر میں لانے کے لیے بے ساختہ اول جلول حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔ آپ ان کی عمر کا تقاضا سمجھ کے اگنور کر دیا کریں۔ زویا اعجاز کو جتنا ہم جانتے ہیں، ان کے لیے ایسی تنقید یقیناً قلمی سفر کے لیے ایندھن کا کام کرتی ہوگی۔ اس حساب سے ہمیں بابر انکل کا شکر گزار بھی ہونا چاہیے۔ کوئٹہ سے سیف خان کی کھلی باتیں جاسوسی کی محبت میں لکھی گئی تھیں۔ لیکن خان بھیا! محبت برداشت کرنا بھی تو سکھاتی ہے۔ ایمانے زارا شاہ جی! وہ تصویر ہمیں تو لانگاہ صاحب کی ساٹھ کی دہائی میں اتروائی گئی لگتی ہے۔ کوثر اسلام کی باریک بینی متاثر کر گئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے روبینہ رشید کی رقابت ورفاقت پڑھی۔ اچھا سسپنس بنایا انہوں نے۔ لیکن صدف کا ماضی کچھ عجلت میں سمیٹ دیا گیا۔ تھوڑی وضاحت ہوتی تو مزید لطف آتا۔ محمد یاسر اعوان کی خود حفاظتی پڑھتے ہوئے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب کسی پرانے انتقام کا چکر ہے لیکن رائٹر کے انداز نے پھر بھی باندھے رکھا۔ منظر امام ہر دفعہ مختصر سی کہانی میں بڑی گہری بات کر دیا کرتے ہیں۔ روشن مستقبل تو پاکستان کے ہر دوسرے گھر کا المیہ ہے۔ ہر کوئی وڈا ابن کر اپنے مشورے دینے چلا آتا ہے۔ انگارے کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔ طاہر جاوید مغل کے قلم میں جانے وہ کون سا جادو ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ انیق کے بارے میں پہلے ہی شک تھا کہ اس کی تبدیلی بے سبب نہیں ہو سکتی۔ ہانا وانی کی انٹری نے اس شک کو کافی حد تک یقین میں بدل دیا۔ وہ ہپناٹزم کا شکار ہو کر بابر عباس جیسی حرکتیں کرتا پھر رہا ہے۔ اعتزاز سلیم کی مرد و زن اچھی تھی لیکن موضوع کے اعتبار سے نئی نہیں تھی۔ عمران قریشی کی جونک بھی اسی پیٹرن پر تھی۔ جمال دستی کی تہلکہ کافی تہلکہ خیز تھی۔ سرور اکرام کی خونِ وفا اتفاقات پر مبنی تھی۔ جام مظہر سلیم کی ضمیر فروش روایتی موضوع پر تھی۔ چولستان میں قید خانے اور اردگرد کے ماحول کی منظر نگاری پر ضرورت سے زیادہ زور رہا جس کی وجہ سے کرداروں پر گرفت کچھ کمزور ہو گئی۔ مصنف کی پہلی کوشش کے حساب سے تحریر اچھی رہی۔ باقی کہانیاں اگر پڑھنے بیٹھا تو سوچتا ہوں کہیں بلیک لسٹ نہ ہو جاؤں۔"

بورے والا سے عبدالجبار رومی انصاری کی چینی نکتہ چینی "خوب صورت نین ونقش سپاٹ چہرے کی دوشیزہ بہت خوب صورت تھی۔ پیارا بنگلا اور گاڑی جبکہ پسٹل تانے مرد تو شکل سے ہی انسانیت کا دشمن نظر آیا۔ ذاکر انکل کی علالت کا سن کر بہت دکھ ہوا دعا ہے اللہ تعالیٰ جلد انہیں روبہ صحت کرے۔ نکتہ چینی، اداریے میں جو ملکی مسائل بیان کیے، ایسے مسائل پڑھ کر سیدھی حکمرانوں پر نظر جاتی ہے۔ قسم سے باریاں لینے والے حکمرانوں سے تو ایسے مسائل کے حل کی توقع ہے ہی نہیں اور بات ہو رہی زر پرست تاجروں کی تو کراچی میں تو رمضان سے ایک ہفتے قبل ہی گوشت کی مہنگائی کی خبر آ گئی ہے اور یہ صرف پاکستان میں ہی ہوتا ہے کہ رمضان میں اشیائے خورونوش مہنگی ہو جاتی ہیں۔ کاش اس کا بھی چیف جسٹس صاحب نوٹس لیں اور رمضان مبارک کی مہنگائی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ سعدیہ قادری کو محفلِ صدارت مبارک ہو۔ سیف علی خان کی کھلی باتیں اچھی تھیں۔ اشفاق شاہین اور ساگر تلوکر نے بھی عمدہ تبصرہ کیا۔ ایمانے زارا شاہ کا شکوہ تو بجا پوسٹ مارٹم بھی خوب کیا سرورق کا۔ ماضی وحال کی باتیں کرتے پرویز احمد لانگاہ بھی خوب رہے۔ عبدالودود عامر، کوثر اسلام کے بھرپور تبصرے بھی جاندار تھے سب کی طرح طلعت مسعود، شاہد ذوالفقار، علی آتش اور مومنہ کشف بھی ٹائٹل پر تپے ہوئے نظر آئے۔ باقی تبصرے اچھے تھے۔ ایم اقبال، عائشہ مرزا اور منشی عزیز مئے نے بھی اپنے تبصروں میں لفظوں کا خوب جادو جگایا اور کہانیوں میں اس دفعہ کیا جادو چل رہا ہے چلیں اس پر بھی نظر ڈالیں۔ سب سے پہلے ضمیر فروش پڑھی اور ضمیر فروش کا چیف نکلا ناصر یزدانی کے اخبار کا ایڈیٹر عدنان زبیری۔ کہاں سکندر کے ذریعے شانی اور مکرانی کو ساتھ ملایا۔ معصوم بچوں کا اغوا اور اعضا نکالنے جیسے گھناؤنے کاروبار سے منسلک ہونا اور پھر پاشا اور شاکر کے ذریعے ضمیر فروش اپنے انجام کو پہنچے عمدہ کہانی۔ انگارے میں شاہ زیب وائس وائے اور اس کی بیٹی کو بچا کے ایک بار پھر پاکستان پہنچ گیا۔ تاجور سے ملاقات بھی ہو گئی اور انیق کی طرف سے پریشان اس کے گھر بھی پہنچ گیا۔ بھئی کمال کی پھرتیاں ہیں۔ آوارہ گرد میں سے جی کو ہارا بڑا ڈھیٹ انسان نکلا۔ آنکھ پھوٹ جانے کے باوجود بھاگ نکلا۔ یاسمین نے بھی خوب ہمت دکھائی باقی یہ کتا کو ہارا، شہزی کے ہاتھوں بچنا نہیں چاہیے تھا خیر پھر سہی۔ رقابت ورفاقت کے آسیب زدہ گھر کا بھی ڈراپ سین ہو گیا۔ سب کا قاتل تیمور نکلا جو خواہشات کے پیچھے نفرت وخود غرضی کے گھوڑے پر سوار تھا مگر اسے منزل کے بجائے موت ہی ملی۔ پہلی کہانی زبردست رہی۔ گمشدہ لڑکی میں ایلن ہیلن نے غنڈوں اور سراغ رساں کو نگنی کا ناچ نچا دیا۔ بالآخر معما حل ہوا اور ہیلن جانسن کی ہو گئی۔ دلچسپ کہانی اچھی لگی۔"

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ "مئی کی گرمی سے بارش کی ٹھنڈک کے درمیان جاسوسی ہمارے ہاں قدم رنجہ فرما چکا تھا۔ سرورق کی خاتون جیکھی نگاہوں سے کسی کو دیکھنے میں اتنی مگن تھیں کہ سامنے پستول تھامے مرد پر نظر نہیں گئی۔ محفل میں داخل ہوئے جہاں سعدیہ قادری شاہانہ انداز میں براجمان تھیں۔ سعدیہ کو مبارک باد دے کر سیف کی جانب دیکھا۔ سیف کا تبصرہ اتنا ہی تھا جتنے ان کے سر پر بال ہیں۔ عائشہ کا چنا منا سا تبصرہ بھی اچھا تھا البتہ طلعت اتنے ڈرپوک کہ ایک سرورق سے ڈر کر چیخیں مار رہے ہیں؟ کوئی حال نہیں آپ کا...... مومنہ کشف پتا نہیں کیوں آپ کا انداز جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ روبینہ رشید کی رقابت ورفاقت کا انجام چونکا دینے والا ثابت ہوا۔ البتہ بقیہ کہانی تھوڑی فلمی فلمی سی لگی۔ جیسا میں سوچ رہی تھی، اس سے کم تھی لیکن پڑھنے میں مزہ آیا اور دس میں سے آٹھ مارکس آپ کے ہوئے۔ انگارے پڑھتے ہوئے ہڑبڑا کر جاگنا پڑا۔ ابھی انیق کی گتھی سلجھنے پائی تھی کہ جادوگرنی صاحبہ کی تشریف آوری ہو گئی لگتا ہے اب شاہ زیب کو وقاص والا رول ختم کرنا پڑے گا۔ مرد وزن میں اعتزاز سلیم وصلی نے مرد کو ہی برتر دکھایا اور اس کا منطقی انجام یہی بنتا تھا۔ ہم متفق ہیں آپ سے...... اچھی کہانی رہی زورِ قلم اور زیادہ ہو اپنے موضوعات کے چناؤ میں تنوع لائیں، یکسانیت ہمیں بیزار بھی کر سکتی ہے۔ خونِ وفا میں خون تو کسی کا بہا نہیں...... لیکن پھر بھی کہانی ہمیں پسند آئی۔ آخری رنگ میں کہانی کا آغاز ٹیپیکل سا تھا لیکن بتدریج کہانی دلچسپ ہوتی گئی...... بچوں کے اعضا نکال کر اسمگل کرنا ایک انتہائی گھناؤنا فعل بن چکا ہے۔ اس پر قلم اٹھانے والے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لکھاری کوخراجِ تحسین پیش کروں گی البتہ کہانی میں بہتری کی گنجائش تھی۔"

چشمہ بیراج سے ساگر تلوکر کی پسند "جاسوسی بہت انتظار اور دعاؤں کے بعد ملا۔ جب ملا تو فرحت اور مسرت ملی۔ سرورق ہٹ کے لگا۔ سعدیہ قادری کو ایک ماہ کی صدارت مبارک۔ ایمانے، پرویز، آتش کے خط اچھے لگے۔ طاہرہ گلزار کی کمی محسوس ہوئی۔ روشن مستقبل منظر امام نے ہلکے پھلکے انداز میں گہرا سبق دیا۔ رقابت ورفاقت بدگمانی، بے اعتمادی اور خودغرضی کے گرد گھومتی کہانی اچھی لگی۔ مکار، مردوزن اور پیسے کا کھیل بھی چٹکیاں کہانیاں تھیں۔ واؤ اس بار انگارے دہکتا ہوا انگارا کرگئی۔ شاہ زیب، رضوان اور فخر کو پاکستان لے آیا۔ تاجور کا درشن بھی کرلیا۔ انیق کا دیدار کرنے رحیم یار خان پہنچا تو واہ رے قسمت کہ وہاں جاماجی کی پُراسرار نانی میڈم ہاناوانی کا بھی درشن کرلیا۔ مغلِ اعظم کیا دماغ پایا ہے۔ اللہ ہو رعقل ڈیوی۔ جام مظہر سلیم کی ضمیر فروش کہانی پڑھ کر چیف عدنان جیسے لوگوں سے نفرت اور بڑھ گئی۔ ایماندار پولیس والے اور شاکر جیسے پُرخلوص اور بہادر دوست پر فخر ہونے لگا۔ اندازِ تحریر کاشف زبیر جیسا لگا۔ آوارہ گرد میں شہزی کا کوہارا سے ایک بار پھر آمنا سامنا لیکن ناکام۔ اس بار ایکشن کم اور لفاظی زیادہ۔ جمال دستی کی تہلکہ انوکھے جاسوسی ناول نگار کی کہانی پسند آئی۔ باقی بھرپور تبصرہ اگلے ماہ۔"

کراچی سے سعدیہ قادری کی قدردانی "اس ماہ جاسوسی نے مجھے اتنی بڑی خوشی دی، میرا خط پہلی بار پہلے نمبر پر آیا۔ یہ دیکھتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے مئی کی تپتی لو کوئٹہ کی ٹھنڈی ہواؤں میں تبدیل ہوگئی ہو۔ حسبِ معمول انگارے سے آغاز کیا جہاں شاہ زیب ہر مشکل میں سے مکھن کے بال کی طرح نکل آتا ہے اب دیکھیں ہاناوانی کے چنگل سے کس طرح سب کو نکالے گا۔ ابتدائی صفحات پر روبینہ صاحبہ کی تحریر نے شروع سے ہی اپنے سحر میں جکڑ لیا، پہلے مجھے لگا شاید نینا کی روح معاملہ حل کروائے گی لیکن آخر میں سارے معمے حل ہوتے گئے۔ پانی پر سفر میں ثابت ہوا کہ امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی اتنے اہم عہدوں پر کرپٹ لوگ موجود ہیں۔ یاسر اعوان کی خود حفاظتی میں کراچی سے ملتے جلتے حالات تھے۔ میرے پسندیدہ مصنف منظر امام نے ان تمام والدین کی آنکھیں کھول دیں جو اپنے بچوں کا مستقبل روشن کرتے کرتے انہیں چوں چوں کا مربہ بنا دیتے ہیں۔ گمشدہ لڑکی میں جانسن لڑکی کو ڈھونڈنے نکلا اور شریکِ حیات کو پالیا۔ انوکھا ہتھیار واقعی کافی انوکھا تھا، کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ ذہانت مثبت کاموں میں استعمال کی گئی ہوتی۔ مکار بھی دلچسپ رہی، پیسے کا کھیل بھی اچھی رہی، آج کل کسی بے گناہ کو پھنسانے کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کو بچانے کے لیے بھی پیسہ چاہیے۔ اعتزاز کے قلم میں روز بروز پختگی آتی جارہی ہے، چونکا دینے والے انجام کے ساتھ مردوزن اس شمارے کی ٹاپ تھری کہانیوں میں سے ایک رہی۔ عمران قریشی کی جونک، جو بویا وہ کاٹا، تہلکہ میں قرار مصنف کم نفسیاتی مریض زیادہ تھا۔ سرور اکرام کی خونِ وفا اتفاقات و حادثات سے بھرپور درمیانے درجے کی تحریر تھی۔ جام مظہر سلیم اپنی پہلی کہانی کے ساتھ آئے اور چھا گئے۔"

راولپنڈی سے عبدالودود عامر کے مشورے "شمارہ ملتے ہی سرورق کا جائزہ لیا۔ پچھلی بار سے قدرے بہتر لگا، خاتون کو چھوڑ کر۔ پتا نہیں سرورق بنانے والے صاحب کا ذوقِ حسن کیسا ہے۔ سرورق کے سرسری سے جائزے کے بعد نکتہ چینی کا رخ کیا۔ اداریہ حسبِ معمول ہی تھا اب تو بس انتظار ہے کسی راہنما کا جوانِ وسائل کو پاکستان کی بہتری کے لیے استعمال کرے۔ ابتدائی صفحات پر سعدیہ قادری براجمان تھیں۔ سعدیہ صاحبہ کا ہر تبصرہ لاجواب ہوتا ہے ویسے سعدیہ صاحبہ! اگر بابر صاحب آپ کو یہ بتادیں کہ کہانیاں کہاں سے لکھوائی جاتی ہیں تو پلیز مجھے بھی بتایئے گا اور لوڈشیڈنگ والی دعا پر آمین کاش کہ کوئی اس دعا کے ساتھ دوا والا بھی آجائے۔ اشفاق شاہین صاحب آپ لمبی چھلانگ لگا کر بھی نکتہ چینی کا رخ کرسکتے تھے چھوٹی سی چھلانگ ہی کیوں؟ خیر تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ اور ایمانے آپ نے کیا بتایا ہوا ہے کبھی تو بے ایمانیاں لے کر آجاتی ہیں تو کبھی شکوے۔ لانگاہ بھائی آپ کا ماضی تو یقیناً فرعون کے دور سے شروع ہوا ہوگا اور آپ سرورق پڑھتے ہی کیا......ہم تو دیکھتے ہیں بس۔ کوثر اسلام صاحب اس سرورق کو دیکھ کر تو سب ہی انگشت بدنداں رہ گئے۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ اور کہانیوں کے جھول آپ نے خوب نکالے۔ طلعت بھائی کی چیخ سن کر لگا کہ غلطی سے طلعت کا نام لکھا گیا ہے ورنہ کسی خاتون کا تبصرہ ہوگا خیر باقی تبصرہ پڑھنے کے بعد یقین آہی گیا کہ طلعت ہی ہے شکر ہے کہ میرے علاوہ بھی کسی نے اعتزاز کے رومانس کو نوٹس کیا۔ شاہد ذوالفقار بھائی یہ لکھنے کی سستی میری بھی ہے لیکن جاسوسی کی محبت میں لکھنا ہی پڑتا ہے، کیا کریں۔ علی آتش! آتش ہوکر بھی اتنی نرمیاں؟ مومنہ کشف لگتا ہے کہ آپ کو احساس دلوانے کے لیے ہی اس بار کا ٹائٹل دیا گیا تھا اب اصل بات سمجھ آئی اور سیف خان کی ناک کیا واقعی بہتی رہتی ہے؟ آپ کو کیسے پتا۔ ایم اقبال صاحب کیا سین ہوگا آنکھوں میں پیاز کاٹنے کی وجہ سے پانی اور بانہوں میں جاسوسی اور واقعی کتاب کہیں بھی ہو تنہائی کی ساتھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات آسان فرمائے۔ کہانیوں میں انگارے سب سے پہلے پڑھی خدا خدا کرکے شاہ زیب تاجی کے چنگل سے نکلا تھا پھر وہیں آن پہنچا اور مزہ نہیں آیا اس بات کا کہ وہاں دو گروپوں کو لڑا کر خود سائڈ پر ہو گیا خود ایکشن میں ہوتا تو مزہ آجاتا باقی انیق پر لگتا ہے کہ ہاناوانی کا جادو چلا ہوا ہے۔ آوارہ گرد اپنے مخصوص انداز میں بہت اچھی جارہی ہے لیکن جب ہیرو اپنے منہ میاں مٹھو بن کر خود کی تعریفیں کرتا ہے تو دل کرتا ہے کہ دو چھانپڑ تو بندہ لگا ہی دے۔ اولین صفحات پہ روبینہ رشید رقابت ورفاقت کے نام سے موجود تھیں۔ کہانی بہت زبردست تھی اگرچہ شروع میں تھوڑا الجھاؤ ضرور رہا۔ ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ سارے پُراسرار واقعات میں وارث کا ہاتھ تھا تو جب ڈیڈ فون کی گھنٹی بجتی ہے تو اس میں سے سانس لینے کی آوازیں کیسے آتی ہیں۔ (کچھ خود بھی سوچ لینا چاہیے) مختصر کہانیوں میں اعتزاز سلیم وصلی مردوزن کے ساتھ نہایت ہی مختصر کہانی لے کر آئے تھے ابھی کہانی پڑھنے میں لطف آنا شروع ہوا ہی تھا کہ کہانی ختم ہوگئی۔ اعتزاز کا رنگ اب پختہ ہوتا جارہا ہے۔ منظر امام روشن مستقبل کے ساتھ ایک بار پھر اپنے مخصوص ومنفرد انداز میں موجود تھے۔ گمشدہ لڑکی میں عکس فاطمہ نے بہت گھمایا اور آخر میں نکلی تو وہی والی۔ تہلکہ جمال دستی کی بہت زبردست رہی ہے۔ ایک مصنف اور دو چوروں کی چالوں کا احاطہ کرتی ہوئی۔ سرورق کے رنگوں میں سرور اکرام پہلے رنگ کے ساتھ موجود تھے۔ جب کہ دوسرے رنگ میں جام مظہر سلیم ضمیر فروش لے کر پہلی دفعہ براجمان ہوئے۔ ایک نہایت

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اہم موضوع کے ساتھ کہانی میں کچھ جھول موجود تھے لیکن پہلی کہانی ہے تو اتنا ہو ہی جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اپنی خامیوں پر قابو کر کے ہمیں اس سے بھی زیادہ اچھی کہانیاں پڑھنے کا موقع فراہم کریں گے۔"

ساہیوال سے عاصم جٹ کی چہکاریں "شمارہ مئی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کو اپنے جلو میں لپیٹے یوم مزدور پہ ظہور پذیر ہوا۔ سابقہ ماہ کے مقابلے میں سرورق کو شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ محفل میں براجمان سعدیہ قادری کی دلچسپ باتوں سے لطف کشید کیا۔ محترمہ اولاً مبارک باد قبول فرمائیں۔ پرویز لانگاہ، عبدالودود عامر اور سیف خان کے مراسلے قابلِ تعریف تھے۔ ایمانے زارا اور طلعت نے بھی خوب لکھا البتہ مومنہ کشف کی باتیں پڑھ کر مسکان چہرے پر بکھر گئی کہ میری اپنی بیٹی بھی ایسے ہی بے ساختہ معصوم باتیں کرتی ہے۔ طویل انتظار کے بعد روبینہ رشید کا نام ابتدائی صفحات پر دیکھ کر حقیقی خوشی کا احساس ہوا کہ آپ نے ناچیز کی فرمائش کا مان رکھا۔ محترمہ نے اپنے مخصوص انداز کا جادو جگا کے ایک شاہکار تخلیق کیا البتہ صفحات کی کمی تشنگی چھوڑ گئی۔ شاید اچھا لکھا کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، ہمیشہ کم محسوس ہوتا۔ انگارے میں مغل صاحب کے قلم کی جادوگری نے سحر پھونک رکھا ہے۔ محبت اور ایکشن کی اس بے مثال داستان کو پڑھتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہاناوانی کی آمد سے جہاں انیق کی بے وفائی کا پردہ چاک ہوا ہے وہیں امید ہے کہ نئی ہنگامہ آرائیاں منتظر ہوں گی۔ آوارہ گرد کی پچھلی دو اقساط سے ایسا محسوس ہو رہا جیسے بھرتی کی اقساط ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے مودبانہ گزارش ہے کہ اپنے مخصوص آہنگ میں کرداروں کو واپس لائیں اور بے مقصد آوارہ گردی کے بجائے عارفہ کی واپسی پہ دھیان دیں۔ رنگوں میں سرور اکرام کی آمد نے چار چاند لگا دیے۔ تحریر گو کہ اتفاقات کا مرقع عظیم تھی لیکن مصنف کی گرفت نے بور نہ ہونے دیا۔ مظہر سلیم کی تحریر سے کافی توقعات وابستہ تھیں لیکن از حد معذرت کہ وہ پورا نہ اتر سکے۔ تسلسل اور ربط کی کمی محسوس ہوئی۔ مختصر تحاریر میں روشن مستقبل، مرد وزن اور تہلکہ پسند آئیں۔"

لاہور سے اشفاق شاہین کی مبارک باد "سرورق اس بار بہت خوب صورت اور لاجواب رہا۔ چھوٹی سی چھلانگ کے بعد چینی نکتہ چینی پہنچا جہاں سعدیہ قادری بہترین تبصرے کے ساتھ انگارے کی قسط جلد ختم ہونے کا شکوہ کرتی نظر آئیں۔ سیف خان، پرویز لانگاہ، عبدالودود عامر، ساگر تلوکر، ایمانے زارا شاہ، کوثر اسلام، شاہد ذوالفقار، ایم اقبال اور منشی عزیز کے سیر حاصل تبصرے محفل کا خاصہ تھے۔ مومنہ کشف، علی آتش... اور عائشہ مرزا کی شرکت بھلی لگی۔ بھاگے انگارے کی جانب۔ والس وائے اور بچی کی بازیابی جیسے مشکل ٹاسک سے عہدہ برآ ہونے کے بعد بہت ہنگامے پھوٹ پڑے۔ گینگ تقسیم ہو گیا۔ خلافِ توقع شہزی جلد پاکستان پدھارے۔ تاجور سے لاحاصل ملاقات اور پھر انیق کی تلاش مادام ہاناوانی تک لے گئی اب دیکھیں کہانی کیا رخ اختیار کرتی، اگلی قسط کا انتظار...... آوارہ گرد بھی کافی دلچسپ ہو گئی ہے۔ روڈلف' یاسمین کے بعد پروفیسر جمشید کا کردار بھی سامنے آیا۔ آخر میں کوہارا شاید پھر سر پر آن پہنچا۔ سرورق کی دونوں کہانیاں سسپنس سے بھرپور اور عمدہ تھیں۔ خصوصاً ضمیر فروش میں شاکر اور خالد کے کردار یادگار رہے۔ ویلڈن جام مظہر سلیم۔ اولین صفحات کی کہانی رفاقت و رقابت روبینہ رشید کی سسپنس سے لبریز دلچسپ اور سنسنی خیز تحریر تھی۔ منظر امام کی روشن مستقبل بہترین اور خوب صورت سبق کے ساتھ عمدہ تحریر تھی۔ اعتزاز کی مرد وزن مختصر مگر پُراثر رہی۔ جونک اور تہلکہ دونوں مختصر لیکن دلچسپ اور لاجواب تحاریر تھیں۔ تمام احباب کو رمضان المبارک کی بہت بہت مبارکباد۔"

کراچی سے ماہ رخ ارباب کی پسند ناپسند "ٹائٹل دیکھ کر ایک خیال آیا کہ اپریل میں کیا گیا ساتھیوں کا تنقیدی اظہارِ رائے رنگ لے آیا۔ سرورق واقعی خوبصورت تھا۔ لڑکی کا چہرہ کچھ دیکھا بھالا سا لگا مگر اس کے برابر موجود صنفِ کرخت جو شاید ایکشن ہیرو تھا، کو جم جوائن کرنے کی شدید ضرورت تھی۔ اداریے سے اتفاق کرتے اور دل جلاتے ہوئے سعدیہ قادری کا تبصرہ پڑھا۔ احساس ہوا کہ صرف میں نہیں ہوں جنھیں کچھ پڑھنے کے لیے بچوں کے گھر سے باہر جانے کا انتظار ہوتا ہے۔ سیف خان کی آہیں دیکھ کر لگا کوئٹہ کا موسم ابھی تک اعتدال پر نہیں آیا شاید۔ ویسے ان کی بات سے مکمل اتفاق ہے کہ احمد اقبال کو لکھنا چاہیے چاہے مختصر ہو۔ وہ نئے رائٹرز کے لیے اکیڈمی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اشفاق شاہین صاحب تمام کہانیاں پڑھ کر بھی الجھے الجھے سے رہ گئے اور ساگر تلوکر اس پہیلی کا جواب ڈھونڈتے نظر آئے جسے بقراط ادھورا چھوڑ گیا۔ یعنی عورت۔ ایمانے پرویز احمد لانگاہ کو سرورق کے مرد آہن سے تشبیہ دیتی نظر آئیں حالانکہ لانگاہ بھائی تو بے مثال ہیں۔ پرویز احمد لانگاہ کی ماضی پرستی پر ہنسی آئی۔ عبدالودود عامر اپنے مخصوص سلجھے ہوئے انداز میں شمارے کا پوسٹ مارٹم کرتے نظر آئے۔ کوثر اسلام کے سوالنامے کو پڑھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے خطوط کو اس تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ کیا کیا نکتے نکالے ہیں۔ طلعت مسعود کے حسبِ معمول بُردبار سنجیدہ و متین تبصرے کی توقع میں جب پڑھنا شروع کیا تو شکاری پر اعتراض پڑھ کر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ واہ کیا الفاظ کا انتخاب ہے۔ شاہد ذوالفقار صاحب سادگی سے منطقی اور غیر منطقی اعتراضات کرتے نظر آئے۔ مومنہ کشف آپ خود اچھی ہیں اس لیے آپ کو دوسرے بھی اچھے لگتے ہیں۔ ایم اقبال صاحب اتنا چھوٹا سا ڈائجسٹ آپ بانہوں میں کیسے سنبھال لیتے ہیں وہ بھی پیاز کاٹتے ہوئے؟ منشی محمد عزیز، عائشہ مرزا اور عبدالجبار رومی کے خوبصورت تبصرے نکتہ چیں دوستوں کی محفل کو چار پانچ چاند مزید لگاتے نظر آئے۔ اولین صفحات پر روبینہ رشید صاحبہ کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی اور کہانی پڑھ کر علم ہوا یہ خوشی بے سبب نہیں تھی۔ سرّیت بھرے انداز میں شروع ہونے والی تحریر نے ابتدا سے ہی اپنے ٹرانس میں لے لیا مگر اچانک ہونے والے اختتام نے مایوس کیا۔ کہانی کچھ اور طویل ہو سکتی تھی۔ (یقیناً) مجموعی طور پر تحریر دلچسپ رہی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

ادیب خان، بلال ٹاؤن ایبٹ آباد۔ سونیا جمشید، کوٹری۔ محمد اقبال، کراچی۔ ہما انصار، کراچی۔ شہناز اقبال، کراچی۔ کامران فرید، حیدر آباد۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آئینِ وفا

امجد رئیس

حسن و عشق کی پیہم کشمکش... گریز و کشش... ہزار اوج سے پستی تک... عقل و خرد کی چیرہ دستی... جذبوں کا مدّوجزر... تگ و تاز کی انتہا... اندیشہ و احتمال... افعال و انفعال۔ رہ گزر بھی لہو رنگ... خنجر بکف... شمشیر بدست... راہِ عشق و فنا میں وہ دلبِر دلربا... آفتِ جاں، ستم گر... زہرہ نگاہ بھاگتی رہی... تابِ غم آزماتی رہی... اشک گراتی رہی... حسن و عشق کے پیچ و خم۔ تجسس و ابہام سحرناک... جو آخری سطر تک قارئین کو اپنے شکنجے میں مقید رکھیں گے...

رومان پرور... فسوں گر... سحر انگیز... مثلِ طلسم... حشر ساماں ناول کی تلخیص

سائمن ٹروٹ، کوسیما کے ڈیک پر کھڑا شبِ دیجور میں بلند ہوتے شعلوں کا نظارہ کررہا تھا۔ وہ ساحل سے زیادہ دور نہیں تھے۔ آگ شدید تھی۔

کوسیما کے کیپٹن نے ٹروٹ سے کہا۔ ”آگ اسے تیزی سے سمندر بُرد کر دے گی۔“ وہ مڑا اور کوسیما کی رفتار بڑھانے کا حکم دیا۔

”کسی کے بچنے کا امکان کم ہے۔“ ٹروٹ نے کہا۔ شعلے فوارے کے مانند بلند ہورہے تھے۔

”رفتار کم کرو، پانی میں تیل ہے۔“ کیپٹن نے کہا۔ کوسیما، آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پانی میں گویا چھوٹا سا آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ آگ میں گھرے ہوئے بدقسمت جہاز کا نام میکس ہیولر تھا۔ وہ پانی کے اندر جارہا تھا۔ چند منٹ بعد اس کا نام ونشان مٹ جانا تھا۔ وہ اسپینش واٹر سے دو میل دور تھے۔ وہاں پانی گہرا تھا۔ آخری لمحات میں ٹروٹ نے تاریکی میں حرکت کی معمولی جھلک دیکھی۔ جھلک میکس ہیولر سے دو سو گز دور تھی جو آگ کی روشنی کے باعث نظر آگئی۔ فوراً بعد اسے کئی افراد کی چیخیں سنائی دیں۔

”یہاں...... ہم یہاں ہیں۔“ وہ ایک لائف بوٹ تھی۔ کیپٹن نے سرچ لائٹ لائف بوٹ پر مرکوز کردی۔ دو بج رہے تھے۔ عملے نے کوسیما کا رخ پھیرا

اور لائف بوٹ سے پُرمسرت آوازیں بلند ہونے لگیں۔ وہ پانچ یا چھ تھے اور زندہ بچنے کے ہیجان میں مبتلا ہو گئے تھے۔

"یہ مکمل کریو ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، دو مر گئے ہیں۔"

"تم لوگ کیوں بچ گئے؟" ٹروٹ نے اپنے آدمیوں کو بہ آواز بلند اشارہ کیا۔ آٹومیٹک گن سے گولیاں بارش کی طرح برسیں۔ بچانے والے موت کے ہرکارے ثابت ہوئے۔ چیخ و پکار کے ساتھ سرخ رنگ اچھلنے لگا۔ بوٹ میں گولیوں سے سوراخ ہو گئے تھے جس کے باعث پانی بھرنے لگا اور لاشوں کو لے کر بوٹ بھی سمندر بُرد ہو گئی۔

"کام ختم کیپٹن...... میرا خیال ہے اب......"

اچانک اس کی زبان بند ہو گئی۔ چند گز دور پانی کی آواز آئی...... جیسے کوئی مچھلی تڑپی ہو۔ کوئی چیز ابھر کر پانی میں غائب ہو گئی۔

"اس طرف۔" ٹروٹ چیخا۔ "فائر۔"

اس کے آدمی اُلجھن میں تھے۔ "فائر کرو۔" وہ پھر چلّایا۔ عملے کے ایک آدمی نے مذکورہ سمت میں ایک کلپ اسپرے کر دیا۔ ٹروٹ نے کچھ دیر جائزہ لیا۔ "پورٹ کی طرف چلو۔" ٹروٹ کی نگاہ وہیں تھی۔ پانی میں خفیف حرکت اس نے پھر دیکھی۔ مچھلی ہے شاید۔ وہ بڑبڑایا اور مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

وہ ایک معمولی سی چوری کی فرمائش تھی۔ جو ویرونیکا نے جورڈن سے کی تھی۔ اس کی زمرد آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ تینتیس برس کی عمر میں اس کا حسن فتنہ پرور تھا۔

"ویرونیکا، میں یہ نہیں کر سکتا۔" اس کا انکار متوقع تھا۔

"جورڈی پلیز۔" اس نے التجا کی۔ "سوچو کیا ہوگا اگر وہ خطوط اولیور کے ہاتھ لگ گئے۔"

"کچھ دن کی تلخی کے بعد حالات معمول پر آجائیں گے۔"

"اگر ایسا نہیں ہوا...... اگر طلاق ہو گئی؟"

"ویرونیکا تمہیں یہ افیئر شروع کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

"میرا خیال نہیں تھا کہ وہ کمینگی کا مظاہرہ کرے گا۔ یہ محبت نہیں تھی اور وہ محبت کا دعویٰ کر کے مجھے دھمکا رہا ہے۔

شریف آدمی ایسے ہوتے ہیں؟" اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

"نہیں، ویسے تم نے خطوط میں کیا لکھا ہے؟"

ویرونیکا کا سر جھک گیا۔ "وہ جو نہیں لکھنا چاہیے تھا۔"

جورڈن نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ جورڈن کے تعلقات ویرونیکا سے تھے لیکن اس وقت وہ اکیس سال کی تھی۔ یہ سلسلہ جلد ختم ہو کر دوستی تک محدود رہ گیا تھا۔ اس نے اولیور سے شادی کر لی...... یہ ایک کلاسک جوڑ تھا۔ اولیور کی دولت اور ویرونیکا کا حسن...... جورڈن مطمئن تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ویرونیکا ایسی بچکانا حرکت کرے گی۔ اگر اولیور، ویرونیکا کو معاف بھی کر دیتا ہے تو عاشق نابکار خطوط تقسیم کرنے کے لیے آزاد ہوگا۔

"کیا وہ اتنا ہی بُرا ہے؟"

"بہت زیادہ...... میں نے منہ بند کرنے کے لیے اسے رقم کی بھی پیشکش کی تھی۔ مجھے کسی دوست سے اس قسم کی مدد طلب نہیں چاہیے لیکن......"

"چوری۔" جورڈن نے کہا۔

"جورڈی میں جانتی ہوں کہ اس نے خطوط کہاں رکھے ہوں گے، یہ دشوار کام نہیں ہے۔ تمہاری بہن کی ہفتے کو منگنی ہے۔ اس رات تم اسے مدعو کر سکتے ہو۔"

"بیرل، گائے ڈیلنسی کو پسند نہیں کرتی۔" جورڈن نے کہا۔

"کسی طرح اُسے بلا لو...... یہاں جیٹ وِنڈ میں پھر وہ شیمپئن میں کھو جائے گا۔"

"اور میں چوری کے لیے اس کے گھر میں گھس جاؤں۔" جورڈن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر میں پکڑا گیا؟"

"گائے کا اسٹاف ہفتے کو چھٹی کرتا ہے۔ تم ایک ہوشیار آدمی ہو۔ تم نے کبھی میرے کسی سیکرٹ کا فائدہ نہیں اٹھایا۔" اس نے اعتماد کے ساتھ جورڈن کو دیکھا۔ "اور تم ہی ہو جس پر میں اعتبار کر سکتی ہوں...... بولو، پلیز...... تم میرے لیے یہ کام کرو گے؟"

جورڈن نے تھکے ہوئے انداز میں پیشانی مسلی اور کرسی پر ڈھیر ہو کر بولا۔ "سوچوں گا۔" اس کی نظر ٹاوسٹوک فیملی کی پینٹنگ پر تھی۔ قابلِ قدر، معزز افراد، ان میں کوئی بھی چور نہیں تھا اب تک......

☆☆☆

مقررہ وقت پر سرونٹ کوارٹرز کی روشنیاں اندھیرے میں بدل گئیں۔ دیرینہ ملازم وائٹ مور کا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شیڈول یکساں تھا۔ اس نے مکان کا چکر کاٹ کر دروازے اور کھڑکیاں چیک کیں۔ کچھ وقت کچن میں گزارا۔ پھر تمام بتیاں گل کر دیں۔

ایک ہفتے سے کیلی رائس، اس کی روٹین چیک کر رہی تھی اور دس دن سے وہ گائے ڈیلینسی کے گھر کے گرد منڈلا رہی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ وائٹ مور نیند کی بانہوں میں ہلکورے کب لیتا ہے۔ باڑھ کے پیچھے سے وہ اٹھی اور قدم بہ قدم چٹانی سطح پر چڑھنا شروع کیا۔ ہوا میں نمی تھی اور گھاس بھیگی ہوئی تھی۔ اس کی چست پتلون رانوں سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ آنے والے واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی اور ہیجانی کیفیت میں تھی مگر وہ باصلاحیت تھی اور پُراعتماد بھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ پکڑی نہیں جائے گی۔ کام تھوڑا سا مشکل تھا مگر اس نے سر کر لیا تھا۔ وہ عمارت کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

کیلی کو عالیشان بیڈ روم کی تلاشی کے لیے گھنٹوں درکار تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے رائٹنگ ٹیبل سے آغاز کیا۔ پھر ڈریسر، وارڈ روب...... وہ وارڈ روب کا دروازہ کھولنے والی تھی کہ ایک نامانوس آواز نے اس پر سکتہ طاری کر دیا۔ آواز دوبارہ آئی تو پہلے سے بلند تھی۔ کیلی نے بالکونی میں جھانکا اور پھرتی سے پلٹ کر وارڈ روب میں چھپ گئی۔

ونڈرفل۔ دوسرا چور...... کیا تیسرا بھی آئے گا؟ یہ اتفاق کیلی رائس کے گمان میں نہ تھا۔ آنے والا بالکونی کے راستے آ رہا تھا۔ کیلی بلند قیمتی وارڈ روب میں مزید پیچھے چلی گئی۔ ملبوسات اسے آڑ فراہم کر رہے تھے۔ کیلی کی صرف دھڑکنیں بول رہی تھیں۔

دھیرے سے فلیش لائٹ کی دھار ظاہر ہوئی، جو وارڈ روب کے کنارے سے ہوتی ہوئی درمیان میں رک گئی۔ کیلی کو پسینے کا احساس ہوا۔ وہ مرد کی جھلک بالکونی سے پرے پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اس کے سر پر سنہرے بال تھے۔ کوئی وجیہہ اور جوان چور تھا لیکن وہ اس وقت وارڈ روب پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔

اچانک وہ وارڈ روب کے پاس سے ہٹ گیا اور ڈریسنگ کی طرف چلا گیا۔ کیلی نے رکی ہوئی سانس خارج کی...... تجسس نے اسے جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ چور بڑبڑاتے ہوئے درازوں کو کھنگال رہا تھا۔ کیلی نے اس کا پورا سراپا دیکھا اور دنگ رہ گئی۔ وہ کسی رخ سے نقب زن نہیں لگ رہا تھا۔ فیکیڈ وجیکٹ اور بلیک بو ٹائی میں ملبوس...... وہ کسی کاک ٹیل پارٹی سے بھاگا ہوا مفرور نظر آ رہا تھا۔ معاً اس کی بڑبڑاہٹ مطمئن سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔

کیا وہ بھی ”آئی آف کشمیر“ کی تلاش میں آیا تھا

لیکن اس نے کوئی لفافہ نکال کر جیب میں رکھا تھا۔ کیلی نے محسوس کیا کہ اس کی آمد کا مقصد پورا ہو چکا ہے اور وہ جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ اس نے تیزی سے وارڈ روب کا رخنہ بند کر کے دیکھنے کی کوشش کی۔ تاہم گھبراہٹ میں یہ ایک غیر متوازن حرکت ثابت ہوئی۔ اس کی پشت وارڈ روب کے عقب سے ٹکرائی۔ کیلی کی سانس رک گئی۔ فلیش لائٹ بجھ گئی تھی...... کچھ دیر بعد کسی نے وارڈ روب پر ہاتھ رکھا۔ ظاہر ہے ہاتھ چور کا تھا...... چور کیا ہیرو تھا۔ پتا نہیں یہاں کیوں گھس آیا تھا؟ فلیش لائٹ پھر روشن ہوئی اور وارڈ روب کا در کھول دیا گیا۔ لائٹ، کپڑوں میں سے جھلکتے کیلی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ روشنی آنکھوں میں تھی، لہٰذا کیلی اسے دیکھنے سے قاصر تھی لیکن وہ دیکھ رہا تھا۔ دونوں بے آواز و بے حس وحرکت تھے۔

بالآخر ہیرو چور بولا۔ ”کون ہو تم؟“

وہ کسمسائی اور خاموش رہی۔ خاموشی بھی جواب تھا۔

جورڈن نے لائٹ کا رخ بدلا۔

”آخری بار پوچھ رہا ہوں...... کون ہو تم؟“

جواب میں جورڈن نے پُراسرار مسکراہٹ وصول کی جس میں شرارت کی آمیزش تھی۔ مسکراہٹ کے ساتھ ہی وہ بلی کے مانند اچھلی۔ غیر متوقع تصادم کے باعث جورڈن لڑکھڑا کر بستر پر گرا۔ کیلی بالکونی کی طرف لپکی۔ جورڈن نے جست لگائی اور ٹخنے کے پاس سے اس کی ٹانگ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں زمیں بوس تھے۔ کشمکش کے دوران کسی کا ہاتھ میز کے پائے پر لگا...... کئی پین اور پنسل فرش پر گرے۔ جورڈن پھرتیلے چور پر چھا گیا جس نے بل کھا کر جورڈن کی ناف کے نیچے گھٹنا مارا۔ جورڈن اذیت کے مارے تڑپ اٹھا۔ حریف تقریباً آزاد ہو گیا تھا۔ قبل اس کے کہ تاخیر ہو جاتی، جورڈن نے بروقت چہرے کی جانب آتی ہوئی حریف کی کلائی تھام لی۔ اس کے گھونسوں سے بچتے ہوئے جورڈن نے ٹوپی پر ہاتھ مارا اور سن ہو گیا۔ ٹوپی کے نیچے سے اخروٹی رنگت کی لہر دار زلفیں نکل کر بکھر گئیں۔

اندر آنے والی چاندنی میں اس کی حرکت کے ساتھ ریشمی زلفیں پارے کے مانند لہرا رہی تھیں۔ جورڈن عالم حیرت میں گھورتا چلا گیا......

لڑکی کا مچلنا کم ہو گیا۔ دونوں ایک ٹک ایک دوسرے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کو دیکھے جا رہے تھے۔ دونوں کا تنفس ناہموار تھا۔ دل کی دھڑکنیں آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

اسے پہلے کیوں احساس نہیں ہوا کہ اس کے نیچے ایک نرم گرم نسوانی بدن ہے۔ اچانک وہ بولی۔ ''چھوڑ دو مجھے۔''

''پہلے بتاؤ، کون ہو تم؟''

جواباً وہ مسکرائی۔ سانسوں کی مہک...... چہرہ بہت قریب تھا۔ قدموں کی آہٹ نے جورڈن کی سوچ کا شیرازہ بکھیر دیا۔ بہکے حواس واپس جگہ پر آ گئے۔ شور شرابے سے یقیناً بٹلر کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے وہاں؟''

پلک جھپکتے ہی دونوں اپنے قدموں پر آ گئے اور بالکونی کی جانب لپکے۔ لڑکی ریلنگ پر پہلے پہنچ گئی۔ اس کی حرکات میں بندر کی لپک جھپک تھی۔ جب جورڈن درخت کے سہارے زمین تک پہنچا، وہ دوڑتی ہوئی لان کراس کر رہی تھی۔ تاہم باڑھ تک پہنچتے پہنچتے جورڈن نے اسے جا لیا۔

''کیا کر رہی تھیں وہاں؟'' اس نے سوال کیا۔

''تم کیا کر رہے تھے؟'' لڑکی نے الٹا سوال کیا۔

عقب میں بیڈروم کی بتیاں روشن ہو گئیں۔

''چور، بدمعاش، میں پولیس کو فون کر رہا ہوں۔''

''میں پولیس کا انتظار نہیں کر سکتی۔'' وہ بولی اور باڑھ پھلانگ کر درختوں کی جانب بھاگی۔ جورڈن نے گہری سانس لی اور اس کے پیچھے دوڑا...... وہ ایک ناہموار علاقہ تھا۔ درخت، جھاڑیاں، شاخیں، پتھر...... دراڑیں۔ دونوں ایک میل تک اچھلتے کودتے، جھکتے...... بچتے بچاتے، چکراتے دوڑتے رہے۔ دونوں کی سانس بحال ہوئی تو جورڈن ہم کلام ہوا۔

''ہم م...... م...... تو گزر بسر کے لیے تم یہ کام کرتی ہو؟''

لڑکی نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ ''اگر تم مجھے چور سمجھ رہے ہو تو غلطی پر ہو۔'' دونوں پہلی بار نارمل انداز و حالات میں بات کر رہے تھے۔ جورڈن اس کی سُریلی آواز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہ چور نہیں ہو سکتی۔'' جورڈن نے سرگوشی کی۔

''کیا کہا؟'' پھر وہی ساز کی جھنکار۔

''لیکن تمہارا عمل اور لباس...... چہرے کی حالت؟ یہ ایک چور کا حلیہ ہے۔'' وہ بولا۔

''میں چور نہیں ہوں۔'' اس نے اضمحلال سے کہا اور پتھر سے ہٹ کر ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ ''کیا تم چور ہو؟''

''یقیناً نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''لباس اور حلیے کا سہارا لے رہے ہو؟''

''نہیں، میں چور نہیں ہوں...... وہ بس ایک عملی مذاق تھا۔''

وہ ابھی تک مشکوک نظروں سے جورڈن کو تک رہی تھی۔

''ڈریسنگ میں سے تم نے کیا نکالا تھا؟'' اس نے سوال کیا۔

جورڈن نے ٹھنڈی سانس بھر کے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ فوراً ہی لڑکی حرکت میں آئی اور راہِ فرار کی تیاری کی۔

''ارے نہیں، کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ محض ایک پاؤچ ہے۔'' جورڈن نے یقین دہانی کرائی۔

''اب تم بتاؤ، چور ہو؟''

''نہیں، کچھ ثابت کرنا تھا۔''

''اچھا کیا؟''

''یہی کہ مسٹر گائے ڈیلنسی کو سیکیورٹی سسٹم کی ضرورت ہے اور میری کمپنی یہ کام کر سکتی ہے...... خوب اچھی طرح۔''

''تم سیکیورٹی کمپنی کے لیے کام کرتی ہو؟'' جورڈن ہنس پڑا۔ ''کون سی کمپنی؟''

لڑکی کے موتی جیسے دانت بھی جھلک دکھلا گئے۔ ''میں نیرو ڈ ایسوسی ایٹس کے ساتھ کام کرتی ہوں۔'' وہ جانے کے لیے مڑی۔

''رکو مس...... تمہارا نام تو معلوم ہی نہیں ہوا۔''

لڑکی نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ ''اور تمہارا بھی۔'' وہ گھاس پر دوڑ پڑی۔ ''ایسے ہی چلنے دو۔''

جورڈن نے تھکے ہوئے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ کیا لڑکی کو جانے دینا چاہیے تھا؟ مگر وہ کیا کرتا، اس کی گاڑی اس مقام سے نصف میل دور تھی۔ اسے چیٹ ونڈ، آبائی جاگیر پر پہنچنا تھا۔ پارٹی اس نے مس کر دی تھی۔ تاہم ویرونیکا کے لیے وہ خطوط حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

☆☆☆

جورڈن کا خیال غلط نکلا۔ چیٹ ونڈ پر پارٹی جوبن پر تھی۔ وہ ڈرائیو وے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کس جانب سے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اندر قدم رکھے۔ اپنا حلیہ درست کرتے ہوئے اس نے سامنے سے ہال میں جانے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دبے قدموں ہال روم کراس کیا اور گھومتی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ ابھی وہ دوسری منزل پر پہنچا تھا کہ عقب سے ایک نسوانی آواز نے اسے ساکت کر دیا۔

''جورڈی، تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

جورڈن خاموشی سے مڑا۔ نیچے اس کی بہن بیرل کھڑی تھی۔ وہ میک اَپ اور لباس کے انتخاب میں ہمیشہ سے زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ ایک ماہ قبل رچرڈ وولف کے ساتھ منگنی کے بعد سے مسکراہٹ مستقل بیرل کے لبوں پر کھیلتی رہتی تھی اور جورڈن دیکھ رہا تھا کہ اس وقت بہن کا حسین چہرہ مسکراہٹ سے عاری تھا۔

جورڈن کی شکن آلود جیکٹ، پتلون پر گرد اور جوتوں کی کیچڑ...... بیرل کی نگاہوں کی زد میں تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سوال کرتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔''

''تو سوال نہ کرو۔'' جورڈن نے کہا۔

''لیکن یہ ضروری بھی ہے۔'' وہ بولی۔ ''کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟''

وہ پلٹ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ''میں چہل قدمی کے لیے نکل گیا تھا۔''

''بس اتنا ہی؟ پہلے تم نے فرمائش کی کہ گائے کو بھی مدعو کیا جائے...... جو مے نوشی اس طرح کرتا ہے جیسے پانی پیا جاتا ہے۔ خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا بھی عادی ہے اور پھر تم غائب ہو گئے۔ اب اس حالت میں نمودار ہوئے ہو۔'' وہ بھی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

''بیرل۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور رخ اس کی جانب پھیرا۔ ''گائے کے بارے میں، میں دل سے معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے اپنا منہ بند رکھنا ہے۔ میں کسی کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا۔''

''ہونہہ، کپڑے تبدیل کر لو۔ قبل اس کے کہ کوئی اور تمہیں اس حال میں دیکھے۔ وہ مڑی اور واپس چلی گئی۔ اپنے پیچھے دروازہ اس نے بند کر دیا تھا۔

جورڈن نے سر جھکا کر نیچے دیکھا۔ کھلی جیکٹ کے بٹن کے سوراخ میں ایک بنا سبز جھنڈے کے پائندا اٹکا ہوا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ پارٹی جاری تھی۔ شیمپین کا دور چل رہا تھا۔ جورڈن نے نیا سوٹ زیب تن کیا۔ بال سنوارے اور پارٹی میں شامل ہو گیا۔ کسی نے اس کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کا رخ بوفے ٹیبل کی طرف تھا۔ خوشبو کا جھونکا آیا اور کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ جورڈن پلٹا۔ وہ ویرونیکا تھی۔ ''کیا بنا؟'' اس نے بے تابی سے سرگوشی کی۔

''تمہاری اطلاع نامکمل تھی۔ میں پکڑا جا سکتا تھا۔''

جورڈن نے جواب دیا۔ ''وہاں ایک اور ملازم تھا۔''

''اوہ، نو......'' وہ کراہ اٹھی۔ ''یعنی کام نہیں ہوا؟''

''خیر کام تو ہو گیا۔''

''گریٹ۔'' خوشی کے رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ مسکراہٹ لوٹ آئی۔ ''اوہ جورڈی۔'' اس نے بانہیں اس کے گلے میں حمائل کر دیں۔ ''تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔''

معاً جورڈن نے ویرونیکا کے شوہر اولیور کی جھلک دیکھی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''اولیور آ رہا ہے۔'' جورڈن نے سرگوشی کی۔

''آنے دو۔'' ویرونیکا ہزار واٹ کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر مڑی۔ ''ڈارلنگ، کہاں ہو تم...... میں نے تو تمہیں کھو دیا تھا۔''

''لگ تو نہیں رہا۔'' اولیور نے مشتبہ نظروں سے جورڈن کو دیکھا۔ اولیور اپنی زوجہ محترمہ سے بیس برس بڑا تھا۔ تاہم وہ ویرونیکا کا ہاتھ جیتنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس ہاتھ میں اب ہیرے جگمگا رہے تھے۔

''تاخیر ہو گئی ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔

''ابھی تو رات بھیگی ہے، ڈارلنگ۔'' ویرونیکا نے مستی بھرے انداز میں کہا۔

''میں تھک گیا ہوں۔ صبح ایک ضروری میٹنگ بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔'' ویرونیکا نے شوخ نظروں سے جورڈن کو دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ آج میں پرسکون نیند لوں گی۔''

'ہاں اپنے شوہر کے ساتھ......' جورڈن نے سوچا۔ اور گلاس لے کر ہال میں چکرانے لگا۔ اُسے گائے نظر آیا۔ جو مسز بکسوم کے ساتھ خوش فعلیوں میں مگن تھا، پھر اس کی نظر رچرڈ پر گئی اور وہ ہونے والے بہنوئی کی جانب بڑھ گیا۔

''کیا تم نے کسی سیکیورٹی فرم نیمرو ڈ ایسوسی ایٹ کے بارے میں سنا ہے؟'' اس نے رچرڈ سے سوال کیا۔

''نہیں، میں نے نہیں سنا لیکن تمہارے لیے میں

چیک کرکے بتا سکتا ہوں۔'' رچرڈ نے کہا۔
''میں ممنون ہوں گا۔''
رچرڈ پُرسوچ انداز میں جورڈن کو دیکھ رہا تھا۔ رچرڈ کا انٹیلی جنس پس منظر بیدار ہو رہا تھا۔ سوالات اس کے ذہن میں کُلبلانا شروع ہو گئے تھے۔ جورڈن نے خفیف سی پریشانی محسوس کی۔
اس اثنا میں بیرل بھی دونوں کے قریب آ گئی۔
رچرڈ، بجلیاں گراتی اپنی دلربا منگیتر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جورڈن نے گلاس خالی کیا اور سوڈا واٹر کے لیے اطراف میں نظر گھمائی۔ نگاہ انکل ہیو پر ٹھہر گئی۔ جو اس خوشی کے موقع پر میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے خوب چہک رہے تھے۔
دفعتاً گائے انکل ہیو سے بات کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدمزگی کے آثار واضح تھے۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔
''کیا معاملہ ہے؟'' جورڈن نے استفسار کیا۔ بیرل نے انکل کو دیکھا جو انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ ان تینوں کے قریب چلے آئے۔
''خوب صورت شام کا انجام اچھا نہیں ہوا۔'' ان کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔
''کیا ہو گیا؟'' بیرل کا سوال تھا۔
''گائے ڈیلنسی کے آدمی کی کال تھی۔ اس نے چوری کی رپورٹ کی ہے۔ بٹلر بھی گھر پر تھا۔ کوئی بالکونی کے راستے ماسٹر بیڈ میں گیا تھا۔''
''کچھ چرایا گیا ہے؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔
''ابھی تک ایسا کچھ سامنے نہیں آیا لیکن یہاں کسی پر شک کیا جا سکتا ہے۔''
''شک؟'' جورڈن نے قہقہہ لگایا۔ ''لیکن کیوں؟''
''اگر ہم اُسے آج رات یہاں مدعو نہ کرتے تو چور کو اس کے گھر میں گھسنے کا موقع نہ ملتا۔''
''عجیب بات ہے۔'' جورڈن نے کہا۔
''جورڈن نے مسکراتے ہوئے سوڈا واٹر کا سپ لیا۔ تاہم وہ دیکھ رہا تھا کہ بیرل متواتر اسے گھورے جا رہی تھی۔ اس کی نظروں میں شک کا رنگ نمایاں تھا۔

☆☆☆

کیلی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئی تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ فون تک پہنچنے سے پہلے ہی گھنٹی بند ہو گئی۔ تاہم اسے علم تھا کہ گھنٹی پھر بجے گی۔ ٹونی بے قرار ہو گا جبکہ وہ فوراً ہی بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اگرچہ اسے جواب دینا ہی تھا...... جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔
وہ باتھ روم میں آ گئی۔ عالمِ مایوسی میں آئینے میں چہرے کو گھورتی رہی۔ واپسی کے دوران کار میں اس نے چہرے کا رنگ صاف کر دیا تھا لیکن اصل نکھار پیدا نہیں ہوا تھا۔ پانی اور تولیا کی مدد سے اس نے باقی ماندہ نشانات ختم کیے۔
فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔ وہ باتھ روم سے نکل آئی اور فون اٹھایا۔
''کیلی؟'' ٹونی کی آواز آئی۔ ''کیا بنا؟''
وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ ''ناکامی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔
''کیا تم گھر میں داخل ہو گئی تھیں؟''
''ہاں...... میں کامیابی کے قریب تھی، بہت قریب......''
''پھر......؟''
''پھر مداخلت ہو گئی۔''
''گائے ڈیلنسی؟''
''نہیں، یقین کرو یا نہ کرو۔ وہ کوئی دوسرا چور تھا۔'' کیلی تھکے ہوئے لہجے میں ہنس دی۔ ''یوں لگتا ہے کہ گائے کا گھر چوروں کے لیے کافی پُرکشش ہے۔''
دوسری جانب سے طویل وقفہ در آیا پھر ٹونی نے سوال کیا۔ جسے سن کر کیلی منجمد ہو گئی۔
''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شخص ایک دوسرا چور تھا؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ وان ویلڈن کا آدمی نہیں تھا؟''
نام سن کر کیلی کی انگلیاں برف ہو گئیں۔
''نہیں۔'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
''یہ ممکن ہے کہ انہیں اندازہ ہو گیا ہو کہ تم کس چیز کے پیچھے ہو۔ لہٰذا وہ خود بھی ''آئی آف کشمیر'' کے پیچھے پڑ گئے ہوں۔''
''وہ میرا تعاقب نہیں کر سکتے۔ میں نہایت محتاط تھی۔''
''کیلی، تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔''
''جہنم میں جائیں...... میں خوب جانتی ہوں کہ میرا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔''
وقفے کے بعد ٹونی نے نرمی سے کہا۔ وان ویلڈن کے دوست لندن میں بھی موجود ہیں...... اونچے عہدوں

پر...... بلکہ اس کے دوست اور مخبر ہر جگہ موجود ہیں۔"

"جانتی ہوں۔"

"تمہاری اہمیت اُن کے نزدیک ملین ڈالرز سے زیادہ ہے۔مردہ کیلی......"

کیلی کے ہاتھ کانپے۔آنکھوں میں غصے اور مایوسی کا پانی اتر آیا۔اس نے پلکیں جھپکائیں۔

"میرا خیال ہے کہ تم دوبارہ پولیس کو آزماؤ۔" ٹونی نے مشورہ دیا۔

"ایسی غلطی میں دوسری مرتبہ نہیں کرسکتی۔میں ثبوت حاصل کروں گی۔"

"کیلی تم تن تنہا یہ کیسے کروگی؟"

"میں کرسکتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں کرلوں گی...... اب میں دوسرا راستہ اختیار کروں گی۔"

"کون سا؟"

"براہِ راست...... سیدھا۔فرنٹ ڈور۔شراب اور شباب اس کی کمزوری ہے۔"

"کیلی، نہیں......" ٹونی کراہ اٹھا۔

"اس جیسے آدمی کو میں سنبھال سکتی ہوں۔وہ جلد ہی مجھ میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوجائے گا۔وان ویلڈن مجھ تک پہنچنے کے لیے آٹھ دس دن لگا دے گا۔اس سے پہلے میں کام کرلوں گی۔"

"گڈ لک، کیلی۔" ٹونی نے نیک نیتی سے کہا۔

☆☆☆

"میں نے نیمروڈ ایسوسی ایٹس کا نام چیک کیا ہے۔" رچرڈ نے کہا۔"کم از کم انگلینڈ میں ایسی کوئی فرم نہیں ہے۔"

وہ تینوں ٹیرس پر بیٹھے تھے۔دو کپ کافی کے بعد جورڈن کے دماغ نے کام کرنا شروع کیا۔رات وہ کئی مرتبہ بیدار ہوا۔ہر بار خواب میں وہی لڑکی نظر آئی تھی۔اس نے تصور کو جھٹکا اور کافی کا تیسرا کپ تیار کیا۔

بیرل ٹوسٹ کے ساتھ مارملیڈ انجوائے کررہی تھی اور نگاہیں جورڈن کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

"جورڈی کیا تم بتاؤ گے کہ نیمروڈ کا نام تم نے کہاں سنا؟"

"وہاٹ؟" جورڈن نے نگاہ اٹھاتے ہوئے پُراعتماد نظر آنے کی کوشش کی۔"پتا نہیں...... شاید خواب میں۔"

"میرا قیاس ہے کہ کل رات کی بات ہے۔" رچرڈ نے کہا۔

"ہاں، شاید ویرونیکا نے ذکر کیا تھا۔" جورڈن بولا۔

بیرل کی مشکوک نگاہیں جورڈن کے چہرے کا طواف کررہی تھیں۔"ان دنوں تم کچھ بدلے بدلے نظر آتے ہو۔میں صرف یہ جاننے کی کوشش کررہی ہوں کہ آخر معاملہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے تردید کی۔

"دیکھو، وہ پولیس کی گاڑی نہیں ہے۔" رچرڈ کی آواز آئی اور کافی کا کچھ حصہ جورڈن کی سانس کی نالی میں جاتے جاتے رہ گیا۔پولیس کار چیٹ ونڈ کی ذاتی سڑک پر مڑ کر ڈرائیووے کی طرف آئی۔کار رکی اور کانسٹیبل گلین نے باہر قدم رکھا۔ٹیرس کی طرف دیکھ کر اس نے ان تینوں کی طرف ہاتھ ہلایا۔گلین سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور جورڈن کے دماغ میں تین الفاظ چکرا رہے تھے۔جیل، اخبارات میں تصویر اور بدنامی۔

"سب کو صبح بخیر۔" اس نے کہا۔"کیا میں لارڈ لیوٹ (انکل) سے بات کرسکتا ہوں؟" گلین نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"انہیں کچھ دیر ہوگئی۔وہ ایک ہفتے کے لیے لندن سے باہر ہیں۔" بیرل نے جواب دیا۔

"اوہ، شاید میں آپ لوگوں سے بات کرسکوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔" بیرل نے مسکراتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔"ناشا کرو۔"

کانسٹیبل گلین بیٹھ گیا۔اس نے کافی پر اکتفا کیا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کے علم میں ہوگا کہ گائے کی رہائش گاہ پر کوئی چور داخل ہوا تھا؟"

ڈیلنسی"گزشتہ رات ہم نے سنا ہے۔" بیرل نے کہا۔

"کوئی سراغ ملا؟"

"ہاں، ایک معقول شے ملی ہے جس کا تعلق یہاں سے بن سکتا ہے۔" گلین، جورڈن کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

جورڈن نے کمزور انداز میں مسکراہٹ کا جواب دیا۔

"خوب، پولیس بہت اچھا کام کررہی ہے۔" بیرل نے کہا۔

"نہیں۔اتنا شاندار بھی نہیں۔" گلین نے اعتراف کیا۔"بس چور سے کچھ بے پروائی ہوگئی تھی جس کے سہارے ہم آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔لڑکی اپنی ٹوپی وہاں گرا گئی تھی۔"

"شی؟" رچرڈ بولا۔"تمہارا مطلب چور کوئی عورت یا لڑکی تھی؟"

"ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا۔ اگرچہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن مفروضے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ دراز ریشمی زلفیں کافی ہیں جن کے چند بال ٹوپی کے ساتھ پائے گئے۔ وہ لڑکی ہے، جوان معلوم ہوتی ہے۔ زلفوں کی رنگت اخروٹی ہے۔ تمہاری واقفیت میں ایسی کوئی لڑکی تو نہیں؟" گلین نے پھر جورڈن پر نگاہ ڈالی۔

ٹوپی اور زلفوں کے بارے میں سن کر جورڈن نے اطمینان کی سانس لی اور دفاعی انداز ترک کر دیا۔

"ہاں ہیں...... اور سب کی سب چور ہیں، کچھ طوائف اور قاتل بھی ہیں...... آخری بات یہ کہ تم سیدھے یہاں کیوں چلے آئے؟ تمہیں پتا ہے تم کہاں بیٹھ کر کس سے کیا سوال کر رہے ہو؟"

جورڈن کے بھڑکنے پر گلین سٹپٹا گیا۔ بیرل اور رچرڈ بھی اس اچانک تبدیلی پر متحیر تھے۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر گلین نے آہستہ سے کہا۔ "یہ پہلی واردات نہیں ہے...... دس مہینے میں تیسری واردات ہے۔ تینوں وارداتیں اسی علاقے میں ہوئی تھیں۔ لڑکی دلیر اور پروفیشنل معلوم ہوتی ہے۔ اس مرتبہ وہ چوک گئی اور پیچھے ٹوپی چھوڑ گئی۔"

"کوئی چیز چرائی گئی ہے؟" بیرل نے سوال کیا۔

"گائے کے بیان کے مطابق کچھ نہیں۔"

جورڈن دل ہی دل میں مسکرایا۔

"امکان ہے کہ وہ آس پاس پھر نمودار ہوگی۔ اسی لیے میں، محض تنبیہ کی خاطر آیا تھا۔ آپ ہوشیار رہیں۔ گائے کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ چیسٹ وڈ، اس کے ٹارگٹ زون میں آتا ہے۔" گلین نے انکساری کے ساتھ کہا۔" اس نے پھر جورڈن پر نظر ڈالی۔

جورڈن نے سوچا کہ گلین اس سے کہیں زیادہ جانتا ہے، جتنا وہ ظاہر کر رہا ہے...... یا پھر یہ خود اس کا احساسِ جرم ہے۔

گلین اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہم سیکیورٹی بڑھا دیں گے۔"

بیرل نے رچرڈ کی طرف دیکھا۔

گلین نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور رخصت ہو گیا۔

"حیرت ہے اسے ہمیں ذاتی طور پر ہوشیار کرنے کی ضرورت کیوں پڑی؟" رچرڈ نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ انکل ہیو کی وجہ سے اس نے یہ عنایت کی ہے۔" بیرل نے کہا۔ "کئی برس پہلے وہ ایم سولہ میں "نگراں" کی حیثیت سے ملازم تھا۔ علاقائی نگرانی۔ میرا خیال ہے کہ وہ خود کو ابھی تک ٹیم کا حصہ سمجھ رہا ہے۔"

"لیکن میں ابھی تک یہ سمجھ رہا ہوں کہ یہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔" رچرڈ نے پُرسوچ انداز میں آنکھیں سکیڑیں۔

"چور لڑکی؟" بیرل نے کہا اور اچانک ہنسنے لگی۔

"لارڈ، کتنا سکون ملا ہے یہ سن کر کہ وہ کوئی مرد نہیں تھا۔"

"کیا مطلب ہوا؟" رچرڈ نے استفسار کیا۔

"مضحکہ خیز بات لگتی ہے۔"

"جو کچھ ہے...... بتادو۔" رچرڈ نے مطالبہ کیا۔

"دیکھو ذرا...... گزشتہ رات، میں سمجھی...... میرا مطلب ہے، یوں لگا......" اس نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ ہنستے ہنستے اس نے بتایا۔ "جورڈی...... میں سمجھی جورڈی کہیں واردات کر کے آیا ہے۔" رچرڈ بھی ہنس پڑا۔

☆☆☆

کیلی کی تفتیش کے مطابق اس کے علم میں یہ بات آئی کہ کسی روز دوپہر کے وقت بیشتر امرا پولو فیلڈ میں ہوں گے۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ گائے کی غیر حاضری میں اس کے گھر پہنچ گئی۔ اپنا تعارف لیڈی لیمب کے نام سے کرایا اور بٹلر سے استفسار کیا...... کیا مسٹر گائے حسبِ وعدہ پولو گیم کے لیے اس سے ملیں گے؟

بٹلر نے یقین دہانی کرائی کہ مسٹر گائے میدان میں ہوں گے۔ واپسی پر کراؤڈ میں گائے کی تلاش پر کیلی کے تیس منٹ صرف ہوئے۔ کیلی نے لباس پر خاص توجہ دی تھی اور قیمتی پرفیوم استعمال کیا تھا۔ ناز و انداز کے ساتھ امریکی حسن کے ہتھیاروں سے لیس وہ کوئی پری چہرہ امیرزادی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ سبز اور سفید دھاری دار ٹینٹ کے نیچے وہ کراؤڈ کے ساتھ موجود تھی۔ جہاں مے نوشی کے انتظامات بھی تھے۔

گائے کی جھلک بار کے نزدیک دکھائی دی تھی۔ وہ گلاس ہاتھ میں لیے اکیلا تھا۔ کیلی کی توجہ ٹارگٹ پر مرکوز تھی۔

"ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔" اس نے سوچا۔ وہ بے پروائی سے ٹہلتی ہوئی بار کے قریب ہوتی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ گائے کے قریب کھڑی تھی۔ تاہم اس نے گائے کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔

"شیمپین۔" اس نے بار مین سے کہا۔ بار مین نے حرکت کی۔ کیلی دیکھے بغیر محسوس کر رہی تھی کہ گائے اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ سرسری انداز میں کیلی نے رخ بدلا۔ اب وہ پوری طرح نہیں دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھ سکتی

تھی۔ تاہم گائے کی بے باک نگاہیں امریکن ہنسی کے فسوں میں کھو گئی تھیں۔ کیلی نے بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بارٹینڈر نے گلاس آگے کیا۔ کیلی نے چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور ادائے دلبرانہ کے ساتھ اپنی زلفوں کو چھیڑا۔ گائے گویا ریشہ خطمی ہو گیا۔

''کیا یہ ایک طویل دن نہیں ہے؟'' بالآخر اس نے راہ و رسم بڑھانے کی ابتدا کی۔

کیلی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ کسی وقت وہ ایک وجیہہ اور توانا شخص رہا ہو گا لیکن بداعتدالی نے اسے خاصا نقصان پہنچایا تھا۔

''طویل سے بھی زیادہ۔'' کیلی نے اکتائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہوائی جہاز کا سفر بھی اچھا نہیں رہا اور وعدے کے مطابق میرے دوست بھی یہاں نظر نہیں آ رہے۔''

''اوہ، تم کہاں سے آ رہی ہو؟''

''پیرس، میں نے چند ہفتے کے لیے چھٹی لی تھی۔ خطرہ ہے کہ مجھے اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑے گا۔ پیرس میں مزہ نہیں آیا۔''

''تمہیں ''پراونس'' ٹرائی کرنا چاہیے تھا، بجائے پیرس کے۔''

''پراونس، ہم...... م...... میں یاد رکھوں گی۔''

گائے کچھ قریب آ گیا۔ ''تمہارا لہجہ...... امریکن ہو؟''

''واوڈو...... تم تیز ہو۔'' کیلی نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ہاں میں امریکن ہوں۔'' تعریف نے گائے کو بھلا دیا۔

''کچھ عرصے میں لندن میں رہی ہوں۔ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اوہ، آئی ایم سوری۔''

''اس کا وقت تھا۔ وہ اسّی سال کا ہو چکا تھا۔'' گائے کچھ اور قریب ہو گیا۔

''اب تم کیا کرو گی؟''

''مجھے ٹرین کے ذریعے گھر جانا چاہیے۔'' کیلی نے ارادہ ظاہر کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ مسکرایا اور تقریباً کیلی کے پہلو میں آ گیا۔ ''شاید میری آفر تمہیں کچھ قبل از وقت محسوس ہو۔ لیکن تمہارا پروگرام خراب ہو گیا ہے۔ تم اُلجھن کا شکار ہو۔ یہ اچھی جگہ ہے۔ مجھے تمہیں سیر کرانے میں خوشی محسوس ہو گی۔''

''میں تمہارے اوپر کوئی ذمّے داری......''

''کوئی ذمّے داری والی بات نہیں ہے۔ میں بھی بور ہو رہا تھا۔ سوچا تھا کہ کچھ دیر پولو دیکھوں گا۔ پھر کلب سے واپس ہو جاؤں گا لیکن یہ صورتِ حال خوشگوار ہے۔''

کیلی نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا، جیسے سوچ رہی ہو کہ اس پر بھروسا کرنا چاہیے یا نہیں۔

''مجھے تمہارا نام تک نہیں معلوم۔'' اس نے کمزور آواز میں کہا۔

گائے نے فی الفور ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''گائے ڈیلینسی، خوشی ہوئی مل کر۔ اور تم......''

''ڈیانا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''ڈیانا لیمب۔''

☆☆☆

جورڈن کو پولو سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ویرونیکا کی وجہ سے وہاں آیا تھا۔ خطوط کا بنڈل اس نے ویرونیکا کے حوالے کیا۔ اس کا شوہر گراؤنڈ میں موجود تھا۔ لہٰذا جورڈن زیادہ دیر ویرونیکا کے ساتھ نہیں رک سکتا تھا۔ اولیور کے آنے سے پہلے وہ ویرونیکا سے الگ ہو گیا۔

وہ سبز اور سفید پٹیوں والے ریفریشمنٹ ٹینٹ کی طرف جا رہا تھا۔ کونے میں اسے ایک میز دکھائی دی اور وہ اس جانب چل پڑا۔ میز کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ قریب والی میز پر گائے موجود تھا۔ گائے کے بالمقابل کوئی عورت بیٹھی تھی جس کی پشت جورڈن کی طرف تھی۔ وہ اس کے شانوں سے کچھ نیچے آتی ہوئی اخروٹی رنگ کی ریشمی زلفوں کو ہی دیکھ سکتا تھا۔ وہ دونوں بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔ جورڈن نے مداخلت کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور اپنی میز پر کرسی سنبھالی۔

گائے کی کسی بات پر عورت ہنسی اور جورڈن کے کان کھڑے ہو گئے...... آواز تھی یا ساز کی جھنکار۔ جورڈن کی نگاہ صنفِ نازک کی زلفوں پر جم گئی۔ جورڈن نے آہستگی سے کرسی کا رخ بدلا اور لڑکی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

بلاشبہ وہی تھی، وہی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں۔ شاید لڑکی کی چھٹی حس پھڑکی۔ اس نے گردن موڑی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ دونوں کو ایک جیسا جھٹکا لگا تھا۔ گائے، کیلی میں مگن تھا۔ جورڈن کو نہ دیکھ سکا۔ لیکن کیلی کے بدلتے تاثرات کے باعث اس نے نظروں کا تعاقب کیا اور جورڈن کو دیکھ لیا۔ جورڈن سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ گائے کو خبردار کر دے۔ لیکن وہ خود بھی وہیں تھا۔ وہ کیسے کہے گا کہ یہ لڑکی چور ہے جبکہ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ کوئی

چورنی ہے۔لیکن یہاں دونوں کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ لڑکی گائے کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

''اوہ، ہیلو جورڈی...... تم یہاں بیٹھے ہو۔''

لڑکی کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ اس نے بوکھلاہٹ چھپاتے ہوئے گلاس اٹھایا، گائے نے جورڈن کی نگاہ کا پیچھا کیا۔

''کیا تم دونوں مل چکے ہو؟'' گائے نے سوال کیا۔

دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔ ''ہاں۔''

''نہیں۔'' لڑکی نے جواب بدلا۔

گائے کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔ ''تم دونوں پُریقین نہیں ہو؟''

''اس کا مطلب ہے۔'' لڑکی جورڈن سے پہلے بولی۔ ''ہم پہلے ایک دوسرے کو دیکھ چکے ہیں۔ ہم متعارف نہیں ہوئے تھے۔'' وہ براہِ راست جورڈن کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر میں خاموش چیلنج تھا۔ ''تردید کر سکتے ہو تو کرو۔''

''بڑی چنٹ ہے۔'' جورڈن نے سوچا۔

''میں تعارف کراتا ہوں۔'' گائے نے کہا۔

''لارڈ لیوٹ کا بھتیجا ہے۔ جورڈن ٹاوسٹوک۔ اور یہ......'' گائے نے فخر سے ہاتھ لہرایا۔ ''ڈیانا لیمب۔''

لڑکی نے ہاتھ سے جورڈن کو میز پر آنے کا اشارہ کیا۔ ''مسٹر ٹاوسٹوک سے مل کر مسرت ہوئی۔'' اس کی آنکھیں جورڈن کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ بولتی آنکھیں...... وارننگ...... اگر راز کھولا تو میں بھی کھول دوں گی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ لڑکی پہلا راؤنڈ جیت گئی تھی۔ اسے جورڈن کی ساکھ اور خاندان کا پتا چل گیا تھا۔

''ٹھیک ہے، دوسرے راؤنڈ میں تمہاری قسمت ساتھ نہیں دے گی۔'' اس نے خود سے سرگوشی کی۔

☆☆☆

ٹینٹ سے کچھ فاصلے پر چارلس اوگلی نے لڑکی کو تاڑا۔ اسے یقین تھا کہ وہ غلطی نہیں کر رہا۔ وہ دو مرتبہ پہلے کیلی رائس کو کھو چکا تھا۔ تاہم تجربے کی بنیاد پر چارلس نے اسے تیسری مرتبہ کھوج لیا تھا۔ وہ جس حلیے میں تھا، کیلی اس سے ناآشنا تھی۔ چارلس ٹہلتا ہوا ٹینٹ میں قریب چلا گیا۔ وہ کیلی کے پروفائل سے مزید تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کیلی اور گائے دونوں کو شناخت کر لیا۔ گائے اٹھ کر ایک طرف چل پڑا تھا۔ کیلی میز پر تھی۔ اس کے ساتھ دوسرے آدمی کو وہ نہیں پہچان سکا۔ دونوں کے انداز سے چارلس نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ یہ نئی دشواری تھی۔ سنہرے بالوں والے آدمی کو کہاں فٹ کیا جائے۔ کیلی کی دستاویزات میں ایسے کسی آدمی کا ذکر نہیں تھا جبکہ وہ دونوں بے تکلفی سے گفتگو میں مصروف تھے۔

چارلس نے ٹیلی فوٹو سے لینس ہٹایا اور وائن بار کے پیچھے چلا گیا۔ فوٹو لینے کے لیے اس نے ایک محفوظ جگہ منتخب کی۔ پہلے اس نے آدمی کے چند شاٹ لیے، پھر کیلی رائس کے...... وہ تین ہفتے سے کیلی کے پیچھے تھا اور اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو چلا تھا اور کتنے وسائل اس نے قلیل مدت میں مہیا کیے ہیں؟ یہی آدمی یا اور بھی؟ لیکن کیا وہ اتنی ہوشیار ہے کہ خود کو زندہ رکھ سکے؟ اس نے کیمرا ری لوڈ کیا اور شوٹنگ کے لیے دوسرا رول تیار کیا۔

☆☆☆

''مجھے تمہارے بال بہت پسند ہیں۔'' جورڈن نے کہا۔

''صرف بال؟''

''نہیں، اور بہت کچھ۔''

''مثلاً؟''

''سننا چاہتی ہو؟''

''کیا حرج ہے؟''

جورڈن مسکرایا۔ ''کسی دن بتاؤں گا۔''

''تمہیں یقین ہے، ہم کسی دن ملیں گے؟''

''ہاں ملتے رہیں گے۔''

''بہت یقین ہے خود پر یا...... یا دل کا معاملہ ہے؟''

''دل کا معاملہ کون جانے...... عشاق کا حوصلہ کون جانے اور ہاں تقدیر کا فیصلہ کون جانے۔''

''اچھا لگا۔'' اس نے آہ بھری۔ ''جورڈن میری زندگی خطروں میں گھری ہے۔ مجھ سے دور رہو۔''

''تیری نگاہ کی فسوں کاری کا کیا کروں۔ اپنے جنوں کی ہشیاری کا کیا کروں۔'' جورڈن نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''تم سنجیدہ ہو؟''

''لکھ کر دوں؟''

''نہیں۔''

''نیرو ڈا ایسوسی ایٹس جعلی نام ہے۔ تم کون ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم چور نہیں ہو اور ڈیانا لیمب تمہارا اصل نام ہے؟''

''تم میری توقع سے زیادہ دلچسپ آدمی ہو۔''

''دلچسپ، دلدار اور دیوانہ بھی......

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

''چیٹ ونڈ تمہاری جاگیر ہے؟'' کیلی نے سوال کیا۔ وہ خوب صورتی سے جورڈن کے سوال ٹال گئی تھی۔

''انکل ہیوی کی...... میرا مطلب لارڈ لیوٹ کی۔''

''گائے نے جو ذکر کیا تھا...... بیش قیمت آرٹ کے ذخیرے کا؟''

''فیملی کا ہے۔ برسوں میں اکٹھا کیا گیا تھا...... کئی نسلوں کا سرمایہ ہے۔''

''میں تمہیں انڈر ایسٹی میٹ کرتی رہی ہوں۔ تم لارڈ نہیں تو لارڈ فیملی سے تعلق رکھتے ہو اور میں......'' وہ تھم گئی۔ چہرے پر سایہ آ کے گزر گیا۔

''اگر میں سنجیدہ ہو جاؤں تو بھی ہم دونوں کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔''

''خیر تمہاری فضول منطق پر پھر بات کریں گے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے گرد کون سے خطرے منڈلا رہے ہیں؟''

''تم نے وہاں سے کاغذات نکالے تھے اور کہہ رہے ہو کہ تم چور نہیں ہو۔'' کیلی نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

''تم مجھے چور ثابت کرنے پر کیوں تُلی ہوئی ہو، یہ ایک ذاتی معاملہ تھا۔ مجھے چوری کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔''

''تم پولیس تک جا سکتے تھے۔''

''تم بھی جا سکتی تھیں۔''

''میرا بھی ذاتی معاملہ تھا۔''

''تو پھر ختم کرو۔ میں نے یقین کر لیا۔ تم بھی یقین کر لو...... میں اتنا تو سمجھ رہا ہوں کہ تمہیں جس چیز کی تلاش ہے وہ گائے کے پاس ہے...... آخر کیا ہے اُس کے پاس؟''

''دل ہے میرا اس کے پاس۔'' کیلی کی آنکھوں میں شوخی لہرائی۔

''اور میرا تمہارے پاس۔'' جورڈن نے کہا۔

''خیر چھوڑو مذاق...... اپنا خاندانی ذخیرہ دکھاؤ گے؟''

''وہ تو دکھا دوں گا۔ عشق کا ناز بھی سکھا دوں گا۔''

''تم شاعر تو نہیں؟''

''شاعری کی الف بے کا نہیں پتا۔ ہاں جب سے تمہیں دیکھا ہے...... شاعری کو دل کرتا ہے لیکن کام مشکل ہے...... تمہارا کام بھی مشکل ہے چھوڑ دو۔ یہ مستقل مزاجی تمہیں سلاخوں کے پیچھے لے جائے گی۔ ایک پری زاد سلاخوں کے پیچھے، کتنا برا لگے گا۔''

''مستقل مزاجی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میں تمہیں سلاخوں کے پیچھے نہیں جانے دوں گا۔''

''یا تم اسے بتا دو گے کہ ہم اس کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔'' لڑکی کی آنکھوں میں خفیف سی تشویش نظر آئی۔

''نہیں، لیکن میں اُسے خبردار کر دوں گا۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' کیلی عرف ڈیانا نے سرگوشی کی۔

''میں کر سکتا ہوں۔ مجھے کرنا پڑے گا۔''

''تم نہیں جانتے، داؤ پر کیا کچھ لگا ہے...... سب تباہ ہو جائے گا۔''

''کیسا داؤ...... کیا تباہ ہو جائے گا؟''

وہ جواب دینے والی تھی کہ گائے نمودار ہوا۔

''سب ٹھیک ہے؟'' وہ بولا۔

''یس، فائن۔'' اگرچہ ڈیانا لیمپ کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ تاہم وہ مسکرانے میں کامیاب رہی۔ ''کار تیار ہے؟''

''مائی لیڈی، کار گیٹ پر ہے۔'' گائے نے اٹھنے میں اس کی مدد کی۔ ڈیانا نے چلتے چلتے برہم نگاہ جورڈن پر ڈالی۔ جورڈن سوچ رہا تھا، کیا وہ اس کی وارننگ کو سنجیدہ لے گی۔ البتہ وہ کچھ بتانے جا رہی تھی کہ گائے کی آمد کے باعث بات ادھوری رہ گئی۔ جورڈن نے رومال نکال کر ڈیانا کا شیمپین گلاس پیندے سے پکڑا اور مسکرایا۔ گلاس کی کرسٹل کلیئر سطح پر انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔

☆☆☆

چارلس اوگلی نے ضرورت سے زیادہ شوٹنگ کر لی تھی۔ کیلی کے ساتھ موجود آدمی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق وہ تنہا سفر کرتی تھی۔ چارلس نے سنہری بالوں والے آدمی کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

وکٹر وان ویلڈن کے لیے وہ بُرا دن تھا۔ پھیپھڑوں کی حالت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے آکسیجن کی ہدایت کی۔ ٹیوبس اس کے نتھنوں میں تھیں۔ بے بسی کا احساس فزوں تر ہو گیا۔ ایک وقت تھا جب اسے اپنی قوت اور بے رحمی پر ناز تھا اور اب وہ ایک بوڑھا اور قریب المرگ شخص تھا۔ دیکھ بھال، ڈاکٹرز اور ادویات کا محتاج۔

یہ کونسا وقت تھا جو سائمن ٹروٹ نے میٹنگ رکھنے پر اصرار کیا تھا۔ وہ سائمن پر انحصار کرنے کے لیے مجبور تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اگرچہ وہ سائمن کو اپنا جانشین نامزد کر چکا تھا۔ تاہم کمپنی کی باگ ابھی وہ سائمن کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخری سانس تک کمپنی میری ہے۔ اس نے سوچا۔

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وان ویلڈن نے وہیل چیئر گھمائی اور اپنے جوان ساتھی سائمن کو اندر آتے دیکھا۔ اس کے تجربے نے بتا دیا کہ سائمن کوئی اچھی خبر نہیں لایا ہے اور وہ نئی خبر سنانے کے لیے ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔

''کیا خبر لائے ہو؟'' وان ویلڈن نے سوال کیا۔

''میرے خیال میں، میں جان گیا ہوں کہ کیلی رائس انگلینڈ کیوں گئی ہے۔'' سائمن نے کہا۔ ''بلیک مارکیٹ میں افواہیں گرم ہیں۔'' اس نے رک کر گلا صاف کیا۔

''کیسی افواہیں؟''

''ایک انگریز کی بڑھک ہے کہ...... کہ وہ ''آئی آف کشمیر'' کی خفیہ خریداری میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔''

''اس کے آئیڈیے پر چل کر ہم نے غلطی کی، کئی پریشانیاں کھڑی ہوگئی ہیں۔''

''میں ٹھیک کرلوں گا۔'' ٹروٹ نے کہا۔

''اگر کیلی رائس نے افواہیں سن لی ہیں تو یہ ہمارے لیے تباہ کن ہوگا۔'' وان ویلڈن نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' سائمن ٹروٹ بولا۔

''وہ انگریز کون ہے؟''

''گائے ڈیلنسی۔ ہم اس کی رہائش گاہ تلاش کر رہے ہیں۔''

وان ویلڈن نے سر ہلا کر پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔ وقفے کے ساتھ وہ بولا۔ ''ڈیلنسی تک پہنچو...... میرا خیال ہے کہ اس طرح ہم کیلی رائس تک پہنچ سکتے ہیں۔''

☆☆☆

''نئے دوست کے نام۔'' گائے نے شیمپئن سے لبریز گلاس کیلی کو پکڑایا۔

''نئے دوست کے نام۔'' کیلی مسکرائی اور ایک سپ لیا۔ شیمپئن عمدہ تھی۔ وہ سیدھی اس کے دماغ کو چڑھتی اگر کیلی محتاط نہ ہوتی۔ وہ اور زیادہ چوکس ہوگئی۔ مدہوش دماغ کے ساتھ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ گائے فلرٹیشن سے بہت آگے جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ سیٹی پر جڑا بیٹھا تھا۔ کیلی بمشکل اس کی قربت برداشت کر رہی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ گائے نے ابھی تک اسے چومنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے باتوں میں الجھانا ہی بہترین حربہ تھا۔

کیلی دلفریب انداز میں مسکرائی۔ ''تمہارا گھر بہت شاندار ہے۔''

''شکریہ۔''

''اور آرٹ، بہترین۔ کوئی نقل نہیں ہے۔''

''ہاں۔'' گائے نے فخریہ انداز میں دیواروں پر پینٹنگز کی جانب ہاتھ لہرایا۔ ''لیکن یہ میرا بہترین انتخاب نہیں ہے۔''

''واقعی؟'' کیلی نے اظہارِ حیرت کیا۔

''میرا خاص ذخیرہ لندن ٹاؤن ہاؤس میں ہے۔ وہاں کی سیکیورٹی بھی اعلیٰ ہے۔''

کیلی کا دل ڈوب گیا۔ لعنت ہے...... اور وہ بکنگھم شائر میں وقت ضائع کر رہی تھی۔

''تم بہت حسین ہو۔'' وہ اس کی طرف جھکا...... چہرہ قریب آیا...... کیلی نے جھرجھری لی۔

''میں بہت عرصے سے تم جیسی لڑکی کی تلاش میں تھا۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''ایک شفاف روح...... آج وہاں جب میں نے تمہاری آنکھوں میں دیکھا تو یوں لگا جیسے میری تلاش ختم ہوگئی ہے۔''

کیلی نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن احتیاط بھی ضروری ہے۔''

''ہاں، ہاں...... میں جانتا ہوں۔'' اس نے پھر کس کی...... پُرجوش۔ کیلی کے دماغ میں غصے کی لہر اٹھی۔ وہ پیچھے ہٹی۔ گائے نے توجہ نہیں دی۔ وہ مدہوش ہوا جا رہا تھا۔

''جلدی مت کرو۔'' وہ بولی۔ ''میں تیار نہیں ہوں۔ پلیز گائے، پھر کبھی۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے وقت لینا چاہیے۔''

''کیا سمجھنا ہے؟'' اس کا منہ بن گیا۔

''کچھ بھی...... مثلاً......'' وہ مڑی اور پینٹنگز کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہیں آرٹ سے دلچسپی ہے لیکن میں نہیں جانتی کہ کونسی چیز یا آرٹ کی قسم تمہیں زیادہ اپیل کرتی ہے۔ پینٹنگ کے علاوہ بھی تم نے کچھ پسند کیا ہے...... میرا مطلب ہے۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

گائے نے شانے اچکائے۔ ''میرے پاس کچھ آثارِ قدیمہ سے متعلق ہتھیار بھی ہیں۔''

''بہت خوب، تمہارا ذوق محدود نہیں ہے۔'' وہ مسکرا کر قریب آگئی۔ ''کس قسم کے ہتھیار؟''

''قدیم تلواریں، پسٹل، چند خنجر......''

کیلی کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ کچھ اور قریب ہوگئی۔
''قدیم ہتھیار۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''پتا نہیں انہیں دیکھ کر مجھے کیوں نفسیاتی لذت کا احساس ہوتا ہے۔''
''کمال ہے، تم پہلی لڑکی ہو جو...... '' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
''آؤ جان، میں تمہیں چند خاص چیزیں دکھاؤں۔ تمہارا بدن سنسنا اٹھے گا۔'' وہ اسے لے کر ہال وے میں آیا۔ وہاں سے گزر کر سیڑھیاں طے کرنے لگا۔
تو یہ دوسری منزل پر ہے۔ شاید بیڈ روم میں۔ کیلی نے سوچا۔ کہیں فون کی گھنٹی بجی۔ گائے نے نظرانداز کر دیا۔ اوپر پہنچ کر وہ دائیں جانب مشرقی سمت مڑا۔ بیڈ روم...... پھر معارک گیا۔
''ماسٹر گائے۔'' ایک آواز آئی۔
''یس۔''
''لیڈی ویرونیکا کا فون ہے۔''
گائے کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''کیا چاہیے اُسے؟''
''وہ فوراً ملنا چاہتی ہیں۔''
''تمہارا مطلب ہے، اس وقت؟''
گائے نے تیزی سے سیڑھیاں طے کیں اور فون اٹینڈ کیا۔ کیلی اس کی آواز سن رہی تھی۔
''یہ ٹھیک وقت نہیں، ویرونیکا۔'' وہ بولا۔ ''نہیں، ایسا مت کرو...... دیکھو مجھے کچھ اور کام ہے...... تمہارا رویہ مناسب نہیں ہے...... کسی اور وقت...... ہیلو...... ہیلو؟'' ریسیور گھورتے ہوئے اس نے اسے واپس کریڈل پر ڈال دیا۔
''سر، میرے لیے کیا حکم ہے؟''
گائے نے سیڑھیوں کے اوپر دیکھا۔ ''ہاں، تم مس لیمب کو ہوٹل چھوڑ آؤ۔''
''اس وقت؟''
''ہاں، ابھی...... گو۔'' اس نے سیڑھیاں چڑھیں اور کیلی کا بازو پکڑ کر معذرت کی۔ ''ایک ضروری کام آن پڑا ہے۔''
کیلی نے قدم قالین میں گاڑ دیے۔ ''ایسی کیا بات ہے؟''
''بتا دوں گا۔ شوفر تمہیں اچھے ہوٹل میں چھوڑ دے گا۔ کل شام پانچ بجے ہم ایک خوب صورت شام منائیں گے۔'' کیلی کے پاس چوائس نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کار میں سوار ہو رہی تھی۔ کیلی نے غصے سے آرام دہ سیٹ کو دبوچا۔ وہ ٹارگٹ سے کتنے قریب آ کر محروم رہ گئی۔ یہ ویرونیکا کون ہے؟

☆☆☆

ویرونیکا فون رکھ کر جورڈن کی طرف مڑی۔ کیا یہ ٹرک کام کرے گی؟''
''اگر نہیں کرے گی تو یہ کام تمہارا وزٹ کرے گا۔'' جورڈن نے جواب دیا۔
''مجھے اس آدمی سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن میں جانتی ہوں۔''
''اس لڑکی کو وہاں سے نکالنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی مجرمانہ حرکت کر جائے۔''
ویرونیکا نے جورڈن سے ہاتھ ملایا۔ ''تمہارا احسان اتارنے کا یہ اچھا موقع ہے۔''
''گائے کے لیے تمہارے جو کڑوے احساسات ہیں...... پھر بھی تم نہیں چاہو گی کہ کوئی اسے لوٹ لے جائے۔''
''میں لعنت بھیجتی ہوں، اس پر۔'' ویرونیکا ہنسی۔ ''یہ تمہاری لیڈی برگلر ہے جس کے بارے میں، میں سوچ رہی ہوں۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ گئی۔''
''تو میری عزت خاک میں مل جائے گی۔'' جورڈن نے کہا۔
''اس نے زبان کھول دی تو میرا بھی ایسا ہی حال ہو گا۔'' ویرونیکا نے کہا۔

☆☆☆

کیلی نے سینڈل جھٹکے سے اتاریں۔ پرس کرسی میں پھینکا اور خود بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ سب کچھ بھلا کر وہ سوجانا چاہتی تھی۔ آئی آف کشمیر سمیت ہر شے بھلا کر...... کیا فضول رات تھی۔ تاہم وہ جب بھی سونے کے لیے آنکھیں بند کرتی، یادیں بادلوں کے مانند امنڈ آتیں۔ خوفناک یادیں...... خوب صورت یادیں، وہ دونوں یادوں کے ساتھ لڑ رہی تھی۔
72ء کا موسم گرما، جب وہ آٹھ برس کی تھی اور ٹونی دس سال کا، دونوں کا مسکراتا فوٹو انکل والٹر کے مینٹل پیس پر رکھا تھا۔ ٹونی کا ہاتھ اس کی گردن میں حمائل تھا۔ انکل والٹر کی شکل میں انہیں ایک غیر معمولی استاد ملا تھا۔ والٹر ایک ٹھگ تھا جو ایک موقع پر معمولی غلطی کر بیٹھا...... اب وہ قید خانے میں تھا۔ جلد ہی وہ پیرول پر رہا ہو جاتا اور شاید زندگی کا ڈھنگ بدل دیتا۔ جیسے ٹونی بدل گیا تھا۔ جیسے وہ خود بدل گئی تھی۔ دفعتاً فون کی گھنٹی نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

''ہیلو؟''

''ڈیانا ڈارلنگ، میں ہوں۔'' گائے کی آواز آئی۔

''ہیلو گائے۔''

''مجھے معاف کر دو۔ میں بہت معذرت خواہ ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''میں کیا کہوں؟''

''یہ ایک اتفاق تھا۔ سوری...... مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ایک موقع دو گی، کل رات......''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' کیلی نے جواب دیا۔

''میں تمہیں قدیم ہتھیاروں کا ذخیرہ دکھاؤں گا۔ تم مدہوش ہو جاؤ گی۔ میں تمہارے ذوق کو سمجھ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

کیلی نے ٹھنڈی سانس بھر کر آمادگی ظاہر کی۔

''میں تمہیں پانچ بجے پک کرلوں گا۔''

''رائٹ، بائے۔'' کیلی نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

گائے ترنگ میں تھا۔ وہ گاڑی ایسے بھگا رہا تھا جیسے کسی ریس میں حصہ لے رہا ہو۔ کیلی کے نزدیک وہ رف ڈرائیونگ کر رہا تھا...... کئی جگہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔

''تم بہت تیز جا رہے ہو۔'' کیلی نے تنبیہ کی۔

''فکر مت کرو۔ یہ بتاؤ کیسی میوزک پسند کرتی ہو؟ پہلے ہم فورسٹر میوزک روم جائیں گے۔''

''ویرونیکا وہاں ہوگی؟''

گائے چونکا۔ ''وہاٹ؟''

''کل رات جس نے فون کیا تھا۔''

''اوہ نو...... اُسے موسیقی سے دلچسپی نہیں ہے۔''

بیس منٹ بعد وہ فورسٹر میں داخل ہو رہے تھے۔

''یہاں کیوں آئے ہو؟'' کیلی نے وہاں موجود افراد کا جائزہ لیا۔

''تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف کرانا چاہتا ہوں......'' معاً اس کی چال دھیمی ہوگئی۔ ''یقین نہیں آتا۔'' وہ ایک دلکش عورت کو گھور رہا تھا۔ لیکن کیلی کی نظریں اس آدمی پر جمی تھیں جو اس عورت کے ہمراہ تھا...... جورڈن ناوسٹوک۔

گائے کھنکھارا۔ ''ہیلو ویرونیکا۔''

''سنا ہے کہ نئی دوست تمہاری زندگی میں آگئی ہے۔''

''ہاں۔'' گائے کے ہونٹوں پر کمزور مسکراہٹ ابھری۔ ''یہ ڈیانا لیمب ہے۔''

''ویرونیکا کیرن کراس۔'' ویرونیکا نے ہاتھ بڑھایا۔ کیلی نے بھی ہاتھ ملایا۔

''ہم پرانے دوست ہیں، گائے اور میں۔'' ویرونیکا نے کہا۔ ''پھر بھی یہ مجھے کبھی کبھی حیران کر دیتا ہے۔''

''میں حیران کر دیتا ہوں؟ تم کب سے موسیقی کے شوق میں مبتلا ہوگئیں؟''

''جب سے جورڈن نے مجھے مدعو کیا۔'' ویرونیکا نے جواب دیا۔

''اولیور کو تم پر بہت بھروسا ہے؟'' گائے نے طنز کیا۔

''اولیور کون ہے؟'' کیلی نے سوال کیا۔

گائے ہنس پڑا۔ ''ویرونیکا کے شوہر نامدار۔''

''تم کمینے ہو۔'' ویرونیکا رخ پھیر کر دوسری طرف چلی گئی۔ گائے بھی اس کے پیچھے گیا۔ کیلی اور جورڈن نے ایک طرف نشست سنبھالی۔

''محبت کے بھی کتنے رنگ ہیں......'' جورڈن نے کہا۔

''کیا وہ دونوں......؟''

''میرا خیال ہے کہ ابھی تک ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔''

''اسی لیے تم اُسے یہاں لائے کہ میرا راستہ کھوٹا کرتے رہو؟''

جورڈن نے وائن کے دو گلاس اٹھائے۔ ''میں تو اپنا راستہ سیدھا کرنے کے چکر میں ہوں۔'' ایک گلاس اس نے کیلی کو پکڑایا۔

''اُف تم کیا چیز ہو؟'' کیلی نے بے زاری سے کہا۔

''ناچیز۔'' جورڈن بے اختیار بولا۔ ''دل و جان تجھ پہ نثار اور کیسے سمجھاؤں؟''

''خوامخواہ گلے پڑ رہے ہو۔'' کیلی مسکرائی۔

''سچ بتاؤ، گائے جیسے ڈھیلے اور اس جواں مرد وجیہہ مرد میں کتنا فرق ہے۔'' جورڈن نے انگلیوں سے بال پیچھے کیے؟

کیلی نے پہلی بار سنجیدگی سے جورڈن کو دیکھا۔ شروع سے ہی اس کی وجاہت میں کوئی شک نہیں تھا۔ چوڑے شانے، خصوصاً آنکھیں، ذہانت اور حسِ مزاح کی حامل۔ آنکھوں میں خاص قسم کا عزم تھا۔ وہ اناڑی چور تو ہو سکتا تھا لیکن اس کی علیحدہ کلاس تھی۔ خاص تعلقات تھے۔ وہ دوسروں پر انحصار کرنے والا انسان نہیں معلوم ہوتا تھا۔

کیلی نے اطراف میں دیکھا اور جورڈن کو ایک طرف خاموش کونے میں لے آئی۔ ''کیا ارادے ہیں؟''
جورڈن نے آنکھیں گھمائیں۔
''تم میری مدد کرو، میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔''
''واقعی، کیسی مدد؟''
وہ جورڈن کے چہرے کو پڑھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ کیلی کے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ ابھرنے لگی۔ ''تم واقعی ایک جنٹلمین ہو...... ٹرو جنٹلمین اور مہربان بھی۔''
جورڈن اچانک بدلی ہوئی صورتِ حال کو جانچ رہا تھا۔ ''اچھا کیسی مدد؟''
''کوئی خاص نہیں۔ ایک معمولی چوری۔'' کیلی نے کہا۔
''گویا تم مجھے ایک شریف آدمی سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو؟''
''نہیں، ایسی بات نہیں۔''
''بدلے میں تم میری کیا مدد کرو گی؟''
''کیا چاہتے ہو؟''
''ہائے یہ بے خبری کا عالم...... اپنے دل سے پوچھو۔'' جورڈن نے کہا۔
کیلی نے محسوس کیا کہ دونوں کے دماغ میں ایک ہی بات ہے۔ اسے زبان تک نہیں آنا چاہیے۔ لطف غارت ہو جائے گا۔
''میں سمجھ گئی شاید، کہہ دو...... دل و جان تجھ پہ نثار۔''
''ٹھیک ہے میں خاموش ہوں۔''
''بدلے میں، میں تمہیں ماہرانہ ٹرکس بتاؤں گی جن کے استعمال سے تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔''
''تم مجھے شریف آدمی کے بجائے چور بنا کر چھوڑو گی۔''
''میری خاطر صرف ایک بار۔'' وہ قریب آ گئی۔
''ارے تمہارے لیے تو گولی کھانے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے عاشقانہ انداز میں کہا۔
''تم شریف آدمی نہیں ہو۔'' اس نے بھی جواباً معنی خیز انداز میں حملہ کیا۔
''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔'' جورڈن نے تبصرہ کیا۔
''ماہرانہ ٹرکس...... یعنی میں ٹھیک سمجھا تھا کہ تم ایک چور ہو...... پیشہ ور چور۔''
''میں چور نہیں ہوں۔ یہ ماضی کی بات ہے۔''
''چلو مان لیا۔ لیکن میں تو شروع سے جنٹلمین ہوں۔''

''آل رائٹ، تمہیں کیا چاہیے...... تم میرے راستے میں نہیں آؤ گے۔''
''تاکہ تم گائے کا کام اتار دو یا خود پھنس جاؤ۔''
''میرا وعدہ ہے کہ میں پھر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاؤں گی۔''
''میرا دل لے کر؟''
''تم جنٹلمین ہو یا پیدائشی عاشق؟''
''یہ احساس تمہیں دیکھ کر ہوا ہے...... ہم محبت کریں گے، شادی کریں گے اور میں تمہاری خاطر چوری بھی کر ڈالوں گا۔''
''مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔''
''زبان بول رہی ہے...... دل محبت کی تال پر دھڑک رہا ہے۔'' جورڈن اڑا ہوا تھا۔
کیلی جانے کے لیے مڑی۔
''اچھا یہ تو بتاؤ کہ ایسی کیا چیز ہے گائے کی ملکیت میں کہ تم مری جا رہی ہو۔'' کیلی الجھن میں پڑ گئی۔ بھروسا کرے نہ کرے۔ اگر آئی آف کشمیر خود اس نے تھیا لیا تو واحد ثبوت بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور وکٹر وان ویلڈن کو گرفت میں لینے کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔
''اس کی اہمیت جذباتی ہے۔'' بالآخر وہ بول پڑی۔
''میں سمجھا نہیں۔''
گائے کے قبضے میں ہماری فیملی کا ایک قدیم خنجر ہے جو کئی نسلوں سے ہماری فیملی کے پاس تھا۔ ایک ماہ قبل اسے چرا لیا گیا۔ مجھے وہ واپس چاہیے۔''
''تم پولیس کا سہارا کیوں نہیں لیتیں؟''
''گائے اس کی اہمیت سے واقف ہے۔ وہ اس کی ملکیت کبھی تسلیم نہیں کرے گا...... مجھے اسے واپس چرانا ہے...... اور کوئی چوائس نہیں ہے۔'' کیلی نے کہا۔
''تو تم نے مجھ پر اعتماد کر لیا؟''
''ہاں۔''
''اور محبت بھی؟''
کیلی خاموش رہی۔
جورڈن کی براؤن آنکھیں بردے کے مانند تھیں۔ قبل اس کے وہ کچھ اور کہتا۔ گائے کی صورت نظر آئی۔ اسی اثنا میں میوزک شروع ہو گیا۔
کیلی اور گائے ساتھ بیٹھ گئے۔ جورڈن ویرونیکا کے ہمراہ تھا۔ میوزک کے آغاز پر گائے نے جام چڑھانے شروع کر دیے۔ میوزک کی تان بلند ہوئی۔

''گائے بس کرو۔'' جورڈن نے پہل کی۔
''کیا بس کرو؟''
''تم نے بہت زیادہ پی لی ہے۔ تم لیڈی کو گھر پہنچانے کے لیے ڈرائیو کرو گے۔''
''میں ہینڈل کرلوں گا۔''
''کم آن، کنٹرول کرو۔'' جورڈن نے کہا۔
''کنٹرول، کون ہوتے ہو تم۔ خود کسی اور کی بیوی کے ساتھ فلرٹ کرتے ہو اور مجھے سمجھا رہے ہو، گائے کی آواز بلند تھی۔ کمرے میں ہونے والی بھنبھناہٹ تھم گئی۔
''میں کسی کی بیوی بھگا کر نہیں لے جا رہا۔'' جورڈن نے غصے سے کہا۔ ویرونیکا نے نفرت سے گائے کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔
''بزدل۔'' گائے ...... نے ویرونیکا کو آواز لگائی۔
''پلیز، گائے ...... ہوش میں آؤ۔'' جورڈن نے کہا۔
گائے، ویرونیکا کے پیچھے گیا۔
جورڈن نے کیلی کو دیکھا۔ ''تم اس کی گاڑی میں گھر نہیں جاؤ گی۔ وہ حواس میں نہیں ہے۔''
''میں سنبھال لوں گی۔''
''ٹھیک ہے، ڈرائیونگ خود کرنا۔''
یہ سچویشن کیلی کے پلان کے مطابق تھی لیکن جب وہ باہر نکلی تو گائے اور ویرونیکا کو بلند آواز میں تکرار کرتے پایا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ اس کی چال بھی غیر متوازن تھی۔ خاصے نازیبا الفاظ استعمال کیے جا رہے تھے۔ معاً گائے، کیلی کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی طرف بڑھا۔
''تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے، گاڑی میں چلاؤں گی۔'' کیلی نے چابیوں کا مطالبہ کیا۔
''تو پھر جاؤ، خود چلی جاؤ، تم دونوں ہی ایک جیسی ہو۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ بے تکے انداز میں دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔
ویرونیکا نے پھر ایک ناگفتنی لفظ ایجاد کیا۔ ''مرے گا مردود۔''
وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کیلی نے غصہ ضبط کیا۔ اس کا پلان بگڑ جاتا۔ اس نے بھاگ کر گائے کی کار کا دروازہ کھولا۔ ''باہر آؤ۔''
''میں ڈرائیو کروں گا۔''
''تم پچھلی نشست پر لیٹ جاؤ۔ میں گھر لے جاتی ہوں۔''
''میں عورتوں کے حکم پر نہیں چلتا۔'' اس نے کیلی کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے گئی اور ایک جھاڑی میں اُلجھ گئی۔ اس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ وہ اٹھی ...... لیکن نیکلس شاخوں میں اُلجھ گیا۔ ساعت سے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ انجن بند ہوگیا۔ اس نے بکواس کرتے ہوئے پھر اگنیشن گھمایا۔ اسی وقت کیلی نے خود کو جھاڑی سے آزاد کرلیا۔ تاہم گائے کی گاڑی غراتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔
''ایڈیٹ۔'' کیلی نے کپڑے جھاڑے اور ساعت شکن دھماکا ہوا۔ کیلی اچھلی اور جھاڑی کے اوپر سے ہوتی ہوئی دوسری جانب سطح زمین پر گری۔ شاک کے باعث اسے کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا۔ پہلا احساس شور شرابے اور چیخ و پکار کا تھا۔ دھاتی ٹکڑوں کے سڑک پر گرنے کی آوازیں تھیں اور بھڑکتے شعلوں کی روشنی۔ ابھی تک وہ تکلیف کے احساس سے عاری تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل اٹھی اور بچوں کے مانند رینگنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کے دماغ نے بیدار ہونا شروع کیا۔ درد کا ادراک ہوا۔ وہ پُریقین نہیں تھی کہ وہ رو رہی ہے۔ چیخ پکار میں اسے اپنی آواز کا احساس نہیں تھا۔ رخسار پر آنسو تھے یا خون ...... یا پھر دونوں۔ وہ رینگتی رہی ...... میں کار میں ہوتی تو مرگئی ہوتی۔
معاً جوتوں کا ایک جوڑا اس کی راہ میں آگیا۔ کیلی نے نظر اٹھائی۔ کون ہے، اس نے شناخت کرنے کی کوشش کی۔
مردانہ آواز آئی۔ ''میں تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔''
''نہیں۔''
''کم آن، تم زخمی ہو۔'' مرد نے اس کا بازو پکڑا۔
دفعتاً گرفت ہٹ گئی اور وہ شخص غائب ہوگیا۔ ایک اور آواز آئی۔ کسی نے اسے دونوں شانوں سے پکڑا۔
''ڈیانا؟ ڈیانا؟''
''وہ کیوں اس نام سے پکار رہا ہے؟'' یہ اس کا اصل نام نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہ جورڈن ٹاڈسٹوک تھا۔
وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے او پتھالموا سکوپ بند کردیا اور روم لائٹ آن کردی۔ ''نیورولوجیکلی سب ٹھیک ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن ہلکی نوعیت کا ٹراما ہے۔ میں ایڈوائس کروں گا کہ کم از کم ایک رات کے لیے مریض کو اسپتال میں رکنا

چاہیے۔ انڈرا و بز روییشن۔‘‘

جورڈن نے نیم بے ہوش ڈیانا (کیلی) کو دیکھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بالوں میں گھاس پھوس نظر آرہا تھا۔ چہرے پر خشک لہو کے نشان تھے۔

’’ڈاکٹر، میں اتفاق کرتا ہوں۔‘‘

ڈیانا نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

’’میں نہیں رکوں گی۔‘‘ وہ بولی۔

’’تمہیں رکنا ہے ڈیئر۔‘‘ جورڈن نے دھیرے سے اسے واپس لٹا دیا۔ ڈیانا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ وہ ٹشو پیپر کے مانند نازک دکھائی دے رہی تھی۔ اس روشن آنکھوں میں خوف تھا؟ یا غم؟

’’مس لیمب، تمہاری مدد کے لیے میں ایک نرس متعین کر دیتا ہوں۔ سب ٹھیک رہے گا۔‘‘

جورڈن نے اس کا ہاتھ دبایا جو برف کے مانند سرد ہو رہا تھا۔ بعدازاں وہ ہچکچاہٹ کے ساتھ ڈاکٹر کے ہمراہ کمرے سے نکل گیا۔ باہر آکر اس نے گائے کے بارے میں پوچھا۔ آواز اندر کیلی تک پہنچ رہی تھی۔

’’اس کی سرجری ہو رہی ہے۔ تم فرسٹ فلور پر معلوم کر سکتے ہو۔ تاہم مجھے خدشہ ہے کہ صورتِ حال امید افزا نہیں ہے۔‘‘

’’میں حیران ہوں کہ بلاسٹ کی شدت دیکھتے ہوئے وہ ابھی تک زندہ ہے۔‘‘ جورڈن نے تبصرہ کیا۔

’’تمہیں یقین ہے کہ یہ بم تھا؟‘‘

’’بلاشبہ۔‘‘ جورڈن نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے نرسز اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ جہاں ایک پولیس مین ڈیانا سے سوالات کا منتظر تھا۔ دو اہلکار پہلے ہی اس سے سوال جواب کر چکے تھے۔ دونوں اس کی جانب سے خاص فکرمند معلوم نہیں ہوتے تھے۔

’’گاڈ، یہ کیا ہو رہا ہے...... ہمارے یہاں بم بلاسٹ، دہشت گردی۔‘‘ ڈاکٹر نے تشویش کا اظہار کیا۔

دہشت گردی؟ جورڈن نے سوچا۔ گائے کو نشانہ بنانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ معاً اس کی دھڑکن بڑھ گئی۔ گائے نہیں ڈیانا۔ وہ کار میں ہوتی تو ماری جاتی۔ وہاٹ اے لک۔ ڈیانا نے جورڈن کے اظہارِ محبت کے جواب میں ایک مرتبہ کہا تھا کہ اس کی زندگی کو خطرات لاحق ہیں...... وہ فرسٹ فلور پر جاتے جاتے واپس پلٹا اور وومین فلور پر آ گیا۔ پولیس مین نرسنگ اسٹیشن پر خوش گپیوں میں معروف تھا۔ کافی کا کپ اس کے سامنے رکھا تھا۔ جورڈن عام سے انداز میں ڈیانا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بستر خالی تھا۔

اس کے دماغ میں گھنٹیوں کا شور بلند ہوا۔ اس نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ ’’ڈیانا؟‘‘ جواب نہ ملنے پر اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسپتال گاؤن کموڈ پر پڑا تھا۔ اس نے تیزی سے کلوزٹ چیک کیا۔ ڈیانا کے کپڑے اور پرس دونوں ندارد تھے۔

کیا پاگل پن ہے...... وہ چکرا گیا۔ وہ کیوں چوروں کی طرح رات میں یہاں سے نکلی...... احمق، کیونکہ وہ چور ہے۔ وہ باہر نکلا اور ہال کے دونوں سروں کو دیکھا...... ایڈیٹ کاپ، کلرک کے ساتھ فلرٹ کر رہا تھا۔ جورڈن تیزی سے ہنگامی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اگر وہ پولیس کو نظرانداز کر رہی ہے تو لفٹ استعمال نہیں کرے گی۔ وہ سائڈ ایگزٹ سے نکلے گی۔ جو سیدھی پارکنگ لاٹ میں جائے گی۔

وہ تھرڈ فلور پر تھا جب اسے ڈیانا کی جھلک نظر آئی۔ وہ کمزور نظر آرہی تھی اور تیزی سے حرکت میں ناکام تھی۔ دو فلائٹس باقی تھیں۔ کہیں وہ آخری فلائٹ پر ہی نہ گر جائے۔ جورڈن حرکت میں آیا۔

☆☆☆

اس کا سر ڈول رہا تھا۔ ہائی ہیل کے باعث چلنا دشوار تھا۔ تاہم اسے چلتے رہنا تھا اور چلی جا رہی تھی۔ رکو مت، چلتی رہو...... وہ اپنے ذہن کے احکامات پر عمل کر رہی تھی۔ دشمن قریب ہے۔ چلتی رہو یا مر جاؤ۔

اس کے قدم اٹھتے رہے۔ سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دو مرتبہ اسے کار کی آواز آئی اور وہ جھاڑیوں میں چلی گئی۔ لیکن کسی نے نہیں دیکھا۔ کسی طرح چند میل دور وہ ٹرین اسٹیشن تک پہنچ جائے۔ پھر وہ بکنگھم شائر سے نکل جائے گی۔ بیرونِ لندن۔

وہ بُری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ اب وہ وان ویلڈن کی ہٹ لسٹ پر سب سے اوپر تھی۔ عالمِ مایوسی میں اس نے آگے بڑھنا چاہا۔ سڑک نگاہ کے سامنے لہرا گئی۔ وہ رک نہیں سکتی تھی۔ ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ نظر دھندلا رہی تھی۔ معاً وہ گھٹنوں کے بل گری اور سر جھکا لیا۔ تاریکی میں وہ نظر صاف ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ قریب ہوتی خفیف تھرتھراہٹ کو وہ محسوس نہ کر سکی۔ دھند کا پردہ چاک ہوا۔ اس کے عقب سے کار نمودار ہوئی۔ اس نے جھٹکے سے سر

اٹھایا۔ ہیڈ لائٹس اس کی طرف رینگ رہی تھیں۔ وہ کھڑی ہوئی اور جھاڑیوں میں گھسنے کی کوشش کی۔ تاہم اگلے لمحے وہ پھر گھٹنوں پر تھی۔ نظروں میں تاریک بادل لہرا گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھل کر بند ہوا...... آہ، وہ نظروں میں آگئی تھی۔

''نہیں۔'' وہ کراہی۔ بازو اس کے جسم کے گرد لپٹ گئے تھے۔ ''پلیز، نو!''

''آل رائٹ۔''

''نو۔'' وہ چلائی۔ چلائی تھی یا محض ذہن چیخا تھا۔ اس کا چہرہ کسی کے سینے کے ساتھ لگا تھا۔ وہ مٹھیاں برسا رہی تھی۔

''ڈیانا، رک جاؤ...... کیا کر رہی ہو؟''

سسکتے ہوئے اس نے سر اٹھایا۔ دھند اور آنسوؤں کے دوسری جانب سے جورڈن اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں موم کی طرح پگھل گئیں۔ ڈیانا نے جورڈن کی جیکٹ پکڑ لی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جورڈن اس کے سرد ہونٹوں پر جھکتا چلا گیا۔ ڈیانا کے بدن کی ٹھنڈ اور نقاہت تحلیل ہونے لگی۔ وہ جورڈن کے ساتھ لپٹ گئی۔ آرام، تحفظ، جذبات......

دونوں ایک اور گاڑی کے قریب تر ہونے سے بے خبر تھے۔ ہیڈ لائٹس نے انہیں جدا کر دیا۔ کیلی نے مڑ کر دیکھا اور جھاڑیوں کی طرف جھپٹی۔

''ڈیانا...... رکو۔''

وہ فرار ہونا چاہتی تھی لیکن ٹانگیں ابھی تک پوری طرح کام نہیں کر رہی تھیں۔ جورڈن نے جلد ہی اسے پکڑ لیا۔ ''ڈیانا......''

''وہ مجھے دیکھ لیں گے۔''

''کون؟''

''مجھے جانے دو۔''

سڑک پر کوئی کار رکی اور دروازہ کھلا۔ کیلی فوراً ہی زمین پر لیٹ گئی۔ کسی آدمی کی آواز آئی۔ ''سب ٹھیک ہے؟ تمہاری کار یہاں کھڑی ہے۔''

''پلیز جورڈن...... کچھ نہ بتانا...... پلیز...... پلیز۔'' کیلی نے دعا کی۔

وقفہ آیا۔ ''سب ٹھیک ہے۔'' جورڈن کی شرمندہ آواز آئی۔ وہ...... وہ پیشاب......

''اوہ، کال آف نیچر...... جاری رکھو۔'' کار کا دروازہ بند ہوا اور عقبی بتیاں دور ہوتی چلی گئیں۔

کیلی اب تک کانپ رہی تھی۔ ''تھینک یو۔'' اس نے سرگوشی کی۔

چند لمحے وہ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر اسے اٹھایا۔ ''آؤ۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''تمہیں اسپتال کی ضرورت ہے۔''

''نہیں۔''

''دیکھو، ڈیانا، تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں نہیں جا سکتی۔''

''بات کیا ہے؟ کس چیز کا خوف ہے؟ پولیس؟''

''تم نے کچھ نہیں کیا...... وہ تمہیں گرفتار نہیں کر سکتے۔ اگر کیا ہے تو بتاؤ۔'' جورڈن نے کہا۔

کیلی نے خود کو چھڑایا۔ اسے یاد نہیں رہا کہ اس کوشش میں وہ اندھیرے میں ڈوب کر زمین کی طرف جھکتی چلی گئی۔ وہ سیاہ رنگ کے پانی میں ڈوب رہی تھی۔ انتہا کی تھکن تھی۔ جورڈن نے اسے اٹھا کر گاڑی میں منتقل کیا...... شدید جدوجہد کے بعد کیلی نے خود کو بے ہوش ہونے سے بچایا اور اسپتال نہ جانے کی التجا دہرائی۔

''آرام سے رہو۔ میں وہاں نہیں جا رہا اگر تم بضد ہو تو تمہیں ہوٹل لے جاتا ہوں۔''

''نہیں، وہاں بھی نہیں۔'' خوف کی تحریر اُس کے چہرے پر لکھی تھی۔

''آل رائٹ، کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''ٹرین اسٹیشن۔''

جورڈن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم سفر کے قابل نہیں ہو۔''

''میرے پاس چوائس نہیں ہے۔'' وہ رو پڑی۔

جورڈن خاموشی سے اس کا ستا ہوا چہرہ پڑھتا رہا۔ ''میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں تمہیں سفر کی اجازت دوں۔''

''اجازت؟''

کیلی کو غصہ آ گیا۔ ''تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔ تم نہیں جانتے مجھے کس درندے کا سامنا ہے؟''

''غور سے سنو۔ درندے، پرندے سے تو میں نمٹ لوں گا۔ فی الحال تمہیں محفوظ جگہ پہنچا دیتا ہوں۔ کیا یہ پوچھنے کی ضرورت ہے کہ تمہیں مجھ پر بھروسا ہے؟''

اس کے ذہن نے کہا کہ اسے جورڈن پر اعتماد کرنا چاہیے اور بہترین کی امید رکھنی چاہیے۔ ویسے بھی اس کے پاس اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ حالات بھی ابتر تھے۔ درحقیقت وہ پہلے ہی اس پر بھروسا کر چکی تھی۔

☆☆☆

"کیا حال ہے اس کا؟" رچرڈ نے سوال کیا۔

"تھکن، نقاہت......" جورڈن نے جواب دیا۔ وہ رچرڈ کے ساتھ لائبریری میں تھا اور برانڈی سے شغل کر رہا تھا۔ "وہ خوف زدہ ہے۔ دوسری طرف ٹھیک بھی لگتی ہے۔ بیرل نے اس کا بیڈروم مخصوص کر دیا ہے۔ صبح تک شاید ہم مزید معلومات حاصل کر سکیں۔"

رچرڈ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے جورڈن انجانی، بھٹکی ہوئی لڑکیوں کو جاگیر پر نہیں لاتا تھا۔ شکر ہے ابھی تک بیرل نے سوالات کی بمباری نہیں کی تھی لیکن وہ وقت دور نہیں تھا۔ جب جورڈن کو لامتناہی سوالات کا جواب دینا پڑتا۔ لیکن اس کے پاس جوابات نہیں تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ ڈیانا کو گھر کیوں لے آیا۔ کیا اسے واقعی محبت ہوگئی ہے۔ وہ کم از کم دو مرتبہ اسے بچا چکا تھا۔ پہلی مرتبہ اسپتال میں پولیس کو ہوشیار نہیں کیا۔ دوسری مرتبہ سڑک سے بچا کر گھر لے آیا تھا۔ جورڈن نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ رگڑا۔

وہ اسے پہلے چور یا چورنی سمجھا تھا۔ تاہم دل نے انکار کر دیا۔ وہ گائے کے پیچھے ہی کیوں پڑی تھی؟ کیا خنجر والی بات سچ تھی؟ دھماکے نے معاملہ الجھا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بم کیلی کے لیے تھا...... جس کی قسمت کام کر گئی۔ رچرڈ کی آواز نے اسے خیالات سے باہر نکالا۔

"بہت مصروف جا رہے ہو۔ کار بم...... گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو اٹھا لانا...... بتاؤ گے، کیا پک رہا ہے؟"

"مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ بمباری شروع ہو جائے گی...... میں اتنا ہی سمجھ رہا تھا کہ چور سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ چوری کی ایک بات ہے لیکن اس نے بم کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔"

رچرڈ قریب ہو گیا۔ "میرا سوال ہے...... شکار کون تھا؟"

"وہاٹ؟" جورڈن نے رچرڈ کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ اپنے ہونے والے بہنوئی کی بہت عزت کرتا تھا۔ رچرڈ سراغ رسانی کی ایجنسی سے منسلک تھا اور اس کی جاسوسی حس پھڑکنے لگی تھی۔

"بم، گائے کی کار میں پلانٹ کیا گیا تھا۔ کیا یہ ایک اندھا حملہ تھا یا ٹارگٹڈ۔ اگر ٹارگٹڈ تھا تو ٹارگٹ کون تھا بظاہر گائے ٹارگٹ معلوم ہوتا ہے۔ یا......"

جورڈن نے آنکھیں سکیڑیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دونوں کے ذہن میں ایک ہی بات تھی۔

"یا گائے ٹارگٹ نہیں تھا۔" جورڈن نے جملہ مکمل کر دیا۔

"گائے کے ساتھ ڈیانا بھی ماری جاتی کیونکہ اسے ساتھ جانا تھا۔ گولڈن لک؟...... تاہم وہ ہراساں تھی۔"

"اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

جورڈن نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ خاص نہیں۔ صرف اس کا نام۔ ڈیانا لیمب۔"

"اس کی انگلیوں کے نشان تم نے گلاس پر سے لیے تھے۔ انکل ہیو کے دوست نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے کمپیوٹر پر دیکھا لیکن نشانات میچ نہیں ہوئے۔ یہ حیرت کی بات نہیں۔ کیونکہ وہ امریکن ہے۔ اگر تم مجھے پہلے مطلع کر دیتے تو میں امریکن اتھارٹی کو استعمال کرتا۔"

"محرک؟" جورڈن نے کہا۔

بیرل لائبریری میں داخل ہوئی۔

"محرک، شکوک......؟" وہ بولی۔

"رچرڈ ہر کسی کو شامل کرنا چاہتا ہے...... جس کا افیئر گائے کے ساتھ رہا تھا۔" جورڈن نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "گڈ نائٹ آل۔"

"جورڈن۔" بیرل نے آواز دی۔ "ڈیانا کا کیا ہو گا؟"

"مجھے بالکل اندازہ نہیں ہے۔" اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ وہ سیڑھیوں کے ذریعے اپنی خوابگاہ کی طرف جا رہا تھا۔ آدھا راستہ طے کر کے وہ رک گیا۔ کچھ سوچ کر مڑا...... اس کا رخ ڈیانا کے کمرے کی جانب تھا...... کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر اس نے دستک دی۔

"ڈیانا؟" کوئی جواب نہیں ملا۔

آواز دے کر وہ دھیرے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کارنر لیمپ کی مدھم روشنی میں وہ گھٹنے پیٹ کی طرف موڑے سو رہی تھی۔ لینن کا نائٹ گاؤن بیرل کا تھا۔ وہ بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈیانا کا وجود کتنا مختصر لگ رہا تھا، قطعی ناقابلِ دفاع۔

"میری چھوٹی سی چورنی۔" اس نے سرگوشی کی۔ جورڈن نے آہ بھری۔ ڈیانا کسمسائی۔ جورڈن نے اٹھنا مناسب خیال کیا لیکن وہ بیدار ہو گئی تھی۔ اس نے بھٹکی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے۔

"معذرت خواہ ہوں۔" وہ اٹھ گیا۔ "سو جاؤ۔" وہ پلٹنے ہی والا تھا۔

"جورڈن؟" جورڈن نے گردن گھمائی۔

"مجھے، تمہیں کچھ بتانا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں کل تک انتظار کرلوں گا۔"

"نہیں، ابھی بتانا ہے۔ میں تمہیں اس گرداب میں نہیں کھینچنا چاہتی تھی۔ تمہیں کچھ ہو جاتا تو......" اس کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

جورڈن بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "کیا دھماکا گائے کے لیے تھا؟"

"نہیں، میرے لیے۔ وہ اس کا حق دار نہیں تھا، وہ میری غلطی کی وجہ سے مارا گیا۔"

"ہوسکتا ہے بچ جائے۔" جورڈن نے کہا۔

"نہیں، تم مجھے بہلا رہے ہو۔"

"تم کیوں کہہ رہی ہو کہ دھماکا تمہارے لیے تھا؟"

"کیونکہ......" اس نے گہری سانس لی۔ "ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔"

"بمباری...... دھماکے؟"

"نہیں...... مختلف۔ جیسے ایکسیڈنٹ۔ چند ہفتے قبل لندن میں ایک ٹیکسی نے مجھے کچلنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بولی۔

"ایسا کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔" جورڈن نے کہا۔

"ایسا ایک بار نہیں ہوا تھا...... انڈر گراؤنڈ پلیٹ فارم پر میں ٹرین کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس وقت کسی نے مجھے دھکا دیا۔ ٹرین سر پر تھی۔ وہ کوئی فرشتہ تھا جس نے بروقت ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھالیا۔"

"ممکن ہے کوئی اتفاقی طور پر تم سے ٹکرا گیا ہو؟"

"تم مجھے احمق سمجھ رہے ہو۔" وہ رونے لگی اور چہرہ بازوؤں میں چھپالیا۔ جورڈن بوکھلا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے ڈیانا کو اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔

"بتاؤ، مجھے پھر بتاؤ۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"تم یقین نہیں کرو گے۔"

"مجھے موقع دو، پلیز۔"

ڈیانا نے سر اٹھایا اور جزئیات کے ساتھ کہانی دہرائی۔

"تم نے ایسا کیا کردیا کہ کوئی تمہاری جان کے درپے ہے؟"

وہ پھر برافروختہ ہوگئی۔ "میں کیا کروں گی؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں الزام نہیں لگا رہا۔ پلیز میں سمجھنا چاہ رہا ہوں...... مرڈر کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے۔ تم مجھ پر بھروسا کرسکتی ہو۔ میرے لیے آسانی ہوگی تمہاری مدد کرنے کے لیے۔"

"نہیں، تم پہلے ہی میری مدد کرچکے ہو۔ میں تم سے مزید امداد کی طلب گار نہیں ہوں۔"

"اگر دھماکے یہاں ہونے لگے تو مجھے وجہ معلوم ہونی چاہیے۔"

ڈیانا نے غصے سے جورڈن کو دیکھا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

"اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں مجبور ہو جاؤں گا کہ پولیس کو اطلاع کروں۔" جورڈن نے کہا۔

ڈیانا نے حیرت سے اسے دیکھا اور غیر یقینی انداز میں ہنسی...... "پولیس تک جانے سے پہلے سوچنا کہ تم گائے کے بیڈروم میں کیا کررہے تھے؟"

"چوری، چھوٹے سے معاملے کی معمولی چوری...... وقت آگیا ہے کہ ہم صاف بات کریں۔" جورڈن نے کہا۔ "میں وہاں اس لیے داخل ہوا تھا کہ ایک لیڈی کو بلیک میلنگ سے بچاسکوں۔"

"کیسی بلیک میلنگ؟"

"خاتون نے افیئر کے دوران جذبات میں کھل کر گائے کو خطوط لکھے تھے۔ خطوط اگر لیڈی کے شوہر تک چلے جاتے تو اس کی ازدواجی زندگی تباہ ہوجاتی۔"

"یہ کسی انٹیلی جنس کا کام نہیں۔" وہ بولی۔

"ہاں، تم کہہ سکتی ہو۔"

"تم نے پہلے کسی لیڈی کا ذکر نہیں کیا؟"

"کیونکہ میں نے خاموش رہنے کا وعدہ کیا تھا اور شریف آدمی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ اس پر تو تم اتفاق کرو گی...... لیکن اب چونکہ صورتِ حال بدل چکی ہے تو ہمیں سچائی سے کام لینا چاہیے۔"

ڈیانا کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

"آل رائٹ۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اعتراف کرلینا چاہیے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میں بھی چور نہیں ہوں۔"

"تم وہاں کیوں گئی تھیں؟" جورڈن نے کہا۔

''میں جاب پر تھی۔ ہمیں ثبوت درکار تھا۔ انشورنس فراڈ کیس کے لیے۔''

اس مرتبہ جورڈن ہنس دیا۔ ''یعنی پولیس کے ساتھ تمہارا تعلق بنتا ہے۔ کون سی برانچ...... لوکل کانسٹیبلری، اسکاٹ لینڈ یارڈ، انٹرپول...... شاید؟''

''میں پولیس کے لیے نہیں، پرائیویٹ انویسٹی گیٹر کے لیے کام کرتی ہوں۔''

''انویسٹی گیٹر؟'' جورڈن نے سوال کیا۔

''تم کمپنی کو نہیں جانتے۔''

''خوب، نام بتانے میں کیا حرج ہے؟''

''وہ انگلش نہیں ہے۔''

''گائے درمیان میں کیسے آیا؟''

''چند ہفتے قبل گائے نے ایک قدیم خنجر ''آئی آف کشمیر'' خریدا تھا۔ ذرائع کے مطابق خنجر دیگر آرٹ کے نمونوں کے ساتھ ''میکس ہیولر'' نامی بحری جہاز پر تھا۔ یہ گزشتہ مہینے کی بات ہے۔ اسپین کے قریب جہاز ڈوب گیا۔ کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ جہاز ایک بیلجیئن کا تھا جس نے بتیس ملین ڈالر کا کلیم داخل کر دیا۔ کلیم جہاز اور آرٹ ورک دونوں کے لیے تھا۔''

جورڈن کی ایک ابرو پیشانی پر چڑھ گئی۔ ''لیکن تم کہتی ہو کہ گائے نے خنجر حاصل کر لیا تھا۔ کب؟''

''تین ہفتے قبل، جہاز ڈوبنے کے بعد۔''

''یعنی...... خنجر جہاز پر تھا ہی نہیں۔'' جورڈن نے نتیجہ اخذ کیا۔

''ظاہر ہے۔ گائے نے آرٹ کا وہ نمونہ ایک پرائیویٹ فروخت کنندہ سے حاصل کیا تھا۔''

''اور تم بیلجیئن کے خلاف کیس بلڈ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''ہاں، اس نے انشورنس کمپنی سے کلیم وصول کر لیا اور فروخت کرنے کے لیے ذخیرہ بھی اس کی ملکیت ہے، گویا دہرا ہرجانہ...... ڈبل معاوضہ۔'' ڈیانا نے کہا۔

''تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ وہ گائے کے پاس ہے؟''

''وہ بڑ بولا ہے۔ پیٹ کا ہلکا ہے۔ اس نے دوستوں کو بتایا۔ بات مارکیٹ میں پھیل گئی کہ سترھویں صدی کا آئی آف کشمیر، گائے کی تحویل میں ہے۔ اس کی ساخت اور نگینوں نے تصدیق کر دی تھی۔''

''تم نے کہا تھا کہ وہ تمہاری فیملی سے چرایا گیا تھا؟''

ڈیانا نے شانے اچکائے۔ ''میں نے تمہاری طرح جھوٹ بولا تھا۔''

''واقعی؟''

''میں نہیں جانتی تھی کہ تم پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔''

''اور اب تم بھروسا کر چکی ہو؟''

''اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ تم نے نہیں چھوڑی۔'' اس کے لبوں دلربا مسکراہٹ ابھرنا شروع ہوئی۔ جورڈن اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ نئی کہانی لیکن اس کی تصدیق کی جا سکتی تھی۔

''جھوٹ بولنے پر ناراض ہو؟'' وہ بولی۔

''نہیں ہونا چاہیے؟''

''ویل، یس...... لیکن اب تو میں نے سچ بتا دیا ہے۔''

''واقعی؟''

''ہاں۔''

بیلجیئن، میکس ہیولر، خنجر اور دھماکا...... جہاں وہ بال بال بچی تھی۔ وہ خود کو روک نہ کر سکا اور جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ''تم یہاں محفوظ ہو۔''

''مجھے یقین ہے۔''

☆☆☆

جب تک رہائش گاہ میں مکمل سناٹا نہیں ہو گیا، کیلی انتظار کرتی رہی۔ بعد ازاں وہ دبے قدموں بستر سے اتری، سر میں ابھی تک دکھن تھی۔ قدموں کے نیچے قالین پوش فرش جیسے لہریں لے رہا تھا۔ وہ ننگے پیر تھی۔ تاہم وہ ہمت کر کے کمرے سے نکل گئی۔ ہال وے سنسان تھا۔ فاصلے پر کونے میں ایک لیمپ روشن تھا۔ لیمپ کے نزدیک فون نظر آ رہا تھا۔ کیلی احتیاط سے فون تک پہنچی۔ احساسِ جرم کے تحت وہ لرز رہی تھی۔ اس نے برسلز میں ٹونی کا نمبر ملایا۔ یہ طویل فاصلے کی کال تھی۔ اسے یقین تھا کہ ٹاوسٹوک فیملی بہ آسانی فون بل برداشت کر سکتی ہے۔

چار گھنٹیوں کے بعد ٹونی کی آواز آئی۔ ''کیلی؟''

''میں مشکل میں ہوں۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''کسی نہ کسی طرح وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔''

''تم کہاں ہو؟''

''فی الحال محفوظ ہوں۔ ٹونی، گائے اسپتال میں ہے اور بچنے کے امکانات برائے نام۔'' کیلی نے اطلاع فراہم کی۔

''کیا ہوا......؟''

کیلی نے مختصر احوال بتایا۔ پولیس نے اس کے گھر کو گھیرا ہوا ہے۔ میرے لیے وہاں جانا ممکن نہیں ہے۔''

"پھر کیا پلان ہے؟"

"پتا نہیں۔" کیلی نے اردگرد دیکھا۔ معمولی آواز تھی۔ تاہم وہاں اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ دل سینے میں ذبح کیے ہوئے کبوتر کے مانند پھڑک رہا تھا۔ "اگر وہ مجھ تک پہنچ گئے تو لازمی تمہیں بھی گھیر لیں گے۔ فوراً وہاں سے نکل کر کسی اور جگہ چلے جاؤ۔"

"کیلی مجھے کچھ کہنا......"

وہ گھوم گئی، آواز پھر آئی تھی۔ کوئی بیدار تھا۔ اس نے پوری بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس کی سانس میں سانس آئی۔ وہ دروازے سے پشت لگائے کھڑی رہی۔ وہ مطمئن تھی...... کم از کم اس نے ٹونی کو خبردار کر دیا تھا۔ قسمت اب تک اس کے ساتھ تھی لیکن یہ صورت تادیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ وان ویلڈن کے آدمی اسے ٹریک کر لیں گے...... اس سے پہلے ضروری تھا کہ وہ اپنے مہربانوں کو مصیبت سے بچاتے ہوئے یہاں سے نکل جائے، انگلینڈ سے نکلنے کے بعد وان ویلڈن اس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔ تاہم اسے ایک بار پھر حلیہ تبدیل کرنا تھا۔ ہیئر کٹ، بالوں کی رنگت، گلاسز، چال...... وغیرہ۔

☆☆☆

"انہوں نے اسے کھو دیا ہے۔" سائمن ٹروٹ نے بتایا۔

وان ویلڈن کا چہرہ تاثرات سے عاری رہا۔ تاہم اس کے دماغ میں غصے کی لہر اٹھی تھی۔ اسے خود کو قابو میں رکھنا تھا۔ کم از کم سائمن ٹروٹ کے سامنے۔

"یہ کیسے ہوا؟" ویلڈن کی آواز برف کے مانند سرد تھی۔

"اسپتال میں۔ دھماکے کے بعد وہ وہیں تھی اور خاموشی سے نکل گئی۔"

"وہ زخمی تھی؟"

"سر کی چوٹ تھی۔ اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔"

"مطلب وہ زیادہ دور نہیں جا سکی ہوگی۔ ٹریک کیا جا سکتا ہے۔" وان ویلڈن نے کہا۔

"کوشش کی تھی۔ یوں لگتا ہے کوئی اس کی مدد کر رہا ہے۔"

بیمار ویلڈن کے سینے میں گولا سا بن گیا۔ وہ رک رک کر سانس بحال کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ سینے میں بننے والے گولے کو تحلیل ہونے کے لیے وقت درکار تھا۔ وہ سیکنڈ گننے لگا۔ اس بار سینے کی جکڑ میں سختی تھی۔ اس نے سوچا...... کیلی کی وجہ سے اس کی زندگی مزید مختصر ہو جائے گی۔ اس نے نائٹروگلیسرین کی بوتل نکالی اور دو گولیاں زبان کے نیچے رکھ لیں۔ کچھ دیر میں سینہ ہلکا ہو گیا۔ مجھے نہیں مرنا...... ابھی نہیں مرنا۔

"کیسے کہہ رہے ہو کہ کوئی اس کی مدد کر رہا ہے؟"

"وہ چار پانچ مرتبہ جان بچا گئی ہے۔ ایسا مدد کے بغیر ممکن نہیں...... شاید پولیس یا انٹرپول۔"

"نہیں، کیلی رائس، پولیس پر اعتماد نہیں کرتی...... اس کی قسمت ساتھ دے رہی ہے جو جلد ہی دغا دے جائے گی۔"

☆☆☆

وہ دیر تک سونے کی عادی نہیں تھی۔ تاہم سر کی چوٹ ابھی تک تنگ کر رہی تھی۔ اگرچہ چکر آنا بند ہو گئے تھے۔ بستر بے حد آرام دہ تھا۔ نیز وہ یہاں خود کو محفوظ خیال کر رہی تھی۔ کئی ہفتوں میں پہلی بار اس نے خود کو محفوظ ترین جگہ پر تصور کیا تھا۔ وہ اٹھی تو سورج کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ سر کا درد بھی تقریباً مفقود تھا۔

"میں ابھی تک زندہ ہوں۔" اس نے حیرانی سے سوچا۔ فرار ہونے کے لیے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ فی الحال اسے مہمان کا کردار ہی ادا کرنا تھا۔ بعدازاں موقع ملتے ہی وہ پیدل نکل جائے گی۔ سیدھی ٹرین اسٹیشن۔ وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ چند میل طے کر سکے۔ ڈریسر میں سے اس نے پنک سلیپرز کا انتخاب کیا۔ مناسب باتھ روب زیب تن کیا اور کمرے سے نکل گئی۔ گھر کے دیگر افراد پہلے ہی بیدار ہو چکے تھے اور ٹیرس پر جمع تھے۔ سیڑھیاں طے کر کے وہ فرنچ ڈور سے گزری اور ٹیرس پر آ گئی۔ وہاں ناشتے کی میز تیار تھی۔ بیرل، رچرڈ اور جورڈن میز کے گرد موجود تھے۔ وہ ہمیشہ کے مانند وجیہہ نظر آ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں جورڈن کے چمک دار بالوں سے کھیل رہی تھیں...... وہ ان نجیب الطرفین افراد سے مختلف تھا۔ یہ خون کی بات تھی۔ اس کی رگوں میں انکل والٹر جیسوں کا خون گردش کر رہا تھا۔ احساسِ کمتری کے زیرِ اثر وہ واپسی کے لیے مڑی۔ تاہم جورڈن کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ وہ بے بس ہو گئی۔ مڑی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان میں شامل ہو گئی۔ جورڈن نے اٹھ کر اس کے لیے کرسی کھینچی۔

"میں چیک کرنے والا تھا۔ کیسا محسوس ہو رہا ہے؟"

"[illegible] بہتر ہوں۔" وہ بیٹھ گئی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جورڈن نے کافی، انڈے اور طعام کی دیگر اشیا اس کے آگے کیں۔ ”انڈوں سے پرہیز تو نہیں ہے؟“
ڈیانا نے پلکیں جھپکائیں اور کانٹا لے کر انڈوں پر جھک گئی۔ اسے احساس ہوا کہ تینوں افراد کی نظریں اس پر ہیں۔
”صبح میں نے کپڑے پہنچانے کے لیے تمہارے کمرے میں جانا چاہا لیکن ناکام رہی۔“ بیرل نے کہا۔
”وہ...... وہ میں نے ڈور کے ساتھ کرسی پھنسا دی تھی۔“ ڈیانا نے شرمندگی سے کہا۔
”اوہ۔“ بیرل خواہ مخواہ مسکرائی۔ کوئی نہیں سمجھا، کیا ردعمل پیش کیا جائے۔ لہٰذا وہ خاموشی سے اسے شکم سیر ہوتا دیکھتے رہے۔ ان کی نگاہ غیر دوستانہ نہیں تھی...... محض الجھن تھی نظروں میں۔ جورڈن نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ سکڑ کر رہ گئی۔ ”ڈیانا، میں نے ان کو بتا دیا ہے۔“
ڈیانا نے جورڈن کو دیکھا۔ ”بتا دیا؟ تمہارا مطلب ہے......“
”ہر چیز، شروع سے اب تک۔“ وہ بولا۔
”یقین کرو، ہم تمہاری مدد کریں گے۔“ بیرل نے کہا۔ ”تم ہم پر اس طرح اعتماد کر سکتی ہو...... جیسے جورڈی پر کرتی ہو۔“
ڈیانا کے ہاتھ کانپے، اس نے دونوں ہاتھ گود میں رکھ لیے۔
”یہ لوگ ٹرسٹ کی بات کر رہے ہیں۔“ اس نے اذیت کے ساتھ سوچا۔ ”اور میں جھوٹ بولتی چلی جا رہی ہوں۔“
”ہمارے مفید ذرائع ہیں۔“ جورڈن نے کہا۔ ”خفیہ کے ساتھ تعلقات ہیں...... رچرڈ کی فرم، سیکیورٹی میں مہارت رکھتی ہے۔“
یہ پیشکش ٹھکرانا بہت دشوار تھا۔ ہفتوں سے وہ خود پر انحصار کرتی آ رہی تھی۔ بھٹکتی پھر رہی تھی۔ یقین سے محروم تھی کہ کس پر اعتماد کرے۔ اگلے قدم کے بارے میں غیر یقینی کا شکار تھی۔ بھاگتے بھاگتے نڈھال ہو گئی تھی۔
اور...... وہ اب بھی اپنی زندگی دوسروں کے ہاتھوں میں دینے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ چاہے وہ جورڈن ہی کیوں نہ ہو۔ شکریہ کے ساتھ اس نے کہا۔ ”میں ایک سہولت مانگوں گی کہ مجھے ٹرین اسٹیشن تک پہنچا دیا جائے اور شاید......“ وہ نظریں جھکا کر ہنسی...... انداز حزنیہ تھا۔ ”اور نیا لباس؟“

بیرل کھڑی ہو گئی۔ ”میں بندوبست کرتی ہوں۔“ رچرڈ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈیانا اور جورڈن تنہا رہ گئے۔ کچھ دیر کے لیے سکوت طاری رہا۔ ”تم یہاں سے جا رہی ہو؟“ جورڈن نے سوال کیا۔
”ہاں۔“ ڈیانا نے نیپکن تہ کر کے میز پر رکھ دیا۔
اسے احساس تھا کہ جورڈن گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ بہت جھوٹ بول چکی تھی۔ بار بار کہانیاں بدلی تھیں۔ اس نے ابھی تک بدترین سچ نہیں اُگلا تھا۔ وہ کیا تھی؟ وہ کون تھی؟ بہتر تھا کہ وہ چلی جائے۔ وہ خود اس کے بارے میں بہترین رائے قائم کر لے گا۔ بجائے اس کے کہ بدتر کا انکشاف ہو......
”کیا کرو گی؟“
”کوئی آسان کام...... جس میں دھماکا نہ ہو... جان کا خطرہ نہ ہو۔“
”ڈیانا، اگر تمہیں کہیں، کبھی میری ضرورت پڑے...... کسی بھی چیز...... کے لیے......“
ڈیانا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں مدد کے رنگ کے علاوہ بھی ایک رنگ تھا۔ سب سے الگ سب سے گہرا...... ڈیانا کا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔ وہ سب کچھ بتا دے اسے...... خطرات کے بھنور میں کھینچ لے۔ نہیں وہ جورڈن کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔ جورڈن پُرامید نظروں سے اسے تک رہا تھا۔ ڈیانا نے نظر جھکا لی۔ ”نہیں، جورڈن...... لیکن تمہاری پُرخلوص پیشکش کا میں دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔“
اس نے بدقت تمام سر کو نفی میں جنبش دی۔ وہ یہ نہ دیکھ سکی کہ جورڈن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کا مان ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ دل کی بات دل میں پنہاں رہ گئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

پلیٹ فارم کی بینچ پر گرے سوٹ میں ایک آدمی بظاہر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ تاہم اس کی نظریں مسافروں پر تھیں۔ لندن جانے کے لیے بارہ پندرہ کی ٹرین کے لیے مسافر جمع ہو رہے تھے۔ یہ اس دن کی چوتھی ٹرین تھی اور وہ اب تک کیلی رائس کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس کا شک بڑھنے لگا کہ کیلی نے باہر نکلنے کے لیے ٹرین کے بجائے کوئی اور راہ اختیار کی ہے۔ وہ بہت تیز تھی، اسی لیے اب تک بچتی چلی آ رہی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا کہ کیلی اسپتال سے کیسے غائب ہوئی تھی۔ اسٹیشن پر وہ ایک بار پھر آزمائش بننے جا رہی تھی۔

وہ نئے امکانات کا جائزہ لینے لگا۔ تب دفعتاً کیلی اسے دکھائی دی۔ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کیا ہوا تھا۔ وہ اسے گھورتا رہا...... گزشتہ تجربے کی بنیاد پر اسے یقین ہو گیا کہ وہ کیلی ہی ہے۔ وہ پلیٹ فارم کے کنارے کے ساتھ چل رہی تھی۔

مرد نے فیصلہ کیا کہ اسے ٹرین پر چڑھنے دیا جائے۔ شولڈر ہولسٹر میں اس نے اپنا آٹومیٹک سہلایا۔

☆☆☆

لندن کے لیے بارہ پندرہ کا انتخاب چارلس کی نظر میں اچھا نہیں تھا۔ چیٹ ونڈ سے وہ جورڈن کی جیگوار کے پیچھے بہ آسانی وہاں آیا تھا۔ اگر وہ یہ کام کر سکتا تھا تو کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔ کیا وہ تنہا ہے...... کیلی کو نظر میں رکھتے ہوئے وہ دوسرے چہروں کو بھی جانچ رہا تھا پھر اسے جورڈن دکھائی دیا جو کیلی سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ جو کچھ ہوگا، جلد ہوگا۔ چارلس نے سوچا اور ٹرین پر ہوگا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ کیا ہونے والا ہے۔ کیلی بے خبر تھی۔ چارلس نے کوٹ سامنے سے کھول دیا۔ شولڈر ہولسٹر میں گن محفوظ تھی۔ اس کی نگاہ جورڈن پر تھی جو کیلی کی واحد لائف لائن تھا۔ چارلس یہ لائن کاٹنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے بعد کیلی کے لیے دوسری لائف لائن نہیں تھی۔

☆☆☆

قریب...... اور قریب۔ کیلی ٹرین پر سوار ہونے والی تھی۔ بس چند قدم اور...... اس کی تمام تر توجہ ٹرین پر تھی۔ ایک پیر پہلے پائیدان پر...... عقب میں کیا گڑبڑ تھی۔ وہ لاعلم تھی۔ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس پلیٹ فارم پر کھینچ لیا۔ وہ تیزی سے گھومی...... مزاحمت کے لیے تیار تھی۔ معاً جیسے بجلی چمکی۔ وہ جم کے رہ گئی۔

”جورڈن؟“ اس کے حلق سے تحیر زدہ آواز برآمد ہوئی۔ جورڈن نے اس کی کلائی پکڑی ہوئی تھی۔ ”نکلو یہاں سے۔“

”تم کیا کر رہے ہو؟“

”بعد میں بتاؤں گا، چلو۔“

”لیکن میں جا رہی......“

”کوئی چیٹ ونڈ سے ہمارا تعاقب کر رہا ہے...... نکلو یہاں سے۔“

ڈیانا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دونوں ساتھ پسپا ہوئے۔ جورڈن حد درجے چوکس تھا۔ اچانک ایک آدمی غیر متوقع طور پر نمودار ہوا۔ وہ دونوں کے راستے میں تھا۔ گرے سوٹ۔ اس کے چہرے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بات اس کے ہاتھ میں موجود گن کی تھی جس پر ڈیانا (کیلی) کی نگاہ جم کے رہ گئی تھی۔ تاہم وہ پھرتی سے بائیں جانب گھوم گئی...... دھماکا ہوا۔ اس کے شانے پر دھکا لگا۔ جورڈن کی جیکٹ کی جھلک نظر آئی۔ جو اس سے ٹکرایا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر زمین بوس ہو گئی۔ اس کی کمر میں چوٹ آئی اور آنکھوں میں اندھیرا اتر گیا۔

اطراف میں شور شرابا بلند ہوا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہوئی اور حملہ آور کو تلاش کیا۔ خوف زدہ افراد کی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ جورڈن، اس کے لیے آڑ بن گیا تھا جس کے کاندھے پر سے اس نے گن مین کو دیکھا...... دوسرا دھماکا۔ وہ اضطراری طور پر سکڑ گئی۔ تاہم حیرت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ابھی تک زندہ تھی۔ گن مین کے چہرے پر بھی یکساں حیرت نمودار ہوئی۔ وہ سر جھکا کر اپنے سینے کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں سرخ دھبا نمودار ہو کر پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ ڈولتا ہوا گھٹنوں کے بل گرا۔ کیلی نے مڑ کر دوسرے آدمی کو دیکھا۔

”بھاگ جاؤ۔“ وہ دہاڑا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ دوسرا فائر اسی نے کیا تھا۔ گرے سوٹ والا ہاتھ پیروں کے بل رینگ رہا تھا۔ گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی جورڈن نے پھر ڈیانا کو دھکیلا...... وہ بے اختیار دوڑ پڑی۔ جورڈن اس کے عقب میں تھا۔ وہ ٹرین کے عقبی کونے کے قریب سے پٹریوں پر کودے اور مخالف سمت پلیٹ فارم کی طرف بھاگے۔ ڈیانا نے جسمانی اذیت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ڈیانا پہلے پلیٹ فارم پر چڑھی اور جورڈن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر کھینچا۔

”میرا انتظار مت کرو۔“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”پارکنگ لاٹ میں جاؤ...... جیگوار، اسٹیشن گیٹ کے قریب ڈبل پارکنگ میں ہے۔“ اس نے چابیاں اس کی جانب اچھالیں۔

ڈیانا ریس کے گھوڑے کے مانند بھاگی۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں ساتھ آرہا ہوں۔“ جورڈن نے رفتار بڑھائی۔

جلد ہی ڈیانا جیگوار تک پہنچ گئی۔ اندر بیٹھ کر وہ مڑی۔ جورڈن قریب تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر گیئر بدلا۔ جورڈن کے کار میں گھستے ہی پہیے چیخے اور جیگوار اچھل کر پارکنگ سے نکلی۔ وہ بات کیے بغیر توجہ سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ سڑک پر آتے ہی سائرن کی

آواز سنائی دی۔ پولیس جیگوار کے قریب سے گزر کر اسٹیشن کی طرف چلی گئی۔ اس نے ایرویو میں دیکھا۔ کوئی تعاقب میں نہیں تھا۔

''وی آر کلیئر۔'' اس نے کہا۔

''فی الحال۔'' جورڈن بولا۔

''کون چیٹ ونڈ سے پیچھا کر رہا تھا؟'' کیلی عرف ڈیانا نے سوال کیا۔

''پہلے مجھے شک تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی MG تھی۔ پھر وہ غائب ہوگئی۔ دوسری بار اسے میں نے اسٹیشن گیٹ کے نزدیک دیکھا۔ اس وقت مجھے خطرے کا احساس ہوا۔'' جورڈن نے وضاحت کی۔

''لیکن تم میری خاطر... آئے تھے؟'' وہ بولی۔

''تم بتاؤ گی، یہ سب کچھ کیا ہے؟'' جورڈن نے سوال کیا۔

''کوئی ہمیں مارنا چاہتا ہے۔''

''ہمیں...... مطلب ہم ایک ہی کشتی میں سوار ہوگئے ہیں۔'' جورڈن مسکرایا۔ وہ خاموش رہی۔

''وہ دوسرا آدمی کہاں سے ٹپکا تھا، کون تھا؟ جس نے ہمیں بچایا؟''

''مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ لیکن......'' وہ رکی۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے اسے دیکھا ہے۔ لندن میں...... زیرِ زمین اسٹیشن۔''

''اوہ تمہارا حفاظتی فرشتہ۔ لیکن اس مرتبہ تم نے اسے دیکھ لیا۔ لہٰذا وہ فرشتہ نہیں کوئی آدمی ہے۔ باڈی گارڈ؟''

''پتا نہیں ہے...... کہاں جانا ہے چیٹ ونڈ؟''

''وہاں نہیں جاسکتے۔''

''کون لوگ ہیں وہ؟'' جورڈن نے سوال کیا۔

''وہی، جنہوں نے گائے کی کار اُڑائی تھی۔''

''کیا ان کا تعلق بیجنگ سے ہے؟ یا کوئی نئی کہانی۔''

''کہہ سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' جورڈن نے کہا۔ اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جورڈن بھی اس کے مانند ہراساں ہے۔

''میرے خیال میں مکمل سچائی کا علم میرا حق بنتا ہے۔'' وہ بولا۔

''کچھ انتظار کرو، کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں۔'' اس نے ایکسلیریٹر دبایا۔ ''اس وقت میری ترجیح لندن پہنچنا ہے۔''

''تمہارے خیال میں یہ اتنا آسان ہے۔ اگر وہ اتنے ہی خطرناک ہیں تو ہائی وے پر ان کی نظر ہوگی اور میری جیگوار ان کی نظر سے بچ نہیں سکتی۔''

ڈیانا سوچ رہی تھی کہ مصائب کے فولادی ذرات کے لیے وہ مقناطیس کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جو متواتر اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اسے چاہیے کہ جیگوار سے چھٹکارا حاصل کرے اور جورڈن سے بھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جورڈن خواہ مخواہ کراس فائر کی زد میں آجائے۔

''اگلا موڑ کہاں جا رہا ہے؟''

''گیسٹ ہاؤس۔'' جورڈن نے کہا۔ ''اس کے مالک کو میں جانتا ہوں۔ ہمیں کچھ دیر وہاں رکنا چاہیے۔ وہاں باڑے میں کار بھی چھپائی جاسکتی ہے۔'' جورڈن نے جواب دیا۔

''میں لندن کیسے جاؤں گی؟''

''وہیں رک کر سوچیں گے۔''

''میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔''

''لیکن مجھے خدشہ ہے کہ ہمیں رکنا چاہیے۔'' جورڈن نے سرگوشی کی۔ ڈیانا نے چونک کر اسے دیکھا اور دہشت کے باعث گاڑی سڑک سے اترتے اترتے رہ گئی۔ جورڈن نے جیکٹ واپس اپنی جگہ پر کرلی۔ اس کی نفیس لینن شرٹ پر خون کے دھبے تھے۔

☆☆☆

''مائی گاڈ، تم نے بتایا کیوں نہیں؟''

''یہ سیریس نہیں ہے۔''

''وہ کیسے؟'' ڈیانا نے جورڈن پر آنکھیں نکالیں۔

''کھانے کا ارادہ ہے کیا؟''

''تم پاگل ہو۔''

''دیکھو میں سانس لے رہا ہوں۔''

''اوہ بڑا کمال ہے۔'' اس نے گاڑی گھمائی۔

''تمہیں اسپتال لے جا رہی ہوں۔''

''نہیں۔'' جورڈن نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ''وہ تمہیں پکڑ لیں گے۔''

''کیا میں جریانِ خون کے باعث تمہیں مرتا دیکھتی رہوں؟''

''مجھے خوشی ہوگی، اگر تم اتنی دیر تک مجھے دیکھتی رہو۔''

''تمہارے دماغ کا کوئی اسکرو تو ڈھیلا نہیں ہے۔''

''پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا تو ڈھیلا ہوگیا تھا۔ اب تو

نکل کر گر پڑا ہے۔"

"جورڈن، پلیز۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ خون رک چکا ہے۔" اس نے شرٹ کی طرف دیکھا۔ "معمولی زخم ہے۔"

"اگر یہ اندر بلیڈ کررہا ہوا تو؟" ڈیانا نے تشویش ظاہر کی۔

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے...... باربار چھوڑ کے بھاگ جاتی ہو۔" وہ تکلیف سے مسکرایا۔ "یقین کرو میں خاصا بزدل ہوں۔ خطرہ ہوتا تو سیدھا اسپتال بھاگتا۔"

ڈیانا سمجھ گئی کہ جورڈن نے خود ڈرائیونگ کیوں نہیں کی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ وہ بزدل نہیں ہے۔ جب تمام بزدل گر جائیں گے جورڈن تب بھی کھڑا رہنے کی کوشش کرے گا۔

"کہاں ہے گیسٹ ہاؤس؟" بالآخر اس نے استفسار کیا۔

☆☆☆

گیسٹ ہاؤس، کاٹیج گارڈن کی طرح تھا۔ ڈیانا نے اسے گاڑی سے اترنے کے لیے سہارا دینے کی کوشش کی۔

"میں چل سکتا ہوں۔" جورڈن نے قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا۔

"خود پر ظلم مت کرو۔"

"اوہ...... سہارا دینے کے بہانے قربت کی متلاشی ہو۔" جورڈن کی رگ پھڑکی۔ "یہ کیف اضطراری ہے یا غیر اختیاری۔"

اس مرتبہ ڈیانا نے اس کی شوخیِ گفتار کو نظر انداز کیا اور بغلوں میں ہاتھ دے کر سہارا دیا۔

"یہ شیوۂ ناز ہے یا ادائے دلبری۔" وہ باز کہاں آنے والا تھا۔

"ہمدردی ہے اور کچھ نہیں۔"

"پندارِ خودی اتنی نہ بڑھاؤ...... اپنے دل کی دھڑکن سنو...... اور ذرا ٹھیک طرح سہارا دو...... گولی کھائی ہے تمہارے لیے۔"

"جورڈن تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" دونوں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

"تم ساتھ رہو تو نہیں لگتا۔"

"تم آگ سے کھیل رہے ہو۔"

"کتنی نرم آگ ہے۔"

ڈیانا نے خاموشی اختیار کرلی۔ حقیقتاً جورڈن کا قرب نشے کی طرح اثر کررہا تھا۔

دستک کے جواب میں گیسٹ ہاؤس کا دروازہ ایک عمر رسیدہ معقول آدمی نے کھولا تھا۔ اس دوران جورڈن نے ڈیانا کو خود سے الگ کرکے جیکٹ بند کرلی تھی۔ گیسٹ ہاؤس والا دبلے پتلے بدن کا مالک تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر خوش کن انداز میں کہا۔

"مسٹر ناوستوک، اتنے عرصے بعد...... شادی کرلی کیا؟" اس نے ڈیانا کو دیکھا۔ وہ خجل سی ہوگئی۔

"کمال ہے...... عجیب آدمی ہو، شادی شدہ جوڑا اس حال میں ہوتا ہے...... بہرحال تمہارا حسن ظن اچھا ہے۔ کرلوں گا۔"

ڈیانا نے جورڈن کے کولہے میں چٹکی بھری۔ جورڈن کی سسکی نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" بڑے میاں نے پوچھا۔

"یہاں شہد کی مکھیاں ہیں غالباً...... ایلون، باہر ہی کھڑا رکھو گے؟"

"آجاؤ...... آجاؤ...... بہت خوشی ہوئی۔" وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ "چیٹ ونڈ، ہاؤس فل جارہا ہے کیا...... تم اپنے مہمان کو یہاں لے آئے؟"

"دراصل یہ جگہ صرف ہم دونوں کے لیے ہے؟" جورڈن نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تم اور...... اوہ اچھا...... سمجھ گیا۔" ایلون مسکرایا۔

وہ سیڑھیوں کے ذریعے انہیں دوسری منزل پر لے آیا۔ جورڈن حال احوال معلوم کرتا رہا، خصوصاً مسز ایلون کی صحت کے بارے میں۔ ڈیانا کو یہ جگہ اندر اور باہر سے بڑی رومینٹک لگ رہی تھی۔ لیکن اس وقت اس کی توجہ جورڈن کی جانب تھی۔ ایلون چلا گیا تھا اور جورڈن بیڈ پر بیٹھا تھا۔ ڈیانا نے اسے بستر پر لٹانے سے پہلے جیکٹ اتاری۔ بعدازاں احتیاط سے شرٹ کے بٹن کھولے۔ بالوں بھرا چوڑا سینہ عریاں ہوگیا۔ زخم دائیں بغل کے قریب تھا۔ سینے کے بال بعض جگہ سے سرخ ہوگئے تھے۔ وہ حیران تھی زخم گولی کے بجائے چھری کا شاخسانہ معلوم ہورہا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ "شاید گولی چھوکر گزر گئی۔ ورنہ یہ آسانی سینے کے پار جاتی۔ یو آر لکی۔" وہ بولی۔

"غالباً تمہیں دھکا دیتے وقت میرا توازن بگڑا تھا لیکن یہ لک سے زیادہ کچھ اور ہے۔" جورڈن نے گردن موڑ کر زخم کی طرف دیکھا۔

"مطلب؟"

''میری جیکٹ دو۔''
ڈیانا اُلجھ گئی۔ تاہم جیکٹ اس نے جورڈن کو پکڑا دی۔ جیکٹ میں بغل کے قریب گولی کا سوراخ تھا۔ جورڈن نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چین والی فولادی گھڑی نکالی۔ گھڑی پرانی لیکن قیمتی تھی۔ ڈیانا نے گھڑی کی پشت پر ایک بدنما ڈینٹ دیکھا۔
''یہ امدادی ہاتھ قبر سے آیا تھا۔ ڈیڈی اب بھی مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔'' جورڈن نے گھڑی کھولی۔ اندرونی سمت برنارڈ ناڈ سٹوک کھدا ہوا تھا۔ ''مائی فادر۔''
''بہتر ہے، اسے ساتھ رکھا کرو...... دوسری گولی روکنے کے کام آئے گی۔''
''امید ہے اب ایسا نہیں ہوگا۔'' جورڈن نے کہا۔
ڈیانا ہاتھ روم سے تولیا بھگو کر لائی اور جھک کر زخم صاف کرنے لگی۔ دونوں کے سر بہت قریب تھے۔
خون، پسینا اور آفٹر شیو کی خوشبو آپس میں مل گئی تھی۔ یہ عجیب خوشبو نتھنوں کے ذریعے ڈیانا کے پورے بدن میں پھیل رہی تھی۔ مخالف جنس کے ازلی جذبات میں ہلچل تھی۔ ڈیانا نے بمشکل جورڈن کی طرف دیکھنے سے خود کو باز رکھا۔
''حیرت ہے مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ تم زخمی ہو۔''
''تمہیں کیا پتا چلتا...... تم اپنی فکر میں رہتی ہو۔''
ڈیانا نے شکوہ کناں نظروں سے جورڈن کو دیکھا۔ دفعتاً اس نے دونوں ہاتھ جورڈن کے سر کے اردگرد رکھے۔ جھکی...... آشفتگی دل سے نڈھال...... ضبط کا حصار ٹوٹ گیا...... سازِ رگِ جاں کے تار بج اٹھے۔ بمشکل تاروں کی جھنکار ختم ہوئی۔ ڈیانا کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھرے تھے۔
''میرا دم گھٹ رہا تھا۔'' جورڈن نے کیف آگیں لہجے میں کہا۔
''تمہاری وجہ سے بھاگتی ہوں۔ میری وجہ سے مارے جاؤ گے۔''
''ایک دن تو مرنا ہے۔ تمہارے لیے جان دی تو زیادہ اچھا رہے گا......'' دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔
''میں اس کی ڈریسنگ کیسے کروں؟'' اس نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔
''گاڑی میں فرسٹ ایڈ کٹ ہے۔''
''میں لاتی ہوں۔''
وہ واپس آئی تو جورڈن کھڑکی کے پاس خاموش کھڑا تھا۔
''کیا بات ہے؟''
وہ مڑا۔ ''میں نے چیٹ ونڈ کال کی ہے...... انہیں بتانا ضروری تھا۔ ہمیں مدد درکار ہے۔''
''بہتر ہوتا، اگر وہ نہ جانتے...... اس طرح ہم زیادہ محفوظ رہتے۔''
''محفوظ...... کس سے؟''
''ہر کسی سے۔ وہ غلط لوگوں سے تفتیش کریں گے۔ غلط چیزیں سامنے آئیں گی۔''
جورڈن کی پشت اب بھی اس کی جانب تھی۔ وہ اس کے تاثرات نہ دیکھ سکی۔ تاہم اس کی آواز میں جھلکتا ہوا غصہ اس نے محسوس کرلیا۔
''اگر میں اپنی فیملی پر ہی بھروسا نہیں کرسکتا تو پھر کس پر کروں گا؟''
جورڈن کی آواز کسی بچھو کے ڈنک کے مانند لگی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''یہاں آجاؤ۔'' اس نے کٹ کھولی۔ جورڈن بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ڈیانا نے بینڈیج شروع کی۔ جراثیم کش کے استعمال پر اس نے اپنی کراہ دبالی۔ اس کی خاموشی ڈیانا کو ڈرا رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں کچھ تبدیل ہوگیا تھا اور معلوم کرتے ہوئے خوف زدہ تھی۔ طویل آنکھ مچولی کے بعد اب اسے چند دھاگے کاٹنے تھے جو ان دونوں کے درمیان باقی رہ گئے تھے لیکن وہ سوال نہ کرسکی۔ کیا وہ اسے کھو چکی ہے یا اس سے بھی بدتر...... کیا وہ اس کے خلاف ہوگیا ہے۔ کال پر کیا بات ہوئی ہے......
بینڈیج ختم ہوئی تو اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔
''رچرڈ آرہا ہے۔'' اس نے بتایا۔
''تم نے بتایا کہ ہم کہاں ہیں؟''
''بتانا ہی تھا۔''
''یہ کافی نہیں تھا کہ تم خیریت کی اطلاع دے دیتے؟''
''وہ کچھ بتانا چاہتا ہے۔'' جورڈن نے کہا۔
''وہ فون پر بتا سکتا تھا۔''
''یہ رُوبرو کرنے والی بات ہے۔'' جورڈن وقفہ دے کر سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ تمہارے متعلق ہے۔''
ڈیانا کی نگاہ اس کے چہرے پر جم گئی۔ دل نے کہا کہ اسے معلوم ہوگیا ہے۔ وہ خود کو بیمار محسوس کررہی تھی۔ اس کا آلودہ ماضی سامنے آنے والا تھا۔ جورڈن کی محبت یقیناً

ختم ہو گئی ہوگی۔ ڈیانا نے تھوک نگلا۔ ''رچرڈ نے کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ تم نے ایمانداری کا مظاہرہ نہیں کیا۔''

''کیسے؟''

''تمہاری انگلیوں کے نشانات جو تم پلےگراؤنڈ میں گلاس پر چھوڑ گئی تھیں۔''

''تو...... تم نے۔'' وہ یک دم کھڑی ہو گئی۔ ''میں نے تم پر اعتبار کیا تھا۔''

''میں نے کبھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ تمہاری کہانیاں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ مجھے سچائی کی تلاش تھی۔''

''کیوں؟ کیا فرق پڑتا؟'' وہ چیخی۔

''میں تم پر یقین کرنا چاہتا تھا۔ مکمل یقین۔''

''کہ میں فراڈ نہیں ہوں۔ یا ثابت کرنا چاہتے تھے کہ میں فراڈ ہوں۔''

''مجھے نہیں پتا۔''

''تمہارے لیے میں شہزادی تھی جبکہ شہزادی کے روپ میں تمہیں کچھ اور نظر آیا...... تم مایوس ہو گئے۔ میرے لیے بھی یہ مایوس کن ہے کہ میں اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ میں کتنی ہی جدوجہد کروں، ماضی میرا تعاقب کرتا رہے گا۔'' وہ خاموش ہو گئی۔ ''لیکن میں تمہاری مدد کا شکریہ پوری طرح ادا نہیں کر سکتی۔ میرے لیے تم دنیا کے سب سے بہتر جنٹلمین ہو...... کاش...... کاش ہم نہ ملے ہوتے۔'' وہ مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''لندن تک پیدل جانا...... لمبا سفر ہے۔ مجھے شروع کرنا چاہیے۔''

وہ فوراً ہی کھڑا ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ ''تم نہیں جا سکتیں۔''

''کچھ تو کرنا ہے۔''

''کتنا وقت لگے گا اور اگلے اسٹیشن پر کیا ہوگا؟''

''کیا تم رضاکارانہ طور پر ایک اور گولی کھانے کے لیے تیار ہو؟''

جورڈن نے اس کا بازو پکڑا...... معاً اپنی طرف گھما کر سینے سے لگا لیا۔ ہونٹوں کے نیچے وہ موم کی طرح پگھلنے لگی۔

ہو چکا ہوں۔'' اس نے ڈیانا کو بانہوں میں لے لیا۔ زینے پر آہٹ ہوئی پھر دروازے پر دستک نے دونوں کو الگ ہونے پر مجبور کر دیا۔

''کون ہے؟'' جورڈن نے کہا۔

''یہ میں ہوں۔''

جورڈن نے دروازہ کھول دیا...... رچرڈ نے ڈیانا کے سرخ چہرے کو دیکھا پھر جورڈن کے عریاں سینے پر نظر ڈالی۔ کوئی تبصرہ کیے بغیر وہ اندر آیا اور دروازہ لاک کر دیا۔

کیلی نے اس کے ہاتھ میں ایک فائل فولڈر دیکھا۔

امید وبیم کی کیفیت میں وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں میں سے کسی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ احساسِ شکست نے اسے نیم مردہ کر دیا تھا۔ اس کا اصل نام سامنے آنے والا تھا۔ ساتھ میں اور بھی بہت کچھ۔ دفاع کے لیے اس کی تحویل میں کچھ نہ تھا پھر وہ چلی جائے گی۔ اس مرتبہ جورڈن اسے .... روکے گا بھی نہیں۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی، آغاز ہی اس کے نام سے ہوا۔ کیلی رائس۔

جورڈن نے کیلی کی طرف دیکھا کہ کوئی تردید۔ جواب یا احتجاج آئے گا۔ اس کی نظر میں مثبت توقعات کا عنصر کم تھا۔ لیکن کیلی مہر بہ لب تھی۔ اس کے شانے ڈھلک گئے۔ جورڈن کی نظر نے اس کا سر جھکا دیا۔ وہ یک لخت تھکن سے چور ہو گئی۔

رچرڈ نے فولڈر جورڈن کے حوالے کر دیا۔ ''مجھ تک ایک گھنٹے قبل واشنگٹن سے پہنچا ہے۔''

''نکی؟''

رچرڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔ نکولائی ساکاروف اس کا پارٹنر تھا۔ سیکیورٹی کنسلٹنٹ۔ کے جی بی کا سابقہ کرنل۔ جورڈن نے فولڈر کھولا۔ پہلے صفحے پر دھندلی تصویر تھی۔ گرفتار شدہ کیلی کا پورٹریٹ۔ سامنے اور سائڈ سے۔ وہ پہچان گیا کہ وہ کیلی کی نوعمری کی تصویریں تھیں۔ جورڈن نے دوبارہ کیلی کی طرف دیکھا۔ وہ ساکت اور خاموش بیٹھی تھی۔

اس نے اگلا صفحہ دیکھا۔ تین سال کی سزا، دس مہینے میساچوسٹس کی جیل میں جہاں بہتر رویے کے باعث سزا میں کمی کی۔

''یہ سب سچ ہے؟''

''ہاں سچ ہے۔'' کیلی نے سرگوشی کی۔

[illegible] رضاکاری کا تو نہیں معلوم لیکن میں پہلے ہی وابستہ [illegible] جورڈن نے [illegible] سوال کیا۔ ''کس مجرم کی کیلی

نے مدد کی تھی؟''
''اس کا نام والٹر ہے۔ وہ ابھی تک جیل میں ہے۔''
''جرم؟''
''چوری، فراڈ، ٹریفکنگ، ڈاکا...... اس کا معاملہ طویل ہے۔'' رچرڈ نے جواب دیا۔
''رائس، وہ تمہارا رشتے دار ہے؟''
''انکل۔''
''کیلی بھی ان جرائم میں شریک تھی؟''
کیلی نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر غصہ نظر آیا۔ ''یہ جھوٹ ہے۔ کم عمری کی وجہ سے میں بچہ جیل میں تھی۔ گھناؤنے جرائم میں، میں عملی طور پر شریک نہیں ہوسکتی تھی۔''
''بارہ سال کی عمر میں تم نے زیور چرانے کی کوشش کی تھی۔ چودہ سال کی عمر میں اپنے کزن کے ہمراہ بیکن ہل میں تم نے چوری کی چھ وارداتیں کی تھیں۔''
''میں بچی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں کیا کررہی ہوں۔''
''اس دوران تم کیا سمجھتی تھیں؟''
''وہی جو انکل والٹر بتاتے تھے۔''
''کیا ان کا تم دونوں پر اتنا اثر تھا کہ تم انکار نہ کرسکو؟''
کیلی نے دوسری طرف دیکھا۔ ''انکل والٹر...... میں ان کے گھر میں پلی بڑھی تھی۔ ہم تین تھے۔ انکل، میں اور ٹونی۔ میں جانتی تھی کہ انکل ہمیں غلط استعمال کررہے ہیں لیکن چوری...... یہ مجھے کھیل کی طرح لگتا تھا۔ وہ چالاکی سے کام لیتے تھے۔ ہم دونوں کو چیلنج کرتے تھے کہ کون فلاں گھر میں گھس کے دکھائے گا۔ یہ رقم کا معاملہ نہیں تھا...... ہمیں لگتا کہ اگر کامیاب نہیں ہوں گے تو بزدل کہلائیں گے...... ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر انکل ہمیں باقاعدہ چور بنا دیتے۔''
''رائٹ یارانگ کے معاملے کا کیا ہوا؟''
''میں نے فیصلہ کرلیا تھا۔ میں اٹھارہ سال کی تھی جب میں نے انکل والٹر کا گھر چھوڑ دیا تھا۔ آٹھ سال تک میں سیدھے راستے پر چلتی رہی۔ میں قسم کھا سکتی ہوں۔''
جورڈن سوچ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی آنکھوں اور چھٹی حس پر بھروسا کرے۔ کیلی کامیابی سے فریب دیتی آئی تھی۔ وہ پھر سے بغور فائل کا جائزہ لینے لگا۔ نکی سا کاروف کے نوٹ میں لکھا تھا۔ بوسٹن ایریا میں والٹر ایک لیجنڈ کے مانند تھا۔ وہ صرف پیسے والوں کو لوٹتا تھا۔ وہ بڑا اسٹائلش چور تھا۔ اس نے کبھی کسی کو جسمانی طور پر نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ ''ریڈ روز تھیف'' کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی عادت تھی کہ اپنے پیچھے سرخ گلاب چھوڑ جاتا تھا...... نیز معذرت نامہ بھی۔ مہارت نامہ رکھنے والا چور بھی غلطی کرجاتا ہے۔ لہٰذا اس کا بُرا دن بھی آیا اور وہ پکڑا گیا۔
جورڈن نے ٹونی کے بارے میں رچرڈ سے سوال کیا۔
''برگلری کی مد میں اس نے چھ سال کی سزا بھگتی تھی۔ نکی کے مطابق وہ اس وقت یورپ میں کہیں ہے اور آرٹ کے قدیم نمونوں کی بلیک مارکیٹنگ سے منسلک ہے۔ مس رائس میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''
کیلی نے سر اٹھایا۔ ''ٹونی کو چھوڑو۔ وہ اب کسی کالے دھندے میں ملوث نہیں ہے۔''
''تم اس کے ساتھ کام کرتی تھیں؟''
''میں کسی کے لیے کام نہیں کرتی۔''
''پھر لوٹے گئے مال کا کیا ہوتا ہے؟''
''کیسی لوٹ مار؟''
''گاڈ ڈیلینسی!''
ردِعمل کے طور پر اس کے چہرے پر یاس کے سائے گہرے ہوگئے۔ ''مجھے جوابات دینے کی ضرورت نہیں ہے...... تم دونوں پہلے ہی مجھے مجرم بنا چکے ہو۔ اب کہنے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔''
''کافی کچھ باقی ہے۔'' جورڈن نے کہا۔ ''کون اور کیوں تمہاری جان لینے کی کوشش کررہا ہے، اب میں بھی نشانے پر ہوں۔''
''میں چلی جاؤں گی تو تمہارے لیے خطرہ ناپید ہو جائے گا۔''
''وہ کون ہے؟''
''میں بتا چکی ہوں۔'' اس نے آہ بھری۔ ''وہ بیلجیئن ہے۔''
''مطلب کہانی کا وہ حصہ حقیقت تھا۔''
''ہاں، سورج کی طرح ہے...... اور ''میکس ہیولر'' بھی۔''
''بیلجیئن کا نام؟'' رچرڈ نے استفسار کیا۔
''وان ویلڈن۔ اس کے ذرائع وسیع ہیں۔ بہت سے لوگ اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ گائے حادثاتی طور پر مارا گیا۔ وان ویلڈن میری جان لینا چاہتا ہے۔''
سکوت کا طویل وقفہ آیا پھر رچرڈ نے دھیرے سے

کہا۔ ’’وان...... وکٹر وان ویلڈن؟‘‘

کیلی کی آنکھوں میں خوف جاگا۔ ’’تم اسے جانتے ہو؟‘‘ اس نے رچرڈ سے سوال کیا۔

’’میں نے اس کا نام سنا ہے۔‘‘ رچرڈ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ’’اسٹیشن پر جس نے حملہ کیا تھا، اس کا نام فریز ہے۔ پتا لندن کا ہے۔ پولیس اس کے رشتے داروں کی تلاش میں ہے۔‘‘ رچرڈ نے نئے زاویے سے کیلی کا چہرہ دیکھا۔ ’’لیکن سوائے اس کے آجر کے کوئی نام سامنے نہیں آیا۔ آجر کا نام ہے۔ شپنگ کمپنی کا مالک وان ویلڈن۔‘‘

کمپنی کے نام پر جورڈن نے کیلی کو جھرجھری لیتے دیکھا...... جیسے کسی شیطانی ہاتھ نے اسے چھو لیا ہو۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی۔

’’دوسرا گن مین کون تھا؟‘‘ جورڈن نے سوال کیا۔

’’کوئی نشان نہیں ملا۔ وہ سلپ کر گیا۔‘‘

’’میں جانتی ہوں کہ کون کیوں مجھے ختم کرنا چاہتا ہے لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ وہ کون ہے جو مجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہے؟‘‘

’’جو تم جانتی ہو، وہ بتا دو۔‘‘ جورڈن نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ’’وکٹر وان ویلڈن تمہیں کیوں مردہ دیکھنا چاہتا ہے؟‘‘

’’کیونکہ میں ’’میکس ہیولر‘‘ کے راز سے آگاہ ہوں۔‘‘

’’وہ کیوں اور کیسے ڈوبا...... یہ مطلب ہے تمہارا؟‘‘

کیلی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’بحری جہاز پر نوادرات نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ انشورنس کلیم جعلی تھا۔ میکس ہیولر کے عملے کو مار دیا گیا تھا۔‘‘ کیلی نے کہا۔

’’تم کیونکر یہ سب جانتی ہو؟‘‘

’’میں اس بحری جہاز پر تھی۔‘‘ کیلی نے دھماکا کیا۔

☆☆☆

’’نیپلز کی جانب، یورپ میں وہ میرا پہلا ٹرپ تھا۔ ماضی کی بری یادوں کو بھلانے کے لیے میں بے قرار تھی۔ لہٰذا جیسے ہی ٹونی نے مجھے مدعو کیا، میں فوراً تیار ہو گئی۔‘‘

’’ٹونی تمہارا کزن؟‘‘

’’ہاں، ایک حادثے کی وجہ سے وہ وہیل چیئر تک محدود ہو گیا تھا۔ کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اسے کسی بااعتماد ساتھی کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسا ساتھی جو نوادرات کی فروخت کے لیے خریدار تلاش کرے۔ یہ قطعی فیئر اور صاف کاروبار تھا۔ اس نے بلیک مارکیٹ سے اپنا تعلق ختم کر لیا تھا۔‘‘

’’اس لیے تم نیپلز میں تھیں...... کزن کی خاطر؟‘‘

’’ہاں، اور وہاں میری دو اٹالین ملاحوں سے ملاقات ہوئی جو دوستی میں ڈھل گئی۔ ایک کا نام کارلو اور دوسرے کا گیانی تھا۔ وہ دونوں ٹونی کے اچھے دوست تھے...... ہم تینوں نے جہاز پر سات دن بہت اچھے گزارے۔‘‘

’’کیا وہ قابلِ بھروسا تھے؟‘‘

’’میں نے انہیں ایسا ہی پایا۔‘‘ کیلی نے جواب دیا۔

’’شپ میں کیا تھا؟‘‘

’’بطور کارگو محض چند کریٹ...... عملہ آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ نویں فرد میں تھی۔ میرے خیال میں نوادرات کی صورت میں کریٹ بہت گراں قدر تھے۔‘‘

’’کیا مالک کا نام موجود تھا؟‘‘

’’ہاں، وان ویلڈن کمپنی...... وہ شپنگ ایجنٹ بھی تھے۔‘‘

’’تم نے وہاں کیا کیا تھا؟‘‘

’’کچھ نہیں، محض تجسس کے تحت پین لائٹ کے ذریعے میں نے ایک کریٹ کے سوراخ سے جھانکا تھا۔ اندرونی صورتِ حال ناقابلِ یقین تھی۔‘‘

’’کیا تھا اندر؟‘‘

’’پتھر۔‘‘

’’کیا تم نے کریو کو بتایا؟‘‘

’’میں نے جہاز کے ڈیک سے ہٹنے کا انتظار کیا۔ بعدازاں گیانی کو آگاہ کیا۔ وہ ہنسنے لگا۔ اس نے کہا کہ جب کریٹ لادے جا رہے تھے تو وہ خود موجود تھا۔‘‘

’’کس نے لوڈ کرائے تھے؟‘‘

’’وان ویلڈن کمپنی۔ وہ براہِ راست ٹرک میں ان کے گودام سے آئے تھے۔‘‘

’’پھر تم نے کیا کیا؟‘‘

’’میں مُصر تھی کہ کیپٹن سے بات کرنی چاہیے۔‘‘ میری اس رائے پر وہ پھر ہنسنے لگا اور بولا کہ وہ بعد میں چیک کرے گا۔ بہرحال جلد ہی عملہ کریٹس کھولنے پر آمادہ ہو گیا...... جہاں پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیپٹن یقین کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے نیپلز، ریڈیو کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم سیڑھیاں طے کر کے برج کی طرف گئے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی انجن

روم میں خوفناک دھماکا ہوا۔

جورڈن اور رچرڈ خاموشی اور سنجیدگی سے میکس ہیولر کی آبی تدفین کی کہانی سن رہے تھے۔ ”گیانی نے SOS کا اشارہ دیا۔ بچے ہوئے عملے نے لائف بوٹ اتاری۔ بحری جہاز تیرتا ہوا آتش فشاں بن چکا تھا۔ انہوں نے تاریکی میں سرد پانی میں چھلانگ لگائی۔ گیانی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لائف بوٹ پر چڑھانے کی کوشش کی اور عین اسی وقت ”کوسیما“ نے فائر کھول دیا۔ ابتدا میں مجھے احساس نہیں ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ گن فائر کی شناخت بھی میں نے تاخیر سے کی۔“ کیلی کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ”پھر کیپٹن نیم مردہ حالت میں بوٹ سے باہر گرا۔ میرا ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔“

”تم فرار کیسے ہوئیں؟“ جورڈن نے سوال کیا۔

کیلی کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے۔ ”میں نے غوطہ لگایا۔“ وہ بولی۔ ”جب تک میرے پھیپھڑوں نے ساتھ دیا، میں زیرِآب تیرتی رہی۔ ساحل تک پہنچنے کے لیے مجھے دومیل تیرنا پڑا۔ کوسیما کو شک نہیں ہوا تھا، لہٰذا کچھ دیر بعد میں سطح آب پر آ گئی تھی۔“

جورڈن اور رچرڈ نے شاک کی حالت میں روح فرسا کہانی سنی۔ انسانی ہوس کی کوئی حد نہیں۔

”صبح کے قریب میں پولیس تک پہنچ گئی۔“ کیلی نے بات آگے بڑھائی اور نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ میری خوفناک غلطی تھی۔“

”ہوں؟“

”میں نے واردات کی وضاحت کی۔ انہوں نے سچائی جاننے کے لیے مجھے عقبی کمرے میں ٹھہرایا۔ مجھے کوئی شک نہیں ہوا۔ اس طرح حالتِ انتظار میں تین گھنٹے گزر گئے۔ شاید پولیس کا قصور نہیں تھا۔ وان ویلڈن کی رسائی دور تک تھی۔ اس کا کوئی بندہ وہاں پہنچا۔ اس کی آواز میں نے پہچان لی۔ وہ آواز میں نے کوسیما پر سنی تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ قاتل بھی، وان ویلڈن کے لیے کام کرتے ہیں؟“

کیلی نے سر ہلایا۔ ”میں کھڑکی سے نکل کر بھاگی اور آج تک بھاگ رہی ہوں۔ اصل نوادرات کہیں اور ہیں۔ جنہیں مناسب وقت پر ایک ایک کر کے بلیک مارکیٹ میں فروخت کیا جائے گا۔“

”پالیسی کس کی تھی؟“

”لائیڈز آف لندن۔“

”کیا تم نے ان سے رابطہ کیا؟“

”ہاں، تاہم انہوں نے یقین نہیں کیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ میری کیا دلچسپی ہے۔ ماضی کا کرمنل ریکارڈ علم میں آنے کے بعد انہوں نے مجھے نظرانداز کر دیا۔“ کیلی نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ ”میں نے ٹونی کو روپوش رہنے کے لیے کہہ دیا، معذوری کے باعث اس کے لیے زیادہ دشواری تھی۔ نیز اس کے ذریعے مجھ تک پہنچنا آسان تھا۔ اب میں خود پر انحصار کر رہی ہوں۔“

خاموشی کا طویل وقفہ آیا۔ بالآخر اس نے ہمت کر کے نظریں اٹھائیں...... دیکھا کہ جورڈن دیوار کو تک رہا تھا جبکہ رچرڈ واضح طور پر غیر مطمئن نظر آ رہا تھا۔

”مسٹر رچرڈ، شاید تمہیں اعتبار نہیں آیا۔“

”ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔ مجھے تھوڑی بہت تفتیش کرنی پڑے گی۔“ وہ جورڈن کی طرف مڑا۔ ”کیا ہم باہر بات کر سکتے ہیں؟“

جورڈن نے سر ہلایا اور دونوں کمرے سے نکل گئے۔ کیلی کھڑکی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سن نہیں سکتی تھی۔ البتہ باڈی لینگویج نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد رچرڈ اپنی کار میں روانہ ہو گیا۔ کیلی، جورڈن کا انتظار کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ وہ کیوں اس پر اعتبار کرے گا؟ اس نے سچ کہنے میں بہت دیر لگا دی تھی۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ اس نے چند لمحے کیلی کے چہرے کا جائزہ لیا جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

تاہم کیلی سبقت لے گئی۔ ”آئی ایم سوری۔“

”سوری؟“

”میں تمہیں اور تمہاری فیملی کو ان معاملات سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ تم چلے جاؤ۔ میں کسی طرح لندن پہنچ جاؤں گی۔“

”دیر ہو گئی ہے...... اب ہم علیحدہ نہیں رہ سکتے۔“

”وان ویلڈن کو مجھ سے غرض ہے...... تم میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔“ کیلی نے کہا۔

”اب ایسا نہیں ہے۔“ جورڈن نے تردید کی۔

”کیا؟“

”یہی بات رچرڈ مجھے بتانا چاہتا تھا۔ وہ یہاں آیا تھا تو اس کا تعاقب کیا گیا۔ تعاقب چیٹ ونڈ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ وہ لوگ ہر ایک پر نظر رکھے ہوئے ہیں، تاہم رچرڈ

پر قابو پانا ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ اُن کو غچا دے کر یہاں آیا تھا۔"

کیلی کا جسم اکڑ گیا۔ قلب کی رفتار بڑھنے لگی۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ وہ ایک مہینے سے اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ وان ویلڈن کے بارے میں جاننا اس نے.... اپنا مشن بنا لیا تھا اور وہ وان ویلڈن کے بارے میں کسی سے بھی بہتر معلومات حاصل کر چکی تھی۔ وان ویلڈن کا جال خوفناک حد تک وسیع تھا۔ وہ کیلی اور جورڈن کے تعلق سے آگاہ تھا۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں تھا جب وہ کیلی کو دبوچ لیتا۔ وہ رک گئی۔ "اب کیا ہوگا؟ رچرڈ کے ذہن میں کیا ہے؟"

"معلومات، تفتیش اور لائیٹڑ آف لندن سے رابطہ......"

"اس دوران میں ہم کیا کریں؟"

"یہیں جم کر بیٹھیں۔ وہ صبح کال کرے گا۔"

کیلی سر ہلا کر گھوم گئی...... 'صبح تک میں جا چکی ہوں گی۔' اس نے سوچا۔

☆☆☆

وان ویلڈن پھر تکلیف میں تھا۔ چہرہ زرد اور ہونٹوں پر نیلاہٹ تھی۔ دنیا میں اس کے لیے زیادہ گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ چند ماہ، سائمن ٹروٹ نے سوچا، پھر سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ اگرچہ تازہ خبر کے بعد امکانات پیدا ہو چکے تھے کہ وان ویلڈن، سائمن کا نام بطور جانشین حذف کر دے۔

"یہ کیسے ہوا؟" وان ویلڈن نے کھانستے ہوئے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ سب کچھ انڈر کنٹرول ہے؟"

"عین وقت پر تیسری پارٹی سامنے آ گئی اور ہم نہ صرف ناکام ہو گئے بلکہ ہم نے اپنا ایک آدمی بھی کھو دیا۔"

"تم نے ٹاوسٹوک کیلی کا ذکر کیا تھا...... کیا ہوا؟"

"ان کی وجہ سے محض توجہ بٹ گئی تھی۔ میں ان کی طرف سے متفکر نہیں ہوں۔" سائمن نے کہا۔

"پھر پریشانی کس کی جانب سے ہے؟"

سائمن نے جواب دینے سے پہلے وقفہ لیا۔ "انٹرپول۔" بالآخر وہ بولا۔ "یوں لگتا ہے کہ اس نے انٹرپول کو متوجہ کر لیا ہے۔"

ردِعمل کے طور پر وان ویلڈن پر کھانسی کے دورے نے حملہ کیا۔ سانس بحال ہونے پر اس نے بددلی سے سائمن پر نظر ڈالی۔ "تم نے بربادی کا در کھول دیا ہے...... ذمّے داری نااہل افراد کو دی...... پولیس بھی کام نہ آسکی۔ ایک آدمی مارا گیا۔ کیسے؟ اُدھر وہ چڑیا روز بروز چالاک تر ہوتی جا رہی ہے۔"

"ہمیں بکنگھم شائر میں سراغ ملا تھا۔ وہاں ہمارا ایک مخبر......"

وان ویلڈن نے غرانے کی کوشش کی۔ "مخبر ایک بوجھ ہے۔ اسے اتار پھینکو...... ختم کر دو، میں مزید کوئی غلطی یا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔"

سائمن نے سر ہلایا۔ اس نے خطرہ محسوس کیا، کسی وقت خود اسی کے خاتمے کا حکم جاری نہ ہو جائے۔

☆☆☆

رچرڈ وولف، چیسٹ ونڈ کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا، تاریکی کا پردہ گر گیا تھا۔ سنگی پلرز کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے سڑک پر تھی۔ اس کی حسیات بتا رہی تھیں کہ جھاڑیوں میں نگرانی ہو رہی ہے۔ اگرچہ اسے پوری طرح کیلی راکس کی کہانی پر یقین نہیں آیا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کی جان کو شدید خطرات لاحق تھے۔ کیلی کے خوف نے رچرڈ کی تمام حسیات کو بیدار کر دیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ بیرل چند روز کے لیے لندن گئی ہوئی تھی۔ وہ کال کر کے کہہ سکتا تھا کہ وہ وزٹ کا دورانیہ بڑھا دے۔

ڈرائیو وے میں ایک کار کھڑی تھی۔ رچرڈ صاب (Saab) کو شناخت نہ کر سکا۔ وہ احتیاط سے باہر آیا۔ صاب کے گرد گھوم کر سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ گاڑی والے کو پہچاننا مشکل تھا۔ فرنٹ ڈور پر ڈیوس نے اس کا استقبال کیا اور برساتی اتاری۔ "مسٹر وولف، کوئی ملاقاتی منتظر ہے۔"

"میں نے دیکھا ہے، کون ہے؟"

"کوئی مسٹر آرچی بالڈ میک لوئڈ۔ وہ لائبریری میں ہیں اور ڈرائیور گاڑی میں۔"

"مقصد؟"

"پولیس بزنس شاید۔"

رچرڈ لائبریری میں چلا گیا۔ وہ براؤن ہیئر، درمیانی قد اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ کسی کتاب کا جائزہ لے رہا تھا۔

"مسٹر میک لوئڈ؟"

"یس، مسٹر رچرڈ۔ کچھ دیر قبل میری تمہارے ایک پرانے ساتھی کلاڈ، فرنچ انٹیلی جنس سے بات ہوئی تھی۔ کچھ سوالات ہیں۔ کلاڈ نے یقین دہانی کرائی ہے کہ میں تم پر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

پورا بھروسا کرسکتا ہوں۔‘‘ اس نے کتاب واپس رکھ دی۔ ’’میرا تعلق انٹرپول سے ہے۔‘‘

’’مجھے خدشہ ہے کہ میں اندھیرے میں ہوں۔‘‘ رچرڈ نے کہا۔

’’ہمیں یقین ہے کہ تم اور مسٹر جورڈن اتفاقیہ ایک پیچیدہ مسئلے میں اُلجھ گئے ہو۔ مجھے فکر ہے کہ کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ اسی لیے میں یہاں ہوں...... تمہارا تعاون درکار ہے۔‘‘

’’کس سلسلے میں؟‘‘ رچرڈ چہرے کو سپاٹ رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔

’’کیلی رائس؟‘‘ میک لوئڈ نے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔

رچرڈ خاموش رہا۔

’’مجھے یقین ہے کہ تم اس نام سے واقف ہو۔ کیونکہ تم نے اس کے فنگر پرنٹس کی آئی ڈی چیک کرائی تھی...... تمہاری درخواست امریکن اتھارٹی نے کرمنل ریکارڈ میں بھجوائی تھی۔ وہیں سے ہمیں معلوم ہوا ہے۔‘‘

رچرڈ نے اندازہ لگایا کہ اسے احتیاط کرنی چاہیے...... رچرڈ فائر پلیس کے قریب بیٹھ گیا۔ ’’اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاؤں میں حقائق سننا پسند کروں گا۔‘‘

’’مطلب، کیلی رائس کے بارے میں؟‘‘

’’نہیں۔ وکٹر وان ویلڈن کے بارے میں۔‘‘

’’بدلے میں تم کیلی رائس کا پتا بتاؤ گے؟‘‘

’’تم اُس کے پیچھے کیوں ہو؟‘‘

’’ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب آگے بڑھا جائے۔‘‘

’’گرفتار کرنا ہے؟‘‘

’’بالکل نہیں...... ہم اسے کافی استعمال کر چکے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اسے حفاظتی تحویل میں لے لیا جائے...... ہم پہلے ہی دو مرتبہ اسے بچا چکے ہیں۔‘‘

☆☆☆

آدھی رات بیت گئی تھی۔ ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد کیلی حرکت میں آئی۔ جورڈن ایک جنٹلمین تھا، ان دونوں کا کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ بہ آسانی باہر نکل گئی۔ سڑک پر آنے کے لیے وہ حکمت عملی بنا رہی تھی۔ جیکٹ اس نے مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ دفعتاً وہ برف کے مانند جم کے رہ گئی۔ وہ کسی آدمی کا سایہ تھا۔ عین اس کے سامنے، کچھ فاصلے پر......

’’تم مجھے بتا کر بھی نکل سکتی تھیں۔‘‘ جورڈن نے کہا۔

اس کی آواز نے کیلی کو پُرسکون کر دیا۔ ’’ہاں، میں ایسا کرسکتی تھی۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’پھر یہ کہ تم مجھے روک لیتے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’تنہائی کے بجائے تم میرے ساتھ زیادہ محفوظ ہو...... کب تک اکیلی بھاگتی رہو گی...... ایک دن وہ تمہیں ختم کر دے گا۔‘‘

وہ چل پڑی۔ ’’مجھے جانے دو۔‘‘

’’کیا واقعی خنجر کی حقیقت ہے اور تم اس کے پیچھے تھیں؟‘‘

’’ہاں۔ وہ مل جاتا تو میں وان ویلڈن کا فراڈ ثابت کرسکتی تھی۔‘‘ وہ پھر چل دی۔

’’تم بھاگ نہیں سکتیں۔ بحری جہاز پر جو کچھ ہوا، تم اس کی واحد گواہ ہو۔ تم وان ویلڈن کو کورٹ میں گھسیٹ سکتی ہو۔‘‘

’’اگر وہ پہلے مجھ تک پہنچ گیا؟‘‘

’’نہیں، وہ سو دِکیل کرسکتا ہے۔ سیکڑوں پولیس والے اس کی جیب میں ہیں۔ درجنوں جہاز اس کی ملکیت میں ہیں...... چودہ ہوٹل اور موناکو میں تین کیسینو......‘‘

’’میں تمہارے لیے امداد مہیا کروں گا۔‘‘

’’تمہارے پاس اچھا مینشن اور ایک بااثر بہنوئی ہے۔ یہ کافی نہیں ہے۔‘‘

’’میرے انکل نے M16 کے لیے کام کیا ہے۔‘‘

کیلی نے نفی میں سر ہلایا۔

جورڈن نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ’’تم ان آٹھ بے گناہ مقتولین کو بھول گئیں۔‘‘

’’تم سمجھتے ہو یہ آسان ہے۔‘‘ وہ آبدیدہ ہو گئی......

’’مجھے سونے کے لیے کاوش کرنی پڑتی ہے۔ لائف بوٹ پر مرتا ہوا غریب گیانی میری آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ گن فائر کی آواز مجھے سوتے سے اٹھا دیتی ہے اور کوسیما کے آدمی کی آواز جو قتل کا حکم جاری کرتا ہے۔‘‘ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

معاً دور سے کار کی روشنی نظر آئی۔ جورڈن نے کیلی کو باڑھ میں دھکا دیا اور بروقت خود بھی جست لگائی۔ چند سیکنڈ میں وہ دوسری طرف گھاس کے بستر پر پڑے تھے۔ جورڈن نے اسے آڑ میں رکھتے ہوئے جھاڑیوں کے سوراخ سے جھانکا۔ کچھ دیر بعد کار سامنے سے گزری۔ اس کا رخ گیسٹ ہاؤس کی طرف تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''کیا وہ چلے گئے؟'' کیلی نے سرگوشی کی۔
''نہیں، یہ ڈیڈ اینڈ ہے۔ وہ گیسٹ ہاؤس سے آگے نہیں جاسکتے۔''
''پھر وہ کیا کررہے ہیں؟''
''نگرانی، انتظار...... کسی کی تلاش۔''
'ہماری تلاش......' کیلی نے سوچا۔
کوئی آواز نہیں تھی۔ کار کے دروازے بھی نہیں کھلے تھے۔ کیلی پر دہشت طاری تھی۔ وہ فرار کے لیے تیار تھی۔ روڈ وہ استعمال نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے میدان کو کراس کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی وہ پوری طرح اٹھی نہیں تھی کہ جورڈن نے کلائی پکڑ کر اسے زمین بوس رہنے پر مجبور کیا۔
''پاگل ہوگئی ہو۔'' وہ بولا۔ ''یہاں باڑھ کی اونچائی کم ہے، کھڑی ہوئیں تو نظروں میں آجاؤ گی۔ اس طرف کھسکو جہاں باڑھ اونچی ہے...... وہاں زاویہ بھی بدل جائے گا۔ ہم اٹھ کر دوڑے تو کار والے دیکھ نہیں سکیں گے۔''
خوف زدہ ذہن نے جورڈن کی بات کا مطلب سمجھ لیا۔ محفوظ مقام پر پہنچ کر وہ اٹھے اور بھاگ پڑے۔ زمین نرم تھی۔ گھاس اور کیچڑ کے باعث قدموں کی آواز بھی ناپید تھی۔ کہیں کہیں علاقہ زیادہ نرم اور دلدل جیسا تھا جہاں قدم دھنس جاتے...... نہ صرف سانس پھول جاتی بلکہ ایسی جگہ پر بھاگنا بھی دشوار تھا۔ تاہم جورڈن سہارا بنا ہوا تھا۔ ورنہ کیلی کو اتنی خبر بھی نہیں تھی کہ وہ کس طرف جارہی ہے۔ ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ زیادہ سے زیادہ دور نکل جائے۔
''ہمارے پیچھے کوئی نہیں آرہا۔'' جورڈن نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ خود بھی ہانپ رہا تھا۔ ٹھنڈ تھی، بادل بھی پر تول رہے تھے۔ خوف اور سردی نے کیلی کو کپکپانے پر مجبور کردیا۔
''آگے ایک جگہ ہے، خشک اور گرم...... محفوظ بھی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔'' جورڈن نے کہا۔ ''اگرچہ فاصلہ ہے۔ ہمیں خاصا چلنا پڑے گا۔ کیلی کے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔ جورڈن نے اس کی کلائی پکڑی اور ایک سمت روانہ ہوگیا۔ ''میدان سے نکل کر ہم سڑک کے ساتھ فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔ اگر تعاقب ہوا تو وہ میدان تک محدود رہے گا جہاں وہ ہمارے قدموں کے نشانات دیکھ سکتے ہیں۔''
بادلوں نے منہ کھول دیا۔

☆☆☆

تین چار میل کا سفر تھا۔ ٹھنڈ کے باعث کیلی کی حالت خاصی ابتر ہوگئی تھی۔ تاہم وہ منزل تک پہنچ گئے۔ وہ ایک پرانا کاٹیج تھا۔ جورڈن نے پتھر برسا کر کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اندر گھس کر سامنے کا دروازہ کھولا۔ کیلی اندر چلی گئی۔ بدن کی لرزش تشویشناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ جورڈن اسے جس کمرے میں لایا، وہ برائے نام سرد تھا۔ اس نے کھڑکیوں کے شٹر بند کیے۔ کیلی کا جیسے دماغ بھی لرز رہا تھا۔ کمرے میں آنے کے بعد بھی اس کے دانت بج رہے تھے۔ اس نے اپنے گیلے کپڑے فوراً اتارنے تھے۔ لیکن اس کے اعضا سن ہوگئے تھے۔ جورڈن نے لیمپ جلایا۔
''اُف خدایا۔'' اس نے کیلی کے چہرے کو چھوکر دیکھا۔ ''تم برف کی ڈلی بن گئی ہو۔''
''آگ...... گ......'' کیلی نے سرسراتی آواز میں کہا۔
''لیمپ سے کام نہیں چلے گا۔ تمہیں فوری تپش کی ضرورت ہے۔'' وہ اسے کھینچتا ہوا ہال میں اور وہاں سے باتھ روم میں لایا۔ گرم پانی کا شاور کھول کر اس نے کیلی کی جیکٹ اتاری۔ ''بس ایک منٹ کی بات ہے۔ الیکٹرک کوائل ہیٹر زیادہ وقت نہیں لے گا۔'' اس نے اسکرٹ بھی اتار دیا۔ ہاتھ سے پانی چیک کیا اور کیلی کو شاور کے نیچے دھکیل دیا۔ گرم پانی گویا برفانی بت پر گررہا تھا۔ باوجود اس کے، کیلی کو لگ رہا تھا کہ اسے نارمل ہونے میں مدت لگے گی۔ بالآخر گرم پانی نے برفیلے بت میں کریک ڈالنے شروع کیے۔ اس کی حسیات واپس آنے لگیں۔ خون گویا جم گیا تھا۔ گردش کرنے لگا۔
''کیلی؟'' پردے کی دوسری جانب سے جورڈن کی آواز آئی۔
وہ اتنی مگن تھی کہ کچھ نہ سن سکی۔
''تم ٹھیک ہو؟''
اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی، پردہ ہٹ گیا۔ جورڈن اسے اور وہ جورڈن کو تک رہی تھی۔ پانی گرنے کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ کیلی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار کو چھوا۔ کیلی کے بھیگے بدن پر برائے نام لباس تھا...... کائنات پھر سمٹنے لگی۔ خواب کے عالم میں بیڈ تک گئے۔ بےخودی و مدہوشی نے حصار میں لے لیا۔ راز، راز نہ رہا اور حائل اسرار نہاں، ایک دوسرے کی تلاش میں نکلے اور کھو گئے۔ اندیشہ و اعتدال سب ساتھ بہہ گئے۔

☆☆☆

''یہ لڑکی کتنی زندگیاں نگل کر آئی ہے۔'' ڈکٹر وان ویلڈن نے کڑواہٹ سے کہا اور کھانسنے لگا۔ اس کے

پھیپھڑوں کی کارکردگی مایوس کن حد تک محدود ہو چکی تھی۔
''بہت جلد۔'' سائمن نے سوچا۔ ''وکٹر مر جائے گا اس وقت تک اسے وکٹر کی گڈبکس میں شامل رہنا چاہیے پھر کمپنی پر اس کی حکومت ہوگی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کیلی رانکس کا مسئلہ حل کرے۔
''تم اُسے خود دیکھو۔ اس سے پہلے کہ ہم......'' وہ پھر کھانسنے لگا۔
''ہم جانتے ہیں کہ وہ جورڈن کے ساتھ ہے۔ ہم جلد اس تک پہنچ جائیں گے۔''
''تم ہر ذمے داری اپنے ہاتھ میں لو۔''
سائمن نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک بار پھر گائے ڈیلینسی کے یارڈ میں موجود تھے۔ وہ گھر کی روشنیاں بند ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ وائٹ مور کی روٹین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ نو بجے دروازے، کھڑکیاں چیک کر کے وہ چائے کے لیے کچن میں گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سیڑھیاں طے کر کے سرونٹ ونگ کی طرف چلا گیا۔ گھر کے اندر تاریکی چھا گئی۔
''تیس منٹ اسے دینے چاہئیں۔'' جورڈن نے کہا۔
آدھ گھنٹے بعد وہ ایک بار پھر سابقہ جائے واردات پر دھاوا بولنے کے لیے تیار تھے۔ ''کس رخ سے جانا چاہیے؟''
کیلی نے گزشتہ واردات کو ذہن میں دہرایا۔ ''نئے راستے سے جائیں گے۔'' وہ بولی۔ ''دوسری منزل کی بالکونی سے ماسٹر بیڈروم میں۔''
''کیلی اگر کچھ غلط ہوا تو وعدہ کرو کہ تم میرا انتظار کیے بغیر فرار ہو جاؤ گی۔ پیچھے مڑ کر بھی مت دیکھنا۔''
''کچھ نہیں ہوگا۔''
''ہر مرتبہ خوش قسمتی ساتھ نہیں دیتی۔ ایک چیز ہوتی ہے بیڈلک۔'' جورڈن نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ الگ ہوئے تو ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
کیلی کو یوں محسوس ہوا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے...... ایسا ہوا تو کیا وہ اسے بھول پائے گی...... کیا وہ اسے یاد کرے گا...... میری طرح اسے مس کرے گا۔ بالآخر وہ ٹارگٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سائے میں رہتے ہوئے وہ نرم گھاس میں آگے بڑھے اور قطعہ پار کر گئے۔ دیوار کے ساتھ رک کر انہوں نے سن گن لی۔ ہوا اور پتوں کی سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔
''میں پہلے جاؤں گا۔'' جورڈن نے کہا۔ کیلی کو موقع دیے بغیر اس نے بل کھائی مضبوط بیل پر چڑھنا شروع کیا۔ شاخوں کی آواز نے کیلی کو بے چین کر دیا۔ قسمت اب بھی ساتھ تھی۔ وائٹ مور خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ جورڈن بلا کسی رکاوٹ کے بالکونی میں پہنچ گیا۔ ذرا دیر بعد کیلی بھی اس کے ہمراہ تھی۔
''لاکڈ۔'' جورڈن نے ڈورناب پر ہاتھ رکھا۔
''توقع تھی۔'' کیلی نے سرگوشی کی۔ ''ذرا ہٹو۔''
کیلی نے مخصوص لاک اوپنر نکالا اور احتیاط سے کارروائی شروع کی۔ ''زنگ ہوا تو یہ چابی سے ہی کھلے گا۔'' وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔
''ڈن۔'' اس نے جورڈن کی طرف دیکھا۔ دونوں آہستگی سے اندر داخل ہو گئے۔ کمرا ویسا ہی تھا، جیسا کیلی نے پہلی بار دیکھا تھا۔ گزشتہ مرتبہ وہ ڈیسک اور ڈریسر دیکھ چکی تھی۔
''تم وارڈروب کی تلاشی لو۔ میں نائٹ اسٹینڈ دیکھتی ہوں۔'' وہ پین لائٹ کی مدد سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دوسرے نائٹ اسٹینڈ کو کھنگال رہی تھی اور پوشیدہ دراذوں کی جستجو میں اتنی مگن تھی کہ ہال وے کے چوبی فلور کی خفیف سی آواز نہ سن سکی۔ واحد تنبیہ جورڈن کی جانب سے تھی۔ قدم سسکی نما آواز اور اس کے بعد کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ بتیاں روشن ہو گئیں۔ کیلی کو ردعمل کا موقع ہی نہیں ملا۔ شاٹ گن بیرل اس کے سر سے آن لگی تھی۔ وہ نائٹ اسٹینڈ کی طرف سے مایوس ہو کر بیڈ پر آ گئی تھی۔

☆☆☆

گن عمر رسیدہ وائٹ مور کی غیر متوازن گرفت میں خوفناک ہتھیار کے مانند تھی۔ ''ایک مردہ شخص کے گھر میں برگلری کا خیال...... بہت بُری بات ہے۔ تم نے سوچا ہوگا کہ بہ آسانی نکل جاؤ گے۔ احمق بوڑھا کیا کر لے گا۔''
''بظاہر تم احمق نہیں دکھائی دیتے۔'' کیلی نے کہا۔
اس نے جورڈن کی طرف دیکھنے کی حماقت نہیں کی تھی جو ہاتھ پیروں کے بل وارڈروب کے قریب موجود تھا۔ بوڑھے بٹلر کو ابھی تک ادراک نہیں تھا کہ کمرے میں ایک نہیں دو چور موجود ہیں۔
''چلو اب اٹھ جاؤ۔'' وائٹ مور نے حکم جاری کیا۔
کیلی دھیرے سے قدموں پر کھڑی ہوئی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ گن پر وائٹ مور کی لرزاں گرفت کے مانند لبلبی پر انگلی بھی نہ لرز اٹھے۔ جیسے ہی وہ پورے قد سے ایستادہ ہوئی۔ وائٹ مور کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''تم صرف ایک عورت ہو۔'' وہ حیرت سے بولا۔
''ہاں، صرف ایک عورت...... کتنے شرم کی بات ہے، تم شاٹ گن تانے کھڑے ہو۔''
آواز سن کر وائٹ مور کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے کیلی کے گریس لگے سیاہ چہرے کو دیکھا۔ ''میں نے تمہاری آواز سنی ہے۔ کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟''
کیلی نے انکار میں سر ہلایا۔
''تم ماسٹر گائے کے ساتھ آئی تھیں۔'' گن پر اس کی گرفت سخت ہوگئی۔ ''بیڈ سے دور ہٹو...... نیچے اترو۔''
''تم مجھ پر گولی چلاؤ گے؟''
''ہم پولیس کا انتظار کریں گے...... وہ پہنچنے والی ہے۔''
پولیس...... کاؤنٹ ڈاؤن...... کسی بھی طرح بڑے میاں سے شاٹ گن ہتھیانی پڑے گی۔ بیڈ سے پرے ہٹتے وقت اس کی نظر جورڈن پر پڑی، وہ اشارہ کر رہا تھا کہ بٹلر کی توجہ بائیں جانب رکھے۔
''کم آن...... بیڈ کے پیچھے سے ہٹو۔'' وائٹ مور نے پھر کہا۔ ''تاکہ ضرورت پڑنے پر میں ٹھیک نشانہ لے سکوں۔''
کیلی میٹرس سے اترتے وقت بائیں طرف گئی۔ وائٹ مور نے بھی رخ بدلا۔ اس کی پشت مکمل طور پر جورڈن کی طرف ہوگئی۔
''میں چور نہیں ہوں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔''
''چور یہی کہتا ہے...... یعنی تم نے چور ہونے کی تصدیق کردی ہے۔''
کیلی اسے باتوں میں لگا رہی تھی اور عقب سے جورڈن گائے کا شارٹس ہاتھ میں لیے بٹلر کے سر پر آگیا تھا۔ حملہ کرنے کی صورت میں بڑے میاں کی جان جانے کا خطرہ تھا۔ جورڈن نے پھرتی سے شارٹس کا ایک حصہ ہُڈ کی طرح بٹلر کے سر پر ڈال دیا۔ عین اسی وقت کیلی نے گن بیرل کا رخ چھت کی طرف کردیا۔ وہ گھبرا کر فائر کرسکتا تھا۔ وہ بُری طرح بوکھلا گیا تھا۔ کیلی دائیں طرف ہٹ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اسی وقت دھماکا ہوا۔ یہ اندھا فائر تھا۔ وزنی گائے کے شارٹس کا ایک حصہ بہ آسانی بٹلر کے چھوٹے سے سر پر چڑھا کر جورڈن نے لپیٹ دیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے وائٹ مور کا بازو مروڑا اور شاٹ گن نیچے گرگئی۔ غیر متوقع یلغار بٹلر کے سان وگمان میں نہیں تھی۔
کیلی اچھل کر کھڑی ہوگئی اور جورڈن کی مدد سے اسے وارڈروب میں ٹھونس دیا۔
''پلیز، مجھے چھوڑ دو۔'' بٹلر کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کیلی نے پھرتی کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں ٹائیوں سے جکڑ دیے۔
''ہوسکتا ہے ہم تمہیں زندہ چھوڑ دیں۔ میں نے ٹھیک کہا تھا۔ میں چور نہیں قاتل ہوں۔'' وہ بولی۔
''کک...... کیا مطلب؟'' اس نے خوف زدہ انداز میں سوال کیا۔
''اگر تم بتا دو کہ گائے نوادرات میں شامل قدیم ہتھیار کہاں رکھتا تھا...... تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔'' کیلی نے نوادرات کی وضاحت کی۔
''وقت کم ہے۔'' جورڈن نے سرگوشی کی جسے کیلی نے نظرانداز کردیا اور اپنا سوال دہرایا۔ بٹلر کی گویا جان پر بنی تھی۔
''بیڈ کے نیچے۔'' اس نے جواب دیا۔
کیلی بلاتوقف بیڈ کے نیچے گھس گئی۔ وہاں قالین کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ غور کرنے پر اسے قالین کے درمیان ایک لکیر نظر آئی۔ جلدی ہی اس نے وہاں سے قالین کو اطراف میں ہٹا کر خفیہ دراز دریافت کرلی...... دور سے سائرن کی آواز ابھری۔
''کیلی، نکلو......''
''ایک منٹ۔'' دراز کے نوادرات دیکھ کر اس کا منہ کھل گیا۔ تاہم اس نے آئی آف کشمیر پر اکتفا کیا۔ وہاں ایک چھے چھ خنجر رکھے تھے لیکن وہ اصل کی شناخت سے واقف تھی...... جس کے دستے کے سر پر یاقوت جڑا تھا۔
''بھاگو۔'' جورڈن نے وارننگ دی۔ سائرن کی آواز قریب آگئی تھی۔ کیلی نے خنجر لیا اور دونوں بالکونی کی طرف بھاگے۔

☆☆☆

''لارین مین پب'' میں سائمن ٹروٹ بار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کا موڈ بہتر نہیں تھا اور یہ خطرے کی علامت تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ نصف شب کا وقت تھا۔ پب کا مالک رخصت ہونے کے لیے بے چین تھا۔
ایک جوان پولیس مین اندر داخل ہوا۔ اطراف میں نظر دوڑا کر وہ بار کے قریب آگیا۔ ''دلچسپ خبر ہے، آج کے لیے۔'' اس نے بارٹینڈر کو مخاطب کیا۔
''کیسی خبر؟''
''گائے کی ناگہانی موت یاد ہے، اس کے گھر میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پھر چوری کی واردات ہوئی ہے۔“
”کیا ہو رہا ہے یہاں...... وہاں ایسا کیا رکھا ہے؟“
”پتا نہیں......“ کچھ دیر بات کر کے وہ پب سے نکل گیا۔
سائمن نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ ذرا دیر میں اس نے پولیس مین کو جالیا۔
”ہاں، کوئی چوری ہوئی ہے وہاں پر۔“ اس نے پولیس مین سے پوچھا۔ جو بار میں بظاہر بارٹینڈر سے بات کر رہا تھا لیکن مقصد سائمن کو پیغام ارسال کرنا تھا۔
”بٹلر کے بیان کے مطابق ایک نوادر چوری ہوا ہے۔“
سائمن کی آنکھیں چمکیں اور تجسس میں اضافہ ہو گیا۔
”کوئی خنجر؟“
”ہاں، عجیب بات ہے کہ ذخیرے کی کسی اور چیز کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔“
”چور کون تھا؟“
”تھے...... وہ دو تھے لیکن بٹلر صرف ایک کو دیکھ سکا اور وہ کوئی لڑکی تھی۔“
”دیکھنے میں کیسی تھی؟“
”پتا نہیں...... چہرے پر سیاہ گریس لگائی ہوئی تھی۔“
”آخری بار کہاں دیکھے گئے؟“ سائمن نے سوال کیا۔
”فرار ہو گئے...... کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔“
بہت ممکن ہے کہ کیلی رائس اب بھی بکنگھم شائر میں موجود ہو۔ سائمن نے سوچا۔
”کوئی خبر ملی تو مطلع کروں گا۔“ پولیس مین نے کہا۔
سائمن نے جیکٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا جس میں پانچ پانچ پاؤنڈز کے نوٹ جھلک رہے تھے، پولیس مین نے لفافہ وصول کیا پھر دونوں جدا ہو گئے۔ بعدازاں اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر سائمن نے فی الفور اپنی کارکردگی کی رپورٹ وان ویلڈن تک پہنچائی۔
”چند گھنٹے قبل وہ دونوں اسی علاقے میں تھے اور گائے کے گھر میں جا گھسے تھے۔“ اس نے وان ویلڈن کو اطلاع فراہم کی۔
”کیا وہ خنجر لے گئے؟“
”ہاں، للہٰذا اب ان کے یہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ان کی اگلی منزل لندن ہونی چاہیے......“
سائمن کے خیال میں وہ لندن پہنچنے کے لیے ذیلی سڑکوں کا انتخاب کرے گی۔ وہ فتح مندی کے جذبے سے لبریز سرشار ہو گی...... امید اور کامیابی، دونوں ہی اس کے ذہن میں سر اٹھائے ہوں گے...... اس کا سبب خنجر تھا جسے وہ آئی آف کشمیر کہتی تھی۔
کتنا غلط سوچ رہی تھی وہ......

☆☆☆

وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ متعاقبین کے خیال میں وہ اس مرتبہ اسٹیشن کا رخ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ انہوں نے الٹی چال چلی اور ٹرین کے ذریعے لندن پہنچ گئے۔ وہ صبح چھ بجے ہوٹل پہنچے تھے اور بستر پر گر کے غافل ہو گئے۔ وہ بہت دیر تک سوتے رہے۔ پہلے کیلی کی آنکھ کھلی، جورڈن کا چہرہ اس کی طرف تھا۔ اس کا بالائی بدن عریاں تھا۔ کیلی مسکراتے ہوئے دھیرے دھیرے اس کے بالوں کو سہلاتی رہی۔
مائی ڈارلنگ جنٹلمین، اُسے خیال آیا...... میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ تم سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن آئے جب تم اپنے معیار کی اور ہم پلہ لڑکی سے بیاہ کرو گے۔ تم اور تمہارے گھر والے سب شاداں ہوں گے...... ایک شاندار اور ہموار زندگی تمہاری منتظر ہو گی۔ اس وقت تم کیلی رائس کو یاد رکھو گے؟
وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دفعتاً ڈپریشن کا حملہ ہوا۔ وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ باہر آئی تو اس کے بال کوئی چھٹی بار رنگ بدل چکے تھے۔ اس نے خوابیدہ جورڈن کو دیکھا۔ ذہانت، صلاحیت، حسن، خود انحصاری، کیلی کے پاس سب کچھ تھا لیکن اس کا مجرمانہ ماضی اور خاندانی پس منظر۔ دونوں چیزیں جورڈن کی فیملی کے برعکس تھیں۔ وہ ان کی دنیا میں کیسے فٹ ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں اس کمرے میں، اس کانیج کے مانند وہ عارضی طور پر اپنی دنیا بسا سکتے تھے...... وہ بیڈ پر جورڈن کے قریب لیٹ گئی۔ ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھا۔ اس نے کسمسا کے آنکھیں کھول دیں۔ کروٹ بدلی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ کچھ نیند کا نشہ، کچھ قربت کا خمار...... کائنات سمٹنے لگی۔ عالم خود فراموشی۔ احساسِ سود و زیاں مٹتا چلا گیا۔ اگر کچھ تھا تو بس اِک بے خودی تھی۔

☆☆☆

”مس رائس آپ یہ بات ذہن میں رکھیں......“ ویگزال نے کہا۔ ”وان ویلڈن شپنگ ہمارے چند اہم اور معتبر کلائنٹس میں سے ایک ہیں۔ نیز ان کے ساتھ ہمارا تعلق

خاصا پرانا اور بے داغ ہے۔ یہ تعلق تین نسلوں پر محیط ہے۔ مسٹر وان ویلڈن کے لیے فراڈ کا لفظ...... ویل...... میں......'' اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''شاید تم نے مس رائس کی کہانی پر غور نہیں کیا۔ وہ غرقاب بحری جہاز پر موجود تھی اور واحد گواہ ہے۔ وہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ سبوتاژ کا واقعہ تھا۔'' جورڈن نے کہا۔

''اگر اسے حقیقت تسلیم کرلیا جائے، پھر بھی ہم کیونکر وان ویلڈن کو اس کا ذمے دار سمجھ سکتے ہیں۔ کسی تیسری پارٹی کا کام بھی ہوسکتا ہے......''

''کیا ملٹی ملین ڈالرز کلیم (Claim) کو فرم کوئی اہمیت نہیں دیتی؟''

''یقیناً...... اہمیت ہے۔''

''پھر بھاری نقصان کی اہمیت کے پیشِ نظر ذمے داران نے تفتیش بھی کی ہوگی؟''

''بالکل، لیکن......''

''پھر تو مس رائس کی کہانی کو سنجیدگی سے لینا چاہیے...... کیوں؟''

ویگزال نے گہری سانس لی۔''میں نے کولن ہیمر اسمتھ سے معاملے پر بات کی تھی۔ وہ انویسٹی گیشن برانچ کا انچارج ہے۔ اس نے چند ہفتے قبل افواہیں سنی تھیں۔'' ویگزال نے پہلو بدلا۔''اس کا مشورہ تھا کہ ''گواہ'' کی حیثیت کو اہمیت دو۔''

گواہ یا سورس، کیلی رائس کے ماضی کی طرف اشارہ تھا۔ جورڈن نے بمشکل اپنے اشتعال کو دبایا۔ وہ اشتعال کی وجہ سے آگاہ تھا۔ وہ بہت پہلے اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ کیلی نے ہیمر اسمتھ کا مشورہ سن کر کتنی اذیت محسوس کی ہو گی، یہ دیکھنے کے لیے جورڈن نے اس کا چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

''تم مس رائس کی اسٹوری کو چیلنج کر رہے ہو یا اس کی شخصیت کو؟'' جورڈن کے لہجے میں تلخی عود کر آئی۔

''نہیں...... میرا ایسا کوئی......''

''پھر کیا سوال ہے؟''

ویگزال نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔''مسٹر تاوستوک، سمندر میں قتلِ عام...... اپنے ہی جہاز کو تباہ کرنا...... یہ بہت شاکنگ ہے۔''

''شاکنگ یا ناقابلِ اعتبار۔''

''ہاں...... وہی...... مستزاد یہ کہ وان ویلڈن کا نام آجائے تو اسٹوری بہت کمزور ہوجاتی ہے۔''

''میں وہاں تھی، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔'' کیلی نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''ہیمر اسمتھ کے ڈپارٹمنٹ نے اپنا کام کیا ہے...... انہوں نے اسپینش پولیس سے بھی بات کی تھی۔ انہوں نے بھی اسے انجن پھٹنے کے باعث ایک حادثہ قرار دیا۔ نہ قتل کے شواہد اور کوئی لاش بھی دریافت نہیں ہوئی۔''

''ایسا امکان بھی نہیں تھا۔'' کیلی نے کہا۔''وان ویلڈن کے آدمی چالاک اور اثر و رسوخ کے حامل ہیں۔''

''غرقاب جہاز گہرائی میں بیٹھ گیا تھا۔ لہٰذا سبوتاژ کے شواہد حاصل کرنا ناممکن تھا۔''

کیلی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ موٹی ناک والے افسر کا منہ نوچ لے۔ وقت آگیا تھا کہ ترپ کا پتّا نکالا جائے۔ اس نے پرس کھول کر کپڑے میں لپٹا ہوا خنجر نکالا۔''میرے الفاظ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہے...... لیکن یہ تمہارا ذہن بدل دے گا۔''

ویگزال کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔''یہ کیا ہے؟''

''ثبوت۔'' کیلی نے کپڑے میں لپٹا خنجر باہر نکالا۔

بے اختیار ویگزال کا منہ کھل گیا۔ خنجر کے دستے پر جڑے جواہر طویل مدت کے باوجود جگمگا رہے تھے۔

''سترھویں صدی کا آئی آف کشمیر۔ تمہاری فائلوں میں اس کی تفصیل دیگر نوادرات کے ساتھ موجود ہوگی۔ یہ وان ویلڈن کے ذخیرے کا حصہ تھا۔ ذخیرہ تمہاری کمپنی میں انشورڈ تھا...... ایک ماہ قبل اسے نیپلز سے برسلز، میکس ہیولر کے ذریعے ٹرانسپورٹ کیا جا رہا تھا۔ اتفاقاً یہ غرقاب ہو گیا اور اتفاقاً یہ بھی تمہاری کمپنی میں انشورڈ تھا۔''

ویگزال کی نگاہ جورڈن پر گئی اور پلٹ کر واپس کیلی کی طرف آئی۔''میں سمجھا نہیں۔''

''یہ خنجر غرقاب جہاز کے ساتھ تہِ آب میں ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ کبھی جہاز پر تھا ہی نہیں۔ اسے کہیں اور محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا...... بعدازاں بلیک مارکیٹ میں اسے ایک انگریز نے خرید لیا۔''

''تمہیں کیسے ملا؟''

''مجھے چرانا پڑا۔''

چند لمحوں تک ویگزال کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیلی نے جواب میں کیا کہا...... پھر اس کا ہاتھ سلو موشن میں انٹرکام کی طرف گیا۔ وہ کسی مسٹر جیکب کو بلوا رہا تھا۔ ساتھ چند ہدایات بھی دیں۔ کیلی سمجھ گئی کہ وہ جواہر کو پرکھنے کا سامان بھی منگوا رہا ہے۔ اس نے آئی آف کشمیر کی فائل بھی منگوائی۔ بات کر

ہوئے وہ نشست سے ٹک گیا۔ چہرے کے تاثرات میں تفکر جھلک رہا تھا۔

جورڈن نے کیلی کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ کھیل بالآخر ختم ہورہا ہے۔ بھیانک خواب کے آسیبی سائے چھٹ رہے ہیں۔ اس نے کیلی کا ہاتھ تھام لیا اور مستقبل کے سہانے سپنے دیکھنے لگا۔ آفس میں سکوت طاری تھا۔ تینوں اذہان الگ الگ انداز میں سوچ رہے تھے۔

پہلے سیکریٹری فائل کے ساتھ داخل ہوئی۔ کچھ دیر بعد مسٹر جیکب نمودار ہوئے۔ جیکب کے تمام بال سفید تھے۔ اس کی چال ڈھال اور بشرے سے نفاست اور وقار نمایاں تھا۔ رسمی گفتگو اور تعارف کے بعد وہ آئی آف کشمیر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس کا ارتکاز اور محویت قابلِ قدر تھی۔ کافی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور وگیزال سے ''پالیسی'' کی درخواست کی...... کاغذات میں بغور اس نے خنجر کا جائزہ لیا اور دوبارہ توجہ خنجر کی طرف مبذول کی۔ اس مرتبہ اس کی توجہ کا مرکز دستے کے سر پر لگا یاقوت تھا۔ ''لاجواب'' وہ بڑبڑایا۔ ''کاریگری ہے۔''

''کیا اتھارٹی کو کال کرنے کا وقت نہیں ہے؟'' جورڈن نے وگیزال سے کہا۔

وگیزال نے سر ہلایا۔ ''وان ویلڈن خود بھی تردید نہیں کرسکتا۔''

جیکب نے سر اٹھایا۔ ''لیکن یہ آئی آف کشمیر نہیں ہے۔'' کمرے میں گویا بے آواز دھماکا ہوا۔ چھ آنکھیں جیکب کو گھور رہی تھیں۔

''کیا مطلب؟'' وگیزال نے سوال اٹھایا۔

''ری پروڈکشن۔ سنتھیٹک کورنڈم۔ لاجواب نقل۔'' جیکب نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ''ورنئیل فارمولا استعمال کیا گیا ہے۔''

کسی نے کیلی کے چہرے سے خون نچوڑ لیا۔

''تم غلطی تو نہیں کررہے؟'' جورڈن نے جیکب سے سوال کیا۔

''نہیں، مجھے پورا یقین ہے۔''

''میں دوسری رائے کا مطالبہ کروں گا۔'' جورڈن نے کہا۔

''کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں دوسرے ایکسپرٹ کو......''

''نہیں، ایکسپرٹ ہم خود ارینج کریں گے۔''

جیکب کے چہرے پر خفت کا عنصر ابھر کر غائب ہو گیا۔ اس نے کرسی چھوڑ دی۔ ''جہاں چاہو لے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''مسٹر جیکب!'' وگیزال نے آواز لگائی۔ ''مسئلہ حل ہونے تک ہمیں خنجر اپنی تحویل میں رکھنا چاہیے؟''

''کوئی جواز نہیں ہے۔ جانے دو۔ بہرحال وہ جعلی ہے۔''

☆☆☆

جعلی ہے...... جعلی ہے...... کاریگری ہے...... کیلی نے کپڑے میں لپٹا ہوا خنجر اتنی سختی سے پکڑا ہوا تھا کہ انگلیوں کے جوڑ سفید پڑ گئے تھے۔

جعلی ہے...... نقلی...... کیلی رائس اور اتنی بڑی غلطی۔ اس نے جواز تلاش کرنے کی کوشش کی تاہم ذہن نے کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ جسم سن ہوگیا تھا۔ وہ ایسی مشین کی طرح تھی جو آٹو پائلٹ پر چل رہی ہو۔ سب خاک ہوگیا تھا جبکہ وان ویلڈن اب بھی اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ سو مرتبہ نام بدل لے...... بالوں کے شیڈز سو مرتبہ بدل ڈالے...... لاحاصل تھا۔ وکٹر وان ویلڈن جیت گیا تھا۔

کیلی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ جورڈن اس کا ہاتھ پکڑے کہاں جارہا ہے۔ پھر وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ دونوں خاموش تھے۔ جورڈن نے ڈرائیور کو بروک اسٹریٹ کا پتا بتایا۔ ٹیکسی نے انہیں جس دکان پر چھوڑا، وہ ایک عام سی دکان تھی۔ گھڑیاں، کراکری، عام جیولری وغیرہ۔ کیلی سمجھ نہیں سکی۔ تاہم خاموش رہی۔ دونوں اندر چلے گئے۔ اندر جاکر جورڈن نے بتایا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے...... کس سے ملنا ہے...... مقصد کیا ہے...... عقبی کمرے سے درمیانی عمر کا ایک شخص برآمد ہوا جس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ اجنبی شکوہ کناں تھا۔ غالباً جورڈن وہاں طویل عرصے بعد آیا تھا۔ جورڈن نے کیلی کا تعارف کرایا۔ مختصر گفتگو کے بعد جورڈن نے مدعا بیان کیا...... کیلی نے کپڑا ہٹا کر خنجر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

جورڈن نے براہِ راست سوال کیا۔ ''یہ یاقوت قدرتی ہے یا انسانی ہاتھوں کی فنکاری؟''

اجنبی نے خنجر ہاتھ میں لیا۔ ''وقت لگے گا۔''

''ہم انتظار کریں گے۔'' جورڈن نے کہا۔

وہ آدمی عقبی کمرے میں غائب ہوگیا اور دروازہ بند کرلیا۔

''کیا ہم اس پر بھروسا کرسکتے ہیں؟'' کیلی نے

سوال کیا۔

”ایک سوایک فیصد۔“

کیلی کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ ”اگر یہ نقلی ہے۔“ وہ بولی۔ ”جورڈن، کیا پھر بھی تم مجھ پر اعتبار کرو گے؟“ شام کا وقت ہو چلا تھا۔ دکانوں پر کام کرنے والی خواتین گھروں کا رخ کر رہی تھیں، ایک آدمی اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

جورڈن نے فوراً جواب نہیں دیا۔ یہ معمولی وقفہ کیلی کا دل چیر گیا۔

”اتنا کچھ ہو چکا ہے، جس کے بعد مجھے اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

”شکوک؟“

”نہیں...... سوالات...... گائے مال دار تھا۔ اُسے نقلی خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔“

”شاید اُسے دھوکا دیا گیا ہو۔“ کیلی نے کہا۔

”نہیں، وہ شوقین تھا۔ وہ ایکسپرٹ ایڈوائس کے بغیر یہ ڈیل نہیں کر سکتا تھا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ جیکب نے بہ آسانی فرق کو تاڑ لیا تھا۔“

کیلی نے آہ بھری۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، وہ نقل کیوں خریدے گا۔ دفعتاً وہ پلٹی۔ ”نہیں، نہیں...... اس نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔“

”میں بھی سمجھ رہا ہوں...... پھر ہوا کیا؟“

کیلی نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ”گائے نے اصل آئٹم خریدا تھا۔ کسی نے اسے بدل دیا۔ جورڈن سوچو، تم ایک نادر پینٹنگ خرید کر گھر لاتے ہو اور کمرے کی دیوار پر ٹانگ دیتے ہو۔ خریدنے سے پہلے تم نہایت محتاط ہوتے ہو لیکن جب پینٹنگ تمہارے کمرے میں آجاتی ہے تو تم بے فکر ہو جاتے ہو۔ اب تمہیں تصدیق کی ضرورت نہیں ہے؟“

”قدرتی بات ہے...... سمجھ گیا۔“

”کیا سمجھے؟“

”کسی نے اصل آئی آف کشمیر کی جگہ اس کی نقل رکھ دی تھی۔ اسے احساس نہیں ہوا...... اس کی ملکیت میں پہلے ہی کافی نوادرات تھے۔“

”ٹھیک۔ نامعلوم چور کو نقل تیار کرنے کے لیے اصل آئٹم لازمی درکار تھا۔ اس کے بعد ہی وہ گائے کی لاعلمی میں نقلی خنجر تیار کروا کر اصل کی جگہ رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ گھر کے اندرون و بیرون سے گہری واقفیت رکھتا ہو...... ہمیں کتنی دشواری پیش آئی تھی...... اتفاقاً ہم وائٹ مور کے ذریعے آئی آف کشمیر تک پہنچ گئے۔ نامعلوم چور جانتا تھا کہ خنجر کہاں پوشیدہ ہے۔ صاف عیاں ہے کہ وہ جو بھی ہے، گائے سے بہت قریب رہا تھا۔“

”اور یہ نظریہ اس بات کی نفی کرتا ہے کہ اس منصوبے میں کوئی بیرونی ہاتھ ملوث تھا۔“ جورڈن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں کہنا نہیں چاہتا کہ یہ بٹلر کا کام تھا لیکن مشکوک افراد کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہے۔“

”گائے کی فیملی؟“

”ناقابلِ قیاس...... ان میں سے کوئی بھی گائے کے اریب قریب نہیں ہے۔“ جورڈن نے کہا۔

”اس کی کوئی محبوبہ؟“

”چند ہیں۔“ جواب دیتے وقت جورڈن نے سوالیہ نگاہ کیلی پر ڈالی۔

”میں نہیں ہوں۔“ کیلی چیخی۔ ”مجھے ہٹا کر دیکھو کہ گزشتہ ماہ وہ کس کے ساتھ عشق لڑا رہا تھا۔“

جورڈن کا بایاں ابرو پیشانی پر چڑھ گیا۔ ”ویرونیکا۔“ اس کی آواز میں سنسنی تھی۔ نظریاتی تجزیے میں طویل وقفہ در آیا۔

”جورڈن، تم دونوں دوست تھے۔“

جورڈن اُلجھ گیا۔ ”ہاں، لیکن میں نے اسے کبھی ایک احمق اور رنگین مزاج عورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ تاہم یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مشکوک افراد میں وہ ٹاپ پر ہے اور میں خود کو ایک احمق محسوس کر رہا ہوں۔ پہلی مرتبہ ہم دونوں اس کی خوابگاہ میں تھے۔ بٹلر...... وائٹ مور...... وہ نہ ہوتا تو ہم بغیر افراتفری کے نکل جاتے...... وائٹ، وہی تالے کی چابی ہے۔“ جورڈن بڑبڑایا۔ ”وہ اس رات گھر پر تھا جبکہ ویرونیکا نے مجھے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ اس کا آف ڈے ہے...... گھر خالی ملے گا۔ لیکن اس کے برعکس ہوا۔ میں اب تک اسے ویرونیکا کی لاعلمی سمجھ رہا تھا لیکن اگر یہ غلطی نہیں تھی؟ اگر وہ جانتی تھی کہ بٹلر گھر پر ملے گا؟“

”وجہ؟“

”وجہ...... تاکہ وہ پولیس کو اطلاع دے سکے۔“

”مقصد؟“ کیلی نے کہا۔

”اس دن چوری کا سرکاری ریکارڈ بنتا اور اگر گائے کو کبھی پتا چلتا کہ اصل آئی آف کشمیر کی جگہ اس کی نقل رکھی ہے...... تو لازمی وہ یہی سمجھتا کہ مذکورہ کارروائی اسی رات کی گئی تھی۔ مزید یہ کہ ویرونیکا اس رات تمہارے گھر پر پارٹی

میں شریک تھی۔ اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔"

"گائے بھی نہ سمجھتا کہ خنجر اس رات سے پہلے تبدیل کیا گیا تھا اور وہ بھی اسی کی محبوبہ کے ذریعے جس کا بیڈروم میں آنا جانا تھا۔" کیلی نے بات آگے بڑھائی۔

جورڈن نے مایوسی کے عالم میں ہونٹ چبائے۔

"میں اسے ایک بے وقوف عورت گردانتا رہا۔ جو اپنے عمر رسیدہ شوہر سے چھپ کر غیر مردوں کے ساتھ گلچھرے اُڑاتی پھر رہی تھی۔ احمق میں تھا، گاؤدی، چغد، کم عقل...... کیا تھا؟"

"ایک ہی بات ہے۔ گاؤدی، احمق یا کچھ اور۔" کیلی اس کی حالت پر ہنس پڑی۔ "لیکن ذرا یہ سوچو کہ ویرونیکا نے نقل بنوانے کے لیے اصل کیسے حاصل کیا۔ یہ ناممکن ہے کہ گائے نے چھ سات دن کے لیے اسے عاریتاً دے دیا ہو کہ جاؤ نقل بنوالاؤ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نقل کیسے اور کہاں سے آئی؟"

"تقریباً ہر شے کا کوئی نہ کوئی سابقہ مالک ہوتا ہے۔ جیسے ایک کار کئی بار فروخت ہوتی ہے۔" جورڈن نے کہا۔

جورڈن کی بات کا مطلب سمجھ کر کیلی کا حلق خشک ہو گیا۔ وان ویلڈن، سابقہ مالک وان ویلڈن کے علاوہ کون ہوسکتا ہے۔ وہ جورڈن کے قریب ہوگئی اور رخسار اس کی جیکٹ کے ساتھ ٹکا دیا۔ وہ ساکت کھڑا رہا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔

"کیلی۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "تم عقبی کمرے سے اس آدمی کو بلاؤ۔ معلوم کرو کہ باہر جانے کا پچھلا راستہ ہے یا نہیں، اس کا نام شٹر ہے۔"

"وہاٹ؟"

"باہر بس اسٹاپ پر ایک آدمی دکان کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس کے پاس سیاہ رنگ کی چھتری ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنی گھڑی دیکھتا ہے...... خطرہ آس پاس ہے۔ ہمیں نکلنا ہو گا۔" کیلی نے سرسری انداز میں جورڈن کی ہدایت پر عمل کیا۔

شٹر نے دروازہ کھولا۔ وہ یاقوت کے بارے میں بتانے ہی جا رہا تھا کہ کیلی نے جورڈن کا سوال دہرایا۔

"ایجنٹ؟" کیلی نے سوال کیا۔ اس اثنا میں جورڈن بھی آگیا۔

"ایک آدمی ہمارے پیچھے ہے۔" جورڈن نے بتایا۔

شٹر انہیں ورک شاپ سے نکال کر عقبی دروازے تک لایا۔

دروازہ گلی میں کھل رہا تھا۔

"خنجر کا کیا کروں؟"

"اصل ہے؟"

"نہیں۔"

"رکھ لو، لیکن کسی کو بتانا مت۔" جورڈن نے کہا۔

اچانک گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔

"گو۔" شٹر نے جورڈن کو دھکیلا۔ وہ دونوں ساؤتھ مولٹن اسٹریٹ کے کونے پر نکلے اور اس وقت تک دوڑتے رہے جب تک بانڈ اسٹریٹ انڈر گراؤنڈ تک نہیں پہنچ گئے۔ ٹرین میں کیلی سکتے کے عالم مہر بہ لب بیٹھی تھی۔ اس کا سرد ہاتھ جورڈن کے ہاتھ میں تھا۔

"شٹر کا کیا ہوگا؟"

"وہ سنبھال لے گا۔ شٹر وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے۔" جورڈن نے کہا۔

"وہ چھوڑے گا نہیں۔ وہ پسپا نہیں ہوگا۔" کیلی نے سرگوشی کی۔

"ہم ایک قدم آگے رہیں گے۔" جورڈن نے کہا۔

"نہیں۔ "ہم" نہیں۔ اُسے میری ضرورت ہے۔ وہ مجھے ختم کرنا چاہتا ہے۔" کیلی نے سر جھکا کر اپنے ہاتھ پر جورڈن کی گرفت دیکھی۔ گرفت تحفظ اور مضبوطی کا مظہر تھی۔ کسی بھی عورت کی اولین خواہش اور ضرورت۔ کتنی جلدی وہ جورڈن پر اعتبار کرنے لگی تھی، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ خطرات سے ڈر کر اپنی محبت سے دستبردار ہونے والوں میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کام اسی کو کرنا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے الفاظ چنے...... نہایت اذیت کے ساتھ۔

"میرے خیال میں......" الفاظ حلق میں اٹک گئے۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ جورڈن کی طرف نگاہ کرنے سے اس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا۔

"میرے خیال میں، مجھے خود پر انحصار کرنا چاہیے۔ اس طرح میں زیادہ تیزی سے حرکت کرسکوں گی۔"

"مطلب، میرے بغیر؟"

"ہاں۔"

"کہاں جاؤ گی؟"

"شاید جنوبی فرانس یا سسلی...... کہیں بھی......"

ٹرین اگلے اسٹاپ پر رکی۔ جورڈن نے اس کا ہاتھ پکڑا اور غصے میں نیچے اتر گیا۔ "کیا تم میرے بارے میں

سوچتی نہیں رہیں؟''

''ہاں۔'' وہ بولی۔

''میں چلا جاؤں گا تو تم خوش ہو جاؤ گی؟''

''نہیں۔''

''پھر کیا چاہتی ہو؟''

وہ بے اختیار اس کے سینے سے جا لگی۔ کیا کہوں تیری الفت کی قسم۔ دل و جاں پہ محیط تو ہی تو ہے۔

''کیا چاہتی ہو؟'' اس کی آواز بلند ہوگئی۔

''تمہیں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ رو پڑی۔

''ہم دونوں زندہ رہیں گے۔ میرا بھروسا کرو۔''

جورڈن نے بھیگی آنکھوں میں دیکھا۔ جلوے سے گزر رہے تھے، یہاں سے وہاں تک۔ مقامِ چشمِ تر ایسا بھی ہوتا ہے۔ اظہارِ غمِ عشق ہے لیکن مشکل ہے۔ اس نے کیلی کو گلے لگا لیا۔

☆☆☆

''جورڈن آئی آف کشمیر آخری امید تھی۔ اب کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔''

''ایک چانس باقی ہے۔'' جورڈن نے کہا۔

''کیسا چانس؟''

''ویرونیکا۔'' وہ مسکرایا۔ ''ہم اسی کی مدد لیں گے۔ وہ جواری ہے۔ بے تحاشا لٹاتی ہے..... قرضوں میں ڈوب گئی ہے۔ اگر وہ ویلڈن سے ملی ہوئی ہے تو اس کی کھال بچ سکتی ہے۔''

''جورڈن، تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں چاہتا ہوں۔ وان ویلڈن ہو یا اس کا باپ.....''

''ہم بچ بھی گئے تو تمہاری فیملی مجھے قبول نہیں کرے گی۔''

''میں اپنی فیملی کو زیادہ جانتا ہوں۔''

''اور مجھے؟''

''تمہیں بھی..... موقع ملتے ہی تم پھر پاگل ہونے کی کوشش کرو گی۔'' جورڈن نے اس کی ناک کو چھوا۔ ''اگر نہیں بھی جانتا تو اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے۔''

کیلی خاموش ہوگئی۔ ''لیکن ویرونیکا نے اصل خنجر کیونکر حاصل کیا۔ وہ وان ویلڈن کی ملکیت تھی کیا اس نے ویلڈن سے خریدا یا عارضی طور پر لیا؟''

''یا چوری کیا؟'' جورڈن بولا۔

''ناممکن، وان ویلڈن کو کراس کرنا ممکن نہیں۔''

''تم شروع سے وان ویلڈن کو بھوت سمجھتی چلی آرہی ہو۔''

''ایسا ہی ہے وہ، جناتی آکٹوپس۔''

''وان ویلڈن اور ویرونیکا کا لنک ہے اور ہمیں اسے ڈھونڈنا ہے..... وہ اور اولیور ویک ڈیز لندن کے ٹاؤن ہاؤس میں گزارتے ہیں۔ یعنی اس وقت وہ اسی گھر میں ہوں گے۔''

کیلی اس نئے موڑ پر پریشان تھی۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''یہی کہ تم کوئی وگ خرید لو۔'' جورڈن نے اس کے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔

☆☆☆

آرچی میک لوئڈ نے فون رکھ دیا۔ وہ رچرڈ وولف اور ہیوٹا وسٹوک کو دیکھ رہا تھا۔ ''وہ دونوں لندن میں ہیں۔ میرے آدمی نے لائیڈ کے افسر سے بات کی ہے۔ وہ وہاں گئے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے وہ وہاں سے نکل گئے تھے۔''

''اس کا مطلب وہ زندہ ہیں۔'' انکل ہیو نے کہا۔ وہ لوگ چیسٹ ونڈ کی لائبریری میں بیٹھے تھے۔ روم، کرائسس ہیڈ کوارٹر بن چکا تھا۔ رچرڈ اور ہیو کے لیے یہ آخری خبر خوش کن تھی۔ رچرڈ پر اپنے ہونے والے سالے کی صلاحیتوں کا اظہار ہوا تھا کہ خطرات میں کیسے زندہ رہا جاتا ہے۔ البتہ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ گیسٹ ہاؤس سے دونوں قبل از وقت کیسے نکل گئے تھے۔ کیلی نے بھی مخالفین کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

''کیلی رائس کے سر کی قیمت یورپ کے ہر ہٹ مین کی توجہ کھینچ لے گی۔'' رچرڈ نے کہا۔ وہ انکل ہیو کے چہرے پر تشویش دیکھ رہا تھا۔

میک لوئڈ نے اتفاق کرتے ہوئے لارڈ لیوٹ کی جانب دیکھا۔ ''آپ اپنے رابطے استعمال کریں، قبل اس کے کہ دیر ہو جائے۔''

''جورڈن بالواسطہ طور پر انٹیلی جنس سے سیکھا ہوا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ پلا بڑھا ہے۔ اسے ٹریک کرنا اتنا سہل نہیں۔ چاہے وان ویلڈن ہی کیوں نہ ہو۔'' انکل ہیو نے کہا۔

''آپ وان ویلڈن کو نہیں جانتے۔ اس موقع پر وہ

بھاری رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہے۔ پیسا دنیا کا بہترین محرک ہے۔''

''پیسا نہیں، خوف......'' رچرڈ نے کہا۔ ''خوف آدمی کو بچاتا ہے۔''

''ختم کرو یہ بحث۔'' انکل ہیو نے کہا۔ ''آخر ہم وان ویلڈن کے بارے میں اتنا کم کیوں جانتے ہیں؟ کیا اُسے چھونا ممکن نہیں؟''

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' میک لوئڈ نے کہا۔ ''وان ویلڈن ازحد مکار ہے۔ بین الاقوامی قوانین کا خیال رکھتا ہے۔ قانون شکنی میں نہایت احتیاط کا مظاہرہ کرتا ہے، کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا۔ وکلا کی رجمنٹ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ کب، کہاں ہوتا ہے، صرف اس کے قریبی رفقا کے علم میں ہوتا ہے۔''

''جرائم کی نوعیت؟''

''بین الاقوامی آرمز ڈیلنگ، ڈرگ ٹریڈ...... لیکن جب بھی ہمارے ہاتھ کوئی مضبوط شہادت آتی ہے، ہمارے ہاتھوں میں ہی بکھر جاتی ہے یا گواہ مارا جاتا ہے یا پھر دستاویز غائب ہو جاتی ہے۔ اونچی پوسٹس پر اس نے جابجا دوست بنائے ہوئے ہیں۔ گزشتہ چھ مہینے سے میں اپنی نئی ٹیم کے ساتھ معلومات اکٹھی کر رہا ہوں...... اس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ وہ پھیپھڑوں کا جان لیوا مرض اور دل کا مریض ہے۔ مرنے سے پہلے ہم اسے کورٹ میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔'' میک نے بات ختم کی۔

''چھ ماہ میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے تم نے؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''ہم یہ بھی جان گئے ہیں کہ گزشتہ برس وان ویلڈن نے کئی جگہ بھاری نقصان برداشت کیا ہے اور اس کی ایمپائر لڑکھڑا گئی ہے۔ بوکھلاہٹ میں اسے اپنا ہی بحری جہاز غرقاب کرنا پڑا۔ انشورنس کلیم بھی لیا اور نوادرات بھی بچا لیے۔ آٹھ افراد بھی مارے گئے تھے۔ ہم انیشنل اتھارٹی کو قائل نہیں کر سکے۔ وہ پھر بچ نکلا۔ اسی دوران کیلی رائس کا نام سامنے آیا۔'' میک نے آہ بھری۔ ''بدقسمتی سے کیلی رائس اور اس کے رشتے داروں کا مجرمانہ ماضی گواہ کی حیثیت میں رکاوٹ بن گیا۔''

''کوئی نئی راہ؟''

''جہاز کے ساتھ کچھ بھی غرقاب نہیں ہوا۔ تمام نادر ذخیرہ کہیں اور محفوظ ہے۔ ان میں بعض آئل پینٹنگ اتنی بڑی ہیں کہ ذخیرہ پوشیدہ رکھنے کے لیے گودام کی ضرورت ہے۔ وہ جگہ ہمیں تلاش کرنی ہے۔''

''انٹرپول تنہا یہ پزل حل نہیں کر سکتی۔'' انکل ہیو نے کہا اور کچھ سوچ کر فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ عمل قواعد سے ہٹ کر تھا لیکن دوسری طرف جورڈن کی زندگی داؤ پر لگی تھی۔

ہیو نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی اسپیشل برانچ میں پرانے دوستوں کو آواز دی، نیز مقامی انٹیلی جنس اور M15 سے بھی رابطہ کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جورڈن رابطہ کیوں نہیں کر رہا؟'' میک نے کہا۔

''وہ محتاط ہے۔'' رچرڈ نے جواب دیا۔ ''وہ جانتا ہے کہ وان ویلڈن کو توقع ہے کہ وہ رابطہ کرے گا جبکہ جورڈن اس کی توقع کے برخلاف غیر متوقع کام کر رہا ہے۔''

''کیلی رائس بھی ایسا ہی کر رہی ہے۔'' میک نے کہا۔

☆☆☆

وان ویلڈن نے فون اٹھایا...... وہ کال کا منتظر تھا۔

''وہ یہاں ہیں۔'' سائمن کی آواز آئی۔ ''جیسے آپ نے کہا تھا...... وہ لائیڈ آف لندن آئے تھے۔''

''ایشو ختم ہوا؟''

وقفے کے بعد آواز آئی۔ ''بدقسمتی...... وہ وہاں سے نکل کر بروک اسٹریٹ پر ایک جیولری اسٹور میں گئے اور وہاں کے عقبی دروازے سے نکل گئے...... دکان دار نے لاعلمی کا اظہار کیا......''

وان ویلڈن کے سینے کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے سانس پکڑنے کے لیے وقفہ لیا۔ اس دوران میں وہ خاموشی سے کیلی رائس کو کوستا رہا۔ وہ جسے معمولی چڑیا سمجھ رہا تھا، وہ لوہے کا چنا ثابت ہو رہی تھی۔ ببول کا ایسا کانٹا جو اندر ہی اندر اترتا جا رہا تھا۔

''وہ آئی آف کشمیر بھی وہاں لائی ہوگی؟''

''یس۔''

''یعنی وہ جان گئی ہے کہ خنجر نقلی ہے۔''

''یس۔''

''اور اصل......؟''

''وہ اپنی جگہ پر محفوظ ہے۔'' سائمن نے جواب دیا۔

''ویرونیکا نے ہمیں خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اُسے سزا ملنی چاہیے۔'' وان ویلڈن نے کہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"جیسے آپ کہیں۔"
"وہ ایک بھوکی کتیا ہے، احمق بھی۔ اس مرتبہ اس کی حرص اسے بہت دور لے گئی تھی۔ اسے بدترین سزا ملنی چاہیے۔"
"کیا یہ کام مجھے کرنا ہے؟" سائمن نے پوچھا۔
"رکو، پہلے تصدیق کرو کہ ذخیرہ محفوظ ہے۔ اسے ایک مہینے کے اندر مارکیٹ میں ڈالنا ہے۔"
"اتنی جلدی، ابھی ایک مہینا گزرا ہے۔ کوئی غلطی نہ ہو جائے۔"
سائمن کا اعتراض درست تھا لیکن وان ویلڈن نے گزشتہ برس ضرورت سے زیادہ کارٹیلو کے ساتھ متعدد معاہدے کر لیے تھے۔ اب اسے کیش درکار تھا۔ بہت زیادہ کیش۔
"میں انتظار نہیں کر سکتا۔" وان ویلڈن بولا۔ "ہانگ کانگ یا ٹوکیو کی مارکیٹ میں فروخت کرو۔ بہترین قیمت ملے گی۔ تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ ٹوکیو کے خریدار ہوشیار ہیں، خیال رکھنا۔ ذخیرے کو حرکت میں لاؤ۔"
"کب؟"
"ولافورڈ کل پورٹ ماؤتھ میں لنگر انداز ہوگا۔ مجھے اس پر ہونا چاہیے۔"
"آپ......؟" سائمن آواز کی معمولی تلخی چھپانے میں ناکام رہا، اسے تلخ ہونا چاہیے تھا۔ دو عورتوں سے شروع ہونے والی معمولی غلطی ایک بڑے بحران میں تبدیل ہونے جا رہی تھی۔ دوسری طرف وان ویلڈن اپنی جگہ بدمزہ تھا کہ اس کا جانشین دو چڑیوں کو قابو نہ کر سکا تو کمپنی کیا سنبھالے گا۔
"شپ منٹ کو میں خود دیکھوں گا۔ اس دوران تم ان دونوں سے جان چھڑاؤ۔" وان ویلڈن کے خیال میں لندن میں اب کیلی راکس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔

☆☆☆

سوا بارہ بجے ویرونیکا اپنے لندن فلیٹ سے نکلی اور ٹیکسی کے ذریعے سیلون اسٹریٹ کے کیفے پہنچی۔ وہاں اس نے لنچ کیا۔ وہاں سے وہ پیدل روانہ ہوئی، رخ ہیروڈز کی جانب تھا۔ درمیان میں اس نے دو دکانوں پر ٹھہر کر شاپنگ کی۔
کیلی حلیہ بدل کر مناسب فاصلے سے تعاقب کر رہی تھی۔ کیلی، ویرونیکا کے بے تکے سیر سپاٹے سے اکتا رہی تھی۔ کیلی نے لمبے بالوں والی سیاہ وگ اور چہرے پر چشمہ سجایا ہوا تھا۔ ویرونیکا، برامٹن روڈ پر تھی...... بالآخر وہ ہیروڈز میں داخل ہوئی۔ وہاں بھی اس کی شاپنگ جاری تھی۔ مقروض ویرونیکا کے پاس رقم کہاں سے آئی...... کون دے رہا ہے...... وہاں سے نکل کر اس نے پھر ٹیکسی پکڑی۔
کیلی نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک ٹیکسی قریب آئی اور کیلی اس میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور ایک سکھ تھا۔ جسے جورڈن نے پورے دن کے لیے ہائر کیا تھا۔ کیلی نے ڈرائیور کو اس کا ٹاسک بتایا۔
"کوئی خبر؟" جورڈن نے سوال کیا۔
"کچھ نہیں...... شاپنگ کرتی پھر رہی ہے...... اس کے پاس رقم ہے اور وقت بھی۔" کیلی نے کہا۔
"صبر سے کام لو، میں اسے جانتا ہوں۔ جب نروس ہوتی ہے تو پانی کی طرح پیسا بہاتی ہے۔ یقیناً اس وقت وہ کافی دباؤ کا شکار ہے۔"
ویرونیکا کی ٹیکسی اولیور کمپنی پر رکی۔ جو اس کے شوہر کی تھی۔ "کہیں اس کا شوہر بھی اس گند میں شامل تو نہیں؟"
"ممکن ہے۔" جورڈن نے کہا۔
وہاں سے نکلی تو اس کا رخ ریجنٹ پارک کی طرف تھا۔ جہاں اس نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل چیسٹر ٹیرس کی طرف گئی۔ وہاں سے ٹی ہاؤس میں داخل ہو گئی۔
"میرے خیال میں وقت آ گیا ہے۔ کچھ ہونے والا ہے۔" کیلی نے کہا...... دونوں نے ایک دوسرے کو احتیاط برتنے کو کہا۔ کیلی نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ چیسٹر ٹیرس کو کراس کیا۔ ویرونیکا نے ٹی ہاؤس میں ایک میز سنبھال لی تھی۔ کیلی اس کے پیچھے دو ٹیبل چھوڑ کر بیٹھی۔ کیلی کا چہرہ مخالف سمت میں تھا۔ ٹی ہاؤس میں نسبتاً خاموشی تھی۔ ویرونیکا آرڈر دے رہی تھی۔ کیلی نے کمبر لینڈ ٹیرس کی سمت دیکھا۔ جورڈن ایک بینچ پر موجود تھا۔ چہرہ اخبار کی آڑ میں تھا۔
ویٹر، ویرونیکا کی میز پر اشیائے طعام رکھ رہا تھا۔ وہ ہٹا ہی تھا کہ ایک آدمی نے ڈائننگ ٹیرس کراس کی، رخ ویرونیکا کی طرف تھا۔ وہ کیلی کی میز کے قریب سے گزرا تھا۔ کیلی آدمی کی جھلک ہی دیکھ سکی۔ اس کے بال بھورے، شانے چوڑے اور جسم مضبوط تھا۔
"مسٹر ٹروٹ۔" ویرونیکا کی آواز آئی۔ "تم تاخیر سے آئے ہو۔" ویرونیکا نے چائے تیار کی۔
"میرے پاس چائے کا وقت نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "میں انتظامات کی تصدیق کے لیے آیا ہوں۔"
اس نے اتنا ہی کہا...... لیکن اس کی آواز، تحکمانہ انداز اور ناقابلِ شناخت لہجہ کیلی کی سانس روک دینے کے

لیے کافی تھا۔ اسے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت تھی نہ ہمت، وہ آواز پہچان گئی تھی۔ اس کا ذہن کہیں اور چلا گیا۔ آگ کے شعلے، انسانی چیخیں، گولیوں کی تڑتڑاہٹ، سمندر کا سرد پانی...... وہ اٹھ کر بھاگنے کے لیے تیار تھی لیکن یہ خودکشی کے مترادف تھا۔ وہ میز کا کنارہ پکڑے ساکت بیٹھی رہی۔ رفتارِ قلب غیر معمولی تھی۔

☆☆☆

سائمن ٹروٹ، ویرونیکا کو سگریٹ سلگاتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اطمینان سے کش لیا اور دھوئیں کا بادل فضا میں پھینکا۔ احمق ہے، ناسمجھ...... خود کو بہت اہم خیال کرتی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ ہم نے اس کے شوہر کا متبادل بھی تیار کر لیا ہے۔

''کارگو تیار ہے۔ کچھ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا۔ میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔'' وہ پرسکون انداز میں سگریٹ نوشی کر رہی تھی۔

''مسٹر وان ویلڈن خوش نہیں ہیں۔''

''کیوں؟ کیا میں نے آئی آف کشمیر والا کام بخوبی کر کے نہیں دکھایا؟''

''یہ جگہ اور وقت گفتگو کے لیے مناسب نہیں ہے۔'' اس نے ایک اخبار ویرونیکا کی طرف بڑھایا۔ ''اطلاع پر دائرہ ہے۔ وہ تیار ہے، اور ہم منتظر۔ جلد ہی روانہ ہو جائیں گے۔''

''کال کر دینا۔'' وہ بولی۔

ٹروٹ نے جانے کے لیے کرسی کھسکائی۔

''معاوضے کا کیا ہوگا؟ ہم نے کافی پریشانی اٹھائی ہے۔''

''رقم نہیں ملی؟''

''وہ ٹوکن تھا۔'' ویرونیکا نے کہا۔

''باقی ایک آدھ روز میں مل جائے گا۔''

☆☆☆

کیلی نے اندازہ لگایا کہ وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا ہے۔ اسے پہچاننا مشکل تھا۔ پھر بھی وہ خوف زدہ تھی۔ اس نے زبردستی چائے کا کپ اٹھایا۔ اس کے جاتے ہی کیلی کی سانس میں سانس آئی۔

ویرونیکا ابھی تک میز پر تھی اور اخبار کو گھور رہی تھی۔ پھر اس نے نصف صفحہ پھاڑ کر تہ کیا اور پرس میں رکھ لیا۔ بعد ازاں وہ بھی اٹھ کر روانہ ہو گئی۔ چند منٹ میں کیلی کے اعصاب پُرسکون ہو گئے۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ ویرونیکا پارک سے نکل چکی تھی۔ کیلی نے تعاقب کے لیے قدم اٹھائے۔ تاہم اس کی چال ہموار نہیں تھی۔ چند قدم چل کر وہ رک گئی۔ اس وقت جورڈن کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر کیلی کے قریب آیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

''ہم یہاں نہیں رک سکتے۔'' کیلی نے سرگوشی کی۔

''کیا ہوا؟''

''وہ...... وہی تھا۔''

''کون؟''

''کوسیما والا آدمی، جس نے فائرنگ کا آرڈر دیا تھا۔'' کیلی نے اطراف میں دیکھا۔ خوفناک آبی مناظر تصور میں ابھرنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رک رک کر اس نے وضاحت کی۔ ''ٹیکسی میں چلو۔'' جورڈن نے کہا۔

''رکو۔'' وہ واپس ویرونیکا کی میز پر گئی اور اخبار اٹھا لیا۔ جس کے ایک صفحے کا آدھا حصہ غائب تھا...... ٹیکسی میں بیٹھتے ہی جورڈن نے ڈرائیور کو چلنے کے لیے کہا۔ سکھ ڈرائیور نے دانت نکالے...... ''کیا خوب دن ملا ہے۔'' اس نے سوچا اور ٹیکسی آگے بڑھائی۔ جورڈن، کیلی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم نے اُن کی باتیں سنیں؟''

''وہ آہستہ بول رہے تھے۔ البتہ ویرونیکا نے اسے مسٹر ٹروٹ کے نام سے پکارا تھا۔ کم از کم ہم اتنا جان گئے ہیں کہ وہ وان ویلڈن کی آلۂ کار تھی جس نے ہیرا، اس نے کما لیا اور ویرونیکا نے اسے واپس چرا کر وہاں نقل رکھ دی۔ خسارے میں صرف گائے ڈیلنی رہا۔''

''لیکن ذخیرے میں سے ایک دانہ نکال کر بیچنے والا کون ہوسکتا ہے؟''

''مشکل سوال ہے۔ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔'' کیلی نے کہا۔

''اور یہ اخبار؟''

''یہ اسی آدمی نے ویرونیکا کو دیا تھا، ویرونیکا نے ایک صفحے کا کچھ حصہ پھاڑ کر رکھ لیا ہے۔''

جورڈن نے اخبار پر نظر ماری پھر ڈرائیور کا کندھا تھپتھپایا۔

''دوست آج کا اخبار ٹائمز ہے؟''

''یس سر، ڈیلی میل بھی ہے۔''

''ٹائمز کافی ہے۔''

ڈرائیور نے گلوو کمپارٹمنٹ میں سے اخبار نکال کر دیا۔

"صفحہ نمبر پینتیس اور چھتیس کا بالائی حصہ۔" کیلی نے بتایا۔ جورڈن نے تیزی سے صفحات پلٹنے شروع کیے۔ نمبر پینتیس، بلڈنگ ایکسٹینشن، مانچسٹر...... گھوڑوں کی افزائشِ نسل، آئرلینڈ۔"

"چھتیس دیکھو۔" کیلی نے کہا۔

"اسکینڈل...... کوئی اشتہاری ادارہ ہے اور......" وہ چپ ہو گیا۔ "پورٹ ماؤتھ میں آج کا شپنگ شیڈول۔" اس نے کیلی کو دیکھا۔

"وٹیس اِٹ...... واؤ...... یہی ہے۔ ان کا کوئی شپ پورٹ پر آ رہا ہے۔" کیلی نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"یا پھر جا رہا ہے۔" جورڈن نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"ڈلیوری یا پک اَپ۔" کیلی نے اختصار کے ساتھ بات مکمل کی۔

"یہ صاف ستھرا کارگو ہو گا لیکن چانس ہے۔" وہ ہوٹل کے قریب رکے۔ "پورٹ ماؤتھ کال کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وان ویلڈن کا شپ کون سا ہے۔" وہ دفعتاً دروازہ کھول کر نکلی۔

"کیلی، رکو۔"

لیکن وہ تو ہوا ہو چکی تھی۔ جورڈن ڈرائیور کو فارغ کر کے ہوٹل میں اپنے کمرے تک پہنچا تو وہ بات ختم کر کے فاتحانہ انداز میں جورڈن کو دیکھ رہی تھی۔ "وان ویلڈن کمپنی کا شپ ولا فورڈ پانچ بجے آئے گا اور آدھی رات کو دوبارہ روانہ ہو جائے گا۔" چند سیکنڈ وہ کیلی کو گھورتا رہا۔ "میں پولیس کو فون کر رہا ہوں۔"

کیلی نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "جورڈن! نہیں۔"

"یہ بہترین موقع ہے۔ ہمیں اتھارٹیز کو الرٹ کرنا چاہیے۔"

"اگر کچھ نہ نکلا تو کیا ہو گا؟" کیلی نے کہا۔ "اس مرتبہ ہم "ایڈیٹس" کی چھاپ نہیں لگوائیں گے...... پہلے ہم اطمینان کریں گے، اس کے بعد......"

"لیکن اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے......" وہ تھم گیا۔

"کیا تم ہمت کرو گی جہاز پر جانے کی؟"

"تھوڑی سی تانک جھانک کرنی پڑے گی۔"

"نہیں، یہ وقت رچرڈ کو بلانے کا ہے یا کوئی اور۔"

"نہیں، میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی۔ راز کھل سکتا ہے۔"

"تمہیں کون آزادی سے وہاں گھومنے پھرنے دے گا؟" جورڈن نے مخالفت کی۔

"انکل والٹر سے میں نے کچھ سیکھا ہے۔"

"لیکن وہ بھی پکڑے گئے تھے۔"

"میرے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔" کیلی نے کہا اور فون کی طرف بڑھتا ہوا جورڈن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جورڈن نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اگلے چند منٹ تکرار کی نذر ہو گئے۔ کافی رد و کد کے بعد سمجھوتا ہوا کہ جورڈن نجی طور پر کوئی ذریعہ استعمال کرے گا اور کیلی کمرے میں اس کی واپسی کا انتظار کرے گی۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔ کیلی کھڑکی تک گئی۔ چہرہ مسکراہٹ سے عاری تھا۔ جورڈن کے عمارت سے نکل جانے کے بعد وہ مڑی اور اس کی چھوڑی ہوئی جیکٹ میں سے برنارڈ ٹاوسٹوک کی گھڑی نکالی۔ سونے کی گھڑی کا پچھلا حصہ فولادی تھا۔ چین والی جیبی گھڑی کا سائز نسبتاً بڑا تھا۔ بناوٹ پرانی طرز کی تھی۔ تاہم وہ ایک خوب صورت گھڑی تھی۔ فولادی حصے پر گولی کا ڈینٹ موجود تھا...... یہاں اور ابھی یہی اختتام ہے۔ یہ تو ہونا تھا۔ بندھن ٹوٹنا چاہیے، حتمی انداز میں۔ وہ ایک چور تھی اور جورڈن رئیس زادہ...... جنٹلمین۔ اسے اپنی زندگی گزارنی چاہیے۔ میرے جانے سے اُسے سکون ملے گا۔

کیلی نے گھڑی اپنی جیب میں رکھ لی۔ ایک دن آئے گا جب وہ ذہنی اذیت کے بغیر گھڑی واپس بھیج دے گی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ جورڈن کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ گڈ بائی، گڈ بائی...... مائی ڈارلنگ جنٹلمین۔ اور پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔ سینے میں دھواں تھا۔ رست و خیز ہے دل کیا ہے...... ملن اضداد کا کیونکر ہو...... حاصل کیا ہے...... عذابِ جاں سہی...... اے دوست ترے قربان۔

☆☆☆

رچرڈ وولف، فون پر برسلز بات کر رہا تھا۔ جب ڈیوس کی شائستہ دستک نے اس کی گفتگو میں دخل اندازی کی۔ عموماً بٹلر اور ملازم دستک کے بعد انتظار کرتے تھے۔ تاہم خلافِ معمول ڈیوس نے دروازہ کھول دیا۔ رچرڈ نے اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ بٹلر دروازے میں کھڑا تھا۔ "میں معذرت خواہ ہوں، مسٹر وولف۔" وہ بولا۔ "کوئی غیر معمولی شخص آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔"

"غیر ملکی؟"

"پگڑی سے سکھ لگتا ہے۔"

"کیا چاہتا ہے؟"

"وہ صرف آپ کو بتائے گا۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

رچرڈ نے فون پر گفتگو مختصر کر دی اور رابطہ منقطع کر کے ڈیوس کی رہنمائی میں باہر آیا...... وہ کوئی سکھ ہی تھا۔ اس کا ایک دانت سونے کا تھا۔

''میرا نام رچرڈ وولف ہے۔''

''آپ نے ٹیکسی منگوائی تھی۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

سکھ نے خاموشی سے ایک لفافہ رچرڈ کی طرف بڑھایا۔ رچرڈ نے لفافے میں جھانکا جہاں ایک طلائی کف لنک پڑا تھا۔ کف لنک پر J.C.T کے حروف کندہ تھے۔

جورڈن، رچرڈ کے ذہن میں خیال آیا۔ اس نے عام سے انداز میں سر ہلایا اور کہا۔ ''اوہ، یاد آیا۔'' ''میں بریف کیس لاتا ہوں۔'' وہ واپس لائبریری میں آگیا۔ نو ایم ایم کا آٹو میٹک شولڈر ہولسٹر میں فٹ کیا اور خالی بریف کیس اٹھا کر چل پڑا۔

سکھ کے ہمراہ وہ ٹیکسی تک آیا۔ دونوں خاموش تھے۔ سکھ تیز رفتاری لیکن سکون سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''کہاں جانا ہے؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''ہیروڈز۔ آپ وہاں تیس منٹ گزاریں گے۔ تمام فلورز کا وزٹ کریں۔ چاہیں تو کچھ خرید بھی لیں۔ پھر واپس آجائیں...... میرا نمبر تیئس ہے۔'' سکھ نے بتایا کہ وہ کہاں ملے گا۔

''مجھے کیا کرنا ہے؟''

''نہیں معلوم...... میں صرف ڈرائیور ہوں۔'' اس نے وقفہ لیا۔ ''ہمارا تعاقب ہوا ہے۔'' سکھ نے مرر میں دیکھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' رچرڈ نے کہا۔

ہیروڈز میں اس نے وقت گزاری کی...... ایک ریشمی اسکارف اور ایک ٹائی خریدی۔ وہ غافل نہیں تھا۔ دو آدمی اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

تیس منٹ بعد وہ تیئس نمبر ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔

''اندر بھی میری نگرانی ہو رہی تھی۔ کوئی بیک اپ پلان ہے؟''

''یہ ہے پلان۔'' ایک شناسا سا آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

رچرڈ نے مڑے بغیر حیرت سے رئیر ویو میں جھانکا۔

''کیا چکر چل رہا ہے؟''

''کیسا جا رہا ہوں۔'' جورڈن نے آنکھ ماری۔ ٹیکسی حرکت میں آ کر ٹریفک کے دھارے میں شریک ہو چکی تھی۔

''بریلینٹ۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''مجھے رہوڈ تعاقب ہو رہا ہے...... کیلی رائس کہاں ہے؟''

''محفوظ ہے لیکن ہمیں مدد درکار ہے۔''

''جورڈن انٹرپول فعال ہے۔ انہیں وان ویلڈن کا سر درکار ہے اور کیلی کے تحفظ کی بھی فکر ہے۔''

''میں کیسے ان پر بھروسا کروں؟''

''وہ ہفتوں سے نگرانی کر رہے تھے...... پھر تم نے انہیں پشت سے جھٹک دیا۔'' رچرڈ نے کہا۔

''ویرونیکا، وان ویلڈن کے لیے کام کر رہی ہے اور غالباً اولیور بھی۔''

یہ سن کر رچرڈ کو لحاتی جھٹکا لگا۔

''تم نے اس کی پہنچ دیکھی۔ وہ آکٹوپس کے مانند ہے۔ میں صرف ایک آدمی پر اعتبار کر سکتا ہوں...... اور وہ تم ہو، تمہارے علاوہ بیرل اور انکل ہیو۔'' جورڈن نے کہا۔

''انکل ہیو نے اپنے پرانے دوستوں کو شامل کر لیا ہے۔ میک لوئڈ بھی گھات میں ہے۔''

''میک لوئڈ؟'' جورڈن نے سوال کیا۔

''انٹرپول...... جس نے اسٹیشن پر تم دونوں کو بچایا تھا۔ اب بتاؤ، کیا پلان ہے؟''

جورڈن خاموش ہو کر کڑیاں ملانے لگا۔ ''میں تیار ہوں۔''

''اور کیلی؟''

''وہ تھک گئی ہے لیکن تیار ہے۔ انڈر گراؤنڈ سیلون اسکوائر۔ اب سے ایک گھنٹے بعد...... ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے۔'' جورڈن نے کہا۔

''میں انکل ہیو کو مطلع کر دوں۔'' رچرڈ نے سیل فون نکالا۔ جورڈن اسے وان ویلڈن کے شپ ولا فورڈ کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اس نے رچرڈ سے کہا تھا کہ پولیس کی جانب سے شپ کے کارگو کی غیر متوقع چیکنگ کارگر رہے گی۔

ڈرامائی لحات سر پر تھے۔ جورڈن فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کا ذہنی تناؤ ختم ہو رہا ہے یا جگہ پر ہے۔ وہ لندن والے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ رچرڈ وہاں جورڈن سے جدا ہو گیا۔ جورڈن نے ڈرائیور کو واپسی کے لیے کہا۔

☆☆☆

جورڈن نے ٹیکسی ہوٹل سے ایک بلاک دور رکوائی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ مطمئن ہونے کے بعد اترا...... رخ ہوٹل کی جانب تھا۔ وہ خیالات میں غلطاں کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دل کیونکر اک آن میں پہلو سے نکلا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بعدازاں امید و بیم، گریز و کشش، قربت اور فرقت کے لمحات...... کبھی اتفاقیہ، کبھی دانستہ دونوں بچھڑ کے ملتے رہے...... ایک دوسرے کو پاتے اور کھوتے رہے۔ کشمکش کا سلسلہ دراز تر ہوتا گیا۔ بالآخر میں اور تم سے ایک ہوئے...... ''ہم'' پر آ گئے۔ خواہ مخواہ وہ زیرلب مسکرایا۔ ''مجھ پر بھروسا کرو۔'' اس نے خود سے کہا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

کمرا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ خاموشی کی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دل دھڑکا، تڑپ کر وہ باتھ روم کی طرف گیا جو خالی پڑا تھا، بیڈ روم بھی...... وہاں سے کیلی کا پرس بھی غائب تھا، اذیت کی لہر اٹھی...... شیشۂ دل چھن سے گرا...... فکرو نظر کے زاویے بھی ساتھ گئے۔

جورڈن کی گھومتی نگاہ جیکٹ پر گئی جو کرسی کے بجائے بستر پر پڑی تھی۔ اس نے جیکٹ اٹھائی اور جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کے مرحوم باپ کی جیبی گھڑی ندارد تھی۔ اس جیب میں یک سطری نوٹ رکھا تھا۔ ''چور تو پھر چور ہے۔ آخری چوری۔ کیلی۔'' اس کے دماغ میں بگولے چکرانے لگے۔ کاغذ کا ٹکڑا اس نے مٹھی میں بھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ سرمایۂ زیست، دشمنِ جان نکلا۔ دل نے نفی کی، اس نے دل کی آواز پر کان رکھا۔ جواب خوفناک نکلا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ اس کے جانے کے بعد کیلی کو تین گھنٹے میسر تھے۔ اب ساڑھے آٹھ میں تیس منٹ باقی تھے۔ جورڈن تقریباً دوڑتا ہوا ہوٹل سے نکلا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے دو اہلکار ساتھ لیے، سیلون اسکوائر سے گھوما...... پورٹ ماؤتھ میں کیلی کی موجودگی یقینی تھی۔ وہ گودام میں ہوگی یا جہاز پر؟

اگر وہ زندہ ہے......

☆☆☆

آہنی باڑھ کیلی کی توقع سے زیادہ اونچی تھی۔ وہ تاریکی میں رینگ رہی تھی۔ کوکیز بنانے والی اولیور کمپنی کا کمپلیکس اس کی نظر میں تھا۔ چین کے بندھن بھی تاروں سے منسلک تھے۔ بسکٹ کے گودام کی ایسی حفاظت۔ آخر کیوں؟ کس بات کا خوف ہے ان کو؟ گودام کے چاروں طرف تاروں کا جنگل تھا۔ گیٹ پر وزنی قفل اور فلڈ لائٹس۔ اندر بسکٹ ہیں یا نیوکلیئر ہتھیار؟ کیلی نے احاطے کا جائزہ لیا۔

گودام کے پلیٹ فارم سے ٹرکوں کے ذریعے منتقلی شروع ہوگی، آج رات کی تیرگی میں۔ سب کچھ بظاہر قانونی نظر آ رہا تھا۔ ویرونیکا کے شوہر اولیور کی کمپنی کے گودام کو استعمال کیا جا رہا تھا۔ کون آنکھ اٹھاتا۔ وان ویلڈن مکار تھا لیکن اس بار کیلی ایک قدم آگے تھی۔ وان ویلڈن اور پولیس دونوں سے۔ جورڈن اور پولیس جب تک پورٹ ماؤتھ کو گھیرتی، کیلی کو ثبوت حاصل کرنا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وان ویلڈن شک میں پڑ کر پلان تبدیل کر دے۔ وہ باڑھ سے کچھ فاصلے پر تھی۔ معاً سیٹی کی آواز پر وہ جھاڑیوں میں دبک گئی...... کیلی نے گارڈ کو گزرتے دیکھا جس کی بیلٹ کے ساتھ گن بھی تھی۔ ادھ جلی سگریٹ ہونٹوں میں دبی تھی۔ اس کا انداز سستی کا حامل تھا۔ کیلی نے اس کے سرکٹ کا وقت دیکھا۔ گارڈ سات منٹ بعد پھر نمودار ہوا۔ کیلی نے احتیاطاً دوسری مرتبہ چیک کیا۔ چھ منٹ، یعنی اس کے پاس چھ منٹ تھے۔ اس وقفے میں اسے باڑھ سے گزر کر گودام تک پہنچنا تھا۔ تاروں کی رکاوٹ اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ درِ گودام پر نظر آنے والے تالے اس کے لیے پریشان کن تھے۔ انہیں کھولنے میں وقت لگ سکتا تھا۔

لیکن رسک لیے بغیر چارہ نہ تھا۔

مقام منتخب کرنے کے بعد، گارڈ کے گزرتے ہی، وہ اپنی جگہ سے نکلی اور پھرتی سے باڑھ کے قریب زمین سے چپک گئی۔ یہاں تاریکی تھی۔ مزید یہ کہ قریبی درخت کا سایہ اندھیرے پر گر کر تیرگی میں سیاہی گھول رہا تھا۔ اس کا لباس بھی سیاہ تھا۔ کوئی اس طرف نظر ڈالتا، پھر بھی اسے دیکھنا ناممکن تھا۔ وہ ساکت پڑی رہی۔ گارڈ پھر گزر گیا اور کیلی نے لنک پر کٹر چلایا۔ ٹک...... ٹک...... ٹک...... ٹک۔ کٹے تار موڑ کر اس نے خلا پیدا کیا اور اندر رینگ گئی۔ کیلی نے خیال رکھا تھا کہ پشت سے لپٹا بیگ تاروں میں نہ اٹکے۔ فوراً ہی وہ گودام کے سائڈ ڈور کی جانب لپکی تالا دیکھتے ہی اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ تالا نیا اور عام نوعیت سے مختلف تھا۔ کیلی نے گھڑی کا سگنل پانچ منٹ پر سیٹ کیا۔ مرکزی دروازے پر کئی تالے تھے۔ وہاں طبع آزمائی خودکشی کے مترادف تھا۔ سائڈ ڈور پر ایک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ تالے کے اندر کم از کم سات پن ہوں گی۔ اس نے گارڈ کا تصور ذہن سے جھٹکا اور ''ایل'' کی شکل کا مخصوص قفل شکن نکالا...... کان لگائے اور مشغول ہوگئی۔

مدھم کلک سنائی دی۔ ون ڈاؤن...... پہلی پن گرانے کے بعد کیلی نے سہولت محسوس کی اور اگلی پانچ کے لیے بہت کم وقت لیا۔ لیکن ساتویں پن حلق میں پھنس گئی۔ غالباً اس کا میکنزم مختلف تھا۔ وقت اپنی رفتار سے رینگ رہا تھا۔ کیلی نے محسوس کیا کہ اس کے بالائی لب پر پسینہ آیا تھا۔ اس نے

کوشش جاری تھی۔ اس کی واچ الارم نے ''بپ'' کا سگنل دیا۔ اب جدوجہد ایک جوئے کے مانند تھی۔ وہ جوا کھیل رہی تھی۔ کامیابی سے قریب تھی...... بہت قریب۔

کار ریاں...... سیٹی کی آواز آئی۔ گارڈ گودام کے کونے سے گھومنے والا تھا۔ روپوش ہونے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ باڑھ تک واپس جانے کا وقت نہیں تھا۔ نبض ہتھوڑے کے مانند چل رہی تھی۔ فرار کا ایک ہی راستہ تھا۔ سیدھا اوپر۔

بدقت تمام کیلی نے خود کو بدحواسی سے بچایا اور ڈرین پائپ کے ذریعے بلی کے مانند اوپر چڑھی۔ گارڈ نمودار ہوا اور آگے بڑھنے لگا۔ کیلی کے دونوں ہاتھ پائپ کے ساتھ اور دونوں پیر پائپ کے ناکافی جوڑ پر تھے۔ وہ دیوار سے چپک گئی...... شامت اعمال...... گارڈ معاً ٹھیک پائپ کے ساتھ رکا اور تازہ سگریٹ سلگائی۔ کیلی دیوار میں لگی اینٹ کے مانند ساکت تھی۔ سانس تک روکی ہوئی تھی۔ پتھر کہاں سانس لیتے ہیں۔ اسے لگا سینے میں دھڑکن نہیں دھماکے ہو رہے ہیں۔ نہایت نازک صورتِ حال تھی۔

کیا وہ اوپر دیکھے گا؟ اس کے ذہن میں پٹاخا چلا...... کیا پائپ وزن سہارے رکھے گا؟ دوسرا پٹاخا......

گارڈ نے کش لیا اور آگے بڑھا۔ جیسے ہی وہ کونے سے مڑا۔ کیلی ہانپتی ہوئی اوپر چڑھتی چلی گئی۔ نیچے جا کر تالے سے اُلجھنے کا خیال اس نے رد کر دیا تھا۔ چھت پر پہنچ کر وہ لیٹ گئی۔ چند منٹ حواس درست ہونے میں لگے۔ کیلی نے اطراف میں دیکھا۔ چھت میں ایک چوکور دریچہ تھا۔ کیلی قریب گئی، وہ بھی مقفل تھا۔ یہاں قفل شکنی میں اس نے دو منٹ صرف کیے۔ دریچے کا پٹ اوپر کیا۔ نیچے سیڑھیاں اندھیرے میں اتر رہی تھیں۔ کیلی نے آہستگی سے دریچے کا پٹ واپس اپنی جگہ پر کر دیا۔ گھپ اندھیرے میں اس نے پین لائٹ روشن کی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ راہ میں ایک اور دروازہ آیا، یہ مقفل نہیں تھا۔ اس میں سے گزری تو اس نے خود کو کشادہ گودام کے سر پر پایا۔ ذرا دیر میں وہ زمین پر تھی۔ گودام روشن تھا۔ جابجا کریٹ سجے تھے۔ بعض مقام پر کریٹ پر کریٹ چڑھائے گئے تھے۔ ہر کریٹ پر اولیور کمپنی کا لوگو اور نام چسپاں تھا۔ ٹول باکس میں کیلی کے ہاتھ لوہے کی سلاخ لگی جو آگے سے مڑی ہوئی تھی۔ اس کے ذریعے اس نے ایک کریٹ تھوڑا سا کھولا۔ کوکیز کی خوشبو آئی۔ کیلی نے جھانکا اندر بسکٹ ہی تھے۔ اس نے مایوسی محسوس کی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ تمام کریٹ کھول کر دیکھتی۔ دفعتاً فاصلے پر اسے ڈبل ڈور نظر آیا۔ نئی امید اور ہیجان کے عالم میں وہ آگے بڑھی۔ ڈبل ڈور لاک تھا۔ آس پاس کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ بلاشبہ ڈور کے پیچھے دفتر کی جگہ کچھ اور تھا۔ چند منٹ میں اس نے دروازہ کھول لیا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ ائرکنڈیشنڈ، کیلی کو خیال آیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے سوئچ آن کیا۔ کمرا روشن ہو گیا۔

یہاں کریٹ مختلف سائز کے تھے۔ کیوں؟ کیلی نے تعجب سے دیکھا۔ چند کریٹ اتنے اونچے تھے کہ ایک آدمی ان میں کھڑا ہو سکتا تھا۔ کیلی نے سنسنی محسوس کی۔ کروبار (Crowbar) اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ایک کریٹ کھولا۔ اس میں لکڑی کا نرم بھوسا بھرا تھا۔ کیلی نے دونوں ہاتھ بھوسے میں ڈبو دیے۔ ہاتھوں نے کسی ٹھوس چیز کو چھوا۔ کیلی نے ٹٹول کر ہاتھ کچھ اور اندر کیے۔ گول سی چیز کو باہر نکال لیا۔ رنگین ماربل کی سطح شیشے کے مانند ہموار اور چکنی تھی۔ جو روشنی میں چمک رہی تھی۔ یہ کسی نوجوان بت کا سر تھا۔ سنگ تراش جو بھی تھا، بلا کا کاریگر تھا۔ سر پر ماربل سے ہی تراشا ہوا زیتون کے پتوں کا تاج تھا۔ کیلی کے ہاتھ شدتِ جذبات سے لرز اٹھے۔ اس نے بیگ سے کیمرا نکال کر بسرعت تین شاٹ لیے۔ کھوپڑی کو واپس رکھ کر کریٹ بند کر دیا۔ دوسرا کریٹ جو قدرے بڑا تھا...... ابھی اوپر سے کھولا ہی تھا کہ دور سے ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ کیلی اپنی جگہ جم گئی اور کان لگا کر سنا۔ وہ ٹرک کی آواز تھی۔ اس نے پھرتی سے سوئچ آف کیا اور دروازہ تقریباً بند کر دیا۔ معمولی جھری چھوڑ دی۔ وہ جھری میں سے دیکھ رہی تھی کہ گودام کا مرکزی دروازہ کھولا جا رہا تھا پھر اس نے ریورس میں ٹرک کو اندر آتے دیکھا۔ ڈرائیور نے اتر کے پیچھے سے ٹرک کے ٹیل گیٹ گرائے۔

معاً ایک طرف سے ویرونیکا ایک مرد کے ساتھ نظر آئی۔ دونوں کا رخ کیلی کی طرف تھا۔ کیلی نے جھٹکا کھایا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ دیوانہ وار پین لائٹ کی مدھم روشنی میں یہاں وہاں چکرا رہی تھی۔ کوئی راہ فرار نہ تھی۔ آوازیں ڈور کے دوسری جانب بہت قریب تھیں۔ کیلی نے کھلے ہوئے کریٹ میں گھس کر کریٹ اوپر سے بند کر لیا۔ وہ بمشکل جگہ بنا کر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔

رخنوں میں سے کیلی نے ڈور کھلتے دیکھا پھر کمرا روشن ہو گیا۔

''سب کچھ یہاں ہے، مسٹر ٹروٹ۔ چیک کرو گے یا مجھ پر بھروسا ہے۔'' ویرونیکا کی آواز آئی۔

''وقت نہیں ہے۔ ہمیں حرکت میں آنا ہے۔'' مردانہ آواز آئی۔

کیلی سمجھ گئی کہ مرد کون ہے۔ خون اس کی رگوں میں جمنے لگا۔

''مجھے امید ہے کہ مسٹر وان ویلڈن ہماری کوششوں کی ستائش کریں گے۔'' ویرونیکا نے کہا۔ ''انہوں نے معاوضے کا وعدہ کیا تھا۔''

''وہ تمہیں مل چکا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آئی آف کشمیر کی فروخت سے جو منافع حاصل ہوا، اس

ئل نے تم اپنا حصہ وصول کرچکی ہو۔" ٹروٹ نے کہا۔

"وہ آئیڈیا میرا تھا پھر اصل کی جگہ نقل رکھا میں نے۔ اس کا کیا ہوگا۔ جب خنجر میرے پاس رہا...... اس دوران نقل بھی میں نے بنوائی۔ بلیک مارکیٹ میں مخصوص خریدار کو بیچا جس نے اولیور کے زیرِ اثر آئی آف کشمیر کو دبائے رکھا...... تاوقتیکہ میں گائے کو ورغلا کے وہاں لے گئی۔" اچانک وہ چپ ہوگئی۔

"مسٹر ٹروٹ، گن ایک طرف کرو۔"

"تم کریٹس سے ذرا دور ہوجاؤ۔" جواب میں ٹروٹ نے حکم دیا۔

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ ہنسنے لگی...... ہسٹریائی انداز میں۔ "تمہیں ہماری ضرورت ہے۔"

"اب نہیں ہے، نہ پڑے گی۔"

فائرنگ کی آواز پر کیلی لرز اٹھی۔ اوپر تلے تین فائر۔ کیلی نے چیخ روکنے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ خوف زدہ سسکیوں کی آواز کہہ رہی تھی کہ ویرونیکا زندہ ہے۔

"صرف وارننگ تھی۔" ٹروٹ نے کہا۔ "اگلی بار ٹارگٹ پر فائر کروں گا۔" وہی سفاک لہجہ عود کر آیا تھا۔ اسی آواز نے بحری جہاز کو سیما سے فائرنگ کا حکم دیا تھا۔

"اِدھر آؤ تم لوگ۔ کریٹس ٹرک میں پہنچاؤ۔" اس نے چیخ کر دوسرا حکم جاری کیا۔

کیلی نے عالمِ ہراس میں رخنے سے آنکھ لگائی۔ دو آدمی لوڈنگ کارٹ کے ساتھ آرہے تھے۔

"یہ بڑا والا پہلے اٹھاؤ۔" ٹروٹ نے کہا۔ وہ کارٹ لے کر کیلی کی طرف آئے۔ کیلی کے اوسان خطا تھے۔ وہ سکڑ سمٹ رہی تھی۔ اس کی پشت میں کوئی ٹھوس شے چبھ رہی تھی۔ کریٹ میں کیا ہے۔ یہ جاننے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"اوہ گاڈ، کتنا وزن ہے۔ کیا ہے اِس میں؟"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ اپنا کام کرو۔" ٹروٹ غرایا۔

ہچکولوں کا سفر شروع ہوا۔ بالآخر اسے کریٹ سمیت ٹرک میں رکھ دیا گیا۔ کیلی نے گہری سانس لی۔ شومیِ قسمت دوسرا کریٹ اسی کریٹ پر رکھ دیا گیا۔ وحشت ناک صورتِ حال تھی۔ وہ مقید ہوکے رہ گئی۔ کریٹ منتقل ہوتے رہے...... گھڑی کے روشن ہندسے آٹھ بج کر دس منٹ کا اعلان کررہے تھے۔ آٹھ پچیس پر ٹرک کا انجن بیدار ہوا۔ کیلی کی پنڈلیوں میں اکڑن بڑھتی جارہی تھی۔ کیلی نے ہاتھ اوپر کرکے تختہ ہٹانے کی کوشش کی، لیکن بالائی کریٹ وزنی تھا۔ وہ اسیر قفس پنچھی کے مانند پھڑپھڑا کے رہ گئی۔

بے خیالی میں اس نے جیب سے جورڈن کی گھڑی نکالی۔ آہ، اسے علم ہوگیا ہوگا۔ وہ خیالات کی رو میں بہنے لگی...... وہ اس کی زندگی سے نکل گئی تھی، جورڈن متنفر ہوگا۔ کیلی یہی چاہتی تھی۔ وہ اس کے قابل نہیں تھی۔ ایک جنٹلمین اور دوسری طرف چور، درمیان میں عمیق کھائی تھی...... یہ ملن کیسے ہوتا...... دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔

گھڑی اس نے مٹھی میں دبائی ہوئی تھی۔ قفس کی گھٹن میں وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بے چارگی قلب ونظر سے بے خبر۔ غیراختیاری طور پر اس کی آنکھیں چھلکتی چلی گئیں۔

دفعتاً ٹرک کی رفتار کم ہوئی اور وہ رک گیا۔ باتوں کی آواز آرہی تھی۔ کریٹ اتار کے کارٹ پر رکھے جارہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کریٹ بحری جہاز پر پہنچائے جائیں گے، کیلی نے سوچا۔ وہ بری طرح پھنس گئی تھی۔ اس کا نمبر آیا تو وزن کے باعث ایک ہی کریٹ اٹھایا گیا۔ کیا اس کا خدشہ صحیح ہے۔ منطق چلا رہی تھی کہ کچھ دیر میں وہ جہاز پر ہوگی۔ تاہم اس کے سر سے دوسرا کریٹ ہٹ چکا تھا۔ کارٹ پر سفر ٹرک کی مانند رواں نہیں تھا۔ معاً تھپ کی آواز کے ساتھ کریٹ ساکن ہوگیا۔ کیلی انتظار کرتی رہی۔ آوازیں معدوم ہوتی گئیں اور سناٹا چھا گیا۔ کچھ توقف کے بعد کیلی نے تختہ ذرا سا اٹھا کے باہر جھانکا۔ وہ اسٹوریج میں تھی۔ وہاں کسی ذی نفس کے آثار نہیں تھے۔ ہر طرف کریٹ ہی تھے۔ ٹانگوں کی اکڑن کے باعث اسے باہر آنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم وہ خاموشی برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ آڑے کراس نے ٹانگوں کو ہلایا۔ پنڈلیوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ دورانِ خون بحال ہو رہا تھا۔ باہر کا راستہ ایک تنگ کوریڈور میں تھا جس کے سرے پر دو آدمی ہنسی مذاق میں مگن تھے۔ اچانک کیلی لڑکھڑائی' اس کے قدموں تلے جیسے لہر پیدا ہوئی۔ انجن کی آواز بھی سماعت سے ٹکرائی۔ آواز بلند ہوتی گئی۔ اس نے کوریڈور کی دیوار پر نگاہ مرکوز کی۔ وہ ایمرجنسی فائر کٹ تھی جس پر "ولافورڈ" کی مہر ثبت تھی۔ وہ وان ویلڈٹن کے بحری جہاز پر تھی۔ فرش پھر لہرایا۔ کیلی نے دیوار کے سہارے خود کو سنبھالا۔ مخصوص حرکات سے وہ سمجھ گئی کہ بحری جہاز سمندر میں نکل رہا ہے۔

☆☆☆

ہیوتا وسٹوک کی لیموزین، گلفرڈ کے باہر سڑک کے ساتھ منتظر تھی۔ جورڈن، اسکاٹ لینڈ یارڈ کے دونوں آدمیوں کے ساتھ پہنچا...... لیموزین کا عقبی دروازہ کھلا اور وہ اندر چلا گیا۔

"میں سمجھا تھا کہ میں ریٹائر ہوچکا ہوں۔" انکل ہیو نے جورڈن کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ بعد کی زندگی تمہیں بچاتے ہوئے گزرے گی۔"

"ہیلو، سوئٹ انکل...... رچرڈ کہاں ہے؟"

"حاضر اور تیار۔" ڈرائیونگ سیٹ کی طرف سے آواز

آئی۔ رچرڈ شوفر کی یونیفارم میں تھا۔ وہ گردن موڑ کے مسکرا رہا تھا۔

"تم اکیلے؟ کیلی کہاں ہے؟"

"نہیں معلوم، صرف اندازہ ہے۔ کیا شپنگ شیڈول کنفرم ہے؟"

"ولا فورڈ، آدھی رات میں نکلے گا۔" رچرڈ نے جواب دیا۔

"تمہاری وہاں کیا دلچسپی ہے؟" انکل ہیو۔۔۔۔ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جہاز پر نوادرات کا خزانہ ہے۔ اور۔۔۔۔۔ر۔۔۔۔۔ ایک چھوٹا سا چور۔"

رچرڈ نے کار ہائی وے پر ڈال دی تھی۔ "تمہیں اسے روکنا چاہیے تھا۔ وہ سارے آپریشن میں خلل ڈال دے گی۔"

"وہ کسی کی نہیں سنتی۔ کسی پر بھروسا نہیں کرتی۔" جورڈن بولا۔

"میں نے سنا ہے، مس رائس کا نام۔ وہ تم پر بھروسا نہیں کرتی؟" انکل ہیو کی آواز میں خفیف سی چبھن تھی۔

جورڈن سامنے سڑک کو گھورتا رہا۔ "میں سمجھا تھا کہ وہ کرتی ہے۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔

"خزانے کے پیچھے ہو یا چور کے؟"

جورڈن ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کتنے پیچ وخم، زیر و بم تھے۔ تنگ و تاز تھی۔ کتنے موڑ تھے۔۔۔۔۔ وہ یقین کر بیٹھا تھا کہ آواز کی پرواز ایک ہے۔ ساز ایک ہے۔ نغمہ ایک ہے۔۔۔۔۔ تب وہ حشر ساماں، آفت جاں۔۔۔۔۔ ماہ جبیں، زہرہ نگاہ۔۔۔۔۔ غم ہجر میں اسے تہی داماں چھوڑ گئی۔ نیرنگیٔ غم پر مسکراؤں یا تلخیٔ غم بڑھا لوں؟ حیرانی دائم کا تقاضا کچھ اور تھا، دل کا اور۔۔۔۔۔ پسِ نغمہ کوئی بات تھی۔ آگ سی سینے میں لگی تھی۔ دل اب بھی دھڑک رہا تھا قربت کے لیے۔

"کہاں کھو گئے؟" انکل ہیو کی آواز نے جورڈن کو خیالات کے حصار سے نکالا۔

"وہ شپ پر۔۔۔۔۔"

"میں بتاتا ہوں۔" رچرڈ نے قطع کلامی کرتے ہوئے جورڈن کی مشکل آسان کی۔

"ہونہہ۔۔۔۔۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپریشن پر دھیان رکھو۔" انکل ہیو نے کہا۔

پورٹ ماؤتھ ابھی تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ جورڈن پھر تصور کی دنیا میں کھو گیا۔ وہ کیلی کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ کیسی چبھن تھی۔ وہ کیا سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ دفعتاً شعلہ سا لپکا گھڑی!! اس نے گھڑی کیوں نکالی۔ اوہ تو، دل کی بات تھی جو وہ اشارہ پا گیا۔ وہ آدھا جھوٹ تھا، آدھا سچ۔ کچھ سرکشی اور کچھ مایوسی۔۔۔۔۔ وہ اسے خود سے دور دھکیل رہی تھی۔ آخری امتحان کے لیے اسے دیوار سے لگا رہی تھی۔ "مجھے پہلے جان لینا چاہیے تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔" اگر وہ ناکام ہو گیا تو اس کی کیا حالت ہو گی، وہ مرنے سے پہلے مر جائے گی۔ جورڈن کو خود پر غصہ آیا۔ حالات دونوں کو جدا کر رہے تھے۔ اس کا ماضی! وہ کیسے اس پر بھروسا کرتی۔ اور وہ کیوں اس پر اعتماد کرتا۔ کیلی نے اسے خلجان سے، مدوجزر سے نکال کر فیصلہ کن راستے پر ڈال دیا تھا اور اپنے لیے وہ ایذا طلب تھی۔ عشق کو ناز سکھانے کے لیے خاردار جان لیوا راستہ چنا تھا۔

شاید وہ آغازِ سفر سے ٹھیک ہی کر رہی تھی۔ شاید وہ درمیانی خلیج کو پاٹ نہیں سکتے تھے۔ جورڈن کا اضطراب مزید بڑھ گیا۔

☆☆☆

میک لوئڈ، پولیس کے ساتھ پورٹ پر منتظر تھا۔

"تاخیر ہو گئی۔" وہ بولا۔ انکل ہیو اور جورڈن نے لیموزین سے باہر قدم رکھا۔

"جہاز وقت سے پہلے نکل گیا۔" میک نے وضاحت کی۔

"انہوں نے پلان تبدیل کر دیا۔"

وہ وہاں ہو گی۔۔۔۔۔ تنہا۔ جورڈن نے تاریکی میں گھورتے ہوئے سوچا۔

"تمہیں اُسے روکنا ہو گا۔" جورڈن، میک لوئڈ کی جانب گھوما۔

"تم میجر آپریشن کی بات کر رہے ہو۔ بغیر ثبوت کے مشکل کھڑی ہو جائے گی۔" میک نے کہا۔

"تمہیں گھڑی چاہیے یا چور۔۔۔۔۔ غیر قانونی خزانہ اگر ہوا تو اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔" انکل ہیو نے جورڈن کو ایک طرف لے جا کر سوال کیا۔

"دونوں۔" جواب ملا۔

ہیو نے پُرسوچ انداز میں سر کو جنبش دی۔ پُرسوچ انداز میں جورڈن کو گھورا۔ جورڈن پھر میک لوئڈ کے ساتھ تکرار میں مصروف ہو گیا۔ میک نے بے بسی سے لارڈ ہیو کی طرف دیکھا۔

"ہمیں رائل نیوی کی مدد لینی پڑے گی۔" انکل نے کہا۔

"لیکن اگر وہاں ٹھوس ثبوت ہاتھ نہ آیا تو خوب دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"میں نے کہا ہے کہ سب کچھ وہیں ہے۔ ثبوت اور کیلی دونوں۔" جورڈن نے بے قراری سے کہا۔

"لیکن ہم کیلی کا ذکر نہیں کریں گے۔ کوئی اور معقول بہانہ تراشیں گے۔" انکل نے کہا۔

جورڈن کا اضطراب حدود سے چھلک پڑا۔ "وہ آپ کی ایجنٹ نہیں تھی۔ اس نے کبھی ملک یا کوئین کی حفاظت کا حلف نہیں اٹھایا۔ وہ سویلین ہے۔ اسے وہاں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

ہیو نے حیرت سے بھتیجے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اس کی اتنی اہمیت ہے تمہارے لیے؟“

”ہاں۔“ جورڈن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”بہت زیادہ اہمیت ہے۔“

انکل ہیو نے آسمان کی طرف دیکھا۔ موسم مشکوک تھا۔ ”وہ انگریزی سمندر کی حدود سے نکل گیا تو صورتِ حال پیچیدگی اختیار کرلے گی۔“ میک ڈونلڈ نے یاددہانی کرائی۔

”جورڈن، جہاز پر تمہاری موجودگی کا کوئی جواز نہیں پیش کیا جاسکتا۔“ ہیو نے کہا۔

”نیوی میری موجودگی کی تردید کرسکتی ہے۔“ جورڈن نے جواب دیا۔

”یہ لڑکی کوئی غیر معمولی چیز ہے۔“ ہیو نے گہری سانس لی۔ پھر نئے سرے سے مشاورت کا آغاز ہوا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد دونوں آدمیوں کی ٹھٹول بازی ختم ہوئی اور آوازیں دور ہوتی ہوئی معدوم ہوگئیں۔ کیلی اسٹورتیج میں سے نکلنے کے خطرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ قبل اس کے، کوئی اور ظاہر ہوتا اسے روپوش ہونے کے لیے نئی جگہ تلاش کرنی تھی۔ وہ دوبارہ کریٹ میں چھپنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ بالآخر وہ کوریڈور میں داخل ہوگئی۔ وہاں سے نکل کر وہ دونوں افراد کی مخالف سمت میں چل پڑی۔

ڈیک پر کوریڈورز کا جال بچھا تھا، کیا کرے؟ سوال کا جواب قدموں کی آہٹ نے دے دیا۔ وہ بے محابا قریبی دروازے میں داخل ہوگئی۔ یہ مقام عملے کے لیے تھا۔ آہٹ قریب تر ہوگئی۔ اس نے لاکرز کی قطار کو دیکھا اور افراتفری میں سکڑ کے ایک لاکر میں دبک گئی۔ وہاں گندے کپڑوں کی بو موجود تھی۔ جوتوں کا جوڑا ابھی نظر آرہا تھا۔ کیلی نے محسوس کیا کہ وہ دو آدمی تھے اور لاکرز کی طرف ہی آرہے تھے۔ وہ کیلی کے لاکر سے دور رہے تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ مطلوبہ شے لے کر دونوں باہر نکل گئے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ شپ پچیس ناٹ کی رفتار پکڑ چکا ہے۔ کیلی باہر نکل آئی۔

کیلی لائف بوٹس کی تلاش میں تھی۔ ابھی تک وہ نظر میں نہیں آئی تھی۔ بچتی بچاتی وہ بھٹکتی رہی۔ انجام کار لائف بوٹس اسے اسٹار بورڈ گن ویل کے ساتھ منسلک دکھائی دیں۔

☆☆☆

سائمن ٹروٹ برج پر کھڑا دوربین کے ذریعے کھڑکی کے عقب سے بگڑتے ہوئے موسم کے تیور دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ کیپٹن مطمئن تھا۔ تاہم سائمن کی بے چینی کم نہیں ہورہی تھی۔ وان ویلڈن، سائمن کی سوچ سے بے خبر تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی برج پر موجود تھا۔ ناگفتہ بہ صحت اور اس عمر میں کسی قسم کا خوف بے معنی ہوگیا تھا۔ چاہے وہ سمندری طوفان ہی کیوں نہ ہو۔

”آثار اچھے نہیں ہیں۔“ سائمن ٹروٹ نے کیپٹن کو مخاطب کیا۔

”اتنے برے بھی نہیں ہیں۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”لیکن اگر تم چاہو تو واپس پورٹ ماؤتھ چلتے ہیں؟“

”نہیں۔“ سائمن کی جگہ وان ویلڈن نے جواب دیا۔

سائمن نے دوربین کا رخ تبدیل کیا۔ وہ مین ڈیک پر تین افراد کو مصروف دیکھ رہا تھا۔ معاً اس نے اسٹار بورڈ کے قریب چوتھی شبیہ دیکھی جو جھلک دکھلا کر غائب ہوگئی۔ اسے علم تھا کہ اس جانب لائف بوٹس ہیں۔ ”وہ کون تھا؟“

کیپٹن کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ ”کیا کہہ سکتا ہوں۔“

سائمن نے فی الفور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس کا رخ اسٹار بورڈ کی جانب تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے گن نکالی۔ لائف بوٹس پر واٹر پروف کور پڑا تھا۔

”آؤٹ۔“ سائمن غرایا۔ ”باہر نکلو۔“ شیٹ کے نیچے حرکت پیدا ہوئی...... آہستگی سے ایک دہشت زدہ چہرہ نمودار ہوا۔

”ویل...... ویل...... ل...... کیا یہ مس کیلی رائس کا چہرہ ہے۔“ سائمن نے شدید حیرت کے ساتھ کہا۔

☆☆☆

کشادہ کیبن، لیونگ روم کے مانند تھا۔ ویل فرنشڈ اور لگژری۔ چھت میں کرسٹل کا فانوس لٹک رہا تھا۔ کیلی کو مہاگنی کی کرسی پر باندھ دیا گیا۔ کرسی پر سبز ویلوٹ چڑھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ آرام ریسٹ پر جکڑے گئے تھے۔ سائمن نے اس کی جیبیں اور بیگ خالی کردیا۔ قفل شکن اور کیمرا دیکھ کر وہ بولا۔ ”بہت اچھے، پوری تیاری کے ساتھ آئی ہو۔ جہاز پر کیونکر پہنچیں؟“

”ٹریڈ سیکرٹ۔“ وہ بولی۔

”کیا تم تنہا ہو؟“ سائمن نے گھڑی اٹھائی۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں بتادوں گی۔“ کیلی نے جواب دیا۔

سائمن نے دو قدم بڑھا کر ہاتھ گھمایا۔ بھرپور تھپڑ تھا۔ کیلی کا سر گھوم گیا۔

”اسے برہم کروگی تو تم شدید خسارے میں رہوگی۔“ وان ویلڈن کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ ”مس رائس، اسے غصہ نہ دلاؤ۔“

کیلی نے آنکھیں سکیڑ کے نظر کا زاویہ تبدیل کیا۔ وان ویلڈن اس کی توقع سے زیادہ بوڑھا اور لاغر دکھائی دے رہا تھا۔ آکسیجن کا ٹینک، وہی چیئر کے عقب میں تھا۔ جہاں سے پلاسٹک

ٹیوبس نکل کر اس کے نتھنوں میں اٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی کھال مہین کاغذ کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وان ویلڈن موت سے بہت قریب تھا۔

"میں پھر پوچھتا ہوں، کیا تم اکیلی ہو؟"

"نیوی سیل کی ٹیم میرے ساتھ ہے۔" جواب ملا۔

سائمن کا ہاتھ دوبارہ حرکت میں آیا۔ کیلی کے دماغ میں گویا روشن بلب تھا۔ جو ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ہونٹوں سے خون رسنے لگا۔

"جورڈن کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

سائمن نے گھڑی کھول کر اندر کھودا گیا نام پڑھا۔ "برنارڈ ٹاوسٹوک۔" پھر کیلی پر نگاہ ڈالی۔ "تم نہیں جانتیں وہ کہاں ہے؟"

"میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔"

"پھر یہ گھڑی کیا کہہ رہی ہے؟" سائمن نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔ کیلی تیسرے تھپڑ کی منتظر تھی۔ ناموسِ محبت پر حرف نہ آنے دوں گی۔ ہر خلش دل سے مٹا دوں گی۔ ہونٹوں کا خون ٹھوڑی سے ہوتا ہوا قالین پر ٹپک رہا تھا۔

"یہ گھڑی میں نے چرائی ہے۔" کیلی نے کہا۔ وہ گردشِ دوراں پر حیران تھی۔ وہ سچ بول رہی تھی اور وہ یقین نہیں کر رہا تھا۔

"وہ اب بھی تمہارے لیے کام کر رہا ہے؟" سائمن نے سوال کیا۔

"میرا اور اس کا تعلق ختم ہو چکا ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔"

سائمن نے وان ویلڈن کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ جورڈن کا خطرہ ابھی باقی ہے۔"

"اس کے خاتمے کا انتظام کرو۔" وان ویلڈن نے حکم دیا۔

کیلی نے سر اٹھایا۔ "نہیں، نہیں۔ اس معاملے سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔"

"گزشتہ ہفتے وہ تمہارے ساتھ تھا۔"

"اس کی بدقسمتی۔" کیلی نے کہا۔ "سیکس، اور کچھ نہیں۔"

"تم سمجھتی ہو کہ میں یقین کر لوں گا۔" سائمن بپھر گیا۔

"وقت ضائع مت کرو۔ اسی طرح اٹھا کر سمندر میں پھینک دو۔" وان ویلڈن نے بے حسی کے ساتھ کہا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ اور......" اچانک وہ مڑا۔ انٹرکام کی آواز نے فقرہ مکمل کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ دیوار کے قریب جا کر اس نے اسپیکر کا بٹن دبایا۔

"سر، یہاں اوپر نئی صورتِ حال ہے۔ شاہی بحریہ کا جہاز ہمارے پیچھے ہے۔ وہ اوپر آنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"ان کا کہنا ہے کہ پورٹ ماؤتھ سے نکلنے والے جہازوں پر IRA کے شرپسندوں کی موجودگی کا امکان ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ لوگ عملے میں گھل مل گئے ہیں۔"

"ان کی درخواست رد کر دو۔" وان ویلڈن نے سکون سے کہا۔

"ان کی مدد کے لیے ہیلی کاپٹرز بھی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اور شپ بھی آس پاس ہے۔" کیپٹن نے کہا۔

"ہم بارہ میل کی حد سے آگے ہیں۔ انہیں یہاں آنے کا حق نہیں ہے۔" وان ویلڈن نے توجیہہ پیش کی۔

"سر میں تعاون کا مشورہ دوں گا...... روٹین چیک اپ معلوم ہوتا ہے۔" کیپٹن کی آواز آئی۔ وہ عملے کو دیکھیں گے۔ اگر ہم نے انکار کیا تو خواہ مخواہ شک پیدا ہوگا۔"

وان ویلڈن اور سائمن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر وان ویلڈن نے سر کی جنبش سے اشارہ دیا۔

"تمام افراد کو ایک جگہ ڈیک پر لاؤ۔" سائمن نے انٹرکام پر کہا۔ "لیکن انہیں وہیں محدود رکھنا۔"

"یس سر۔"

"ہم دونوں کو ڈیک پر ہونا چاہیے۔" سائمن نے وان ویلڈن سے کہا اور اس کی وہیل چیئر کمرے سے نکال کر پرائیویٹ ایلی ویٹر میں لے گیا۔

"میں، مس رائس کو محفوظ کر کے برج پر ملتا ہوں۔" سائمن نے ایلی ویٹر کا بٹن دبایا اور واپس کمرے میں آ گیا۔ اس نے کیلی کے بندھن چیک کیے پھر احتیاط اور تیزی سے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ باہر نکل گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی کیلی بندشوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگی۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ بندھن مضبوط ہیں، نجات ممکن نہیں۔ اس نے آنسو روکنے کی کوشش کی، کیا وہ یہاں آئیں گے یا بالا ہی بالا چلے جائیں گے۔ ان کے تو گمان میں نہ ہو گا کہ نیچے ایک پنچھی قفس میں حال سے بے حال ہے۔ آہ، اتنے قریب آ کے بھی کتنی دوری ہے۔ اس نے دانت پر دانت جمائے اور ایک بار پھر جکڑ بندی سے نجات حاصل کرنے کے لیے زور لگانا شروع کیا۔

☆☆☆

جورڈن ہیلی کاپٹر کی کھڑکی سے نیچے دشمن کے علاقے (ڈیک) کو دیکھ رہا تھا۔ معقول امکان تھا کہ اسے پہچانا نہیں جائے گا۔

"تمہیں یقین ہے کہ تم ہمارے ساتھ اترو گے؟"

"یس، شیور۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس بیس منٹ ہیں۔" نیول آفیسر نے کہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

"اس کے بعد ہم نکل جائیں گے...... تم ساتھ ہو یا نہ ہو۔ ہمیں واپس جانا پڑے گا۔"

"سمجھ گیا۔"

"بیس منٹ، میرے لیے کافی ہیں۔ تم بُرا وقت نہیں دیکھو گے۔ آج کی رات وان ویلڈن کے لیے بدترین ثابت ہوگی۔"

جورڈن کے لہجے میں الاؤ دہک رہا تھا۔ وہ نیوی یونیفارم میں تھا۔ اس کے ساتھ اترنے والے سات دیگر نیول آفیسر کے لیے وہ ایک مشکوک آدمی تھا۔ تاہم جورڈن کو پروا نہیں تھی۔ اس کے دماغ میں ایک سودا سمایا ہوا تھا۔ اسے آخری امتحان پاس کرنا تھا۔ جہاز پر کوئی اس کا منتظر تھا۔ ہر دھڑکن میں کیلی کا نام تھا۔

☆☆☆

"لیفٹیننٹ کمانڈر رٹوبی، رائل نیوی۔"

"سائمن ٹروٹ، وی پی آپریشن، وان ویلڈن کمپنی۔ کمانڈر کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"کریو کو چیک کرنا ہے۔"

"کیوں نہیں۔ ہم نے انہیں یہاں جمع کرلیا ہے۔" سائمن نے برج اسٹیرویے کے قریب مجتمع کریو کی جانب اشارہ کیا۔

"کیا یہی تمام لوگ ہیں؟"

"دو آدمی برج پر ہیں۔ کیپٹن اور خود مسٹر وان ویلڈن۔"

"ڈیک کے نیچے کوئی ہے؟"

"نو سر۔"

کمانڈر نے سر ہلایا۔ دونوں ٹیموں کے ٹاکرے سے چند سیکنڈ پہلے جورڈن کمالِ ہوشیاری سے ادھر سے کھسک گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، شروع کرتے ہیں۔" کمانڈر نے کہا۔

جورڈن زیریں کوریڈورز میں چکرا رہا تھا۔ وقت کی قلت اس کے ذہن میں تھی۔ لہٰذا وہ آوازیں لگانے لگا۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا، کوئی بھی سن سکتا تھا۔ بوجہ وہ کیلی کے بجائے ڈیانا کو آوازیں دے رہا تھا۔

ڈوروے، کریو کوارٹرز، آفیسرز کوارٹرز، میس ہال، کیلی......

کیلی کہیں نہیں تھی۔ وہ مزید پیچھے کی جانب گیا اور اسٹوریج میں جا پہنچا۔ کمرے میں درجنوں کریٹس تھے۔ ایک کا تختہ کچھ ہٹا ہوا تھا۔ جورڈن نے اس میں جھانکا۔ وہ کسی بت کا چیتنل نما سر تھا۔ چہرہ نسوانی۔ جورڈن نے تیزی سے اطراف میں دیکھا اور آواز دی۔ ڈیانا، ڈیانا۔

دس منٹ گزر گئے تھے۔ پریشانی نے سر اٹھایا۔ انجن روم اور کارگو بے ابھی باقی تھے۔ اس کے علاوہ کہاں، کون، کون سی جگہیں تھیں؟ اوپر سے ہیلی کاپٹر کی آواز آئی۔ ایک اور چاپر لینڈ کررہا تھا۔ کون آیا ہے؟

جورڈن نے مہاگنی سے بنا ڈور دیکھا۔ جس پر پرائیویٹ کا نشان تھا۔ کیپٹن کے لیے؟ اس نے ناب گھمانے کی کوشش کی۔ لاک۔ اس نے کئی بار زوردار دستک دی۔ "ڈیانا؟"

جواب ندارد۔

کیلی نے جورڈن کی آواز سن لی تھی۔ وہ اس کا فرضی نام لے رہا تھا۔ ٹیپ کی وجہ سے وہ جواب دینے میں ناکام رہی۔ وہ نیم پاگل ہوگئی۔ مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ اس نے چیخنا چاہا۔ نہ جاؤ۔ کیلی نے محسوس کیا کہ وہ ہٹ رہا ہے۔ میں کتنا ہی بھاگوں، اس کی آس نہیں ٹوٹے گی۔ کیلی نے مایوسی کے ساتھ کرسی جھلانا شروع کی۔ دائیں بائیں...... بائیں سے دائیں۔ کرسی میز سے ٹکراتی ہوئی گری۔ اذیت کے باعث اس کے سر میں شرارے سے چھوٹے۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ پردہ گر گیا۔ کھسکنے کے لیے وہ توانائی کا ایک ایک اونس خرچ کررہی تھی۔ بینائی بحال ہونا شروع ہوئی۔ اس کے بکھرے ہوئے اعصاب وحواس نے شک محسوس کیا کہ کوئی دروازے سے ٹکرایا ہے۔ کوئی چیز دروازے سے بار بار ٹکرا رہی تھی۔ فائر کٹ کی سرخ کلہاڑی نے دروازے کے تختے ادھیڑ دیے تھے پھر ایک ہاتھ نے اندر آکے دروازے کی ناب گھما کر دروازہ کھول دیا...... جورڈن اندر داخل ہوا۔

"مائی گاڈ۔" کیلی کی حالت دیکھ کر وہ بڑبڑایا۔ فوراً ہی وہ اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ اسے بندھنوں سے آزاد کررہا تھا۔ بعدازاں، ٹیپ اس کے منہ سے ہٹایا۔ کیلی کے ہاتھ پیر سن ہورہے تھے۔ وہ جورڈن کی بانہوں میں سِتی سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ بار بار کیلی کا نام دہرا رہا تھا۔ ڈیانا نہیں، کیلی کا نام۔ اچانک مدھم سی "بپ" کی آواز نے اسے الرٹ کردیا۔ اس نے بیلٹ کے ساتھ لگے بیپر کی آواز بند کی۔ "ہمارے پاس ایک منٹ بچا ہے۔ کیا تم چل سکتی ہو؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ اُف میری ٹانگیں۔" وہ کراہی۔

"ٹھیک ہے۔" جورڈن نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آگیا۔

"ہم شپ سے جان کیسے چھڑائیں گے؟" کیلی نے سوال کیا۔

"جیسے آئے تھے، ویسے جائیں گے۔ ہیلی کاپٹر۔" وہ کونے سے مڑا اور یک لخت تھم گیا۔

"مسٹر ناڈسٹوک، مجھے خطرہ ہے کہ تم فلائٹ مس کرنے والے ہو۔" سامنے سائمن ٹروٹ دیوار بن کے کھڑا تھا۔

☆☆☆

کیلی نے محسوس کیا کہ جورڈن کی بانہیں اس کے گرد اور تنگ ہوگئی ہیں۔ اس کی بڑھتی ہوئی دھڑکنیں کیلی کے سینے پر ضربیں لگا رہی تھیں۔

ٹروٹ نے گن سیدھی کی۔ "اِسے نیچے اتار دو۔"

"وہ چلنے کے قابل نہیں ہے۔" جورڈن نے کہا۔

"ویری ویل، کارگو بے میں چلو۔" سائمن ٹروٹ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ گن کی موجودگی میں جورڈن بے بس تھا۔ وہ کریٹس سے بھرے کارگو بے میں آ گئے۔

"میری پارٹی کے علم میں ہے کہ میں بورڈ پر ہوں...... وہ میرے بغیر نہیں جائیں گے۔" جورڈن نے کہا۔

"اچھا۔" سائمن نے چھت کی طرف دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کے روٹرز گھومنے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ "کوئی لمحہ جاتا ہے وہ روانہ ہو جائیں گے۔" ہیلی کاپٹر بلند ہوا اور روٹرز کی آواز دور ہوتی گئی۔ سائمن کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

"ہم تمہاری موجودگی کی تردید کریں گے۔" وہ بولا۔ "البتہ نیوی کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔" اس نے گن والا ہاتھ لہرایا۔ "وہ کریٹ اتنا بڑا ہے کہ تم دونوں اس میں سما جاؤ گے۔ اینڈ برا نہیں ہے۔ انجام کار تم دونوں ساتھ ہو گے۔"

یقیناً وہ ان کو کریٹ سمیت سمندر کی نذر کر دے گا۔ ان کا ملن سمندر کی گہرائی میں ہوگا۔ درحقیقت یہ دو روحوں کا ملاپ ہو گا...... سمندر سے دور آسمانوں میں۔ کیلی کے لیے سانس لینا دشوار تھا...... دماغ سوچنے کے قابل نہ رہا۔

جورڈن کی پُرسکون آواز آئی۔ یہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ انٹرپول اور اٹالین پولیس، نیپلز میں تمہاری منتظر ہے۔"

"نیپلز برسوں سے ہمارے لیے مسئلہ نہیں ہے۔"

"وقت بدلنے والا ہے۔"

"بس بہت ہو گیا ہے۔ اسے نیچے اتارو اور کریٹ میں داخل ہو جاؤ......" جورڈن نے کیلی کو نیچے اتارا۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی اور گھٹنوں پر آ گئی۔

"اسے یہیں چھوڑ دو اور کریٹ کھولو۔" سائمن نے حکم دیا۔

جورڈن پلک جھپکائے بغیر کیلی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی پیغام دینا چاہ رہا تھا۔ کسی قسم کا اشارہ۔ وہ کیلی کے قریب ہو کے جھکا۔ جیکٹ کا ایک حصہ کھل گیا۔ تب کیلی نے شولڈر ہولسٹر کی جھلک دیکھی۔ جورڈن کی پشت سائمن کی طرف تھی۔ کیلی نے پھرتی سے گن ہولسٹر سے کھینچ لی۔

"اس کے قریب سے ہٹ جاؤ۔" سائمن پھنکارا۔

"آنسو بہانے دو۔" جورڈن نے ہونٹ کیلی کی پیشانی پر رکھے۔ پھر ہونٹ پھسل کر کان پر چلے گئے۔ اس نے سرگوشی کی۔ "مجھے شیلڈ بنا کر تمہیں اس کے دھڑ کا نشانہ لینا ہے۔" کیلی نے دہشت سے جورڈن کی آنکھوں میں دیکھا۔ "نہیں۔"

جورڈن نے اس کا شانہ تھام لیا۔ "وقت نہیں ہے، جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔" جورڈن کی آواز میں اذیت اور عجلت کا عنصر تھا۔ دونوں کی نظریں لاک ہو گئیں۔ "تم کو زندہ رہنا ہے۔ ہم دونوں کے لیے۔" کیلی نے پیغام پڑھ لیا۔ جورڈن نے دوسری مرتبہ اس کا شانہ نرمی سے دبایا۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔

"آنسو سمندر میں جا کر بہانا۔ چلو شروع کرو۔" سائمن کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

کیلی نے پہلے کبھی گولی نہیں چلائی تھی۔ ڈو اور ڈائی والا معاملہ تھا۔ خطا کی گنجائش نہیں تھی۔ برعکس صورت میں سائمن نے پورا کلپ جورڈن کے جسم میں اتار دینا تھا۔ کیلی نے قریب قریب صحیح نشانہ لیا تھا۔ جورڈن کے لیے۔

"تم ایسے نہیں مانو گے۔" سائمن بے قابو ہو گیا۔ دھماکا ہوا گولی چلی اور جورڈن لڑکھڑایا۔ گولی اس کی ران میں گھس گئی تھی۔ جورڈن نے دونوں ہاتھوں سے زخم دبایا۔ خون بہہ نکلا۔ کیلی کا چہرہ پہلے سفید پھر سرخ ہو گیا۔ جورڈن کے خون کی جھلک نے اسے مشتعل کر دیا۔ ساری ہچکچاہٹ غضب کے تند ریلے میں بہہ گئی۔

گن مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں لے کر پے در پے اس نے تین فائر کیے۔ ایک گولی سائمن کے سینے میں، دوسری پیٹ میں...... تیسری کا کیلی اندازہ نہ لگا سکی۔ سائمن پیچھے کی طرف گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور دہشت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ٹانگیں جام لنڈھانے والے کے مانند رقصاں تھیں۔ گن ہاتھ سے پھسل گئی۔ وہ خود بھی گھٹنوں کے بل گرا۔ ناتوانی کے عالم میں وہ گن اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بے سود۔

"نکلو یہاں سے۔" جورڈن نے کہا۔

"میں تمہیں چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔"

"منہ بند رکھو۔ میری ٹانگ......" جورڈن نے کرخت لہجے میں کہا۔

"تم چپ رہو۔" وہ لڑکھڑا کے اٹھی اور سائمن کی گن پر قبضہ کر لیا۔ "ہم جہاز پر سے کہاں جائیں گے۔ ہمیں ساتھ رہنا چاہیے۔ دھماکوں کی آواز کے بعد عملہ کسی وقت بھی ہلہ بول دے گا۔" کیلی نے جورڈن کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "تم کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے؟" کیلی نے سوال کیا۔

"تم مجھے بھلا کیوں نہیں دیتیں؟" وہ اپنے ہی خون میں بیٹھا تھا۔

کیلی خاموش رہی۔ جورڈن نے اپنا رومال نکال کر گرہ لگائی۔ یہ ناکافی تھا۔ تاہم اس نے زخم پر کس کر باندھ دیا۔

"بھلا دیا تھا۔" کیلی نے جواب دیا۔

"اسی لیے گھڑی چرائی تھی؟"

"اوہ جورڈن تم کیوں نہیں سمجھتے؟"

"میں سمجھ گیا ہوں۔ اب تمہاری باری ہے۔" وہ بولا۔

قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کتنی دیر فائٹ کریں گے۔ المناک انجام سر پر تھا۔ کیلی نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ اور سرگوشی کی۔ ”آئی لو یو۔“

کوئی دروازے پر تھا۔ کیلی نے گن اٹھا کر نشانہ لیا...... اور فائر کرتے کرتے رک گئی۔ رائل نیوی کا ایک آدمی حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے تین اور تھے۔ ان میں ایک رچرڈ وولف تھا۔ رچرڈ سب کو ہٹا کر کمرے میں آیا۔ جورڈن کی حالت دیکھی اور مڑ کر چلایا۔

”یس سر۔“ ایک آفیسر نے انٹرکام کا رخ کیا۔ کیلی کی گرفت پسٹل پر ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھی۔ رچرڈ نے ہاتھ بڑھایا اور نرمی سے مسکرایا۔ کیلی نے کچھ کہے بغیر گن اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”گڈ گرل۔“ رچرڈ نے کہا۔

ہیلی کاپٹر، میڈیکل ٹیم کے ساتھ پہنچ رہا تھا۔ وہ قریبی بحری جہاز سے اڑ کر آرہا تھا۔

☆☆☆

کیلی طبی عملے کی کارروائی دیکھتی رہی۔ وہ اسٹریچر کے قریب تھی۔ بعدازاں اسٹریچر کو ہیلی کاپٹر کی طرف لے جایا گیا۔ اسے لگا کہ جورڈن جدا ہو رہا ہے۔ وہ دوڑ پڑی۔ جو راستے میں آیا اسے ہٹا دیا۔ خدشات دہلا رہے تھے کہ وہ آج کے بعد اسے کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ رچرڈ نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ ”اسے اسپتال لے جا رہے ہیں۔“

”اسے میری ضرورت ہے۔ میں اس کے ساتھ رہوں گی۔“

”میرا وعدہ ہے، تم جلد اسے دیکھو گی۔ اس وقت ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔“ رچرڈ کی آواز اس نے سنی ہی نہیں۔ وہ بلند ہوتے ہیلی کاپٹر کو تک رہی تھی۔ زیرِ لب دعا گو تھی۔

☆☆☆

جورڈن کو دیکھے ہوئے دو روز بیت گئے تھے۔ کیلی کو بتایا گیا تھا کہ جورڈن کا خون زیادہ بہہ گیا تھا لیکن سرجری کامیاب رہی۔ اس کے سوا اسے کچھ علم نہیں تھا۔

رچرڈ نے اسے M16 کے ذریعے لندن سے باہر ایک سیف ہاؤس میں منتقل کرا دیا تھا۔ کیلی کے لیے یہ بھی قید خانے سے کم نہیں تھا۔ یہ تاثر اسے تین آدمیوں کی وجہ سے ملا تھا جو سیف ہاؤس کی حفاظت کر رہے تھے۔ رچرڈ نے کہا تھا کہ یہ انتظام صرف اس کے تحفظ کے لیے تھا۔ وہ کچھ اور سمجھ رہی تھی اور اسے اپنے نظریے پر حیرت بھی نہیں تھی۔ لارڈ فیملی انجام کار کسی نقصان سے بچ گئی تھی۔ کیلی اتنی اہم نہیں تھی۔ اگرچہ جورڈن اس کے لیے آخری حد تک گیا تھا۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور کھائی تھی۔ فیملی کیا کرے گی۔ ان کے نزدیک جورڈن زیادہ اہم تھا۔ وہ ان کی سوچ کو الزام نہیں دے سکتی تھی لیکن اس کی آزادی سلب ہو گئی تھی جو اس کی افتادِ طبع کے خلاف تھی۔ دو دن بعد اس کا صبر جواب دے گیا۔ بیگ اٹھا کر اس نے باہر کا رخ کیا۔ گارڈ راہ میں حائل تھا۔

”میں جانا چاہتی ہوں۔“

”یہ ممکن نہیں۔“ اس نے شائستگی سے کہا۔

”ممکن ہے، تم دیکھو یا شوٹ کرو۔“ کیلی نے اسے ایک طرف کیا۔ اس وقت لیموزین ڈرائیو وے میں داخل ہوئی۔ کار اس کے سامنے رکی۔ وہ تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ شوفر اترا اور گھوم کر عقبی گیٹ کھولا۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس ایک عمر رسیدہ شخص اترا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولا۔ ”یعنی تم ہو مس کیلی رائس۔“

کیلی نے اسے سرتاپا دیکھا۔ ”اور آپ؟“

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”میں ہیوناوستوک، جورڈن کا انکل۔“

کیلی ٹپٹا گئی۔ بنا الفاظ کے اس نے ہاتھ ملایا۔

”مس رائس تم سے چند باتیں کرنی ہیں۔“ انکل نے کہا۔ ”پلیز تم کار میں بیٹھو گی؟“

”دراصل میں رخصت ہو رہی تھی۔“

”مطلب تم جورڈن کو دیکھنا نہیں چاہتیں؟“

کیلی کا دل دھڑکا۔ اس نے انکل کو پڑھنے کی کوشش کی۔ تاہم انکل کے تاثرات سپاٹ تھے۔ وہ اندر بیٹھ گئی۔

وہ کچھ فاصلے سے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ہم کیا بات کر سکتے ہیں۔ وہ پریشان تھی۔ میں اس دنیا کے لیے اجنبی ہوں...... جیسے وہ ہمارے لیے......

”یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرا بھتیجا تم سے کوئی انجانا رشتہ قائم کر چکا ہے۔“ انکل ہیو نے آغاز کیا۔

”آپ کا بھتیجا ایک اچھا انسان ہے۔“ وہ بولی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دوبارہ نرمی سے گویا ہوئی۔ ”بہت نفیس آدمی ہے۔“

”اس کے بارے میں میرے خیالات بھی ہمیشہ ایسے ہی رہے ہیں۔“

”اس کا حق بنتا......“ وہ بات پوری نہ کر سکی کہ آنسوؤں کو روک رہی تھی۔ ”وہ بہترین کا حق دار ہے۔“

”تم نے سچ کہا۔“ انکل ہیو نے تائید کی۔

”تو......“ کیلی نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ ”لارڈ.... آپ کو سمجھنا چاہیے کہ میری وجہ سے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوگی۔ میرا کوئی مطالبہ ہے نہ توقعات۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں......“ وہ دوسری

طرف دیکھنے لگی۔ ''میں اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں کچھ بھی کر جاؤں گی۔ ممکن ہے غائب ہوجاؤں۔''

''تم اس سے محبت کرتی ہو۔'' یہ سوال نہیں بیان تھا۔

اور اس مرتبہ وہ اشک پر قابو رکھنے میں ناکام رہی...... وہ بہہ نکلے دھیرے سے...... خاموشی سے۔

''نہیں۔ حفظِ مراتب کے بغیر نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' انکل ہیو نے استفسار کیا۔

''بہت سی لڑکیاں تیار ہیں اس کے لیے۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''وجہ بھی جانتے ہوں گے آپ؟'' کیلی نے کہا۔

''ہاں، لیکن ان میں سے کوئی بھی تمہاری طرح نہیں ہے۔ تم نے تن تنہا وکٹر وان ویلڈن سے ٹکر لی اور اس کی ایمپائر کے خاتمے کا آغاز ہوا۔''

کیلی نے شانے اچکائے۔ جیسے اس کے نزدیک اس کارنامے کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ بے دھیانی سے سن رہی تھی کہ ولا فورڈ پر کیا کیا لدا تھا۔ ویرونیکا اور اولیور کو کیسے گرفتار کیا گیا۔ میکس ہیولر کے غرقاب ہونے کی تفتیش دوبارہ شروع ہوئی۔ زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل اولیور کمپنی کے گودام سے برآمد ہوئے...... وغیرہ...... وغیرہ......

''تمہاری خدمات ہم سب کے لیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ مس رائس میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔''

وہ خاموش رہی۔ تاہم اسے حیرت ہوئی جب انکل نے کہا۔

''میں زندگی میں بہت سے ہیروز سے مل چکا ہوں لیکن تعریف کے مقابلے میں تمہارے جیسا ردِعمل مجھے کہیں نہیں ملا۔''

کیلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لارڈ لیوٹ میں تھک چکی ہوں۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''امریکا؟''

''وہی میرا گھر ہے۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتی۔''

''جورڈن کا کیا ہوگا۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔''

''آپ خود سمجھ گئے ہیں کہ حفظِ مراتب کسے کہتے ہیں......''

''جن لڑکیوں کی تم بات کرتی ہو، جورڈن ان میں دلچسپی نہیں رکھتا۔''

کیلی کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔

''دو دن سے......'' انکل ہیو نے کہا۔ ''اچھی فطرت کا حامل میرا نارمل بھتیجا بے قرار ہے، قابو سے باہر ہے۔ دو مرتبہ اس نے اسپتال سے نکلنے کی کوشش کی۔ ہم اسے سمجھا رہے ہیں کہ اس کی حالت اجازت نہیں دیتی کہ وہ کہیں جائے۔ وان ویلڈن کی موت کے ساتھ تمہارے قتل کے کنٹریکٹ ختم ہو چکے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم تمہیں اس کے پاس لے جائیں۔ تم اسے سنبھال سکتی ہو۔''

''یہ آپ کا خیال ہے؟''

''نہیں، رچرڈ کا بھی۔''

''اور جورڈن؟''

''وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

کیلی ہنس پڑی...... ہنسی میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ ''آپ کے لیے کس قدر مایوس کن امر ہوگا کہ جورڈن اور میں...... کیا مجھ جیسی لڑکی کو فیملی کلوزٹ میں بند رکھا جائے گا۔''

''اگر میں نے ایسا کیا تو بھی، تمہیں تنہائی نہیں ستائے گی...... ہمارے آباؤاجداد میں سے نصف کلوز اور فولو فریزر میں رہتے ہیں۔ مطلب، دلہن کے انتخاب میں ہمارا انداز غیر روایتی ہے۔'' انکل ہیو مسکرائے۔

''اپنی فیملی میں مجھے شامل کرنا آپ کے لیے کیسا ہوگا؟''

''سوال جورڈن کا ہے۔ یہ اس کا انتخاب ہے۔ اس کی خوشی میں ہم خوش ہیں۔'' انکل ہیو نے جواب دیا۔

کیا پیش گوئی کی جا سکتی ہے؟ کیلی نے سوچا...... ایک مہینے یا سال بعد اس پر انکشاف ہوسکتا ہے کہ دراصل میں کون ہوں...... لیکن وہ جہاز کے قفس سے بچ نکلنے کو کیسے بھول سکتی ہے اور موجودہ مڈبھیڑ نے فرار کا راستہ بند کردیا تھا۔

☆☆☆

اسپتال پہنچنے تک وہ خود سے ہم کلام رہی۔ ایلی ویٹر میں بھی خاموش رہی۔ وہ خود کو کمپوز کر رہی تھی۔ بہتر انداز میں گڈبائے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ وہ ساتویں منزل پر جورڈن کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پُرسکون تھی...... ملنے آئی تھی یا بچھڑنے۔ جورڈن پر نظر پڑی تو یکسو خیالات بکھر گئے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ سفید قمیص بغیر ٹائی کے اور گرے ٹراؤزر۔ بغلوں میں بیساکھیاں تھیں۔ ڈور کی آواز پر وہ بے ڈھنگے انداز میں گھوما۔ وہ توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم نظر کیلی کے چہرے پر تھی۔ کیلی کے ساتھ دینے والے واپس چلے گئے۔ دونوں تنہا رہ گئے۔ دل آگے بڑھ رہا تھا اور ذہن روک رہا تھا۔ وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔ ''میں جانتی تھی کہ تم صحت یاب ہوجاؤ گے۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

جورڈن اس کے چہرے پر کچھ ڈھونڈ رہا تھا جو اسے دکھائی نہیں دیا۔ ''میں تم تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔''

''انکل نے بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی حرکت پذیر ہو۔'' وہ مسکرائی۔ ''لیکن اب وان ویلڈن کا قصہ پاک ہوچکا ہے تو ہم دونوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے راستے پر واپس لوٹ جائیں۔''

''کیا تم ایسا کرو گی؟''

''اور کیا کروں گی؟''

''میرے ساتھ رہو۔'' وہ بہت ساکن کھڑا تھا۔ سنگی مجسمے کے مانند...... کیلی کو تک رہا تھا۔ جواب کا منتظر تھا۔

کیلی نے پہل کی اور نظر ہٹالی۔ ''رک جاؤں؟ تمہارا مطلب ہے انگلینڈ میں؟''

''میرا مطلب ہے، میرے ساتھ۔''

وہ ہنسنے لگی۔ تاثر بے معنی اور مبہم تھا۔

''میرے ذہن میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ تم حقیقت سے انکار کر رہی ہو۔'' جورڈن نے کہا۔

''حقیقت؟''

''ہم نے مل کر آگ اور خون کا دریا پار کیا ہے۔ ایک دوسرے کا خیال کیا ہے۔ کم از کم مجھے اپنے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہے، نہ اپنی چاہت پر کوئی شک۔ اور میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔''

کیلی نے نفی میں سر ہلایا اور پھر ہنسنے لگی۔ غیر حقیقی ہنسی تھی۔ اس کا دل بغاوت پر تلا تھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں اتنا یقین نہیں کہ میں کون ہوں۔''

''میں جانتا ہوں تم کون ہو۔''

''میں نے بار ہا تم سے جھوٹ بولا...... بار بار......''

''جانتا ہوں۔''

''بڑے بڑے جھوٹ۔''

''ساتھ ہی تم نے سچ بھی بولا۔'' جورڈن نے کہا۔

''ہاں، لیکن جورڈن تم بھول رہے ہو کہ میں ایک سابقہ چور ہوں اور میری فیملی بھی ایسی تھی۔''

''تمہارا ماضی میرے لیے اہم نہیں ہے۔''

''اور اسے کیا کہو گے؟'' کیلی نے ناوستوک کی گھڑی نکالی۔ ''میں نے وہ چیز چرائی تھی جو تمہارے لیے اہم تھی۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ میں تمہیں دکھانا چاہتی تھی کہ تم مجھ پر بھروسا کر کے حماقت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔''

''نہیں کیلی ایسا نہیں تھا۔ ایسا تم نے کسی اور وجہ سے کیا تھا۔'' جورڈن نے سکون سے کہا۔

''کس وجہ سے کیا تھا؟''

''تم مجھ سے خوف زدہ تھیں۔''

''میں، خوف زدہ؟''

''ہاں تم میری محبت سے خوف کھا رہی تھیں اور اپنی محبت سے بھی ہراساں تھیں۔ تمہیں یہ خوف تھا کہ یہ محبت پنپ نہیں سکے گی۔''

''اوکے۔'' وہ لاجواب ہو گئی۔ لیکن کیا یہ قابلِ فہم نہیں تھا، فریب کھانے سے بہتر نہیں تھا۔ جذبات کا دریا اترنے کے بعد جلد یا بدیر تمہیں میری حیثیت کا ادراک ہو جانا تھا۔''

''ادراک تھا اور ہے۔ میں اس معاملے میں خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔''

''خوش قسمت۔'' وہ پھر کھوکھلے انداز میں ہنسی اور گھڑی جورڈن کے چہرے کے سامنے لہرائی۔ ''خوش قسمت؟ یاد رکھو میں چور ہوں۔ یہ میں نے چرائی تھی۔''

جورڈن نے اس کی کلائی تھام لی۔ اسے ایک بے ساکھی چھوڑنی پڑی۔ ''تم نے صرف میرا دل چرایا تھا۔''

وہ مہر بہ لب تکتی رہ گئی۔ نظریں ہمکلام تھیں۔ خود فراموشی تھی۔ بلا کی تشنگی تھی...... بے تابیِ قلب بے حال کر رہی تھی۔

''کیلی نہیں۔ اب بھاگنا چھوڑ دو...... ختم کرو...... بس کرو۔'' جورڈن نے کہا۔

کیلی کا وجود بے حس و حرکت تھا۔ وہ قطعی ساکن کھڑی تھی۔

تب دھیرے سے جورڈن نے کلائی چھوڑ دی۔ محض اس کی نظروں نے کیلی کو تھاما ہوا تھا۔

کیلی کا دماغ سُن تھا۔ نئی حقیقت منکشف ہو رہی تھی۔ ''میں تم سے نہیں درحقیقت خود سے بھاگ رہی تھی۔ اپنے ہی وجود سے فرار چاہ رہی تھی۔ تم سے نہیں...... کبھی بھی نہیں۔'' وہ خموش کھڑی سوچ رہی تھی۔ جورڈن نے نرمی سے اس کا رخسار سہلایا۔ ایک آنسو پھسل کے جورڈن کے ہاتھ پر آیا۔

''میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا، کیلی۔ اگر چاہوں بھی تو بالجبر تمہیں نہیں روک سکتا لیکن میں نے بہت پہلے ایک فیصلہ کیا تھا۔ اب فیصلہ کرنے کی تمہاری باری ہے۔'' جورڈن کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ بکھر رہی تھی۔

اشکوں کی جھالر کی دوسری طرف جورڈن کا چہرہ گویا تھرک رہا تھا۔ اس کی نظروں میں اندیشہ تھا، غیر یقینی تھی اور امید تھی...... امید کے ساتھ فریاد تھی۔

کیلی کا پورا وجود طوفان کی زد میں تھا۔ گویا پارہ پارہ ہو جائے گا۔

''تمہارے بھاگنے کے دن ختم ہو گئے۔ بھروسا کرو۔'' وہ بمشکل کہہ سکا۔ ''مم...... م...... مجھے یقین دلاؤ۔''

جورڈن نے دوسری بیساکھی بھی چھوڑ دی۔ لڑکھڑایا۔ کیلی سنبھالنے کے لیے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اشک بار چہرہ اوپر اٹھایا۔ جورڈن نے سر جھکایا۔ ہونٹوں نے آنکھوں سے نکلنے والے نمکین پانی کو چھوا......

کیلی نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ ایک چور کی مسکراہٹ تھی۔ اس نے کیلی کا دل چرا لیا تھا۔

جرم کے راستوں پر پہلا قدم رکھنے کی دیر ہوتی ہے... اس کے بعد قدموں میں تیزی بڑھتی چلی جاتی ہے... وہ بھی اس جرم زدہ دنیا میں داخل ہو چکا تھا... وہ جو دوسروں کی جانوں سے کھیلتے تھے... خود اپنی جان کی حفاظت کرنے پر مجبور ہو گئے...

جرم کی دلدل سے نکلنے کا عزم رکھنے والے نوجوان کی عبرت ناک کتھا......

آستین کا سانپ

تنویر ریاض

ولی کوستا، لٹل ہوانا کے کیوبن ریسٹورنٹ میں بیٹھا اپنے پرانے ساتھی برنارڈو کرز سے باتیں کررہا تھا۔ برنارڈو کی عمر اب ستر برس ہو چکی تھی اور وہ کئی سال پہلے میامی پولیس ڈپارٹمنٹ سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ ولی اس سے تیس برس چھوٹا تھا تاہم اس نے بھی اپنی پرائیویٹ سراغ رساں فرم کھولنے کی خاطر پولیس کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ پرانے دنوں میں اس نے برنارڈو کے ساتھ مل کر مختلف طرح کے غیرملکی مجرموں کا سراغ لگایا تھا جنہوں نے میامی میں اپنے اڈے قائم کررکھے تھے۔ ان میں سے کچھ لاطینی امریکا یا دوسرے ملکوں کی کالعدم سیاسی تنظیموں کے نمائندے تھے جنہیں غیرقانونی طریقے سے پیسے بھیجنے اور پناہ لینے کے لیے میامی بہت پسند تھا۔ دوسرے عام طرح کے مجرم تھے جنہوں نے فلوریڈا میں اپنے غیرقانونی کاروبار کی شاخیں کھول رکھی تھیں جن میں منشیات فروشی، اسلحے کی سپلائی اور انسانی اسمگلنگ جیسے کام شامل تھے۔

اس وقت ولی اور برنارڈو اس آپریشن کی یادیں تازہ کررہے تھے جو انہوں نے روسی مافیا کے عناصر کو کچلنے کے لیے کیا تھا۔ یہ لوگ سوویت یونین کے خاتمے پر میامی آگئے تھے۔ انہوں نے روسی باتھ ہاؤس اور روسی ریستورانوں میں بھیس بدل کر کافی وقت گزارا جو کہ زندگی گزارنے کا مشکل طریقہ نہیں تھا۔

وہ دونوں کافی کے گھونٹ لینے کے ساتھ ساتھ مختلف روسی کھانوں کے ذائقے اور معیار پر بھی گفتگو کررہے تھے کہ ولی کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر دیکھا۔ وہ کوئی مقامی لیکن اس کے لیے اجنبی نمبر تھا۔ اس نے

فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''کوستا انویسٹی گیشن۔''
''کیا میں مسٹر کوستا سے بات کر رہا ہوں؟'' ایک نوجوان نے ہسپانوی میں پوچھا۔
''ہاں، میں کوستا ہی بول رہا ہوں۔'' ولی نے اسی کی زبان میں جواب دیا۔
''تم ہی باڈی گارڈ کے طور پر کام کرتے ہو؟''
ولی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ خدمت بھی انجام دیتا ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''
''میں چاہتا ہوں کہ تم فوری طور پر مجھے تحفظ فراہم کرو۔ ایک شخص جو میامی پہنچا ہے، وہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہے۔''
اس کی بات سن کر ولی چونک اٹھا۔ وہ شخص کچھ زیادہ ہی پُرجوش لگ رہا تھا اور ولی سوچنے لگا کہ کہیں وہ مبالغہ آرائی سے تو کام نہیں لے رہا کیونکہ کچھ لوگ اپنی اہمیت جتانے کے لیے معمولی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں لیکن ولی کو بحث کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے اس نے اپنے مخصوص سادہ انداز میں کہا۔
''وہ آدمی کون ہے اور وہ تمہیں کیوں نقصان پہنچانا چاہتا ہے؟''
اب تک کی گفتگو سن کر برنارڈو نے تیوری چڑھائی۔ اسے بے وقت کی یہ مداخلت اچھی نہیں لگی۔
''جب تم مجھ سے ملو گے تو میں تمہیں تفصیل بتاؤں گا۔'' نوجوان آدمی نے کہا۔
''تم کہاں ملنا چاہتے ہو؟''
''جہاں میں اس وقت رہ رہا ہوں کیونکہ فی الحال میں باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''
ایک بار پھر اس شخص نے اپنی بات اوپر رکھی اور اسی لیے ولی بھی کچھ ہچکچا رہا تھا جسے اس شخص نے بھی محسوس کیا اور بولا۔
''مجھ سے بات کرنے کے بعد تم بہتر طور پر معاملے کو سمجھ سکو گے۔''
''تمہاری رہائش کہاں ہے؟'' ولی نے پوچھا۔
اس شخص نے اسے ایسٹ لٹل ہوانا کے ایک گھر کا پتا بتایا جو اس جگہ سے تقریباً بیس بلاک کے فاصلے پر تھا جہاں اس وقت وہ اور برنارڈو بیٹھے ہوئے تھے۔ پتا معلوم ہونے کے بعد ولی نے اسے اپنی روزانہ کی فیس بتادی اور کہا۔
''میں دو دن کی فیس نقد اور ایڈوانس میں لیتا ہوں۔''
اس کا خیال تھا کہ شاید وہ شخص اس پر راضی نہ ہو لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جب تم مجھ سے ملنے آؤ گے تو میں یہ فیس ادا کر دوں گا۔''
''گڈ، میں آدھ گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟''
''کارلوس، کارلوس مرنڈا۔''
ولی نے کافی ختم کی اور اس شخص کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہو گیا۔ ایسٹ لٹل ہوانا کے علاقے میں کئی عشروں سے پناہ گزینوں کے گروپ آباد تھے اور ان میں سے بیشتر نے اپنے ذاتی گھر بھی بنا لیے تھے۔ 1930ء سے وہاں یہودیوں نے آنا شروع کر دیا جو نازیوں اور یورپ میں ان کے اتحادیوں سے جان بچا کر بھاگے تھے۔ 1960ء تک زیادہ تر یہودی نسبتاً بہتر علاقوں میں منتقل ہو چکے تھے لیکن پھر ان کے خستہ حال گھروں کو آباد کرنے کے لیے کیوبا کے لوگ آنا شروع ہو گئے جنہیں فیڈرل کاسترو کی حکومت نے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ وہ یہاں خوب پھلے پھولے اور جنوبی فلوریڈا تک پھیل گئے۔ یہ بہت سے سینٹرل امریکنوں کا بھی مسکن بن گیا جو ستر اور اسی کی دہائی میں گوریلا جنگ کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے بھاگ کر فلوریڈا آگئے تھے۔
اس علاقے میں بہت سے چھوٹے بڑے پرانے بورڈنگ ہاؤس اور چھوٹے چھوٹے فرسودہ اپارٹمنٹ بھی تھے کیونکہ نئے آنے والے مہاجرین کی الگ گھر لینے کی گنجائش نہیں تھی۔ ان چھوٹے کابک نما فلیٹوں اور مکانوں کی دیواروں میں مختلف کھانوں کی مہک رچ بس گئی تھی جو وہاں برسوں سے پکائے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ یہ مفرور خاندان ابھی تک اس خوف سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے یا انہیں قتل کرنے کے درپے ہے۔
حال ہی میں یہاں کافی تبدیلیاں ہوئی تھیں اور پرانی خستہ حال عمارتوں کو گرا کر بلند و بالا اور جدید اپارٹمنٹ تعمیر کیے گئے تھے۔ کارلوس مرنڈا کا گھر بھی ایسی ہی ایک پانچ منزلہ عمارت میں تھا جس میں بہت سی کھڑکیاں اور کشادہ ورانڈے تھے۔ دیکھنے میں ہی وہ ایک عمدہ جگہ لگ رہی تھی حالانکہ اس کے چاروں طرف پرانے اور بوسیدہ مکانات اور اپارٹمنٹ تھے جن کی دیواروں کا پلاسٹر جھڑ چکا تھا اور

ان پر کائی جمی ہوئی تھی۔

ولی لفٹ کے ذریعے چوتھی منزل پر پہنچا اور 407 کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے چٹخنی گرنے کی آواز سنی لیکن کارلوس مرنڈا دروازے پر نہیں آیا بلکہ اس کی جگہ وہاں ایک نوجوان عورت کھڑی تھی..... اس کی عمر تقریباً پچیس کے لگ بھگ ہوگی دبلی پتلی، چھوٹا قد، جلد کا رنگ انتہائی حد تک گورا، لمبے سیاہ بال اور کافی کلر کی گہری آنکھیں۔ اس نے سفید جینز اور کریم کلر کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی چوکس اور چوکنا نظر آرہی تھی۔

''میں کارلوس مرنڈا سے ملنے آیا ہوں۔'' ولی نے ہسپانوی زبان میں کہا۔ ''کیا وہ یہیں رہتا ہے؟''

لڑکی نے تائید میں سر ہلایا لیکن کچھ نہیں بولی۔ اس نے ولی کو اندر آنے دیا اور اندر سے دروازہ مقفل کر دیا پھر اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بیڈ روم کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

''کارلوس، وہ آگیا ہے۔''

ولی نے اپارٹمنٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اسے روایتی انداز میں سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر پینٹنگز آویزاں تھیں۔ البتہ کوئی خاندانی تصویر یا ذاتی استعمال کی کوئی چیز مثلاً لیمپ، گلدان یا ڈیکوریشن پیس نظر نہیں آیا۔

''وہ ابھی نہا کر باہر آیا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''کیا میں تمہیں کافی یا کوئی مشروب پیش کروں۔''

ولی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ فی الحال اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ لڑکی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر کارلوس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ خاموش طبیعت ضرور تھی لیکن شرمیلی نہیں۔ اس نے سپاٹ انداز میں ولی کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا جیسے نئے کپڑوں کے لیے اس کا ناپ لے رہی ہو یا پھر یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہو کہ اس نے اپنی گن کہاں رکھی ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ کسی پرائیویٹ سراغ رساں سے پہلی بار ملتے ہوئے ایسا ہی کرتے ہیں۔

''میں نے تمہارا نام نہیں پوچھا۔'' ولی نے کہا۔

''میرا نام نینا ہے۔''

''کیا تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو کہ یہ کیا قصہ ہے؟''

اس نے چند لمحے سوچا پھر اس طرح جواب دینے لگی جیسے تھوڑی سی شرمندہ ہو۔

''کارلوس اور میں ایل سالویڈور کے ایک ہی علاقے میں پلے بڑھے اور ہم بچپن سے ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ کئی برس پہلے اس نے ایک تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی اور کچھ عرصہ بعد مقامی سطح کا لیڈر بن گیا۔ لیکن آئے دن اس کی تنظیم کے ساتھی دوسرے گروہوں کے ساتھ جھگڑے میں مارے جاتے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک دن بالآخر اس کا نمبر بھی آئے گا۔ اس لیے اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔''

''اوہ، میں سمجھا۔''

ولی نے حالیہ برسوں میں وہاں ہونے والی گینگ وار کے بارے میں اخبارات میں پڑھا تھا اس لیے لڑکی کے خوف کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔ سینٹرل امریکا کے تمام شہروں پر جرائم پیشہ گروہوں کا کنٹرول تھا جو اپنے اپنے ملکوں میں منشیات اور اسلحے کے بہت بڑے سوداگر بن گئے تھے۔ اکثر اوقات ان گروہوں میں صرف اسی شخص کو شامل کیا جاتا تھا جس نے کم از کم ایک قتل کیا ہو۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا کہ وہ دن دہاڑے کسی اجنبی کو سڑک پر گولی مار دیں۔ پورے علاقے میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور پورے کے پورے خاندان شمال کی طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''لیکن اب تو تم یہاں آگئی ہو۔'' ولی نے کہا۔ ''پھر

چینی کہاوت

کفایت شعار بیوی تلاش کرنے میں اگر سو جوتے بھی گھس جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

سڑک کے کنارے کا درخت اگر بادام سے لدا ہوا ہے تو یقین کر لو کہ بادام کڑوے ہی ہوں گے۔

جاپانی کہاوت

سوئی کے چھیدے سے سارا آسمان نظر نہیں آتا مگر شعور کے آئینے میں خدا بھی چھپ نہیں سکتا۔

آدمی کے لیے اس کا نام اور شیر کے لیے اس کی کھال بیش قیمت ہوتی ہے۔

سونا چرانے والے کو جیل کی سزا ملتی ہے اور ملک چرانے والا تخت و تاج پاتا ہے۔

سانپ کو بانس کی نلی میں بھی رکھو تو وہ ٹیڑھا ہی چلے گا۔

☆☆☆

کس بات کا ڈر ہے؟"

"گروہ کے بڑے اتنی آسانی سے آپ کو جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان تنظیموں سے موت ہی نجات دلا سکتی ہے۔ اور یہ بات تنظیم میں شامل ہوتے وقت بتا دی جاتی ہے۔ کیونکہ کارلوس نے تنظیم کا قانون توڑا ہے اس لیے انہوں نے اسے قتل کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔ ہم ایک دوست کے ذریعے جان گئے ہیں کہ وہ کون ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ یہاں پہنچ چکا ہے۔"

ولی پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ کون ہے لیکن عین اسی وقت کارلوس مرنڈا کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ولی خاموش ہو گیا۔ وہ نہا کر آیا تھا اور اس نے صرف سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کی عمر بھی پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ رنگ سانولا اور جسم مضبوط تھا جیسے وہ وزن اٹھانے کی مشق کرتا رہا ہو۔ اس کے پورے جسم اور چہرے پر ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔

وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا تاکہ ولی اس کے ٹیٹوز غور سے دیکھ لے۔ جو کوئی بھی اس سے پہلی بار ملتا، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے چہرے اور جسم پر بنے ہوئے نقش و نگار دیکھنے لگتا۔ اس کے ماتھے پر اس کے گینگ کا نام ایم، اٹھارہ کھدا ہوا تھا۔ ولی اس نام سے اچھی طرح واقف تھا جو حالیہ برسوں میں دنیا کا سب سے بڑا وحشی گینگ بن چکا تھا۔ اس کے دونوں گالوں پر درجن بھر صلیب کے نشان اور آنکھوں کے نیچے ایک قبرستان کی چھوٹی سی تصویر بنی ہوئی تھی اور ولی سوچ رہا تھا کہ آیا صلیب کے یہ نشان اس کے ساتھیوں، دشمنوں یا پھر دونوں کی قبروں کو ظاہر کرتے ہیں جو اس کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔

اس نے ولی سے ہاتھ ملایا اور نینا کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی بین الاقوامی ٹھگ لگ رہا تھا لیکن اس کی نظروں کا انداز جارحانہ یا تند تھا۔ وہ نینا سے زیادہ مضطرب اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔ ولی سوچ رہا تھا کہ اس شخص نے کم عمری میں ہی اتنا زیادہ تشدد اور قتل و غارت گری دیکھ لی ہے کہ وقت سے پہلے ہی بڑا ہو گیا۔

"تمہاری گرل فرینڈ نے مجھے تمہارے ماضی کے بارے میں بتایا ہے اور یہ بھی کہ تم نے کس طرح گینگ چھوڑا۔" ولی نے کہا۔

"میں موت کے منہ میں جا رہا تھا۔" کارلوس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔"

"تم یہاں کب سے ہو؟" ولی نے پوچھا۔

"تقریباً بیس دن ہو گئے۔ نینا ایک ہفتے پہلے آئی ہے۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم خوف زدہ ہو کیونکہ تمہارے گینگ کے ساتھیوں نے شاید کسی کو تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے بھیجا ہے؟"

کارلوس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "شاید نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ مجھے گینگ کے ایک پرانے دوست نے متنبہ کر دیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ قاتل یہاں موجود ہے۔ اسی لیے میں گھر سے باہر نہیں جا رہا۔ خاص کر دن میں، اور اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

اس نے اپنے ٹیٹو والے دونوں ہاتھ اٹھا کر گالوں پر رکھے۔ وہاں بھی ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل تھا کہ لوگوں کی بھیڑ میں اسے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ ان ٹیٹوز کی وجہ سے وہ فوراً نظروں میں آ جائے گا۔

"میں ان ٹیٹوز سے جان چھڑانا چاہ رہا ہوں لیکن فی الحال میں یہ خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا کہ کوئی انہیں صاف کرنے آئے۔" کارلوس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ ان تمام ٹیٹو آرٹسٹوں کی نگرانی کر رہے ہوں گے جو یہ کام کر سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے انہیں خرید لیا گیا ہو تاکہ مجھ پر نظر رکھی جا سکے۔"

وہ ایک بار پھر وسوسوں میں گھر گیا لیکن جب آپ کا واسطہ ایم اٹھارہ جیسی تنظیم سے ہو تو وہاں وسوسوں کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

"اس شخص کا نام کیا ہے جو تمہیں قتل کرنے یہاں آیا ہے؟"

"میرے ذریعے نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے یہاں آنے کے لیے جو پاسپورٹ استعمال کیا اس پر اس کا نام رائیل سوریز لکھا ہوا ہے۔"

"یعنی یہ کہ یہ اس کا اصلی نام نہیں ہے؟"

کارلوس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھ جیسے لوگوں کا پیچھا کرنے والے قاتل کئی نام استعمال کرتے ہیں، اس کے علاوہ تمہیں ان کے بارے میں ایک اور بات بھی جان لینی چاہیے۔"

ولی نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگا۔

کارلوس نے ایک بار پھر اپنے ٹیٹو والے چہرے

پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''تم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ مجھ جیسا ہوگا۔ گینگ چھوڑ کر جانے والوں کو قتل کرنے کے لیے جنہیں بھیجا جاتا ہے وہ گینگ کے دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ برسوں پہلے گینگ کے بانیوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ گینگ کا ہر ممبر ٹیٹو نہیں بنوائے گا۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہونے چاہئیں جو کسی کی توجہ حاصل کیے بغیر آزادانہ نقل و حرکت کر سکیں، جو کاروباری دنیا میں گھل مل جائیں جن کے جسم اور چہرے پر کوئی ٹیٹو نہ ہو جو سرحد پار سے بڑی مقدار میں پیسا لا سکیں اور ان لوگوں کو نشانہ بنا سکیں جنہیں تنظیم کا غدار سمجھا جاتا ہے۔ تم جس آدمی کی تلاش میں جاؤ گے، وہ ان میں سے ایک ہے جو مجھ جیسے لوگوں کو قتل کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اسے بہت کم عمری میں منتخب کر کے تربیت دی گئی۔ تمہیں اس کے جسم اور چہرے پر کوئی ٹیٹو نظر نہیں آئے گا اور تم اسے دیکھ کر نہیں کہہ سکتے کہ وہ کوئی جرائم پیشہ شخص ہے۔ اس کی ظاہری شکل و صورت اور کام کی مناسبت سے اسے گینگ میں انتقام لینے والا فرشتہ کہا جاتا ہے۔

ولی کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ ان الفاظ پر غور کرنے لگا۔ اس نے کبھی بھی قاتلوں کی اس خاص نسل کے بارے میں نہیں سنا تھا لیکن اس سے پہلے اس کا ایم اٹھارہ جیسے بڑے گینگ کے سابق سرغنہ سے ملنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس نے یہی اندازہ لگایا کہ ہر جگہ اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

''اس کے علاوہ تم مجھے اس فرشتے کے بارے میں کچھ اور بتا سکتے ہو؟''

کارلوس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، فرشتوں میں ایسی صفات نہیں ہوتیں جنہیں آسانی سے بیان کیا جا سکے۔''

ولی نے ان فرشتوں کے بارے میں سوچا جن کی تصویر کشی مذہبی پینٹنگز میں کی جاتی ہے۔ انہیں ہمیشہ جوان اور ہینڈسم دکھایا جاتا تھا اور وہ سب ایک جیسے لگتے تھے۔ اس نے اپنی نوٹ بک پر نظر دوڑائی جہاں اس نے رافیل سوریز کا نام لکھا تھا۔ اسے یاد آگیا کہ بائبل میں بھی ایک مشہور فرشتے رافیل کا ذکر ملتا ہے۔

''میری خدمات کا معاوضہ کس طرح ادا ہوگا؟'' ولی نے پوچھا۔

وہ عورت اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے پرس کھولا اور دو دن کا معاوضہ گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ولی نے نوٹ بک کے ایک صفحے پر رسید لکھ کر اسے دی اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔

''تم ان ٹیٹوز کے ساتھ گھر پر ہی رہو گے۔ جب تک میں نہ کہوں کہ اب تم محفوظ ہو۔''

اس نے شیطان اور اس کی خوب صورت گرل فرینڈ کو خدا حافظ کہا اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کا اپارٹمنٹ للل ہوا نا میں آٹھویں اسٹریٹ پر تھا جسے وہ اپنے دفتر کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر لیپ ٹاپ پر ایک نمبر تلاش کیا اور فون ملا دیا۔

آرٹی یوگر، میامی وزیٹرز اور کنونشن بیورو کا سیکیورٹی چیف تھا۔ اس سے پہلے وہ کاؤنٹی میں سراغ رساں رہ چکا تھا اور ولی اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ دونوں ساتھ کام کرتے تھے۔

''ہائے ولی۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''میرے بچے کیسے ہو؟''

وہ بہت خوش لگ رہا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ اسے میامی کی سب سے بڑی صنعت یعنی سیاحت میں ایک پُرکشش ملازمت جو مل گئی تھی۔

''میں ایک کیس پر کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے تمہاری تھوڑی سی مدد چاہیے۔''

''بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''میں ایک ایسے مہمان کی تلاش میں ہوں جو ہماری کاؤنٹی میں رافیل سوریز کے نام سے آیا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس نام کے شخص نے کسی ہوٹل میں کمرا بُک کروایا ہے۔''

ولی جانتا تھا کہ یوگر کے پاس پولیس جیسے اختیارات ہیں اور وہ کسی بھی ہوٹل یا موٹیل سے مہمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا ہے گو کہ اس کے لیے بھی اس کے پاس معقول وجہ ہونی چاہیے۔

''اگر یہ کسی لاپتا شخص کا معاملہ ہے تو میں یہ کام نہیں کر سکتا ولی۔ کیونکہ بعض اوقات لوگ جان بوجھ کر لاپتا ہو جاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ انہیں تلاش کیا جائے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔''

''میں تم سے بالکل متفق ہوں آرٹی لیکن یہ ایک غیر ملکی شہری کا معاملہ ہے جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ میرے ایک کلائنٹ کو زخمی یا نقصان پہنچانے کی غرض سے یہاں آیا ہے، اگر یہ اتنی سنجیدہ بات نہ ہوتی تو میں تم سے کبھی نہیں کہتا اور نہ ہی میں کسی پر ظاہر کروں گا کہ مجھے اس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے بارے میں کہاں سے اطلاع ملی۔“

”سمجھ گیا۔ میں اپنے تمام اراکین کو ارجنٹ ای میل بھیج رہا ہوں۔ اس کے بعد تم سے دوبارہ بات کروں گا۔“

ولی نے فون رکھنے کے بعد فریج میں جھانکا تو اسے رات کا بچا ہوا آدھا سینڈوچ مل گیا۔ فی الحال یہی غنیمت تھا۔ اس نے سوچا کہ آرٹی سے بات ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے لیے کھانے کا بندوبست کرے گا۔

”آدھے گھنٹے بعد اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔

دوسری طرف سے آرٹی بول رہا تھا۔

”رافیل سوریز نام کا ایک شخص برکیل کے علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے موٹیل اسٹار ڈوسٹ میں رجسٹرڈ ہے۔ اس کے کمرے کا نمبر دو سو بارہ ہے۔“

ولی نے موٹیل کا نام اور کمرا نمبر اپنے پاس لکھ لیا۔ وہ علاقہ ایسٹ لٹل ہوانا سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں بہت سے سلواڈور کے باشندے رہتے تھے اور انہی میں کارلوس مرنڈا بھی شامل تھا۔ اگر رافیل اسے قتل کرنے کے ارادے سے تلاش کر رہا تھا تو وہ جگہ رہنے کے لیے ہر لحاظ سے مناسب تھی۔

ولی نے اس مدد پر آرٹی کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔

”کوئی ایسا کام نہ کرنا جو میں بھی نہ کرتا۔“

ولی نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا لیکن اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ پندرہ منٹ بعد اس نے موٹیل کے سامنے سڑک پر اس زاویے سے گاڑی کھڑی کی کہ اسے موٹیل کی دوسری منزل اور کمرا نمبر دو سو بارہ صاف نظر آئے۔ اس عمارت پر سفید ڈیکو پینٹ ہوا تھا جبکہ دروازوں، کھڑکیوں اور بیرونی سیڑھیوں پر اورنج پینٹ کیا گیا تھا۔ وہ عمارت غالباً 1950ء یا اس کے آس پاس تعمیر ہوئی تھی۔

ولی تین گھنٹے تک کار میں بیٹھا ریڈیو سے نشر ہونے والی خبریں، تجزیے اور ٹاک شوز سنتا رہا۔ اسے دنیا کے بارے میں تو بہت کچھ معلوم ہو گیا لیکن وہ اس شخص کے متعلق بہت کم جانتا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ بالآخر سات بجنے میں چند منٹ قبل کمرا نمبر دو سو بارہ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک نوجوان شخص باہر آیا۔ کارلوس کی طرح اس کی عمر بھی پچیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کا رنگ گندمی اور بال سیاہ تھے۔ اس نے پوری آستین کی آف وائٹ شرٹ، اسی رنگ کی قمیص اور براؤن شوز پہن رکھے تھے۔ سفید کپڑوں میں وہ واقعی فرشتہ لگ رہا تھا۔

سوریز نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا پھر اس نے سڑک کے دونوں جانب دیکھا اور خلیج کی جانب چل دیا۔ ولی نے چند لمحے انتظار کیا پھر اپنی کار میں سوار ہو کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ سڑک پر پیدل چلنے والوں کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ زیادہ تر لوگ دو گھنٹے پہلے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر گھر جا چکے تھے۔ لیکن جب سوریز تجارتی علاقے میں پہنچا تو وہاں ڈنر کے لیے آنے والوں اور نشے کے عادی افراد کی خاصی تعداد نظر آئی۔

موٹیل سے تین بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سوریز نے سڑک پار کی اور اس سڑک کی جانب بڑھ گیا جہاں کئی ریستوران اور بار تھے پھر وہ ایک معروف بار کے باہر رک گیا۔ ولی نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے عقب میں سڑک کے پار سو فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ اس نے دیکھا کہ سوریز اطراف کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس کی نظر سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر رکھی ہوئی ایک لوہے کی میز پر گئی اور وہ اس پر بیٹھ گیا۔ اگر آپ کسی ایسے شخص کو تلاش کر رہے ہوں جسے قتل کرنا چاہتے ہیں تو ایسی جگہ پر بیٹھ کر آپ وہاں سے گزرنے والوں پر نظر رکھ سکتے ہیں۔

ولی اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اس آدمی کو آرڈر دیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک پیشہ ور قاتل تک پہنچنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے قریب ہوتے وقت بہت محتاط ہونا چاہیے۔ پھر ایک بلاک کے فاصلے پر ولی نے میامی پولیس کی پٹرول کار کھڑی ہوئی دیکھی اور دو پولیس والے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی وہاں آمد کا مقصد صرف یہ تھا کہ کوئی شخص دنگا فساد کرنے کے بارے میں نہ سوچے۔

فٹ پاتھ پر لگی ہوئی نصف درجن میزوں میں سے ایک خالی تھی۔ ولی نے چند منٹ انتظار کیا پھر دو افراد وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ اب وہاں کوئی میز خالی نہیں تھی۔ ولی نے سڑک پار کی اور یہ ظاہر کیا کہ جیسے وہ بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کر رہا ہے پھر وہ سوریز کے پاس آیا۔

”اگر تم کچھ خیال نہ کرو تو کیا میں تمہارے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس نے ہسپانوی زبان میں پوچھا۔

سوریز نے اس کی طرف دیکھا لیکن ولی نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔

سوریز کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
''میرے مہمان بن جاؤ۔'' وہ بڑبڑایا۔
ولی نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور اسے وائن کا آرڈر دیا۔
''کیا میں تمہیں اس میزبانی کے بدلے ایک مشروب کی پیشکش کرسکتا ہوں؟'' اس نے سوریز سے پوچھا۔
سوریز کے سامنے آدھا گلاس بیئر کا رکھا ہوا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں شکریہ۔ مجھے جو چاہیے تھا وہ میں نے منگوا لیا۔''
ولی بظاہر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن چوری چوری سوریز پر بھی نظر ڈال رہا تھا۔ وہ اس کے کندھے کے نیچے یا کمر میں بندھی ہوئی گن تلاش کررہا تھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔
ولی کا مشروب آگیا تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور بولا۔ ''کیا تم یہاں نئے ہو؟''
سوریز نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''
''کہاں سے آئے ہو؟''
اس نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''سینٹرل امریکا۔''
ولی نے پوچھا۔ ''سینٹرل امریکا میں کس جگہ سے؟''
اس سوال پر وہ شخص تھوڑا سا بے چین ہوا پھر بولا۔
''میں مختلف ملکوں میں رہ چکا ہوں۔''
ولی نے وائن کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم وہاں کیا کام کرتے تھے؟''
اس کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کا ضبط جواب دینے لگا۔ اس کی آنکھوں سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ ''میں نے کئی مختلف کام کیے ہیں۔ تم کیا کرتے ہو۔ اگر تمہیں میرا پوچھنا بُرا نہ لگے۔''
ولی نے پولیس کار کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ ابھی تک وہاں موجود تھے اور سو فٹ سے بھی کم فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے سوچ لیا کہ ان کے علاوہ یہاں پر موجود دوسرے لوگ بھی اسے تحفظ فراہم کرسکتے ہیں۔ اس لیے خطرہ مول لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔
''میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور مجھے یہ معلوم کرنے کا معاوضہ دیا گیا ہے کہ تم کون ہو؟''
اس کے ساتھ ہی ولی کا ہاتھ اپنی کمر پر بندھے ہوئے ہولسٹر پر چلا گیا۔ اسے توقع تھی کہ شاید وہ شخص بھی اپنا ہتھیار

خوشی کی خبر

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ کل رضیہ کا شوہر مرگیا؟''
سہیلی گھبرا کر بولی۔ ''ہائے اللہ وہ کیسے؟''
خبر دینے والی عورت نے کہا۔ ''بس میاں بیوی میں جھگڑا ہورہا تھا۔ رضیہ نے شوہر سے طلاق مانگی اور وہ مرگیا۔''
سہیلی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیا صدمے سے؟''
پہلی عورت سنجیدگی سے بولی۔ ''نہیں وہ اتنی بڑی خوشی برداشت نہیں کرسکا۔''

(انتخاب۔ بسنت کمار، بی ایم سی، کوئٹہ)

غلطی

''کیا پریکٹس کے دوران آپ نے کبھی کوئی ناقابلِ فراموش غلطی کی ہے؟'' ایک مشہور و معروف سرجن کے دوست نے بے تکلفانہ انداز میں سوال کیا۔
''جی ہاں، صرف ایک دفعہ۔''
''کیا وہ بہت خطرناک غلطی تھی؟''
''جی ہاں، بے حد خطرناک۔''
''کیسے؟''
''ایک شخص میرے پاس آپریشن کے لیے آیا۔ میں نے آپریشن کردیا اور ایک ہزار روپیہ فیس وصول کرلی۔'' ڈاکٹر نے بات ختم کردی۔
''یہ کیا غلطی ہوئی؟''
''مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے پاس پانچ ہزار روپے تھے۔'' ڈاکٹر نے مزید وضاحت کی۔

خواب

ایک زن مرید شوہر نے نفسیاتی معالج کو بتایا کہ وہ ہر رات کو یہی خواب دیکھتا ہے کہ وہ بارہ خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ ایک ویران جزیرے میں رہ رہا ہے اور اسی خواب سے اس کی زندگی اجیرن ہوکر رہ گئی ہے۔
نفسیاتی معالج نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا پُرلطف خواب دیکھنے سے آپ کی زندگی کیسے اجیرن ہوسکتی ہے؟''
زن مرید شوہر بولا۔ ''پُرلطف کیا خاک...! میں پوچھتا ہوں آپ نے کبھی بارہ لڑکیوں کے لیے کھانا پکایا ہے۔''

(انتخاب، اورنگزیب الٰہی، الشرائع مکہ مکرمہ)

نکالنے کی کوشش کرے لیکن ایسا نہیں ہوا، اس کے بجائے اس نے اپنے دونوں ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر رکھے اور اس طرح اٹھنا شروع کیا جیسے بھاگنے والا ہے۔ ولی نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

''ایسا مت کرو۔'' ولی نے سختی سے کہا لیکن اپنی آواز اونچی نہیں کی۔ ''اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں ان پولیس والوں کو بلا لوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے ان پولیس والوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے بھی ان کی جانب نظر کی پھر دوبارہ ولی کو دیکھنے لگا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے سرگوشی کی۔ ''تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟''

ولی نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے اس کی کلائی پر اپنی گرفت مضبوط کی اور بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو رافیل اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ گینگ والے تمہیں کیا کہتے ہیں۔ بدلہ لینے والا فرشتہ۔''

اس شخص نے حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

برابر والی میز پر بیٹھی ہوئی ایک عورت اچانک ہی ان کی جانب متوجہ ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ ایک شخص نے دوسرے کی کلائی پکڑ رکھی ہے اور وہ خوف زدہ نظر آ رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی ولی نے سوریز کی کلائی چھوڑ دی اور سڑک پر گزرتے ہوئے ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ اس عورت نے بھی اپنا منہ موڑ لیا اور دوسری جانب متوجہ ہو گئی۔

اس کے بعد ولی اس طرح جھکا جیسے کوئی چیز نیچے گر گئی ہو پھر اس نے جلدی سے سوریز کی کمر پر ہاتھ پھیرا تا کہ کسی ہتھیار کی موجودگی کو محسوس کر سکے لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' سوریز نے سرگوشی میں پوچھا۔

''میں بل ادا کرنے جا رہا ہوں اور تم میرے ساتھ چلو گے۔ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں پولیس کو بلا لوں گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم ان سے بات کرنا چاہو گے۔''

سوریز نے پہلے سڑک اور پھر ولی کی طرف دیکھا اور گھبراہٹ میں سر ہلا دیا۔

ولی نے کمر کی پشت سے اپنا ریوالور نکالا اور اسے میز کے نیچے اس طرح پکڑا کہ سوریز اسے دیکھ سکے۔ جیسے ہی اس کی نظر ریوالور پر گئی، وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔

''تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔'' ولی نے سرگوشی کی۔ ''اگر تم واقعی وہ نہیں ہو جو میں سمجھ رہا ہوں تو میری طرف سے تم آزاد ہو۔''

وہ شخص جال میں پھنسے ہوئے جانور کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس نے کوئی بحث نہیں کی۔ ولی نے بل کی ادائیگی کی اور وہ اسی راستے پر چل دیے جس سے وہ آئے تھے۔ ولی نے سوریز کو آگے چلنے کے لیے کہا۔ جب وہ کار کے پاس پہنچے تو ولی نے ریموٹ سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''اندر بیٹھو۔''

سوریز نے حکم کی تعمیل کی اور ولی بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ریوالور الٹے ہاتھ میں پکڑا، اور اسے ران پر رکھ کر اس کی نال کا رخ سوریز کی طرف کر دیا اور سیدھے ہاتھ سے کار اسٹارٹ کی۔

''کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے میں گھبرا جاؤں اور کار بے قابو ہو جائے۔'' اس نے کہا۔

سوریز نے ریوالور کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ ولی نے تقریباً دس بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار روکی اور ایک بغلی سڑک پر کھڑی کر دی۔ اب اس نے ریوالور دائیں ہاتھ میں پکڑا اور اس کی نال کا رخ دوبارہ اس کی طرف کر دیا۔

''اب ہم دوبارہ اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ تم میامی کیوں آئے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ تم ایم اٹھارہ کے تربیت یافتہ قاتل ہو۔ تم یہاں گینگ کے اس رکن کو تلاش کرنے اور اسے قتل کرنے کے لیے آئے ہو جو تنظیم کو چھوڑ چکا ہے۔''

دوسرے شخص کا منہ پورا کھل گیا اور اس نے تیوری چڑھا لی۔

''تم پاگل ہو اور تمہارے پاس پرانی معلومات ہیں۔ میں کبھی ایم اٹھارہ میں تھا لیکن تنظیم سے علیحدہ ہو چکا ہوں۔ میں کسی کو تلاش نہیں کر رہا بلکہ خود اپنی جان بچاتا پھر رہا ہوں۔''

ولی نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کی آستینوں کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر کھال کا رنگ اڑ گیا تھا۔ سوریز سمجھ گیا کہ ولی کیا دیکھنا چاہ رہا ہے۔ اس نے اپنی دونوں آستینوں کے بٹن کھولے اور انہیں کہنیوں تک موڑ لیا۔

اس کے دونوں بازوؤں پر ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ پر ایک عورت کا ٹیٹو تھا جس کے سینے پر ردمن

حروف میں اٹھارہ لکھا ہوا تھا۔ سوریز نے اپنی قمیص کے بٹن کھولے۔ اس کے سینے پر بھی ایم اٹھارہ لکھا ہوا تھا۔

سوریز نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کے نیچے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''اس جگہ بھی ٹیٹو بنے ہوئے تھے لیکن میں نے صاف کروا دیے۔ تم غور سے دیکھو۔''

کار کے اندر مدھم روشنی میں ولی کو اس جگہ کا رنگ اڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔

سوریز نے اپنی دونوں مٹھیاں کھولیں اور ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''ان کی پشت پر بھی ٹیٹو بنے ہوئے تھے لیکن میں نے مٹا دیے۔''

ولی کو اس جگہ زخم نظر آئے جو شاید تیزاب کی وجہ سے آئے ہوں گے۔ زیادہ ہوشیار کاریگر ٹیٹو کو ہٹانے کے لیے لیزر استعمال کرتے ہیں لیکن سوریز نے روایتی طریقوں پر ہی اکتفا کیا۔

ولی اپنی آنکھوں سے ثبوت دیکھ چکا تھا۔ سوریز کسی طرح بھی بدلہ لینے والا فرشتہ نہیں لگ رہا تھا اور اس تعریف پر پورا نہیں اترتا تھا جو کارلوس نے اسے بتائی تھی۔

''یہاں ایک اور سابق ممبر بھی موجود ہے جسے یقین ہے کہ تم اس کو قتل کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو۔''

سوریز قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر کوئی اسے قتل کرنے یہاں آیا ہے تو غالباً اس قاتل کو مجھے بھی مارنے کے لیے بھیجا گیا ہوگا۔''

ولی کی نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں جیسے اس طرح دیکھنے سے سچ عیاں ہو جائے گا۔ اس نے گزشتہ برسوں میں کئی لوگوں سے پوچھ گچھ کی تھی اور اس کا اندازہ تھا کہ یہ شخص سچ بول رہا ہے۔

ولی نے گن دائیں ہاتھ میں رکھی اور سیل فون نکال کر کارلوس کا نمبر ڈائل کرنے لگا جس نے دو گھنٹیوں کے بعد جواب دیا۔

''میں کوستا بول رہا ہوں اور رافیل میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ یہ وہ شخص نہیں ہے جس پر تم نے قاتل ہونے کا شبہ ظاہر کیا تھا۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کارلوس نے کہا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ وہ شخص نہیں ہے۔''

''میں نے اس کے بازو دیکھے ہیں جن پر ٹیٹو بنے ہوئے ہیں۔ وہی ایم اٹھارہ والے ٹیٹو۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہی کہو گے کہ یہ وہی فرشتہ ہے جس سے تم خوف زدہ ہو؟''

''تم اس وقت کہاں ہو؟ میں اس سے ملنا اور بات کرنا چاہتا ہوں۔''

ولی نے کارلوس سے انتظار کرنے کے لیے کہا اور فون پر ہاتھ رکھ کر سوریز کو بتایا کہ کارلوس کون ہے اور اس وقت وہ کیا کہہ رہا ہے۔

یہ سنتے ہی سوریز اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ ''کیا یہ نام تمہارے لیے جانا پہچانا ہے؟'' ولی نے پوچھا۔ ''کیا تم کارلوس کو جانتے ہو؟''

سوریز نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایم اٹھارہ کے ہزاروں رکن ہیں، ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔''

لیکن وہ اس سے خوف زدہ ضرور تھا۔ اگر اس کی بات کو سچ مان لیا جائے تو وہ ایم اٹھارہ سے جان چھڑانے کے لیے دور دراز کا سفر طے کر کے یہاں آیا تھا اور اب اس سے اس شخص سے ملنے کے لیے کہا جا رہا ہے جو نہ صرف گینگ کا اہم رکن رہ چکا ہے بلکہ اس کی طرح شاید اس نے بھی قتل سمیت لاتعداد جرائم کیے ہوں گے۔ اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت سے ولی اس کے خوف کو محسوس کر سکتا تھا۔

وہ کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ولی نے اپنا کام پورا کر لیا تھا۔ اس نے بہت کم وقت میں مشتبہ قاتل تلاش کر لیا اور اب اسے صرف اپنے کلائنٹ پر یہ ثابت کرنا تھا۔

''میں یقین دلاتا ہوں کہ تم سے ملاقات کے دوران وہ مسلح نہیں ہوگا۔'' ولی نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ یہ ملاقات انتہائی مختصر ہو اور یہ یقینی بناؤں گا کہ اسے تمہاری موجودہ رہائش کا پتا نہ چلے۔ اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو میں تمہارا تحفظ کروں گا اور دوبارہ بھی زحمت نہیں دوں گا۔''

سوریز فوراً بات کی تہ تک پہنچ گیا یعنی اگر اس نے ولی کے کہنے پر عمل نہیں کیا تو وہ اسے دوبارہ زحمت دے گا۔ وہ غیر قانونی طور پر یہاں آیا تھا اور صرف اسی بنیاد پر ولی اس کے لیے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد تائید میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں لیکن میری حفاظت کا پورا بندوبست ہونا چاہیے۔''

ولی نے پہلے ہی اس بارے میں سوچ لیا تھا۔ اسے پولیس کی ملازمت کے دوران گشتی پارٹی کے ساتھ پورے شہر کو دیکھنے کا موقع ملا تھا اور وہ چپے چپے سے واقف تھا اس

لیے فوراً ہی ایک مناسب جگہ اس کے ذہن میں آ گئی۔ اس نے فون پر کارلوس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری رہائش گاہ سے پانچ بلاک کے فاصلے پر اسی سڑک کے ساتھ ایک چھوٹا سا پارک ہے۔ کیا تم نے وہ جگہ دیکھی ہے؟''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

''تم آدھ گھنٹے بعد مجھے وہاں ملو۔ میں جس شخص کو ساتھ لے کر آ رہا ہوں وہ غیر مسلح ہے اور تمہارے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہاری حفاظت کی ضمانت دیتا ہوں۔ تم میری بات سمجھ گئے؟''

وہ دونوں دس منٹ بعد ہی وہاں پہنچ گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ اس کی چوڑائی بمشکل پچاس فٹ ہو گی۔ وہاں اچھی خاصی روشنی تھی اور کئی بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کا رخ دریا کی طرف تھا۔ سو فٹ کے فاصلے پر دریا کے کنارے کچھ کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں لیکن وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی طرح پارک بھی بالکل سنسان تھا اور تمام بینچیں خالی پڑی تھیں۔ اس لیے ملاقات کے لیے وہاں مکمل پرائیویسی تھی۔

وہ دونوں کار سے باہر آئے اور ولی اسے ایک ایسی جگہ لے گیا جو بالکل دریا کے کنارے کے ساتھ تھی اور اسے بالکل ساکت رہنے کے لیے کہا۔ وہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس کے پاس بھی دریا میں چھلانگ لگانے کے سوا فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

دس منٹ بعد ایک کار وہاں آئی اور ولی کی گاڑی کے برابر میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ کارلوس کار سے باہر آیا اور گھاس پر چلتا ہوا ولی کی طرف بڑھا۔ اب وہ دونوں کھمبے کی روشنی میں کھڑے ہوئے تھے۔

کارلوس نے پوری آستین کی سیاہ قمیص، پوری لمبائی کی پتلون اور بیس بال کی ٹوپی پہن رکھی تھی تاکہ اس کے ٹیٹو کسی کو نظر نہ آ سکیں۔ ولی نے جلدی سے اس کی تلاشی لی اور مطمئن ہونے کے بعد سوریز کو پکارا کہ وہ اپنی کمین گاہ سے باہر آ جائے۔ وہ جھاڑیوں سے برآمد ہوا، اور محتاط انداز میں ان کی طرف بڑھا اور کھمبے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

''اسے اپنے ٹیٹو دکھاؤ۔'' ولی نے کہا۔

سوریز نے اپنی دونوں آستینیں موڑیں اور بازوؤں پر بنے ہوئے ٹیٹو اسے دکھا دیے پھر اس نے قمیص کے بٹن کھول کر سینے اور گردن پر بنے ہوئے نقش و نگار بھی ظاہر کر دیے پھر اپنی آنکھ کے نیچے انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں پر بھی ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ تم اس کا زخم دیکھ سکتے ہو۔ میں وہ فرشتہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔''

کارلوس اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ناقابلِ تردید ثبوت دیکھ لیا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں سمجھ گیا۔''

جیسے ہی سوریز مڑا اور اس نے ولی کے عقب میں دیکھا تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ولی نے گھوم کر دیکھا تو وہاں نینا کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سفید پینٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا اور دونوں ہاتھوں میں گن تھام رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے سرد مہری جھلک رہی تھی۔ اس نے پلک جھپکتے ہی ایک فائر کیا۔ گولی کارلوس کے سر میں لگی اور وہ زمین پر گر پڑا۔

پھر وہ سوریز کی طرف مڑی لیکن اس سے پہلے ہی ولی نے اس کی جانب ایک پتھر پھینکا جس سے اس کا ہاتھ بہک گیا اور اس کی چلائی ہوئی گولی سوریز کی بائیں ران میں لگی۔ جب تک ولی اپنا ریوالور نکالتا، نینا نے ایک اور فائر کر دیا۔ سوریز ایک زوردار چیخ کے ساتھ زمین پر گر گیا جب تک ولی فائر کر چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نینا کے ماتھے کے درمیان... لگی اور وہ گھاس پر گر گئی پھر اس کے جسم نے دوبارہ حرکت نہیں کی۔

گولیوں کی آواز سن کر پارک کے قریب رہنے والوں نے پولیس کو اطلاع دی اور چند منٹوں میں پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولینس وہاں پہنچ گئیں۔ کارلوس اور نینا موقع پر ہی دم توڑ گئے تھے تاہم سوریز کے بازو میں گولی لگی اور اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ پولیس کے سراغ رسانوں نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ ولی نے ان کے علم میں لائے بغیر ان دو مجرموں کی ملاقات کروائی۔ ولی نے انہیں بتایا کہ وہ دونوں ایم اٹھارہ کے مفرور رکن تھے اور نینا کو انہیں قتل کرنے کا ٹاسک دیا گیا تھا۔ دونوں سراغ رسانوں نے لڑکی کو دیکھا بظاہر وہ مشکوک لگ رہی تھی۔

کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ولی نے لاش کا بغور جائزہ لیا۔ اس نے جھک کر لڑکی کا سر سیدھا کیا تو اس کی گردن کا پچھلا حصہ عیاں ہو گیا جو وہ ہمیشہ چھپائے رکھتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا نیلے رنگ کا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی بمشکل چوتھائی انچ تھی۔ وہ ایک خیالی فرشتے کا ٹیٹو تھا۔

گواہی کی قیمت

عکس فاطمہ

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ پیدا ہی داداگیری کے لیے ہوئے ہیں۔ رحم دلی... ایمانداری اور نازک احساسات و جذبات سے کوسوں دور رہنے والے شخص کی سنگ دلی۔ وہ اپنے... بیگانوں سب کے لیے ایک ہی برتاؤ رکھنے کا عادی تھا... ماضی کے ایک واقعے کی بازگشت جو طویل مدت بعد سنی گئی...

ان گواہوں کی کسمپرسی جنہیں گواہی کی قیمت ادا کرنا پڑی تھی......

ایک بار پھر مرد نے اس عورت کو غور سے دیکھا۔ وہ چھوٹے قد کی دبلی پتلی سحرزدہ سی عورت تھی اور اس سڑک کی جانب مسلسل دیکھ رہی تھی جس پر وہ رہتا تھا۔ وہ سردی کے موسم میں بھی ناکافی لباس پہنے ہوئے تھی اور ہمیشہ اتنی تیزی سے چلتی جیسے وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہ سفر کر رہی ہے لیکن بظاہر ایسی کوئی بات نہیں نظر آتی تھی۔ مثال کے طور پر اس کے ہاتھ میں کبھی شاپنگ بیگ نہیں ہوتا تھا جس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ خریداری کے لیے گھر سے نکلی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاس دستی بیگ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اسے ہمیشہ خالی ہاتھ دیکھا۔ وہ اس سڑک پر چلتی جس پر اس آدمی کا مکان واقع تھا اور یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی کیونکہ اس سڑک کے دونوں جانب اور بھی بہت سے مکانات تھے۔ کئی مرتبہ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آتی ہوئی بھی دکھائی دی۔ ہمیشہ اسی تیز رفتاری سے چلتی۔ ہمیشہ اس کی نظریں سامنے کی طرف ہوتیں تاہم وہ اس شخص کو نہیں دیکھتی جو اس کی جانب متوجہ تھا۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ اس نے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

اس عورت کو بال بال حادثے سے بچتے ہوئے دیکھا۔ ایک دن وہ مرکزی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی جو اس مرد کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ اس نے اچھی طرح دیکھا کہ اس کے دائیں جانب سے کوئی گاڑی نہیں آرہی تھی۔ البتہ بائیں جانب سے ٹریفک رواں دواں تھا۔ اس میں ساٹھ سیکنڈ کے لیے وقفہ آیا تو اس عجیب و غریب عورت نے دوبارہ دائیں جانب دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور سڑک پار کرنے لگی۔ اس جانب سے آنے والی بس کے ڈرائیور نے ہنگامی طور پر بریک لگایا اور بالکل اس کے قریب جا کر بس روک لی اس سے پہلے کہ اس عورت کو ٹکر لگتی۔ اس کا خیال تھا کہ عورت نے بس کو نہیں دیکھا جو اس کے دائیں جانب اس سے چند انچ کے فاصلے پر رک گئی تھی۔ وہ اس طرح کی عجیب عورت تھی جبکہ اس شخص کی پیشہ ورانہ آنکھ نے اس کے بارے میں بہت کچھ محسوس کرلیا تھا۔

اس کا اندازہ اسے اس عورت کی وقفے وقفے سے ہونے والی غیر حاضری سے ہوا جس دوران وہ اسپتال میں داخل ہوگئی تھی اور وہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد بھی اسے ہر ہفتے چیک اَپ کے لیے جانا پڑتا۔

موسمِ بہار کی ایک خوشگوار صبح جب تیز ہوا چل رہی تھی اور پرندے اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ وہ آدمی سڑک پر جا رہا تھا جبکہ وہ عورت مخالف سمت سے آرہی تھی پھر اچانک ہی خلافِ توقع اس عورت نے سڑک پار کی۔ پہلے کی طرح اس بار بھی اس نے سڑک پر سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو نہیں دیکھا اور اس آدمی کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ عورت نے نظریں اٹھا کر اس آدمی کو دیکھا اور یوں مخاطب ہوئی جیسے اس سے دیرینہ شناسائی ہو۔

''گرے سالومن نے سوسانا پائر کو قتل کیا ہے اور اس کی لاش کو میرے بوائے فرینڈ کیتھ مارک اور کچھ دوسرے لڑکوں نے سپر مارکیٹ کے قریب خالی میدان میں گڑھا کھود کر دفن کردیا۔''

یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے چپ ہوئی پھر بولی۔ ''کیا یہ کافی ہے؟''

''ہاں۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''کافی ہے۔''

یہ سُن کر وہ عورت مڑی اور واپس اپنے راستے پر پہاڑی کی جانب چل دی جس سے اس آدمی نے اندازہ لگایا کہ وہ وہاں رہتی ہوگی۔

☆☆☆

دوسرے روز وہ آدمی پولیس اسٹیشن کے انٹرویو روم میں موجود تھا اور میز کی دوسری جانب اس کے سامنے چیف انسپکٹر جارج ہنری اور اس کے برابر میں سراغ رساں سارجنٹ گیری نیل بیٹھے ہوئے تھے۔

اس آدمی نے پوری بات بتانے کے بعد کہا۔ ''لہٰذا میں سیدھا یہاں چلا آیا۔ صاف لگ رہا ہے کہ اس عورت کو کوئی نفسیاتی بیماری ہے جو زیادہ خطرناک نہیں۔ اس کا بہت پیچیدہ نام ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا البتہ اگر تم چاہو تو میں اس کا نام کاغذ پر لکھ کر دے سکتا ہوں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں ڈاکٹر ہوں، ماہرِ نفسیات۔''

''اوہ اچھا، اسی شہر میں پریکٹس کرتے ہو۔ تمہارا کلینک کہاں ہے مسٹر فریزر؟''

''نہیں۔'' کرسٹوفر فریزر نے جواب دیا۔ وہ دراز قد، خوش لباس اور نرم لہجے میں بات کرنے والا ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ ''میں پونٹیف ریکٹ جنرل اسپتال میں ہوں۔''

''وہ تو یارک سے کافی فاصلے پر ہے۔ تمہیں روزانہ کافی طویل سفر کرنا ہوتا ہوگا۔'' ہنری نے تبصرہ کیا۔

''اتنا زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہے۔'' فریزر نے جواب دیا۔ ''میری کار بہت آرام دہ ہے اور میں دورانِ سفر ریڈیو سنتا رہتا ہوں۔ اس طرح مجھے سفر کی طوالت محسوس نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم جیسے لوگوں کو ایسی جگہوں سے دور رہائش اختیار کرنی چاہیے جہاں ان کے ساتھ کام کرنے والے رہتے ہوں۔ مثلاً اساتذہ، سوشل ورکرز، ڈاکٹر، نرس اور ماہرِ نفسیات وغیرہ۔ اگر میرے مریضوں کو معلوم ہو جائے کہ میں کہاں رہتا ہوں تو میرے دروازے پر ان کی طویل قطار ہوگی کیونکہ نفسیاتی مریضوں کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ خطرناک ہوتے ہیں جو کہ درست نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ بالکل بے ضرر لیکن ضرورت مند ہوتے ہیں۔ انہیں ہماری توجہ چاہیے۔ ایسی صورت میں مجھے آرام کے لیے بالکل وقت نہیں ملے گا۔ میں اسی لیے یارک میں رہتا ہوں اور چالیس میل دور پونٹیف ریکٹ میں کام کرتا ہوں۔''

''سمجھ گیا۔'' ہنری نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کھولتے ہوئے کہا۔ وہ ایک مضبوط جسم اور ادھیڑ عمر کا شخص تھا اور نرم لہجے میں بات کرتا تھا۔ ''کیا تم مجھے اس عورت کی پیچیدہ بیماری کے بارے میں بتاؤ گے۔ میں نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔''

''اور میں نے بھی۔'' گیری بیل نے لقمہ دیا۔

''ویسے تو اس عنوان سے ایک نظم بھی بہت مشہور ہوئی ہے لیکن اس بیماری کا اس نظم کے مندرجات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس مرض میں مبتلا افراد بالکل اجنبی لوگوں کو اپنے انتہائی اندرونی راز بتا دیتے ہیں لیکن اپنے قریبی دوستوں اور رشتے داروں سے اس کا ذکر نہیں کرتے۔'' فریزر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ اس عورت کی بنیادی تشخیص کیا ہے لیکن اس بیماری کی وجہ سے اس کی پیچیدگی بڑھ گئی ہے۔ ایک بات اور بتا دوں کہ ایسے مریض ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور خیالی باتیں نہیں کرتے۔ اس نے جب مجھے یہ بات بتائی تو میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ اسی لیے میں سیدھا یہاں چلا آیا۔ اس کے کہنے کے مطابق سپر مارکیٹ کے برابر والے خالی میدان میں ایک لاش دفن ہے اور وہ جگہ میرے گھر سے چند سو گز کے فاصلے پر ہے۔ اس نے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کی کہ کیا یہ کافی ہے، اور میں نے بھی جواب میں ہاں کہہ دیا اور وہ اپنے گھر کی طرف چل دی۔''

''تم جانتے ہو کہ وہ عورت کہاں رہتی ہے؟''

''نہیں، لیکن وہ چرچ لین کی طرف نہیں گئی جہاں میں رہتا ہوں بلکہ اس کا رخ شاپنگ سینٹر کی طرف تھا۔ سڑک کے اختتام پر مکانات ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ وہیں رہتی ہے۔ یہ مکانات اکیلے لوگوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ میں نے اس کے ساتھ بھی کسی کو نہیں دیکھا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ تنہا رہتی ہے۔'' فریزر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اسے پہچاننا بہت آسان ہے۔ چھوٹے قد کی کمزور اور درمیانی عمر کی عورت ہے۔ تیز تیز چلتی ہے اور اس کے پاس کبھی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کوئی شاپنگ بیگ کوئی ہینڈ بیگ، کچھ نہیں جبکہ عام طور پر عورتیں ان کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔''

''بالکل ٹھیک کہا۔'' ہنری بولا۔ ''ہینڈ بیگ کا نہ ہونا غیر معمولی بات ہے۔''

''اس لیے اسے تلاش کرنا بہت آسان ہوگا۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا۔ اب آگے تمہارا کام ہے۔''

واقعی وہ عورت بہت آسانی سے مل گئی۔ اسے پولیس اسٹیشن لایا گیا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہوتی ہوئی چلی آئی۔ انٹرویو روم میں ہنری اور بیل نے اس سے بڑی بے تکلفانہ گفتگو کی اور جب اس سے لاش کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے تقریباً انہی الفاظ میں وہ سب کچھ دہرا دیا جو وہ اس سے پہلے ڈاکٹر فریزر کو بتا چکی تھی اور اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس نے وہی جملہ ادا کیا۔ ''کیا یہ کافی ہے؟'' اور جواب میں ہنری نے بھی فریزر کی طرح کہہ دیا۔ ''ہاں، کافی ہے۔''

اس عورت نے اپنا نام ملی فشر بتایا۔ اپنی بات ختم کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''اب میں جا سکتی ہوں؟''

''نہیں۔'' ہنری نے نرم لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کچھ دیر یہاں رکنا ہوگا، ہمیں اس معاملے کی تحقیقات کرنی ہے۔''

سراغ رساں کانسٹیبل وینٹور کی سربراہی میں باوردی پولیس والوں کی ٹیم اس جگہ گئی جس کی نشاندہی ملی فشر نے کی تھی۔ اس مخصوص جگہ کو تلاش کرنے کے لیے ایک تربیت یافتہ کتا بھی ساتھ تھا جو زمین میں دبی ہوئی انسانوں یا جانوروں کی باقیات کا سونگھ کر پتا لگا سکتا تھا۔ جس جگہ وہ کتا بیٹھ گیا وہاں کھدائی شروع کر دی گئی اور تھوڑی دیر میں ہی ایک انسانی جسم کی باقیات برآمد ہو گئیں۔

وینٹور نے کھدی ہوئی قبر کے گرد خیمہ لگانے کا حکم دیا اور پھر فون کر کے پیتھالوجسٹ کو بلانے کی درخواست کی۔ اس نے ہنری کو بھی لاش برآمد ہونے کے بارے میں بتا دیا۔

اب صورتِ حال مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی اور لاش کی برآمدگی کی اطلاع ملنے کے بعد یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ملی فشر سے مزید پوچھ گچھ کی جائے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس بارے میں مزید تفصیل بتا سکتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بولنا شروع کیا۔

''ہم ایک گاڑی میں وہاں گئے تھے۔ میں سوسانا کے ساتھ وین کی پچھلی نشست پر تھی۔ اسے ایک بیگ میں لپیٹ دیا گیا تھا۔''

''بیگ؟'' ہنری نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں، وہ ایک بڑے ہولڈال کی طرح اسپورٹس بیگ تھا۔ اسے بیگ میں اس طرح رکھا گیا کہ اس کی ٹانگیں، گھٹنوں سے موڑ دیں۔ وہ بھی میری طرح چھوٹے قد کی تھی۔ اس طرح وہ بڑی آسانی سے بیگ میں آگئی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کچھ لوگ زرد بنیان پہنے ہوئے قینچی سے گھاس کاٹ رہے تھے۔ یوں لگا جیسے کوئی ٹیم وہاں پر کام کرنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ پھر اس نے گاڑی میں سے بیگ باہر نکالا اور مجھ سے کہا کہ اس کے ساتھ آؤں۔ میں

نے ایسا ہی کیا۔ وہ بیگ کو اس میدان میں لے گیا اور لاش ایک گڑھے میں ڈال دی پھر دوسرا آدمی اس گڑھے کو بھرنے لگا اور بعد میں اس پر کچھ بڑے پتھر رکھ دیے گئے۔ اس کے بعد ہم واپس آگئے۔ کیا یہ کافی ہے؟''

''ابھی تو بات شروع ہوئی ہے۔'' ہنری غرایا۔

''تمہارے ساتھ اور کون لوگ تھے؟''

''وہ لاش سوسانا پائر کی تھی۔ میرا بوائے فرینڈ کیتھ مارک وہاں تھا۔ جس شخص نے سوسانا کو قتل کیا، اس کا نام گرے سالومن ہے۔''

''گرے؟''

''اس کا پورا نام تو کچھ اور ہے لیکن سب لوگ گرے کہہ کر بلاتے ہیں۔''

''تمہارا بوائے فرینڈ کہاں ملے گا؟''

''اب وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ جب میں بیمار ہوئی تو اس نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ٹیچر بننا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اس شہر میں کئی بار دیکھا ہے لہٰذا وہ اب بھی یہیں کہیں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے لیکن اس کا پتا معلوم نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔ ''کیا یہ کافی ہے؟''

☆☆☆

یارک ڈسٹرکٹ اسپتال کی پیتھالوجی لیبارٹری میں اسٹین لیس اسٹیل کی میز پر پڑے ہوئے ڈھانچے کو ڈاکٹر لوئیس نے غور سے دیکھا۔ ''عورت۔'' اس نے بولنا شروع کیا۔ ''قدرے چھوٹا قد، جب یہ زندہ تھی تو غالباً اس کا قد پانچ فٹ ہوگا۔''

ڈاکٹر لوئیس دراز قد اور دبلی پتلی عورت تھی جس نے اپنے بال چھوٹے کررکھے تھے اور چہرے پر صرف ہلکی سی لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ ''بظاہر کوئی زخم نظر نہیں آرہا۔'' اس نے وینٹور کی طرف دیکھ کر کہا جو لیبارٹری کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا پوسٹ مارٹم کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''موت کے وقت اس کی عمر پچیس سال سے کم تھی۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ موت کی وجہ معلوم کرنے میں یہ پوسٹ مارٹم بے نتیجہ رہے گا۔ البتہ میں ڈی این اے اور دانتوں کے ریکارڈ سے اس کی شناخت معلوم کرسکتی ہوں اگر پولیس کے ریکارڈ میں یہ لاپتا افراد کی فہرست میں شامل ہے۔''

''شکریہ مادام۔'' وینٹور نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے نتائج سے مسٹر ہنری کو آگاہ کردوں گا۔''

''بہرحال میں بھی اپنی تحریری رپورٹ فیکس کردوں گی۔'' ڈاکٹر نے اپنے دستانے اتارتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر تم اسے زبانی بتا دو تو بہتر ہوگا۔''

''ٹھیک ہے مادام۔'' وینٹور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''ہمیں ابھی تک کوئی ثبوت نہیں ملا۔'' کارمن فریڈ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے جوڑے سے کہا جو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ..... بیٹھے تھے۔ ''لیکن موت کا وقت اور تاریخ وہی ہے جب تم نے سوسانا کے لاپتا ہونے کی رپورٹ درج کروائی تھی۔''

کارمن ایک دراز قد سیاہ فام تھا۔ ''اس کی باقیات کی ابتدائی پوسٹ مارٹم سے پتا چلتا ہے کہ وہ عورت ہے اور موت کے وقت اس کی عمر پچیس سال سے کم تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ اور جسم دبلا پتلا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ یہ تمہاری بیٹی کی باقیات ہیں، ہم تمہارے ڈی این اے اور اس کے دانتوں کے ریکارڈ سے تصدیق کرسکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دانتوں کا ریکارڈ گیارہ سال بعد ضائع کردیا جاتا ہے۔''

''میں تمہیں اپنے ڈی این اے کا سیمپل دوں گا۔'' ارنسٹ پائر نے کہا۔

''شکریہ۔'' کارمن بولا۔ ''ایک کرائم آفیسر آج کسی وقت سیمپل لینے کے لیے فون کرے گا۔ تم سوسانا کے حالات کے بارے میں کیا جانتے ہو جب وہ لاپتا ہوئی تھی۔''

''وہ ایک ناپسندیدہ شخص سے ملنے لگی تھی۔'' مسز فونیا پائر نے کہا۔ ''انتہائی قابلِ نفرت۔ مجھے وہ پہلی نظر میں ہی اچھا نہیں لگا۔ میں اس وقت نفسیاتی اسپتال میں نرس تھی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ایسا نفسیاتی مریض ہے جس نے اپنے چہرے پر خوش اخلاقی کا نقاب چڑھایا ہوا ہے۔ سوسانا اس پر فدا ہوگئی کیونکہ اس شخص نے اسے دنیا دکھانے کی پیشکش کی تھی جبکہ اس وقت وہ صرف بیس برس کی تھی۔ وہ اس کی باتوں میں آگئی اور دنیا دیکھنے کے شوق میں اس کی سب خامیوں کو نظرانداز کردیا۔''

''وہ ایسا پرندہ تھا جو درختوں کے پتے کھا کر زندہ رہتا ہے۔'' ارنسٹ نے کہا۔

''معاف کرنا۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔'' کارمن نے کہا۔

''میری بیوی نے اس کے بارے میں کھل کر بتا دیا ہے۔'' ارنسٹ بولا۔ ''وہ پہلی نظر میں ہی اسے ناپسند کرچکی تھی۔ نفسیاتی اسپتال میں کام کرکے وہ خود بھی نفسیات داں

ہوگئی تھی اور اس میں لوگوں کو پرکھنے کی صلاحیت ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ہم اپنی بیٹی کو اس سے دور رکھیں گے اور ہم نے اس کے لیے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی۔ اس وقت تک وہ بالغ ہو چکی تھی۔''

''اس آدمی کا نام کیا تھا؟''

''سالومن، گرے سالومن۔'' فونیا بولی۔ ''اسی نے سوسانا کو قتل کیا ہوگا۔''

☆☆☆

کیتھ مارک کا پتا لگانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس کے لیے یارک کے محکمۂ تعلیم کو ایک فون ہی کافی تھا۔ وہاں سے معلوم ہو گیا کہ اس نام کا ایک ٹیچر اولڈ ہال کمپرہنسیو اسکول میں پڑھا رہا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی ہنری اور گیری بیل، اسکول کے لیے روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے ہیڈ ماسٹر ڈیوڈ ایڈورڈ سے ملاقات کی۔

''وہ پانچ منٹ بعد فارغ ہو جائے گا۔'' ہیڈ ماسٹر نے ٹائم ٹیبل دیکھ کر بتایا۔ ''میں چاہوں گا کہ تم اس کا انتظار کرلو جب تک وہ کلاس سے فارغ ہو جائے اگر تم ایسا کر سکو۔ صرف پانچ منٹ کی بات ہے۔ دراصل ہم کلاس کے دوران اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے۔''

''کوئی بات نہیں، ہم انتظار کر سکتے ہیں۔'' ہنری نے کہا۔ ''لیکن اسے ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔''

''مجھے تو کچھ سنجیدہ معاملہ لگتا ہے۔'' ایڈورڈ نے کہا۔

''ایسا ہی ہے۔'' ہنری نے جواب دیا۔ ''لیکن زیادہ سنجیدہ بھی نہیں۔''

''میں سمجھ گیا۔'' ایڈورڈ اپنا گاؤن پہنتے ہوئے بولا۔ ''میں اسٹاف روم سے اسے لے کر آتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اسے اگلا پیریڈ شروع ہونے کے بعد لے کر جاؤ۔ یہ لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث ہوگا جب وہ دیکھیں گے کہ پولیس ایک ٹیچر کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہم ایسا ہی کریں گے۔'' ہنری نے کہا۔

☆☆☆

کیتھ مارک چھوٹے قد کا مضبوط جسم والا شخص تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ ''اس کیس نے میری زندگی تباہ کر دی۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں کیا کر سکتا ہوں۔''

وہ اس وقت پولیس اسٹیشن کے انٹرویو روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ''جو کچھ تم جانتے ہو وہ بتا دو۔'' ہنری نے کہا۔ ''تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔''

''کیا مجھے وکیل کو بلانے کی ضرورت ہے؟'' مارک نے پوچھا۔

''صرف اس صورت میں اگر تم اپنا دستخط شدہ بیان دے رہے ہو جو کہ ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے۔'' ہنری نے وضاحت کی۔ ''دوسری صورت میں ہم صرف اسی پر عمل کریں گے جو تم اس انٹرویو کے دوران ہمیں بتاؤ گے لیکن تمہارے حق میں بہتر ہے کہ وعدہ معاف گواہ بن جاؤ۔''

کیتھ مارک کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے باری باری دونوں سراغ رسانوں کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ گفتگو ریکارڈ نہیں ہوگی؟''

''نہیں۔'' ہنری نے دیوار میں لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کی طرف دیکھا۔ ''ایسی صورت میں کیسٹ چلنا شروع ہو جاتا ہے اور سرخ بتی جلنے لگتی ہے جبکہ اس وقت ایسا نہیں ہے اس لیے یہ گفتگو ریکارڈ نہیں ہو رہی۔''

''میں تم دونوں میں سے ایک سے بات کروں گا۔'' مارک نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''تاکہ میں جو کچھ کہوں وہ صحیح معنوں میں آف دی ریکارڈ ہو۔ یہ کسی کے خلاف گواہی نہیں ہے۔ بلکہ میں صرف وضاحت کروں گا کہ کیا ہوا تھا؟''

''یہی کافی ہے۔'' ہنری نے جواب دیا اور سارجنٹ گیری کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم کچھ خیال نہیں کرو گے۔''

سارجنٹ کے جانے کے بعد مارک نے بولنا شروع کیا۔ ''اس وقت میں انیس سال کا تھا اور یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ تبھی میری ملاقات للی سے ہوئی۔ وہ وہاں زیر تعلیم نہیں تھی لیکن اس نے ایک دوسری لڑکی کے ساتھ کمرا شیئر کیا ہوا تھا۔ اس کا نام سوسانا بائر تھا اور وہ گرا ہم سالومن نامی شخص سے ملتی تھی جسے لوگ مختصراً گرے، کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ بہت ہی مکروہ اور خطرناک شخص تھا۔ آج بھی وہ یاد آتا ہے تو میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ وہ انتہائی متحرک اور لوگوں کو ترغیب دلانے والا شخص تھا اور اپنی شخصیت سے متاثر کر کے انہیں اپنے حق میں استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کے پاس کوئی تعلیمی قابلیت نہیں تھی لیکن ایسے لوگوں سے تعلقات بنانے میں اسے کمال حاصل تھا جو چاہتے تھے کہ کوئی انہیں قبول کرے۔''

''میں ایسے لوگوں سے واقف ہوں۔'' ہنری سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تم اپنی بات جاری رکھو۔''

''سوسانا سے ملنے سے پہلے اس نے افریقا میں ایک

فلاحی تنظیم سے روابط قائم کر لیے۔ وہ اسے اپنے ساتھ کینیا یا کسی دوسری وسطی افریقی ریاست لے گئے جہاں اسے بسوں کے ڈرائیوروں کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس نے چند ہفتے وہاں ملازمت کی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ شخص محض ایک شعبدہ باز اور کام کے معاملے میں بالکل اناڑی ہے تو اسے واپس بھیج دیا گیا۔ یارک آنے کے بعد اس کی ملاقات سوسانا سے ہوئی جو ان دنوں ایک بار میں کام کر رہی تھی۔"

"اچھا۔" ہنری نے ایک بار پھر سر ہلایا۔

"لیکن اس افریقی تجربے نے اسے بہت نقصان پہنچایا اور اس کے دماغ میں الٹے سیدھے خیالات جمع ہونے لگے۔ وہ وہاں ڈرائیوروں کا انچارج تھا اور اختیارات کا مزہ چکھ چکا تھا۔ وہ واپس آنے کے بعد بھی ایسا ہی رہنا چاہتا تھا۔ دوسروں پر حکم چلانے والا...... میرا مطلب ہے......" مارک نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

"ہاں ہاں۔" ہنری مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہارا کیا مطلب ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ ہوئی کہ سفید فام ہونے کی وجہ سے اس میں احساسِ برتری پیدا ہو گیا لہٰذا جب وہ سوسانا سے ملا تو وہ بھی اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور اس کی پُرفریب باتوں میں آ گئی۔ وہ ناتجربہ کار اور ایڈونچر کی شوقین تھی جبکہ سالومن خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے کا فن بھی جانتا تھا۔"

"اور اس نے انہی باتوں کا فائدہ اٹھایا۔"

"ہاں۔" مارک بولا۔ "وہ جانتا تھا کہ ان صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کرنا ہے چنانچہ اس نے ایک اسکیم بنائی جسے اس کا کھلا پن یا حماقت کہا جا سکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ ہوئی کہ وہ اسے قابلِ عمل سمجھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر افریقا واپس جانے کا پروگرام بنایا۔ اس کے پاس سفری اخراجات کے لیے پیسے نہیں تھے اور وہ گاڑیوں سے لفٹ لے کر صحرا پار کر کے نائیجیریا کے جنگلوں سے گزرتا ہوا لاگوس پہنچتا اور مقامی مزدوروں کی نگرانی کے لیے ملازمت تلاش کرتا جبکہ اس کی واحد قابلیت یہ تھی کہ وہ سفید فام تھا اور سیاہ فام مزدوروں پر بہ آسانی حکم چلا سکتا تھا۔ وہ بے وقوف یہ سمجھ رہا تھا کہ برطانیہ کے مقابلے میں وہاں اسے پانچ گنا زیادہ معاوضہ ملے گا۔"

"یقیناً، یہ اس کی بے وقوفی تھی۔" ہنری نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں اس شخص کی فطرت کو پوری طرح سمجھ گیا ہوں۔"

لوگوں نے سوسانا کو سمجھانے کی بہت کوشش کی جن میں لِلی اور اس کے گھر والے بھی شامل تھے لیکن وہ اس کے سحر میں پوری طرح گرفتار ہو چکی تھی۔ اسے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بس وہ اتنا جانتی تھی کہ ایک خوب صورت اور خوش گفتار شخص اسے اس مہم جوئی کی پیشکش کر رہا ہے تاکہ اس کے تجربات میں اضافہ ہو سکے۔ وہ بہت خوش تھی اور اس کا خیال تھا کہ خوش شکل ہونے کی وجہ سے اس کا مستقبل روشن ہو جائے گا لیکن یہ محض اس کا خواب تھا۔"

مارک نے چند لمحے توقف کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ان کے جانے میں ایک دن باقی تھا کہ کرسمس آ گیا۔ سوسانا نے اصرار کیا کہ وہ کرسمس گھر پر منائے گی۔

سالومن پہلے تو ہچکچایا پھر اس شرط پر تیار ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہے گا۔ انہوں نے ایک دن کے لیے ہول گیٹ میں ایک چھوٹا مکان کرائے پر لیا اور ہم سب کرسمس منانے کے لیے وہاں جمع ہوئے یعنی میں، لِلی، سالومن اور سوسانا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ سوسانا پر اچانک ہی اس کی حقیقت واضح ہو گئی۔ وہ بولی۔

"لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تم کچھ نہیں ہو۔ صرف خواب دکھاتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا رہی۔"

یہ سنتے ہی اس کے اندر کا خبیث انسان باہر آ گیا۔ وہ سوسانا کی طرف بڑھا اور پوری قوت سے اسے ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑائی اور زمین پر گر پڑی۔"

"کیا اس نے اسے مار ڈالا؟"

"ہاں، لِلی تو فوراً ہی بے ہوش ہو گئی اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں لیکن سالومن نے ایسا ردِعمل ظاہر کیا جیسے کچھ نہیں ہوا۔ اس نے سوسانا کی نبض دیکھی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ میں پہلے بھی یہ کر چکا ہوں۔"

"اس نے یہ کہا۔" ہنری حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" مارک نے جواب دیا۔ "اس نے اور بھی قتل کیے تھے۔ کم از کم ایک یا اس سے بھی زیادہ۔ ممکن ہے کہ اس نے ہوائی چھوڑی ہو لیکن اس وقت مجھے اس کا یقین کرنا پڑا۔"

"مجھے بھی یقین ہے۔" ہنری نے سرگوشی میں کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"وہ اندر کے کمرے میں گیا اور ایک بڑا سا اسپورٹس

بیگ لے کر آگیا۔ اس نے سوسانا کے جسم سے جیولری اتاری اور اس کی لاش کو گھٹنوں سے موڑ کر بیگ میں رکھ دیا۔ وہ دبلی پتلی اور چھوٹے قد کی تھی۔ اس لیے بہ آسانی اس میں سما گئی۔ پھر وہ لاش کو باہر لے گیا اور اسے ایک وین کے عقبی حصے میں رکھ دیا جسے وہ خود چلا رہا تھا۔"

"اور تم؟"

"میں صدمے سے سُن ہو گیا تھا اور خوف زدہ بھی....." مارک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ میں اتنا طاقتور نہیں ہوں بلکہ میرے کچھ شاگرد تو مجھ سے بھی زیادہ لمبے چوڑے ہیں اور سالومن کی جسامت تو بالکل پہلوانوں جیسی تھی۔ اس نے میرے سامنے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ایک عورت کو مار دیا۔ اس لیے میں اپنے تحفظ کی خاطر خوف زدہ تھا۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" ہنری نے جواب دیا۔ "لیکن تم نے اگلے روز یا اس کے بعد یہ بات کسی کو کیوں نہیں بتائی؟"

"میں نہیں جانتا۔" مارک نے فرش پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ہنری نے کہا۔ "اپنی بات جاری رکھو۔"

"وہ سوسانا کی لاش وین میں رکھ کر لے گیا اور میں ملی کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا پھر ہم اوپر چلے گئے۔ دونوں ہی صدمے کی حالت میں تھے۔ پھر دو دن بعد......"

"دو دن!" ہنری چلّایا۔ "تم دو دن تک پولیس کے پاس نہیں گئے؟"

"ہاں، اس دوران ہم گھر میں ہی رہے۔ جو کچھ ہوا اس پر ہمیں یقین نہیں آرہا تھا۔" مارک نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "پھر وہ واپس آگیا۔ اس کے ساتھ لڑکوں کی ایک ٹیم تھی۔ ان سب نے زرد رنگ کے بنیان پہن رکھے تھے۔ اس نے مجھے اور ملی کو بھی وہ بنیان دیے اور ہم بھی ان لڑکوں کے ساتھ وین میں سوار ہو گئے۔"

"تم ان لڑکوں کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔" مارک نے جواب دیا۔ "وہ اس کے بھائی تھے۔ اس لیے ہم صرف گرے سالومن ہی نہیں بلکہ پورے سالومن خاندان کے خلاف ہو گئے۔ وہ دورانِ سفر بڑے فخریہ انداز میں اپنی سزاؤں، قید اور جرمانے کا تذکرہ کر رہے تھے۔"

"اس طرح اب ہم بھی ان کے بارے میں جان جائیں گے۔" ہنری بولا۔

"ہاں، تمہیں ان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔" مارک نے جواب دیا۔ "بہرحال ہم چرچ اسٹریٹ کے نزدیک سپر مارکیٹ کے برابر والے میدان میں پہنچے۔ اس نے ملی کے علاوہ ہم سب کو گھاس کاٹنے کے لیے قینچیاں دیں جبکہ ملی سے کہا کہ وہ وین میں اسپورٹس بیگ کے پاس رہے جس میں سوسانا کی لاش تھی۔"

مارک نے اپنی انگلیاں آپس میں پھنسائیں اور بولا۔ "ہم نے ایک قطار بنا کر گھاس کاٹنا شروع کر دی جو کہیں کہیں دو فٹ اونچی تھی۔ لوگ وہاں سے گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک پولیس کار بھی وہاں آئی۔ انہوں نے ایک نظر ہمیں دیکھا اور چلے گئے۔ ہمیں زرد بنیان پہنے دیکھ کر وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ ہم کمیونٹی کی جانب سے صفائی کرنے آئے ہیں۔"

"اور سالومن؟"

"وہ گڑھا کھودنے لگا۔ پانچ بجے کے قریب جب اندھیرا ہونے لگا تو وہ وین تک گیا۔ اس نے اسپورٹس بیگ اٹھایا اور اسے لے کر گڑھے تک آگیا۔ اس کے ساتھ ملی بھی تھی۔ ہم سب اس گڑھے کے گرد کھڑے ہو گئے جو سالومن نے کھودا تھا۔ اس نے سوسانا کی لاش اس میں رکھی اور ہم بیلچوں کی مدد سے گڑھا بھرنے لگے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"جب بھرائی مکمل ہو گئی تو اس نے ہم سے کہا کہ پتھر جمع کر کے قبر پر رکھ دیں۔ اس کے بعد مجھے اور ملی کو گھر جانے کے لیے کہا گیا اور وہ سب وین میں بیٹھ کر چلے گئے۔"

ہنری خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

"کچھ عرصے بعد ملی کو نروس بریک ڈاؤن ہوا۔" مارک نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس واقعے کا اس کے ذہن پر بہت برا اثر ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی دماغی طور پر کچھ کمزور تھی لیکن سوسانا کو قتل ہوتے دیکھنا پھر اس کی لاش کے ساتھ وین میں بیٹھنا اور اسے دفن ہوتے دیکھنا اس کے اعصاب کو منتشر کرنے کے لیے کافی تھا۔ دو دن بعد وہ ہذیانی انداز میں چلاتی ہوئی سڑک پر نکل گئی جیسے کوئی بدروح اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ وہ اسپتال میں داخل ہوئی تو میں اسے دیکھنے گیا۔ اسے مسکن دوائیں دی جا رہی تھیں اور وہ ایک زندہ لاش کے مانند نظر آرہی تھی۔ تاہم وہ تھوڑی بہت گفتگو کر رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے شیزوفرینیا ہو گیا ہے۔ یہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

ایک دماغی عارضہ ہے جس میں مریض کی شخصیت بے ربط اور منتشر ہو جاتی ہے۔ وہ دائمی مریض بن کر طویل عرصے تک اسپتال میں رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسے مریض بھی صحت یاب نہیں ہوتے۔

میں اسے کئی مرتبہ دیکھنے گیا پھر اس میں وقفہ آنے لگا اور ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے اس کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ منتشر ذہنی کیفیت میں میری رپورٹ نہیں کر دے۔ پھر بھی اس نے کافی وقت لیا کیونکہ یہ واقعہ بیس سال پہلے پیش آیا تھا۔''

''نہیں، اس نے تمہاری رپورٹ نہیں کی۔'' ہنری نے کہا۔ ''بلکہ وہ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے جس میں انسان کسی اجنبی کے سامنے اپنا راز ظاہر کر دیتا ہے۔''

''حیرت ہے۔'' مارک بولا۔ ''میں نے کبھی اس بیماری کے بارے میں نہیں سنا۔''

ہنری نے اسے تفصیل بتائی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم یہ سب باتیں ریکارڈ کریں گے اور اعترافی بیان پر تم سے دستخط بھی کروائیں گے۔''

''نہیں۔'' مارک نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''اب میں کسی وکیل سے تنہائی میں بات کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ کم از کم تم نے اس کی شناخت کی تصدیق تو کر دی۔'' ہنری کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال ابھی ہمیں ڈی این اے کروانا ہے اور ہم یہ بھی جان گئے ہیں کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ کیا تمہارا کوئی وکیل ہے یا ڈیوٹی سالیسٹر ہی کافی ہوگا؟''

''میں ڈیوٹی سالیسٹر سے بات کر کے ہی مطمئن ہو جاؤں گا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اس لیے مجھے وکیل کی ضرورت نہیں۔''

☆☆☆

گائلز سالومن انٹرویو روم ون میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں سوٹ میں ملبوس ٹونی فوسٹر تھا جس کا تعلق وکیلوں کی فرم فوسٹر، سورلینڈ اینڈ میک گوئر کمپنی سے تھا۔ ان دونوں کے سامنے ہنری اور گیری بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر کی سرخ بتی روشن ہوئی اور دونوں کیسٹ آہستہ آہستہ گھومنے لگے۔

''ہمارا خاندان بہت بڑا تھا اور ہم سب کے نام G سے شروع ہوتے ہیں۔'' سالومن نے وضاحت کی۔ ''ہمارے اپنے علاقے میں زیادہ دوست نہیں تھے۔ لیکن جب ہم بڑے ہوئے اور سڑکوں پر نکلنا شروع کیا تو والدین بھی ہمارے راستے سے ہٹ گئے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ سب بھائی......'' ہنری نے پوچھا۔

''ہاں، گراہم یا گرے سب سے بڑا تھا۔ اس کے آٹھ سال بعد میں پیدا ہوا، پھر گرانٹ، جیری، گورڈن پھر گائے۔ ہم چھ بھائی تھے۔ ماں کا نام گلین اور باپ کا گیری تھا۔ کیونکہ سب کے نام G سے شروع ہوتے تھے۔ اس لیے بعض اوقات لوگوں کو پریشانی ہوتی تاہم ہمارے درمیانی نام بھی تھے جو حروف تہجی سے شروع ہوتے۔ گراہم پہلے پیدا ہوا۔ اس کا نام گراہم اینڈریو تھا۔ دوسرے نمبر پر میں تھا۔ اس لیے میرا نام گائلز برائن رکھا گیا پھر گرانٹ کرسٹوفر۔ اس طرح سب بھائیوں کے درمیانی نام حروف تہجی کی ترتیب سے رکھے گئے۔

''ہم بہت چھوٹے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا اور ماں کی ساری توجہ گراہم پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اس پر بری طرح فدا تھی۔ وہ جب چاہتا اور جو چاہتا وہ پورا ہو جاتا۔ ہم سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے پورے گھر پر اس کا حکم چلتا تھا۔''

''میرے سامنے پوری تصویر آ گئی ہے۔'' ہنری بولا۔

''ہم گراہم کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔'' گائلز نے وضاحت کی۔ ''ایک دفعہ گورڈن اس کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن پھر اٹھ نہ سکا۔ گراہم اسے اسپتال لے گیا اور اس سے کہا کہ وہ پولیس کو یہی بیان دے کہ کچھ اجنبی لوگوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اس نے گراہم کے کہنے پر پولیس کو بیان دیا کہ کچھ لوگوں نے اس پر عقب سے حملہ کیا لیکن وہ انہیں دیکھ نہیں سکا۔ گورڈن چار ہفتے اسپتال میں رہا اور آج بھی اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ ہے۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ میرا بھائی گراہم کتنا ظالم اور سفاک ہے۔ ہم اس کی حکم عدولی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

ہنری اور گیری اب بھی خاموش رہے۔

''لہٰذا جب اس نے ہم سے اس خالی میدان میں گھاس کاٹنے کے لیے کہا تو ہم نے کوئی سوال کیے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی جبکہ وہ خود گڑھا کھودتا رہا۔''

''تمہیں معلوم تھا کہ وہ کس لیے گڑھا کھود رہا تھا؟'' ہنری نے پوچھا۔

''نہیں جناب۔ جب وہ وین سے اسپورٹس بیگ لے کر گڑھے تک آیا پھر اس نے بیگ کھول کر اس لڑکی کی لاش گڑھے میں رکھی تب ہمیں معلوم ہوا پھر اس نے ہم سے

گڑھا بھرنے کے لیے کہا اور جب یہ کام ہو گیا تو اس نے ہم سے کہا کہ میدان سے پتھر جمع کر کے گڑھے پر رکھ دیے جائیں۔‘‘

’’اور تم نے اس پر بھی عمل کیا؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ گائلز نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

’’مجھے خوشی ہے کہ یہ معاملہ کھل گیا۔ ہم تھوڑے سے بُرے ضرور ہیں اور ہمارا مجرمانہ ریکارڈ بھی ہے لیکن گرے..... وہ ہم سے بہت مختلف ہے۔ وہ شیطان ہے گو کہ وہ میرا بھائی ہے لیکن میں اسے شیطان کا چیلا سمجھتا ہوں۔ اس وقت وہ فل سوٹن کے قید خانے میں ہے۔ اس کا شکار خوش قسمت تھا کہ پانچ ٹانکے لگنے کے بعد بھی زندہ بچ گیا۔ ورنہ وہ آسانی سے قتل ہو سکتا تھا۔‘‘

’’تمہیں معلوم ہے کہ اس نے کسی اور کو بھی اپنا نشانہ بنایا تھا؟‘‘ گیری نے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ گائلز نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’اگر ایسا کوئی ہے تو مجھے اس پر حیرت نہیں ہوگی لیکن اس نے سب کام بڑی ہوشیاری سے کیا۔ اس نے مجھے اور میرے بھائیوں کو اس طرح استعمال کیا جیسے ہم کوئی سرکاری ڈیوٹی انجام دے رہے تھے اور لڑکی کی لاش کو گڑھے میں ڈالتے وقت بھی وہ پُرسکون تھا۔‘‘

’’لگتا ہے کہ اسے ان کاموں کی مشق تھی؟‘‘ ہنری نے خیال ظاہر کیا۔

’’شاید۔‘‘ گائلز نے کہا۔ ’’لیکن اس نے اس سے پہلے اپنے بھائیوں کو کبھی اس طرح استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ ہمارے لیے بالکل نئی بات تھی۔‘‘

☆☆☆

’’مجھے پانچ سال کی سزا ہوئی تھی لیکن میں تین سال پورے ہونے سے پہلے ہی باہر آ جاؤں گا۔‘‘ گراہم سالومن نے انکشاف کیا۔ وہ ایک لمبا چوڑا اور مضبوط جسم والا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ نظر آئی جو اس کے جذبات کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور نہ ہی ہنری کو اس کی آنکھوں میں گرم جوشی نظر آئی۔ وہ فوراً ہی جان گیا کہ اس کے سامنے ایک انتہائی خطرناک شخص ہے۔

’’بس چند ہفتوں کی بات ہے۔‘‘ گراہم نے کہا۔ ’’اس کے بعد میں دل کھول کر عیاشی کروں گا۔ عورت اور شراب کے بغیر تین سال گزارنا بہت مشکل تھا۔‘‘

’’لگتا ہے کہ تمہیں کچھ زیادہ ہی انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘ ہنری نے جواب دیا۔ ’’شاید کم از کم مزید بیس سال۔‘‘

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘ سالومن غصے سے بولا۔

’’میرا مطلب ہے کہ ہمیں سوسانا پائر کی لاش مل گئی ہے۔ کیتھ مارک تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ تمہارے پانچوں بھائیوں نے اعتراف کر لیا ہے کہ انہوں نے لاش کو ٹھکانے لگانے میں تمہارا ساتھ دیا تھا۔‘‘

سالومن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

’’میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تم سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر سالومن۔‘‘ ہنری نے کہا۔ ’’بہرحال یہ ایک دلچسپ ملاقات تھی۔‘‘

☆☆☆

گرمیوں کی خوشگوار شام وہ دونوں بازو میں بازو ڈالے جھیل کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ مارک بہت فائدے میں رہا۔ اس نے پہلے ہی یہ بات منوالی تھی کہ وہ اس شرط پر گواہی دے گا کہ اس پر کوئی الزام عائد نہ کیا جائے۔ پراسیکیوشن کو یہ شرط ماننا پڑی کیونکہ اس کی گواہی کے بغیر وہ سالومن پر قتل کا الزام عائد نہیں کر سکتے تھے اور ملی فشر کی گواہی اس کی ذہنی حالت کی وجہ سے قابلِ اعتبار نہیں تھی۔ تاہم اس کیس کو میڈیا میں اتنی شہرت ملی کہ مارک کی ملازمت خطرے میں پڑ گئی۔ جب وہ عدالت میں گواہی دے کر باہر نکلا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ملازمت برقرار رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے کیونکہ اس پر کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود محکمۂ تعلیم میں کچھ لوگ اس کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں اسی لیے وہ کوئی دوسرا کام ڈھونڈ رہا ہے تاکہ گھر کا خرچ چلا سکے۔‘‘

’’اور سالومن کے بھائیوں کا کیا بنا؟‘‘ عورت نے پوچھا۔

’’انہیں اعانتِ جرم کے الزام میں پانچ پانچ سال کی سزا سنائی گئی کیونکہ انہوں نے سوسانا کی لاش کو دفن کرنے میں سالومن کی مدد کی تھی۔ اس بار سوسانا کی باقیات کو پورے اعزاز اور باوقار طریقے سے دوبارہ دفنایا گیا۔‘‘

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جارج ہنری نے کہا۔ ’’اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ آج رات ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘

ڈاکٹر لوئیس نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔‘‘ ہنری کو لگا جیسے اسے اس کی منزل مل گئی۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

چھتیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر ورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِ راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے دو بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی گتھی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب

تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جارہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیر زمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیر زمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارا قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں...... شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنون سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آ چکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا میں اور انیق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے خورسند آ چکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کر دیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا ہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کروا کے میں اپنوں میں اجنبی بن گیا تھا۔ اجنبی چہرے کے ساتھ ہی سیف کے گھر تک آ پہنچا تھا۔ اصل مقصد میرا تاجور کا حصول تھا میں اس تک پہنچنا چاہتا تھا اس کے گھر والوں نے دارا ب فیملی میں اس کا رشتہ طے کر دیا تھا مگر اہل خاندان اس سے ناخوش تھے۔ آہستہ آہستہ میں سیف کے گھر والوں کے دل میں جگہ بنا رہا تھا۔ سیف کی موت کا سن کے اس کی ماں اور باپ کا برا حال تھا۔ کچھ دنوں بعد ماں یہ صدمہ جھیل نہ سکی اور خالق حقیقی سے جا ملی۔ شاید میری قسمت میں تاجور کا ساتھ نہیں تھا۔ وہ قریب آ کے پھر دور جا چکی تھی۔ انیق کی اچانک عداوت کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی جاماجی سے پانا دانی کی پُراسرار آمد نے ہم سب کو ششدر کر دیا تھا...... وہ ہم سب کی دشمن تھی...... اور ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ یقینی تھا......

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

خدا کی پناہ، یہ کیسا انکشاف تھا۔ آنکھوں کے سامنے سے جیسے ایک پردہ سا ہٹ گیا تھا اور ایک ایسا منظر نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا جو نہایت تشویش ناک تھا۔ کیا انیق جو کچھ کر رہا تھا، اس کے پیچھے عورت ہانا وانی کا ہاتھ تھا؟ ہپناٹزم ایک مانی ہوئی سائنسی حقیقت ہے، یہ جن پریوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہ ایگزرسسٹ کرتی ہے۔ نگاہ کی طاقت سے ذہن کو تابع کیا جاتا ہے اور سوچوں کو من چاہی سمت میں موڑا جاتا ہے۔ جاماجی میں اس طاقت کا مظاہرہ دیکھنے سے پہلے میں بھی اس پر پوری طرح یقین نہیں رکھتا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ ست رنگا بھنور آج بھی میری نگاہوں کے سامنے تھا جس سے بچنے کے لیے میں نے اپنے زخمی انگوٹھے کو نہایت بے دردی سے کچل ڈالا تھا۔

ہاں پیرا سائیکالوجی کی یہ حقیقت زندہ سلامت میرے سامنے موجود تھی اور اس کا نام ہانا وانی تھا تو کیا اس نے انیق کے دل و دماغ کو مفلوج کر رکھا ہے اور اس سے اپنی منشا کے کام کرا رہی ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انیق کی وہ ساری تکلیف دہ کارروائیاں نگاہوں کے سامنے آئیں جنہوں نے ہم سب کو متحیر کر رکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انیق ''شکاری'' نہیں ''شکار'' ہے۔ وہ ستم گر نہیں بلکہ اس پر ستم کیا گیا ہے۔

انیق کے رشتے دار بزرگ کی آواز کی بازگشت میری کانوں سے ٹکرائی۔ ایک دن پہلے انہوں نے کہا تھا۔ ''کبھی

کبھی تو مجھے اپنے بیٹے پر ترس آتا ہے۔ بہت پریشان رہتا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ اس پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔"

"یار! اِدھر چپک ہی گئے ہو۔" فخر کی سرگوشی نے مجھے چونکایا۔

میں نے کھڑکی کی جھری سے آنکھ ہٹائی اور واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "کیا ہوا برادر؟" فخر میرا چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔

"وہ...... جو کچھ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔" میں نے بمشکل خود کو سنبھال کر کہا۔ "انیق وہ نہیں ہے فخر...... جو نظر آ رہا ہے۔ وہ کسی شکنجے میں ہے۔ اُسے...... استعمال کیا جا رہا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ حیرت سے بولا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، بابا جی واپس آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پڑیا تھی۔ اس پڑیا کو انہوں نے کھولا تو اس میں ایک قیمتی یاقوت تھا۔ بزرگ نے بتایا کہ یہ بی بی صاحبہ نے کسی چوہدرائن کو دیا ہے۔ اس کو سونے کی انگوٹھی میں لگوانا ہے۔

وہ "بی بی صاحبہ" کے بارے میں بتانے لگے کہ وہ واقعی بہت پہنچی ہوئی ہیں...... صرف عورتوں کا علاج دم اور وظیفے وغیرہ سے کرتی ہیں۔ منہ سے کچھ بولتی نہیں مگر ان کے عمل میں اللہ نے بہت شفا رکھی ہوئی ہے۔

میرے لیے اب زیادہ دیر یہاں بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دماغ میں صرف اور صرف انیق کا چہرہ تھا۔ اسے بڑے خطرناک طریقے سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک میں تو "مر" چکا تھا ورنہ ہو سکتا تھا کہ اس کے ذریعے پہلے مجھے ہی بے دردی سے مروایا جاتا۔ اب ان لوگوں کا سب سے بڑا دشمن سجاول تھا...... اور سجاول مسلسل انیق کی زد میں تھا لیکن کیا واقعی وہ انیق کی زد میں تھا؟ اس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ جاماجی کی بدنام ترین ساحرہ ہاناوانی کی زد میں تھا۔

باہر جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو فخر نے قدرے ہراساں لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہوا ہے یار! کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

میں نے کہا۔ "فخر! میں ابھی وہ دیکھ کر آیا ہوں جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ دشمنی جو جاماجی سے شروع ہوئی تھی، ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میں نے تمہیں رائے زل کی ماں کا بتایا تھا نا؟"

"کون؟ وہی جو کھلی قبر میں رات گزارتی ہے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا ماؤ وارا؟"

"ہاں...... اسے ہاناوانی بھی کہتے ہیں۔ وہ اس وقت یہاں انیق کے گھر میں موجود ہے مجھے یقین ہے فخر...... انیق جو کچھ کر رہا ہے...... ہاں، جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اس ہاناوانی کی وجہ سے کر رہا ہے۔ وہ ہمارے تصور سے زیادہ خطرناک...... ناقابلِ فہم عورت ہے۔"

"وہ عورت اور یہاں؟" فخر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "تمہیں غلطی تو نہیں لگی؟"

"کاش غلطی ہی لگی ہوتی مگر یہ ہو چکا ہے فخر...... اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہاں خیبرا ایجنسی میں سجاول اور انیق کے ساتھ...... یا دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بہت بُرا ہونے والا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے...... انیق حواس میں نہیں ہے، اور جو کچھ کر رہا ہے اسی عورت کے زیرِ اثر کر رہا ہے؟"

"ایک سو ایک فیصد ایسا ہے...... بظاہر یہ باتیں عجیب لگتی ہیں مگر میں جاماجی میں اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتے دیکھ چکا ہوں۔ میں نے ایک مرتبہ سجاول کو بھی ایسے ہی "ٹرانس" میں دیکھا تھا۔ وہ جیسے کسی تیز نشے کے مستقل اثر میں تھا۔ کچھ عرصے کے لیے بالکل بیگانہ ہو گیا تھا۔ یہ تنویم کی ایک خاص قسم ہوتی ہے۔"

"اوہ خدا!" فخر نے سر پکڑ لیا۔ "یہ اکیسویں صدی ہے...... اور کیا ہم ایک بار پھر جادو اور طلسم کی طرف لوٹ رہے ہیں؟"

"اب ان باتوں کو چھوڑو فخر...... ہمیں جلد از جلد انیق اور سجاول تک پہنچنا ہوگا۔ وہ اس وقت نہایت مہلک صورتِ حال میں ہیں۔ سجاول کا پارا ساتویں آسمان کو چھو رہا ہے۔ اس کی والدہ کی بہن کو قتل کر دیا ہے انیق نے، اس کی بھتیجی کے ساتھ سرِعام دست درازی ہوئی ہے۔ سجاول اب اسے معاف نہیں کرے گا۔"

وہ بولا۔ "چلو ڈرائیونگ میں سنبھالتا ہوں، تم فون پر رابطے کرو۔ شاید کہیں سے کوئی سرا ہاتھ آ جائے۔"

فخر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ گاڑی تیزی سے مضافاتی علاقے کی پختہ و نیم پختہ سڑکوں پر بھاگنے لگی۔ شام کے سائے طویل ہو رہے تھے اور ہم اس مین سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے جو آگے جا کر ہمیں جی ٹی روڈ سے جوڑ سکتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر یونس پمپ والا کو فون ملانے کا ارادہ کیا، تاہم اس کی کال آ گئی۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں

بولا۔ ''وقاص بھائی! ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ نہیں تو ان دونوں میں سے کسی ایک کا خون ہو جائے گا۔ انیق کا کھوج کہیں کوہاٹ کے آس پاس ملا ہے۔ سجاول صاحب وہاں پہنچ گئے ہیں۔ کوئی مقامی ملک زرق خاں بھی ان کے ساتھ ہے۔''

''تم تک یہ خبر کیسے پہنچی ہے؟''

''خیبر ایجنسی میں اپنا ایک بندہ ہے، وہی اطلاع دے رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تین بڑی جیپوں پر سجاول صاحب اور ملک زرق خاں کے مسلح بندے ''باغ'' کے پاس کی پہاڑیوں کی طرف گئے ہیں۔ وہاں پر فون کے سگنل نہیں ملتے۔ میں نے بڑا سر مارا ہے مگر سجاول صاحب سے رابطہ نہیں ہوا۔''

''ٹھیک ہے، تم اطلاع دینے والے بندے سے رابطہ رکھو۔ ہم جلد از جلد ان تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی جیسے آپ کہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری بات سے پتا چلتا ہے کہ سجاول کافی بندے لے کر انیق کے پیچھے گیا ہے۔ کیا انیق کے ساتھ بھی بندے ہیں؟'

''جہاں تک میرا اندازہ ہے ''باغ'' میں تو اس کے ساتھ دو تین بندے تھے۔ اب کا پتا نہیں ہے۔'' (باغ، وہاں ایک قصبے کا نام تھا)

فون بند کر کے میں نے فخر سے کہا۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ انیق کو مدد کی ضرورت ہے۔ وہ سجاول کے بے پناہ طیش کا شکار ہو سکتا ہے۔''

رات کے نو بجے تھے جب ہمارے جہاز نے لاہور کے علامہ اقبال ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔ رضوان نے ہمارے لیے گاڑی کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ اچھی حالت کی ایک بلیو کار تھی۔ ائرپورٹ سے ہم ہوٹل پہنچے۔ میرے پاس بریٹا پسٹل کے علاوہ ایک عدد سیون ایم ایم رائفل بھی موجود تھی۔ ہم نے یہ چیزیں ایک کمبل میں لپیٹ کر گاڑی تک پہنچائیں اور پھر وہاں سے نکل آئے۔ رضوان میری ہدایت پر لاہور میں مولانا کے پاس رہا۔ موٹر وے پر پہنچتے ہی ہم تقریباً 120 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے راولپنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں وقتاً فوقتاً یونس سے بھی رابطہ ہو رہا تھا۔ وہ پنڈی بھٹیاں انٹرچینج پر موجود تھا اور ہمارا انتظار کر رہا تھا (میں نے فخر کو یاد دہانی کرا دی تھی کہ وہ یونس کی موجودگی میں مجھے وقاص کے نام سے ہی بلائے گا) ہم نے انٹرچینج سے یونس کو پک کیا اور تیز رفتاری سے سفر جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد یونس نے دوبارہ اپنے 'اطلاع کنندہ' سے رابطہ کیا۔

''ہیلو آصف خاں کیا حالات ہیں؟''

موبائل اسپیکر سے آواز ابھری۔ ''خو، حالات بڑا گڑبڑی والا ہے۔ ام کو تو لگتا ہے کہ اب اس لڑکے کا لاش ہی آئے گا۔ سجاول صیب اور اس کا ساتھی بہت غصے میں گیا ہے۔ ام کو نہیں لگتا کہ وہ اس کو زندہ چھوڑے گا۔''

''کیا تم کسی طرح اس لڑائی کو روک نہیں سکتے خان؟ میرا مطلب ہے کسی طرح سجاول صاحب یا زرق صاحب سے رابطہ ہو جائے۔''

''یہی تو بڑا مصیبت ہے۔ وہاں سگنل کیا، سگنل کا بچہ بھی نہیں ملتا۔ بارڈر کے پاس کا پہاڑی علاقہ ہے۔''

میں نے فون یونس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ ''آصف خان! یہ ایک بے گناہ بندے کی زندگی موت کا سوال ہے۔ کیا تم کسی طرح خود اس جگہ نہیں پہنچ سکتے؟''

''برادر! یہاں شام سے بہت بارش لگا ہوا ہے۔ امارے پاس موٹر سائیکل کے سوا کوئی سواری نہیں ہے اور اگر سواری ہوتا بھی تو شاید ہم نہ جا سکتا۔ وہ کافی بڑا علاقہ ہے۔ ام کو کچھ پتا نہیں کہ وہ کس طرف کو گیا ہے۔''

''تم کوشش تو کر سکتے ہو، کسی کو ساتھ لے لو۔ جتنا بھی خرچہ آئے گا ہم دینے کو تیار ہیں بلکہ تمہاری مدد کرنے والے کو انعام اکرام بھی دیں گے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ ام کو انعام شنام کا لالچ نہیں ہے اور نہ امارے کسی ساتھی کو ہے۔ اگر ام کچھ کر سکتا تو تمہارے کہنے کے بغیر ہی کر دیتا۔''

''سوری..... سوری.....'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''بہت پریشان ہوں۔ تمہیں بُرا لگا ہے تو معافی چاہتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے فون یونس کو تھما دیا اور اشارے سے کہا کہ وہ اپنے اس دوست کو آمادہ کرے۔ یونس نے فون لے لیا اور اپنی سی کوشش کرنے لگا، مگر دوسری طرف سے جو کہا جا رہا تھا اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ جو کچھ ہم چاہ رہے ہیں، وہ ہو نہیں سکے گا۔ فون کے اسپیکر میں سے گاہے بگاہے بادلوں کی گھن گرج بھی سنائی دے جاتی تھی۔

آخر... یونس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ڈرائیونگ فخر کر رہا تھا۔ اسپیڈ میٹر کی سوئی 120 کلومیٹر کے قریب تھی۔ میں نے کہا۔ ''اسپیڈ تھوڑی سی بڑھا لو فخر۔''

''چالان نہ ہوجائے۔''

''ہونے دو۔'' میں نے کہا۔

فخر نے اسپیڈ قریباً دس کلومیٹر فی گھنٹا مزید بڑھادی۔

یونس بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا لیکن اچھی کاٹھی کا تھا اور تیز طرار بھی تھا۔ وہ سجاول کے ان دوستوں میں سے تھا جو براہِ راست کسی جرم میں شریک نہیں تھے مگر تھے دبنگ لوگ۔ اس نے اپنی بڑھی ہوئی شیو کو کھجا کر ہولے سے کہا۔ ''وقاص بھائی! چھوٹا منہ بڑی بات کررہا ہوں۔ اس منڈے نے سجاول صاحب کو بڑا دکھ پہنچایا ہے۔ پہلے ان کے بیوی بچے کو مارنے کی کوشش کی...... پھر سجاول صاحب پر حملہ کیا، پھر ان کی بہن کی عزت خراب کی اور ان کی خالہ کی جان لی...... لیکن آپ اسے بے گناہ کہہ رہے ہیں؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ بے گناہ ہے، اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ کچھ باتوں کا تمہیں پتا نہیں...... اور سجاول کو بھی نہیں......''

''آپ کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ اس منڈے نے نہیں کیا؟''

''اس سے کرایا گیا ہے۔ مجبور کرکے کرایا گیا ہے۔ بہرحال یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ بعد میں سمجھ میں آجائے گا سب کچھ۔ ابھی ہمیں کسی بھی طرح وہاں پہنچنا ہے اور ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرانا ہے۔''

''مگر بھائی جی، وہ جو قتل ہوگیا ہے اس کا کیا ہوگا؟''

وہ شاید بحث کے موڈ میں تھا۔

میں نے اُسے گھورا۔ ''میں نے تم سے کہا ہے ناں یونس، یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ بعد میں تمہیں بتاؤں گا سب کچھ۔''

ہمارے قریب سے ایک بڑی لگژری جیپ گزری۔ اس کی پچھلی اسکرین پر دارج داراب کے باپ کا ایک رنگین پوسٹر چسپاں تھا۔ جس میں اس شخص کو قوم اور ملک کا سچا خیرخواہ اور ہمدرد بتایا گیا تھا۔ ایسے پوسٹر اور بینرز پتا نہیں کہاں کہاں لگے تھے لیکن جو پوسٹر میرے دل پر لگ چکا تھا اس کی سیاہی کبھی ماند پڑنے والی نہیں تھی۔ اس شہ زور فیملی کے ایک شہ زور فرزند نے میری تاجور کو مجھ سے جدا کیا تھا...... اور میں جانتا تھا کہ وہاں اس کی زندگی ایک کنیز کی زندگی سے بھی بدتر رخ اختیار کرنے والی ہے۔

میں نے خیالات کی اس اچانک ابھرنے والی لہر کو بمشکل اپنے ذہن سے دور کیا۔ گاڑی برق رفتاری سے رواں تھی۔ ابھی ہم راولپنڈی سے آگے نکلے ہی تھے کہ بارش کا آغاز ہوگیا۔ مسلسل بارش میں ہم جس وقت فتح جنگ پہنچے، رات کے تین بج چکے تھے۔ ہم نان اسٹاپ سفر کررہے تھے۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے کسی موہوم امید کے سہارے سجاول کے نمبر پر بھی رابطے کی کوشش کررہا تھا۔ وہاں سے بس ایک ہی منحوس جواب تھا...... ''آپ کے مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔''

میرے پردۂ تصور پر بار بار انیق کا چہرہ چمکتا تھا...... اور وہ سارے مناظر نگاہوں میں گھوم جاتے تھے جو اَب تک مجھے بے پناہ حیرت اور دکھ میں مبتلا کرتے رہے تھے۔ تب میرا دل بار بار مجھ سے یہی سوال کرتا تھا کیا ہمارا انیق ایسا ہوسکتا ہے؟

وہ جو مجھ پر جان قربان کرتا تھا جس نے کئی بار اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچائی تھی۔ وہ جو مجھے اور تاجور کو ایک دیکھنے کے لیے تڑپا کرتا تھا، اس نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ بندہ اپنی بے پناہ مصروفیات میں کئی باتوں کو بھول جاتا ہے مگر وہ باتیں اس کی زندگی سے نکلی نہیں ہوتیں۔ ہم بھی چند ماہ پہلے جاماجی سے آنے کے بعد، وہ باب بند کر بیٹھے تھے لیکن وہ بند نہیں ہوا تھا۔ وہ دشمنی ہنوز دہک رہی تھی اور اس کا قرض چکانے کے لیے جزیرہ جاماجی کی یہ بدذات عورت یہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ نئے دور کی جدید ساحرہ تھی۔ وہ اپنی آنکھوں میں شاید ہپناٹزم سے بھی آگے کی کوئی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ لوگوں کے دل و دماغ کو اپنے شکنجے میں جکڑتی تھی اور قریباً دیوانہ بنا کر رکھ دیتی تھی۔

وہ دیوانگی ہی تو تھی جو اَب تک انیق سے سرزد ہوتی رہی تھی۔ وہ مسلسل اس کے ''ٹرانس'' میں تھا۔ اس کا میرے متعلق جھوٹ بولنا، بند کمرے میں تاجور کو میرے خلاف بھڑکانا، تاجور پر غلط نگاہیں ڈالنا، سجاول کے بیوی بچے پر قاتلانہ حملہ...... اور اس کی بیوی کو شدید زخمی کرکے مہینوں کے لیے بستر پر ڈال دینا...... ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں سجاول کو گولیوں سے چھلنی کرنے کی کوشش اور اب سجاول کی قریبی عزیزہ کا قتل...... لیکن یہ سب کچھ انیق نے اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا۔ وہ ایک کل پُرزے کی طرح حرکت کررہا تھا۔

فخر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ یونس کی وجہ سے اس نے مجھے وقاص کے نام سے مخاطب کیا اور بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ عورت مجیشن کے علاوہ میڈیکیشن کا استعمال بھی کرتی ہے۔ سنا ہے کہ آج کل اکثر

ہپناٹسٹ اپنے معمول کو دوائیں وغیرہ بھی کھلاتے ہیں۔“
”مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں فخر، میں بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ عورت اس جزیرے کی ایک انوکھی مخلوق ہے۔ اس کے بارے میں اَن گنت کہانیاں مشہور ہیں اور یہ خبیث اپنی ساری شیطانیت کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ انیق کے رشتے دار بزرگ کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ یہاں آتی جاتی رہتی ہے۔ پچھلے پانچ چھ مہینوں میں شاید تیسری یا چوتھی دفعہ یہاں آئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس نے انیق کو مسلسل اپنے اثر میں رکھا ہوا ہے۔“

فخر نے کہا۔ ”باباجی بتا رہے تھے کہ اس مرتبہ وہ ڈھائی تین مہینے بعد یہاں آئی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈھائی تین مہینے وہ انیق سے دور تھی۔ تو کیا اس دوران بھی انیق اس کی زد میں تھا؟“

”ہمیں ابھی کچھ پتا نہیں فخر، کیا پتا وہ انیق کو اپنے ساتھ ہی لے گئی ہو اور وہ اس کے ساتھ ہی رہا ہو۔ ویسے جہاں تک میری معلومات ہیں ایسے ماہر عامل فاصلے پر رہ کر بھی اپنے معمول کو اپنے ٹرانس میں رکھ سکتے ہیں۔“

فخر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں ایک جرمن ہپناٹسٹ کے بارے میں خبر پڑھی تھی میں نے۔ وہ فون کے ذریعے اپنے معمول کو ’سجیشن‘ دیتا تھا اور معمول اس پر عمل کرتا تھا...... لیکن یار! ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ اگر یہ ایسی ہی دبنگ اور خطرناک عورت ہے تو اس نے وہاں اس دور دراز گاؤں میں جا کر انیق کو کیوں آلۂ کار بنایا، وہ خود بھی تو سجاول اور انیق کو من چاہا نقصان پہنچا سکتی تھی۔“

”تمہارا سوال اپنی جگہ درست ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کو، اپنے ایک دشمن کو دوسرے دشمن کے ذریعے مروا کر ہی زیادہ تسکین ملتی ہے۔ بہرحال ابھی تو یہ سارے مفروضے ہی ہیں۔“

ہماری باتیں، یونس حیرانی سے سن رہا تھا۔ کچھ اس کی سمجھ میں آرہی تھیں، کچھ نہیں۔ میرا دھیان بار بار خورسنہ اور اس کے بچے کی طرف بھی جا رہا تھا۔ ہم نہایت ناقابلِ بھروسا حالات سے گزر رہے تھے اور سجاول تو آتشیں بگولے کی طرح انیق کے پیچھے نکل گیا تھا۔ میں نے یونس سے پوچھا۔ ”سجاول صاحب کی بیگم اور بچے کی حفاظت کا کوئی انتظام ہے؟“

”ہاں جی، میں نے اپنے دو چوکس بندوں کو چوبیس گھنٹے سجاول صاحب کے گھر کی حفاظت پر لگایا ہوا ہے، آپ بے فکر رہیں۔“

پنڈی سے کوہاٹ جانے والی سڑک کو فتح جنگ روڈ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت اچھا راستہ تو نہیں تھا، تاہم اگر ہم اچھی رفتار سے چلتے رہتے تو ہمیں ڈیڑھ دو گھنٹے میں کوہاٹ پہنچا سکتا تھا۔ جوں جوں ہم پنڈی کوہاٹ روڈ پر آگے بڑھتے رہے، بارش کی شدت بڑھتی رہی۔ فخر اور یونس کو تو شاید تھوڑی بہت بھوک محسوس ہو رہی ہو لیکن میری بھوک، خالی پیٹ ہونے کے باوجود مری ہوئی تھی۔ میں جلد سے جلد کوہاٹ پہنچنا چاہتا تھا۔

کچھ آگے جا کر میں نے محسوس کیا کہ مسلسل ڈرائیونگ نے فخر کو کچھ تھکا دیا ہے۔ میں نے لبِ سڑک ایک بس اڈے پر گاڑی رکوائی۔ پیٹرول لیا...... کچھ جوسز اور بسکٹس وغیرہ پکڑے اور ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال لی۔ میرے خیال میں، میں نے زندگی کی جو مشکل ترین ڈرائیوز کی ہیں، وہ ان میں سے ایک تھی۔ ہمارا پہلا ٹارگٹ تو باغ پہنچنا تھا۔ اس کے بعد یونس کے انفارمر آصف خاں کو ساتھ لے کر اس پہاڑی ایریا میں جانا تھا جہاں انیق اور سجاول موجود تھے۔

ہم نے پنڈی کوہاٹ روڈ پر 60 کلومیٹر کا فاصلہ قریباً 45 منٹ میں طے کیا اور موسم اور راستے کو دیکھا جاتا تو یہ بڑی اچھی رفتار تھی۔ اچانک مجھے گاڑی کی رفتار آہستہ کرنا پڑی۔

”کیا ہوا؟“ اونگھتے ہوئے یونس نے پوچھا۔
”لگتا ہے ٹریفک جام ہے۔“

گاڑیوں اور ٹرکوں کی ایک قطار کے پیچھے ہمیں رکنا پڑا۔ فخر تیزی سے نیچے اترا۔ یونس بھی اس کے ساتھ گیا۔ انہوں نے آگے جا کر دیکھا۔ ایک دو بندوں سے بات کی پھر واپس آگئے۔ یونس پمپ والا ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ”گڑبڑ ہوگئی جی۔ آگے ایک بڑا لوڈر سڑک کے درمیان پلٹی ہوگیا ہے۔ کوئی دو فرلانگ کی لائن لگی ہوئی ہے۔“

میں نے بےساختہ ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”اب کیا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

یونس بولا۔ ”وقاص بھائی، لیٹ نہ کریں جلدی سے واپس موڑیں۔“

میں نے گاڑی کو واپس موڑ لیا۔ ایک دو اور گاڑیاں بھی واپس مڑ رہی تھیں۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

یونس پمپ والا پنجاب اور پختونخواہ میں کافی سفر کر چکا تھا۔ ان راستوں کا شناسا تھا، بولا۔ ”پشاور روڈ والا چکر تو

بہت زیادہ لمبا ہے۔ پندرہ بیس میل پیچھے ایک اور چھوٹی سڑک بھی نکلتی ہے مگر ایک دو پٹھان ڈرائیوروں نے بتایا تھا کہ اس کا بہت برا حال ہے۔ ایک دو پلیاں بھی ٹوٹی ہوئی ہیں۔''

''کوئی رستہ نکالو یار، کسی پرانے ٹرک ڈرائیور کو فون وغیرہ لگاؤ۔''

اس نے سگریٹ سلگا کر مٹھی میں دبایا اور ایک لمبا کش کھینچ کر بولا۔ ''فون لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری اپنی عمر بھی ان رستوں پر ہی گزری ہے۔ یہاں سے کوئی چار میل پیچھے ایک پرانی سڑک ہے۔ سات آٹھ میل کا راستہ ہے۔ اگر ہم وہاں سے نکل جائیں تو نہ صرف اس 'جام ٹریفک' سے جان چھوٹ جائے گی بلکہ سفر بھی کم از کم بیس بائیس میل کم ہو جائے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ شارٹ کٹ ہے؟'' فخر نے پوچھا۔

''بالکل شارٹ کٹ ہے مگر اس سڑک کا کوئی تین میل کا ٹوٹا امراجوں کی پراپرٹی سے گزرتا ہے۔ انہوں نے کوئی جھگڑا کھڑا کیا ہوا ہے...... اور وہاں پھاٹک لگا رکھے ہیں۔ جب موڈ زیادہ خراب ہوتا ہے تو پھاٹک بند کر دیتے ہیں۔''

''یہ زندگی موت کا سوال ہے یار، ہم ان کا منت ترلا کرلیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ویسے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آج کل پھاٹک بند نہ ہوں۔'' یونس نے امید دلائی۔

''یہ امراجے ہیں کون؟''

''علاقے کے ملکوں کی کوئی برادری ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور ڈاکو چراغ بالی جب قانون سے چھپتا پھر رہا تھا تو کچھ عرصے اس علاقے میں بھی رہا تھا۔ کافی ڈھاڈے لوگ ہیں۔''

''چلو دیکھا جائے گا۔'' میں نے کہا اور گیئر لگا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

تین چار میل پیچھے جا کر ہم ایک تاریک سنسان سڑک پر مڑے۔ دونوں طرف ٹیلے اور پہاڑیاں تھیں۔ تنگ سڑک ان کے درمیان سے بل کھاتی گزرتی تھی۔ بارش کچھ ہلکی ہوگئی تھی مگر بدستور برس رہی تھی۔ ''گن وغیرہ تیار کرلیں؟'' فخر نے بوجھل خاموشی کو توڑنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''بالکل کرلو۔'' میں نے بھی رسمی انداز میں جواب دیا۔

اس وقت ہمیں ہرگز اس بات کا یقین نہیں تھا کہ دس پندرہ منٹ بعد میں واقعی ان ہتھیاروں کی ضرورت پیش آجائے گی۔ اس سڑک پر ہم دو ڈھائی کلومیٹر ہی آگے گئے تھے کہ وہ پھاٹک نظر آگیا جس کا ''ذکرِ خیر'' یونس نے کیا تھا۔ پھاٹک بند تھا۔ موٹی سی زنجیر میں بھاری قفل لگا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک بڑا سا سائبان تھا جس کی تین جانب پتھروں کی آٹھ نو فٹ اونچی دیوار تھی۔ سائبان کے اندر الاؤ روشن تھا اور رائفل بردار افراد نظر آرہے تھے۔ گاڑی دیکھ کر دو مسلح افراد لپکتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہوں نے سروں پر چھتریاں تان رکھی تھیں۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا اتار لیا۔ ایک ہٹے کٹے شخص نے پہلے تو پشتو زبان میں کچھ کہا۔ پھر یہ جان کر کہ ہم پشتو نہیں سمجھ پا رہے، ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ ''کون ہو تم...... اور یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

یونس باہر نکل کر بولا۔ ''یار! مین سڑک پر ایکسیڈنٹ ہوا ہے، ٹریفک رکی ہوئی ہے، ہمیں سخت ایمرجنسی ہے، ہمیں کوہاٹ پہنچنا ہے۔''

ہٹے کٹے شخص نے شرارتی انداز میں گاڑی کے اندر جھانکا اور بولا۔ ''یہاں تو مجھ کو کوئی عورت نظر نہیں آتا جس کو بچہ ہونے والا ہو بلکہ سرے سے کوئی عورت نظر ہی نہیں آتا۔''

میں بھی بارش کی پروا کیے بغیر گاڑی سے اتر آیا۔ میں نے کہا۔ ''میرے بھائی! یہ کسی کی زندگی موت کا سوال ہے۔ اگر ہم بروقت ''باغ'' نہ پہنچ سکے تو ایک بالکل بے گناہ شخص مارا جائے گا۔ ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں۔''

''بڑا ملک صیب ہمارا چمڑی اتروا کر اس میں گائے کا گوبر بھر دے گا۔ اس نے بالکل پابندی لگایا ہوا ہے۔'' وہ روکھے پن سے بولا۔ ساتھ ساتھ وہ ہم سب کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں ہم نے ان لوگوں کی ہر طرح منت سماجت کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ چار پانچ مزید بندے بھی سائبان کے نیچے سے نکل کر ہمارے اردگرد کھڑے ہو گئے تھے۔ آخر پھاٹک کی دوسری جانب سیاہ شلوار قمیص اور پگڑی والا ایک گرانڈیل شخص نظر آیا۔ اس نے بھی اپنے سر پر چھتری تان رکھی تھی۔ ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس نے پشتو زبان میں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کچھ کہا۔ غالباً اس نے یہی کہا تھا کہ اگر یہ نہیں مان رہے تو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پھر کھول دو گیٹ……

تالا کھول کر گیٹ کے پٹ وا کر دیے گئے۔ ہم نے گرانڈیل شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی……اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا مگر گاڑی پانچ چھ گز ہی آگے گئی ہوگی کہ ہمیں ایک اور چھوٹا پھاٹک نظر آ گیا۔ میں نے پھر بریک لگا دیے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا گیٹ بھی بند ہو چکا تھا۔

گرانڈیل شخص مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا آگے آیا اور بولا۔ ''ام نے تو تم سے بہت کہا تھا کہ واپس چلے جاؤ، اب تم نہیں مانے تو تمہاری مرضی لیکن آگے جانے سے پہلے تم کو تلاشی ملاشی تو دینا ہوگا۔ دو منٹ کے لیے باہر آ جاؤ۔''

فخر نے میری طرف اور میں نے فخر کی طرف دیکھا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بلا ٹلی نہیں ہے۔ رائفلوں والے چھ سات افراد ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ میں اور فخر باہر آ گئے۔ مجبوراً یونس کو بھی آنا پڑا۔ وہ موجودہ صورتِ حال میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

گرانڈیل شخص نے پشتو میں اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا۔ وہ آگے بڑھا اور ہماری تلاشی شروع کر دی۔ پہلے فخر کی جیب سے دو تین ہزار کی نقدی اور موبائل فون نکالا گیا پھر یونس کو نقدی، گھڑی اور موبائل فون سے محروم کیا گیا۔ اب شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ ہمیں گاڑی سے بھی محروم کرنے کی کوشش کرتے۔ جونہی تلاشی لینے والے نے میری پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا میں نے سر کی زوردار ٹکر عین اس کی طوطے جیسی ناک پر رسید کی۔ وہ گرانڈیل شخص کے پاؤں پر جا کر گرا۔ ایک دم کئی رائفلیں ہماری طرف سیدھی ہو گئیں لیکن کوئی فائر نہیں ہوا……اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ گرانڈیل شخص نے کسی کو بھی فائر کرنے سے روک دیا تھا……وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا عین میرے سامنے آیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''اوئے بدبختا! یہ کیا کر دیا تم نے؟ اپنا موت خود آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بھرپور طمانچہ میرے چہرے پر رسید کرنا چاہا۔ میں نے اطمینان سے اس کا یہ ''وار'' خالی دیا اور اس کا گریبان اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔

ایک بار پھر رائفلیں میری طرف سیدھی ہوئیں اور کرخت آوازیں بھی ابھریں مگر گرانڈیل شخص نے اب بھی فائر سے روک دیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ یہاں پر فائر ''افورڈ'' نہیں کر رہے۔ فائرنگ سے انہیں کوئی اندیشہ لاحق ہو سکتا تھا۔

گرانڈیل شخص کا پارا اب ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس نے گالی دی اور منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے بولا۔ ''خوا نہی ہاتھوں سے تم ابھی میرے پاؤں کو پکڑے گا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ مجھ پر پل پڑا۔ اس کے ساتھی، فخر اور یونس پر جھپٹ پڑے۔ فائرنگ پر بات چلی جاتی تو اور معاملہ تھا۔ دوبدو لڑائی میں یہ قبائلی غنڈے میرا اور فخر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہاں یونس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس پر دو قدآور قبائلی حملہ آور ہوئے تھے اور رائفل کے دستوں سے اسے کوٹ رہے تھے۔ میں نے اپنے ایک مدِمقابل کی چھاتی پر ٹانگ رسید کر کے اسے آٹھ دس فٹ گہری کھائی میں پھینکا اور یونس کی مدد کو لپکا۔

ایک ڈیڑھ منٹ کے مختصر وقفے میں ہی حملہ آوروں کو اندازہ ہو گیا کہ وہ غلط جگہ متھا لگا بیٹھے ہیں اور خالی ہاتھ وہ ہم سے نمٹ نہیں سکیں گے۔ اب وہ کسی بھی وقت ہتھیار استعمال کر سکتے تھے۔ میں نے جست لگا کر گرانڈیل شخص کو عقب سے دبوچ لیا۔ اس کے ہولسٹر میں 38 بور کا وزنی ریوالور موجود تھا۔ میں نے ریوالور ہولسٹر میں سے کھینچ کر اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ ''خبردار! کھوپڑی توڑ دوں گا اِس کی……پیچھے ہٹ جاؤ۔'' میں نے چلّا کر کہا۔

رائفل ابھی تک گرانڈیل شخص کے ہاتھ میں تھی مگر اس کی گردن پر اتنا شدید دباؤ تھا کہ وہ میری مرضی کے بغیر رائفل بھی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ چند سیکنڈ پہلے تک وہ فخر سے گتھم گتھا تھا۔ فخر نے آگے بڑھ کر رائفل گرانڈیل شخص کے ہاتھوں سے جھپٹ لی اور چند قدم پیچھے پلٹ کر اس کا رخ مسلح قبائلیوں کی طرف کر دیا۔ ان سب کے تیور خطرناک تھے۔ ان میں سے کسی نے ابھی تک میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ شاید ان کو یقین تھا کہ ان کا طاقتور سرغنہ کوئی پلٹی شلٹی مار کر میری گرفت سے نکل جائے گا لیکن ایسے NECK LOCKS بڑے بڑے پروفیشنل فائٹرز کو بھی بے بس کر دیتے ہیں۔ اپنی وارننگ کو مزید مؤثر بنانے کے لیے میں نے ایک فائر سرغنہ (سرخیل) کی پنڈلی پر کیا اور ریوالور پھر اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ گرانڈیل سرغنہ درد سے کراہ اٹھا تھا۔ ''دوسری گولی اس کے بھیجے میں جائے گی۔'' میں نے گرج کر کہا۔

بجلی زور سے چمکی اور اس نے میری گرج کا ساتھ دیا۔ بیشتر چھتریاں اُڑ چکی تھیں۔ بارش کی بوچھاڑیں اب براہِ راست ہمیں اور حملہ آوروں کو بھگو رہی تھیں۔ چند افراد

پیچھے ہٹ گئے لیکن رائفلیں انہوں نے بھی نیچے نہیں کیں۔
میں نے بے دریغ دوسرا فائر گرانڈیل کی زخمی ٹانگ پر کیا اور ریوالور دوبارہ اس کے کھوپڑے سے "ٹچ" کر دیا۔ اس مرتبہ وہ تڑپ اٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو پیچھے ہٹ جانے کا کہا۔
اس کے ساتھی بھی سمجھ گئے تھے کہ "باس" مصیبت میں ہے...... یعنی اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا ہے۔ انہوں نے پسپائی کا انداز اختیار کیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے، ان کی رائفلوں کے "بیرلز" کا رخ بھی زمین کی طرف ہو گیا تھا۔
میری گرفت میں پھنسا ہوا شخص اب بلند آواز میں کراہ رہا تھا۔ یقیناً اس کی گھیر دار شلوار گھٹنے سے نیچے خون سے تر ہو چکی تھی۔ "رائفلیں نیچے پھینک دو اور ہاتھ اٹھاؤ۔" میں نے اس کے ساتھیوں کو ہدایت کی۔
تھوڑی سی پس و پیش کے بعد انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران میں فخر بھی گاڑی میں سے سیون ایم ایم نکال چکا تھا۔ اس نے ہاتھ نہ اٹھانے والے دو افراد کے پاؤں کے پاس فائر بھی دے مارے۔ یہ لوگ اب جان چکے تھے کہ غلطی سے انہوں نے عام شہریوں کے بجائے اپنے سے کہیں زیادہ تگڑے لوگوں پر ہاتھ ڈال دیا ہے اور اگر اب بھی انہوں نے خر دماغی کا مظاہرہ کیا تو "باس" کی لاش سب سے پہلے گرے گی۔
میں گرانڈیل باس کو گھسیٹتا ہوا گاڑی کے پاس لے گیا۔ اس کی ایک ٹانگ تقریباً ناکارہ تھی اور زمین پر گھسٹتی ہوئی آ رہی تھی۔
فخر نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ چھینے ہوئے موبائل اور نقدی وغیرہ واپس ہماری گاڑی میں رکھے۔ برساتی پہنے ہوئے اس شخص نے فوراً سے پہلے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ہماری اشیا گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھ دی گئیں۔ یہ لوگ پوری طرح دب گئے تھے۔ اگر ہم اس وقت ان کی گھڑیاں، نقدی اور موبائل وغیرہ لینا چاہتے تو لے بھی سکتے تھے تاہم اس شغل میلے کا وقت ہمارے پاس نہیں تھا۔ میں نے لحیم شحیم سرغنہ کو گھما کر گاڑی کی پچھلی نشست پر پھینکا۔ فخر نے اس کی لمبی ٹانگیں سمیٹ کر گاڑی کے اندر کیں اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس کی رائفل بھی اٹھا کر گاڑی میں رکھ لی۔
میں نے اس کے دم بخود ساتھیوں کی طرف دیکھا اور وارننگ دی۔ "اگر مزید کوئی حرامزدگی نہیں کرو گے تو تمہارے اس باپ کو آگے جا کر چھوڑ دیں گے۔ چلو کھولو اس پھاٹک کو۔"
ایک بندہ جس کے گھٹنے پر کاری چوٹ لگی تھی لنگڑاتا ہوا پھاٹک کی طرف گیا۔ لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے کھٹکا ہٹایا اور پھاٹک کھول کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور برق رفتاری سے اسے اونچے نیچے سیاہ ٹیلوں کے درمیان بھگاتا چلا گیا۔ جگہ کم تھی لہٰذا گرانڈیل سرغنہ گٹھڑی سا بن گیا تھا۔ وہ کراہنے اور بڑبڑانے کے سوا اور کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ یونس نے احتیاط کے طور پر اس کا ریوالور اس کی پسلیوں سے لگا رکھا تھا۔ آج کی رات یقیناً اس مغرور شخص اور اس کے متکبر ٹولے کے لیے بھیانک ثابت ہوئی تھی۔ وہ شخص پشتو تو بول رہا تھا لیکن شاید اصل نسل کا پٹھان نہیں تھا۔ اس کا رنگ خاصا سانولا تھا، نقوش بھی عام پٹھانوں سے کافی مختلف تھے۔
فخر نے اس کا "چوڑا ہاتھی جیسا کان" مروڑتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے کہ آپ نے لوٹ مار کرنے کی یہ ڈگری کسی بڑی گندی سی یونیورسٹی سے لی ہوئی ہے۔ اسی لیے تو آٹھ دس ساتھیوں کے باوجود آپ ایک چھوٹی سی "اسائنمنٹ" بھی ٹھیک سے کر نہیں پائے...... اگر آپ کے اندر مادۂ عقل کی بالکل قلیل سی مقدار بھی موجود ہے تو آئندہ کے لیے راہ زنی سے توبہ فرما لیں۔"
وہ پتا نہیں کہ فخر کی گاڑھی اردو پوری طرح سمجھا یا نہیں لیکن بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "تم لوگوں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تم ان امراجوں کو جانتا نہیں ہے، یہ تمہارا جینا حرام کر دے گا۔"
"ایسی کی تیسی تیرے ان امراجوں کی۔" یونس نے ایک کلاسیکل گالی سے اپنے اس فقرے کو مزین کیا۔ دھینگا مشتی میں یونس کی ناک کا پکوڑا بنا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔
فخر میرے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے مڑ کر سرغنہ کو مخاطب کیا اور بولا۔ "آپ کے ان خادموں کے پاس وقت کم ہے، ورنہ ابھی آپ کے امراجوں سے شرفِ ملاقات حاصل کر کے جاتے، آپ جناب کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوتی کہ آپ کی طرح ہم ان کی اکڑ خانی کا بھی اخراج براستہ ناک کرتے...... اور عین ممکن تھا کہ ان کو آپ کے سامنے ایک قطار میں مرغا بھی بنا دیتے۔ چلو کوئی بات نہیں محترم...... یار زندہ صحبت باقی۔"
امراجوں کی پراپرٹی سے نکلنے کے بعد اور ایک محفوظ فاصلے پر جا کر ہم نے زخمی سرغنہ کو جھاڑ جھنکاڑ میں پھینک دیا،

تاہم اس کی رائفل اور کچھ دیگر اشیا ہمارے پاس ہی رہیں۔ امید یہی تھی کہ کچھ دیر میں اس کے ساتھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔ فی الحال ہمیں اپنے پیچھے دور دور تک کوئی روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ہماری گاڑی یہ ہنگامہ خیز شارٹ کٹ لگانے کے بعد ایک بار پھر مین روڈ پر تھی۔ مارکٹائی میں تھوڑا سا وقت ضرور ضائع ہوا تھا پھر بھی ہمیں دو بڑے فائدے ہوئے تھے۔ ایک تو ہم ایک لمبے چوڑے ''ٹریفک جام'' سے بچ گئے تھے، دوسرے ہم نے اپنے وقت میں سے کم از کم آدھا گھنٹا بچا لیا تھا۔

اب دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ کوہ دمن روشن ہورہے تھے۔ لیکن یہ ملگجی سی روشنی تھی۔ بے آب و گیا پہاڑیاں بارش میں بھیگی ہوئی تھیں اور بادلوں کے سیاہ ٹکڑے اب بھی چوٹیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ بارش اب ایک ہلکی لیکن مسلسل پھوار کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ پہاڑی راستوں پر ایسے موسم میں تیز رفتاری سے ڈرائیونگ نہیں کی جاسکتی مگر میں یہ رسک بھی لے رہا تھا۔ ایک دو جگہ لینڈ سلائڈنگ کے آثار بھی نظر آئے۔

فخر سیل فون تھامے میرے پہلو میں بیٹھا تھا اور وقتاً فوقتاً سجاول اور آصف خاں کے نمبر پر ٹرائی کررہا تھا۔ اچانک آصف خاں سے رابطہ ہوا۔ اس نے خود فخر کے نمبر پر کال کی تھی۔ ''کیا خبر ہے خان بھائی؟'' فخر نے پوچھا۔ لہجے میں بے تابی تھی۔

''ایک لحاظ سے تو اچھا خبر ہی ہے۔ آپ ام کو بتائیں کہ کہاں پہنچے ہیں۔''

میں نے فون فخر کے ہاتھ سے لے لیا اور آصف خاں کو بتایا۔ ''سائن بورڈز کے مطابق ہم باغ سے پچیس میل دور ہیں لیکن تمہارے پاس خبر کیا ہے؟''

وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ''برادر! اس جگہ کا پتا چل گیا ہے جہاں پائرنگ (فائرنگ) ہورہا ہے۔ شہر سے پانچ چھ میل کا دوری ہے صرپ۔''

''کس کے درمیان فائرنگ ہورہی ہے؟'' میں نے بے تاب ہوکر پوچھا۔

''اسی لڑکے اور سجاول صاحب کے درمیان۔ زرق خاں صاحب بھی وہیں پر موجود ہے۔''

''اس لڑکے کے ساتھ اور کون ہے؟''

''اب تک کی خبروں کے مطابق اس کے ساتھ تین بندہ اور تھا۔ ایک تو پہلے ہی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ باقی دو میں سے ایک اور مارا گیا ہے۔ خُواُب تو یہی لگتا ہے کہ اس کے ساتھ شاید ایک بندہ ہے...... یا شاید وہ بھی نہیں ہے۔''

''آصف خان! کیا سجاول سے اب بھی رابطہ نہیں ہو سکتا؟''

''برادر! ام نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ سگنل کا بچہ بھی وہاں نہیں پہنچتا۔ آدھا گھنٹا پہلے صرف چار پانچ سیکنڈ کے لیے سجاول صیب کے نمبر پر گھنٹی گیا تھا۔ اس وقت شاید وہ کسی اونچی جگہ پر ہوگا، اس کا بس 'ہیلو' ہی سنائی دیا پھر لائن کٹ گیا۔''

میں نے کہا۔ ''آصف خان کوشش جاری رکھو، اگر رابطہ ہوجائے تو اس کو کہو تمہارے ایک دوست شاہ زیب کی طرف سے تمہارے لیے پیغام ہے۔ اس لڑکے انیق کی بے گناہی کا پتا چلا ہے، اس کی جان نہیں جانی چاہیے۔''

آصف خاں نے میری بات کا جواب اثبات میں دیا۔ میں نے کہا۔ ''آصف خان لگتا ہے کہ ہم آدھے گھنٹے میں تم تک پہنچ جائیں گے۔ تم یونس سے بات کرو اور وہ جگہ طے کرو جہاں تم سے ہم کو ملنا ہے۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے برادر۔'' وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

میں نے فون یونس کو تھما دیا۔ وہ یہاں کے پہاڑی راستوں اور سڑکوں وغیرہ سے واقف تھا، اس نے آصف سے بات کی اور اسے آبادی سے باہر ہی ایک ایسی سڑک پر بلا لیا جہاں سے ہم شہر میں جانے کے بجائے سیدھا پہاڑیوں کی طرف نکل سکتے تھے۔

☆☆☆

ایک بار پھر بادل گھر کر آگئے تھے اور دن میں ہی رات کا سماں نظر آنے لگا تھا۔ ہمارا معاون آصف خاں نہایت ذہین اور جہاندیدہ شخص لگتا تھا۔ ایک ہمدرد دوست اور اچھے معاون کی ساری خصوصیات اس میں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ میرے ساتھ ایک پرانی لیکن نہایت طاقتور بریڈ فورڈ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور مشاقی سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ میں دبی ہوئی نسوار اس کی چوکسی اور توانائی میں شاید اضافہ ہی کررہی تھی۔ ہم نے اپنی بلینو کار وہیں پر چھوڑ دی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''آصف، لوکیشن کا پتا کیسے چلا ہے تمہیں؟''

وہ بولا۔ ''اسے اوپر والے کا مہربانی ہی سمجھیں۔ وہاں ہونے والی پائرنگ میں ملک زرق کا ایک کارندہ شدید زخمی حالت میں یہاں شہر لایا گیا تھا۔ وہیں سے پتا چلا ہے

کہ سجاول صیب اور ملک زرق خاں کس جگہ پر ہے۔''

پتھروں سے بنے ہوئے سخت ناہموار راستے پر ہم نے قریباً پانچ کلومیٹر سفر کیا۔ اس سے آگے کا راستہ بالکل ناپید ہوگیا یوں لگتا تھا کہ اب پیدل ہی چلنا پڑے گا مگر آصف خاں کسی نہ کسی طرح جیپ کو آگے بڑھاتا رہا۔ بارش پھر تیز ہوگئی، ہمارے لباس غتربود ہوچکے تھے تاہم ہم نے اپنے ہتھیار اور ایمونیشن وغیرہ پلاسٹک کی شیٹ میں لپیٹ رکھے تھے۔

''پائر (فائر) کا آواز آرہا ہے۔'' آصف خاں نے چونک کر کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دور کہیں پہاڑیوں کے اندر چند فائر سنائی دیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم منزل کے قریب ہیں۔

جیپ بُری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ الٹ ہی جائے گی۔ میں نے ایک بار پھر سجاول کے نمبر پر ٹرائی کیا۔ سینے میں دل اچھل کر رہ گیا۔ سجاول کے نمبر پر بیل جارہی تھی۔ پانچ چھ بار بیل ہوئی مگر فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ میں نے دوبارہ کال کی اور پھر تیسری دفعہ بھی۔ تیسری مرتبہ کال ریسیو کی گئی۔ ''ہیلو سجاول...... ہیلو یہ میں بول رہا ہوں۔ انیق کو کچھ نہیں ہونا چاہیے...... میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔ تمہیں سب بتاتا ہوں......''

میں نے اپنی آواز سجاول کی سماعت تک پہنچانے کے لیے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیا۔ ''ہیلو...... ہیلو......'' سجاول کی بھاری پاٹ دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ آواز ٹوٹ ٹوٹ کر آرہی تھی۔

میں نے پھر اپنی بات دہرائی۔ اسی دوران میں سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میں نے کہا۔ ''آصف، راستہ اب کچھ بہتر ہے۔ رفتار بڑھاؤ۔''

آصف نے رفتار بڑھادی۔ چند منٹ بعد ہمیں نشیب میں ان جیپوں کی جھلک نظر آگئی جن پر سجاول اور ملک زرق خاں یہاں پہنچے تھے۔ اِکّا دُکّا افراد بھی حرکت کرتے دکھائی دیے، تاہم فائرنگ کی آواز اب معدوم تھی۔

چار پانچ منٹ بعد ہم موقع پر موجود تھے۔ یہاں کا منظر بڑا سنسنی خیز تھا۔ ایک طرف چٹائی پر زرق خاں کے دو بندوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ دو تین بندے زخمی حالت میں تھے۔ ان کو گولیاں لگی تھیں۔ تاہم ان کی حالت خطرے والی نہیں تھی۔ پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر دو ٹیلوں کے درمیان سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔

سجاول کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بے حد حیران نظر آیا، میں لپک کر اس کی طرف گیا۔ ''سجاول! یہ بہت بُرا ہوا ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے تمہارے نقصان کا افسوس ہے اور انیق کے نقصان کا بھی، انیق کہاں ہے؟''

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا اور اس کی نگاہ بے ساختہ اس دھوئیں کی طرف چلی گئی جو ٹیلوں کے درمیان سے اٹھ رہا تھا۔

''یار پہیلیاں نہ بجھواؤ، مجھے بتاؤ۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟ کہاں ہے وہ؟''

سجاول نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور ٹیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہاں چھپا ہوا ہے کنجر کا تخم۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے نفرت سے ایک طرف تھوکا۔

میں نے تیزی سے دھوئیں کی طرف بڑھنا چاہا لیکن سجاول نے مجھے کالر سے پکڑ کر روک لیا۔ ''ذرا چھری کے تلے سانس لو۔ کہیں تمہیں بھی نہ پھڑکا دے۔ بڑے بھانبڑ مچے ہوئے ہیں اس کے اندر۔''

میں نے سجاول کی گرفت سے اپنا کالر چھڑایا اور دھوئیں کی طرف بڑھا۔ سجاول کا پرانا ساتھی باقر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ ہولے سے بولا۔ ''اُدھر جانے سے کوئی فائدہ نہیں...... وہ شاید مر چکا ہے۔ ہم بس دھواں چھوڑ کر تسلی کررہے ہیں۔''

زمین آسمان، جیسے میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ ''کیا بکواس کررہے ہو؟'' میں نے گھما کر ایک طمانچہ باقر کے منہ پر مارا اور اس کھوہ کی طرف بھاگا جس کے دہانے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ میں پکارنے لگا۔ ''انیق! یہ میں ہوں۔ گولی نہ چلانا...... انیق...... انیق۔''

بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ اندازہ ہورہا تھا کہ انیق نے کھوہ کے اندر سے سجاول اور زرق کا مقابلہ کیا ہے۔ اب یا تو وہ شدید زخمی ہوچکا تھا یا پھر اس کا ایمونیشن ختم ہوگیا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ یہ دو درجن سے زائد لوگ اس کی مزاحمت سے اتنا ڈرے ہوئے تھے کہ کھوہ کے اندر نہیں گھس رہے تھے۔ انہوں نے دھواں چھوڑا تھا تاکہ اگر وہ زندہ ہے تو خود ہی باہر نکل آئے۔

میرے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں بڑے سائز کی ٹارچ تھی۔ بارش کی بوچھاڑ میں، میں جھک کر بھاگتا ہوا کھوہ کے دہانے پر پہنچا اور پھر سانس بند کرکے اندر گھس

گیا۔ یہاں وہاں گولیوں کے خول چمک رہے تھے۔ یہ کھوہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ مجھے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے پلٹ کر ٹارچ کی روشنی اس رکاوٹ پر پھینکی اور میرا دل جیسے سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔

میرے سامنے انیق تھا۔ ہاں وہ انیق ہی تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بے ڈھنگی سی پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم پر کم وبیش دس گولیاں لگی تھیں..... دونوں ٹانگیں پوری طرح خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جو سانس سینے میں روک رکھی تھی، وہ مزید رکی نہ رہ سکی۔

''انیق......انیق......'' میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر بُری طرح جھنجوڑا۔

وہ بے حرکت تھا۔ میں نے اس کا ماتھا چوما اور اسے بازوؤں میں اٹھا کر باہر کی طرف بڑھا۔ دھواں میرے سینے میں بھی داخل ہو گیا تھا اور میں بُری طرح کھانس رہا تھا۔ اپنی رائفل اور ٹارچ میں نے وہیں کھوہ میں پڑی رہنے دی تھی۔ کھوہ سے آٹھ دس قدم آگے آکر میں نے اسے ایک ہموار پتھر پر لٹایا۔ اس کے گلے پر ہاتھ رکھ کر اس کی نبض ڈھونڈی، اس کے سینے سے کان لگایا۔ وہ ابھی زندہ تھا لیکن دھڑکن کسی بہت گہرے کنویں میں ٹمٹماتے ہوئے ستارے کی طرح تھی، کسی بھی وقت اوجھل ہو سکتی تھی۔

انیق کو دیکھ کر سجاول سیالکوٹی طوفان کی طرح اس کی طرف بڑھا، اس کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کی ''اے کے 47'' رائفل بڑی خافناک دکھائی دے رہی تھی۔ رائفل کا رخ سیدھا انیق کی طرف تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے ٹریگر دبا دے گا۔ بجلی چمکی اور بادلوں کی جگہ سجاول دہاڑا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں نے زندہ نہیں چھوڑنا اِسے۔''

میں سجاول کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''مرے کو کیا مارو گے۔ وہ مر چکا ہے۔ شاید ہی کوئی سانس باقی ہو۔''

''ایک سانس بھی نہیں، ایک سانس بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے دائیں جانب ہو کر بے ہوش انیق کا نشانہ لینا چاہا۔ میں نے آگے بڑھ کر ''اے کے 47'' کی سیاہ نال تھام لی۔

''میں یہ نہیں ہونے دوں گا سجاول، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

وہ میرے اس لہجے کو پہچانتا تھا۔ جانتا تھا کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں وہ اٹل ہے۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا۔ تاہم اس کی آنکھیں اب بھی خون کی طرح سرخ تھیں۔ وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا پھر گورا چٹا ملک زرق خاں آگے بڑھا۔ اس نے سجاول کے کان میں کچھ کہا۔ یقیناً یہی کہا ہوگا کہ مرے کو مارنے سے کیا حاصل۔ وہ تقریباً مر چکا ہے۔

سجاول نے ایک بار پھر خونی نظروں سے انیق کی طرف دیکھا اور اس کے بے حرکت جسم کی طرف تھوک کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

زرق خاں اور دیگر افراد کی رائے یقیناً ٹھیک ہی تھی۔ انیق میں زندگی کی رمق نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن میں کوشش کرنا چاہتا تھا۔ میں ''موت'' سے پہلے اسے مردہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے انیق کو ایک لینڈ روور جیپ میں ڈالا، زرق خاں کے دو شدید زخمیوں کو بھی جیپ میں سوار کر لیا گیا۔ حتی الامکان رفتار سے ہم شہر کی طرف بڑھے۔ وہ جیپ کی ایک طویل سیٹ پر بے حرکت لیٹا تھا۔ اس کی نیلی جین میں جگہ جگہ گولیوں کے سوراخ تھے۔ اس کی ٹانگوں اور سینے سے رستے والا خون قطروں کی صورت جیپ کے فرش پر ٹپک رہا تھا۔ اس کا سر میری گود میں تھا...... اور ہچکولوں سے مسلسل دائیں بائیں ہل رہا تھا۔

جیپ میں فخر کے علاوہ یونس بھی سوار تھا۔ ڈرائیونگ زرق خاں کا ہی ایک بندہ کر رہا تھا۔

''انیق...... آنکھیں کھولو۔'' میں نے اس کے گال تھپتھپائے اور ہولے سے پکارا۔

لیکن وہ آنکھیں کھولنے کی منزل سے بہت دور تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ اس کی سانس کی ڈور ابھی ٹوٹی نہیں تھی۔

فخر نے ڈرائیونگ کرنے والے شخص کو مخاطب کیا اور ذرا کڑے لہجے میں پوچھا۔ ''خان! کیسے ہوا ہے یہ سب کچھ؟''

وہ بولا۔ ''ام کو کچھ زیادہ پتا نہیں ہے صیب جی، ام تو ملک زرق صیب کا ملازم ہے۔ وہ جیسا کہتا ہے ام کو کرنا ہوتا ہے۔ ویسے بھی امارا کام گاڑی چلانے کا ہے۔''

''پھر بھی تم یہاں موجود تھے۔ تمہیں پتا تو ہوگا کہ یہاں تک نوبت کیسے پہنچی ہے؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''ام کو صرپ اتنا پتا ہے کہ اس زخمی لڑکے کے ساتھ دو بندے اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک تو اسی کھوہ کے اندر مارا گیا ہے جہاں سے آپ نے اس لڑکے کو نکالا ہے۔ دوسرے کا ٹھیک پتا نہیں، لیکن لگتا ہے کہ وہ بھی بچا نہیں ہوگا۔''

''پر یہ سب کچھ ہوا کیوں؟'' فخر نے چیخ کر پوچھا۔ ''اور تم لوگوں کو شرم بھی نہیں آئی۔ دو یا تین بندوں کے لیے

پورا جتھا لے کر یہاں آ گئے؟''

ڈرائیور نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''یہ بات تو آپ اپنے دوست (سجاول) سے پوچھیں یا پھر ملک زرق خاں سے پوچھیں۔ ام کو صرف اتنا پتا ہے کہ ان کو کل شام ان ٹیلوں میں گھیرا گیا تھا۔ ان کو بے شمار مرتبہ کہا گیا کہ یہ ہتھیار پھینک کر باہر نکل آئیں مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اس بات پر کان نہیں دھرا...... بلکہ رات نو بجے کے قریب ایک دم پائر کھول دیا جن میں سے ایک کچھ دیر میں ہی مر گیا، دوسرے کو سول اسپتال بھیج دیا گیا۔ سچا بات تو یہ ہے کہ دونوں طرپ کا کاپی (کافی) نقصان ہوا ہے۔ یہ لڑکا اس طرح جم کر لڑے گا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔'' ڈرائیور کا اشارہ انیق کی طرف تھا۔

میرے سینے سے آہ سی نکلی۔ میں نے انیق کے سر کے نم بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ بڑے پیارے بال تھے اس کے لیکن اس نے کبھی انہیں سنوارا نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنا حلیہ جان بوجھ کر بگاڑے رکھتا ہے۔ شاید اس کے اس رویّے کا تعلق اس کے ماضی سے بھی ہو۔ اس نے کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا اور پھر ایک ''روڈ ایکسیڈنٹ'' میں اسے کھو دیا تھا۔ اس کا غم اور اس کی بے کسی اسے دھیرے دھیرے ایک اَن چاہی سمت میں لے گئے تھے۔ وہ گینگسٹر کے روپ میں ڈھل گیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، یقیناً اس کے لیے کوئی صفائی یا دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس نے برا کیا تھا مگر ایسا ہوتا ہے، بے شمار لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، اپنے غم و غصے کو ہر کوئی مثبت توانائی میں بدل کر ڈاکٹر، انجینئر یا عظیم فن کار تو نہیں بنتا، بہت سے مجرم بھی بن جاتے ہیں۔ وہ بھی مجرم بنا تھا، لیکن اس کے اندر کی انسانیت پوری طرح مری نہیں تھی۔

اس کا سر میری گود میں تھا اور مجھے ماضی کے وہ سارے مناظر یاد آ رہے تھے کہ جب جب وہ میرے ساتھ تھا۔ میرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔ چاند گڑھی کے خونی واقعات، ملنگی ڈیرے کا جان لیوا معرکہ، پارا ہاؤس کے خطرناک شب و روز اور جاماجی کے تہلکہ خیز جنگی حالات۔ اس نے کہاں کہاں میرا ساتھ نہیں دیا تھا، کہاں کہاں اپنے سینے کو میرے لیے ڈھال نہیں بنایا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کی کیچڑ آلود پیشانی چومی۔ ''نہیں میرے ککو شہزادے میں اس طرح تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ فی الحال باتیں کرنا چھوڑے اور گاڑی تیز چلائے۔

یہ دن کے بارہ بجے کا وقت تھا، ہلکی بارش جاری تھی۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ مشکل تنہا نہیں آتی، کئی دفعہ مشکلات کا ایک سلسلہ بندے کو گھیر لیتا ہے۔ ہم طوفانی رفتار سے انیق کو ''باغ'' کے ایک مقامی اسپتال لے گئے۔ اس کے خون کا اخراج بند کیا گیا اور آکسیجن لگائی گئی۔ اس کی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ اسے اس چھوٹے سے اسپتال میں رکھا جاتا۔ کم از کم اسے کوہاٹ یا پشاور تک پہنچایا جانا بہت ضروری تھا مگر پتا چلا کہ شدید بارش کی وجہ سے مین روڈ پر دو جگہ لینڈ سلائڈنگ ہوئی ہے اور راستہ صاف ہونے میں آٹھ سے دس گھنٹے لگ جائیں گے۔

''اتنا وقت تو یہ نہیں گزار سکے گا۔'' فخر نے بڑے دکھ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ سرجری تو یہاں بھی ہوسکتی ہے۔ سینے میں لگنے والی دو گولیاں نکال لی جائیں تو کچھ امید ہوسکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر دیر نہ کی جائے۔'' فخر نے کہا۔ ''ڈیوٹی ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ خون لگنے کے باوجود 'بی پی' تیزی سے گر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ باڈی کے اندر بھی بلیڈنگ ہو رہی ہے۔''

سجاول اور ملک زرق خاں کا تو کوئی پتا نہیں تھا۔ شاید وہ کسی دوسرے اسپتال میں اپنے زخمیوں کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہاں آصف خاں اور یونس بدستور ہمارے ساتھ تھے۔ آصف خاں نے نہ صرف خود انیق کے لیے خون دیا تھا بلکہ وہ چھ سات صحت مند نوجوان بھی اس کام کے لیے لے آیا تھا۔

ہماری اجازت ملنے کے بعد دو مقامی سرجنز نے انیق کا ہنگامی آپریشن شروع کر دیا۔ انہوں نے بتا دیا تھا کہ مریض کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ پتا نہیں کیوں میرے پردۂ تصور پر جاماجی والے مناظر گھومنے لگے۔ جواں سال ابراہیم بھی تو اسی طرح جاں بلب ہوا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ (ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا اور بتایا تھا کہ اپنے اندر کے زہر کو فاقہ کشی سے ختم کرتے کرتے وہ خود ختم ہو گیا ہے) مگر اس کو چاہنے والوں کی دعائیں اور محبتیں موت کے منہ سے واپس لے آئی تھیں۔

ایک آواز نے مجھے چونکایا۔ ایک میل نرس نے مجھے انیق کے لباس میں سے ملنے والی کچھ اشیا تھمائیں۔ اس کا سیل فون، شناختی کارڈ، تھوڑی سی نقدی، اور ایک چھوٹا سا

پلاسٹک پاؤچ جس میں چند میڈیسن تھیں۔
میں نے ان دواؤں کو غور سے دیکھا اور حیران ہوا۔ میری معلومات کے مطابق ان میں سے دو ٹیبلیٹس تو SEDATIVE تھیں اور ٹھیک ٹھاک نشہ آور تھیں۔ مجھے اس بزرگ کی بات یاد آئی جو رشتے میں انیق کا نانا بھی کہلاتا تھا۔ بزرگ نے کہا تھا۔ ''انیقے کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ہر وقت سویا سویا سا لگتا ہے۔ بات کچھ اور کر رہا ہوتا ہے، دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔'' تو کیا یہ سب کچھ ایسی ہی مضرِ صحت دواؤں کی وجہ سے تھا۔ وہ کیوں کھا رہا تھا یہ دوائیں...... اسے تو ایسی کوئی عادت نہیں تھی۔ کیا وہ یہ سب کچھ بھی مجبوری کے عالم میں کر رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ''سیلف میڈیکیشن'' بھی اس سے کرائی جا رہی تھی۔
میں نے اس کے سیل فون کو چیک کیا۔ جو نمبر وہ استعمال کر رہا تھا، وہ نیا تھا۔ میں نے فون کی ''کال لاگ'' میں جا کر دیکھا۔ ایک نمبر ایسا تھا جس پر بے شمار دفعہ کال کی گئی تھی اور اس نمبر سے بہت دفعہ انیق کو کال آئی بھی تھی۔ کال ریکارڈ میں بھی یہ نمبر اَن گنت مرتبہ موجود تھا۔ دیکھا جاتا تو کئی ماہ سے یہ انیق کے فیورٹ نمبروں میں سے تھا۔
انیق کے موبائل میں بیلنس موجود تھا۔ میں نے اس نمبر پر ''ٹرائی'' کی۔ ایک مرتبہ تو کال اٹینڈ نہیں ہوئی مگر دوسری کوشش کامیاب رہی۔ ایک بھرائی ہوئی بھاری آواز کانوں سے ٹکرائی۔ بظاہر مردانہ محسوس ہونے والی اس آواز پر غور کیا جاتا تو پتا چلتا تھا کہ یہ زنانہ ہے۔ میرے سینے میں دل اچھل کر رہ گیا۔ یہ آواز میرے لیے نئی نہیں تھی۔ اس سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ جاماجی کی اسی ساحرہ کی آواز تھی جو اپنی آنکھوں اور اپنے لہجے کے ذریعے دل و دماغ کو مفلوج کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔
اس نے غالباً شکستہ انگلش میں کچھ کہا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اپنی آواز سے انیق کی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی اور ''ہیلو'' کہا۔ یقیناً میری یہ کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔
''کون؟'' دوسری طرف سے ذرا چونکی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ میں اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ محسوس کر رہا تھا۔
''کون تھا؟'' فخر نے مجھ سے پوچھا۔
''جاماجی کی وہی بدبخت...... مادام ہاناوانی...... یہ دیکھو اس ''کال ریکارڈ'' سے پتا چلتا ہے کہ یہ مسلسل انیق کے ساتھ رابطے میں رہتی تھی۔ اس نے انیق پر پوری طرح کنٹرول کر رکھا تھا۔''
''تمہارا مطلب ہے ہپناٹزم؟''
''ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ خاص لوگوں میں پائی جانے والی یہ صلاحیت ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ فخر، یہ دیکھو...... یہ ہیں وہ دوائیں جو انیق مسلسل استعمال کر رہا تھا۔ اس طرح کی دوائیں تو ویسے ہی دل و دماغ کو ماؤف کر دیتی ہیں پھر جب ان میں کسی ماہر ہپناٹسٹ کی ٹیکنیشن بھی شامل ہو جائے تو کیا نہیں ہو سکتا۔'' میں بات کر رہا تھا اور میرا سینہ جل رہا تھا۔
فخر بولا۔ ''یہ بات تو میں نے بھی کہیں سنی تھی یا شاید ہالی ووڈ کی کسی فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ہپناٹزم کے کچھ ماہر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ''معمول'' سے دور رہ کر صرف اپنی آواز اور اپنے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ہی اسے ٹرانس میں لے لیتے ہیں۔ ''معمول'' ان کی ہدایات پر عمل شروع کر دیتا ہے۔''
''یہ بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔'' میں نے کہا۔
آپریشن شروع ہو چکا تھا۔ اسٹاف اور ڈاکٹرز آپریشن تھیٹر میں آ جا رہے تھے۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں جیسے ان کے قدموں کی چاپوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ فخر بھی بے چینی سے میرے ارد گرد ٹہل رہا تھا۔ ''اگر یہ سب کچھ کسی باہر کے ملک میں ہوا ہوتا تو اب تک مریض کو ''پک'' کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر یہاں پہنچ چکا ہوتا۔''
میرا دھیان شکیل داراب کی طرف چلا گیا۔ وہ لمبے ہاتھوں والا ایک بارسوخ شخص تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ہیلی کاپٹر کا انتظام بھی ہو سکتا تھا مگر اسے فون کون کرتا۔
بادل زور سے گرجے اور بارش کی بوچھاڑیں کچھ اور تیز ہو گئیں۔ فخر بولا۔ ''اگر ہیلی کاپٹر مہیا ہو بھی جائے تو اس طرح کے موسم میں شاید یہاں اتر ہی نہ سکے۔''
تیز ہوا سے اس چھوٹے سے اسپتال کے کھڑکیاں دروازے تھرا رہے تھے اور اندر شاید انیق کی زندگی کی لو بھی تھرا رہی تھی۔
انیق کا فون خاموش تھا۔ مادام ہاناوانی نے یا کسی اور نے اس نمبر پر دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ مادام ہاناوانی چونک گئی ہے اور اسے کسی شدید گڑبڑ کا احساس ہو چکا ہے۔ اس کا ردِعمل کیا ہوگا، اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔
میں انیق کے موبائل کی مختلف ایپلی کیشنز دیکھتا رہا۔

میوزک میں اچھی قسم کی غزلیں اور نغمے موجود تھے۔ اچھی فلمی شاعری سے انیق کو ہمیشہ لگاؤ رہا تھا۔ شاید اس ذوق کا تعلق بھی کہیں اس کی بچپن کی محبت سے ہی ہو۔ وہ لڑکی جو اس سے چھین لی گئی تھی لیکن تا جوری کی طرح اس کے ہاتھوں پر سہاگ کی نہیں، خون کی مہندی لگی تھی۔ اوپر والے نے محبت تو بنائی لیکن اس سے بھی پہلے شاید جدائی بنا دی۔ محبت کی قسمت میں چند گھڑیوں کی مسرت لکھ کر طویل انتظار، آس اور نہ پوری ہونے والی امیدیں درج کر دی گئیں۔

میں نے ایک ''سونگ'' پر ٹچ کیا۔ معروف گلوکارہ فریدہ خانم کی مدھر آواز فون کے اسپیکر سے ابھرنے لگی۔

''وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا، اب اس کا حال سنائیں کیا......''

''بے ہوش کرنے والے عملے کا ایک فرد تیزی سے تھیٹر میں سے نکلا اور یونس کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر ''فارمیسی'' کی طرف لپک گیا۔

میں اٹھ کر بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ انیق کا سیل فون میرے ہاتھ میں تھا۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے جو تھوڑی دیر پہلے میں نے کاٹن سے صاف کر دیے تھے۔ فون میں پیغامات کے خانے میں ایک جگہ کچھ ڈرافٹس نظر آئے۔ ان میں سے ایک نسبتاً طویل ڈرافٹ کافی اہم تھا۔ اس کی تحریر کچھ اس طرح تھی۔ انگلش کی یہ تحریر انیق کی طرف سے تھی۔

''......یہ کیسا رنگ دار گول چکر ہے؟ یہ کیسی دھند ہے جس میں، میں گھرا رہتا ہوں؟ یہ رنگ برنگی دھند میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی؟ میں اس میں دھنسا ہوا ہوں، کبھی کبھی یہ بس چند منٹ کے لیے چھٹتی ہے جیسے اب...... میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، چلّانا چاہتا ہوں۔ لیکن کوئی میرا گلا دبا دیتا ہے۔ میری آواز سینے سے باہر نہیں نکل پاتی۔

ایسا کیوں ہے، میں کس ان دیکھی گرفت میں ہوں...... بس اب وہ کال آجائے گی جس کے بعد میں کئی دن کے لیے ہوش سے بیگانہ ہو جاؤں گا۔ میں کیوں وہ کال سننے پر مجبور ہو جاتا ہوں، شاید وہ آرہی ہے...... وہ آواز آرہی ہے......کون میری مدد کرے گا؟ کون میری مدد کر سکتا ہے؟''

ایک اور ڈرافٹ (تحریر) میں اسی طرح کے کچھ اور الفاظ لکھے تھے لیکن وہ بے جوڑ اور ناقابلِ فہم تھے...... میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیوں جا رہا ہوں۔ یہ میری زندگی ہے یا کسی اور کی؟ کون جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے......کون ہے جس کے قدم زمین میں دھنسے ہوئے ہیں...... وہ میں ہوں تو پھر بھاگتا کیوں نہیں ہوں...... بھاگ جاؤں تو کتنا اچھا ہو...... میری دوا کی گولیاں...... رنگ برنگی دھند...... رنگ دار گولیاں...... یہ سارے رنگ کہاں سے آتے ہیں......

انیق کے لکھے ہوئے بہت سے لفظوں کے ہجے غلط تھے۔ کچھ حرف الٹے لکھے تھے (حالانکہ وہ انگلش ہی نہیں، بہت سی دیگر زبانیں بہت اچھی طرح جانتا تھا) لگتا تھا کہ یہ ٹیکسٹ کمپوز کرتے وقت بھی انیق اپنے مکمل حواس میں نہیں تھا۔

ایک دو اور چھوٹے چھوٹے ڈرافٹس بھی اسی نوعیت کے ملے۔ ان سب تحریروں سے ایک ناقابلِ بیان بے چارگی اور اذیت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ تو کیا یہی بے چارگی و اذیت تھی جس سے وہ مسلسل لڑ رہا تھا۔ اپنی منشا کے خلاف کچھ ایسے کام کر رہا تھا جو اسے اندرونی طور پر بے حد کرب میں مبتلا رکھتے تھے۔ ہم اسے دشمن سمجھتے رہے اور وہ دشمنوں کے گھیرے میں تھا۔ یہ بہت بڑا ستم توڑا گیا تھا ہم پر......اور اسے توڑنے والی وہی کریہہ عورت تھی۔ اس نے اپنی شکست اور اپنے بدقماش بیٹے رائے زل کی موت کا سنگین بدلہ لیا تھا ہم سے۔ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اس جاں نثار ساتھی کو موت کے دہانے پر پہنچا دیا تھا جو کسی طور بھی اس سزا کے لائق نہیں تھا۔ اچھا تھا کہ اس وقت سجاول اور ملک زرق وغیرہ میرے سامنے نہیں تھے، ورنہ پتا نہیں کہ میرا ردِعمل کیا ہوتا۔

اسی دوران میں انیق کے فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اسکرین پر نظر آنے والا نمبر وہ نہیں تھا جس پر کچھ دیر پہلے ہاناوانی سے بات ہوئی تھی۔ میں نے دوسری طرف سے بولنے والے کا انتظار کیا۔ ''ہیلو'' ایک بھرائی ہوئی مردانہ آواز ابھری۔

میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی بزرگوار تھے جن سے انیق کے آبائی گھر میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے چند لمحے سوچا پھر نارمل لہجے میں کہا۔ ''ہیلو باباجی! میں انیق کا دوست وقاص بول رہا ہوں۔''

چند سیکنڈ بعد بزرگوار نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''اچھا اچھا پُتر! میں نے پہچان لیا لیکن انیقا کہاں ہے؟ فون کر کر کے برا حال ہو گیا ہے ہمارا۔''

''وہ......یہیں ہے باباجی! بس اس کی طبیعت تھوڑی سی خراب ہے، دو تین دن سے بخار چل رہا ہے، اب

بھی دوا کھا کر سویا ہوا ہے۔ ویسے پریشانی کی بات نہیں۔''
''پریشانی کی بات تو ہے پتر! ایسا بے وقوف کھوتا ہے کہ خیر خبر تک نہیں دیتا۔ پچھلے تین چار دن میں کوئی سو واری فون کیا ہوگا اس کو...... اس کی پھوپی تو مرن والی ہوگئی ہوئی ہے۔ اب بھی مزار پر دعا مانگنے گئی ہے۔ اس کو جگاؤ ذرا...... ایک منٹ بات کرلے مجھ سے۔''
''باباجی! ابھی سویا ہے، ڈاکٹر نے منع کیا ہے بار بار جگانے سے۔ جونہی طبیعت بہتر ہوتی ہے، میں اس سے کہتا ہوں کہ آپ کو فون کرے۔''
''تم...... اس وقت ہو کہاں؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔
مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔''لاہور میں ہی ہوں...... اس کے مرغی خانے پر۔'' پھر اس سے پہلے کہ بزرگوار کچھ اور کہتے میں نے جلدی سے پوچھا۔''وہ آپ کی مہمان..... بی بی صاحبہ کہاں ہیں؟''
''ادھر ہی تھیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے، ڈرائیور کے ساتھ اپنی گڈی پر کہیں گئی ہیں۔ کچھ دیر میں آجائیں گی۔ پر...... تم انیقے سے بات کب کراؤ گے۔ ہم بہت پریشان ہیں اس کے لیے......''
''کہا ہے ناں باباجی! ابھی جاگتا ہے تو کرا دیتا ہوں۔''
''اس سے بات کراؤ، اور اسے سمجھاؤ بھی۔ تم یار بیلی ہو اس کے...... اس سے کہو، اب یہ بے پروائیاں چھوڑ دے۔ بہت ہوچکی ہے...... ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔''
میں نے بزرگوار سے تسلی کے چند بول کہے اور فون بند کردیا۔
یہی وقت تھا جب سبز کپڑوں میں ملبوس نوجوان سرجن دھیمے قدموں سے، آپریشن تھیٹر سے باہر نکلا۔ میں اور فخر لپک کر اس کے پاس گئے۔''کیا پوزیشن ہے سرجن؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔''سوری جی، ہم اس کو بچا نہیں سکے۔''
میں سکتہ زدہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ دماغ ماؤف سا ہوگیا۔ اس کی آواز جیسے اسپتال میں اور اسپتال سے باہر دور دور تک گونج رہی تھی۔ ''سوری جی، ہم اسے بچا نہیں سکے...... سوری جی! ہم اسے بچا نہیں سکے۔''
میرا دل چاہا، میں نوجوان سرجن کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالوں۔ اس سے کہوں کہ...... وہ ختم کرے یہ مذاق...... اپنے الفاظ واپس لے...... اور کہے کہ نہیں وہ ابھی زندہ ہے...... اس کے بچنے کی امید ہے......
لیکن سرجن جاچکا تھا...... اور حقیقت یہ تھی کہ انیق بھی جاچکا تھا۔ میرا انگو شہزادہ...... میری سانس کے ساتھ سانس لینے والا اور میرے پسینے پر اپنا خون چھڑکنے والا، اب نہیں رہا تھا۔ اس کی باتوں کی پھلجھڑیاں، اس کی مسکراہٹیں، اس کے گیت سب کچھ اس کے ساتھ ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا تھا۔
میں اکثر مذاق میں اس سے کہا کرتا تھا کہ وہ جس طرح کی باتیں کرتا ہے، ایک دن سجاول نے اسے جان سے مار دینا ہے...... اور اس نے مار دیا تھا...... لیکن...... اس میں سجاول کا بھی کیا قصور تھا، اس میں کسی کا قصور نہیں تھا، اگر قصور تھا تو اس بدذات عورت کا جو اپنے خونی بیٹے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ہزاروں میل کا فاصلہ پاٹ کر یہاں پہنچی تھی اور انیق کو اپنے قبضے میں کیا تھا۔ وہ ایک خطرناک عاملہ تھی اور اس کی پُراسرار صلاحیتوں نے وہ کر دکھایا تھا جو ہمارے گمان میں بھی نہیں تھا۔
ایک اسٹریچر آپریشن تھیٹر سے باہر لایا گیا۔ اس پر انیق لیٹا تھا۔ اس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس چادر پر بھی اس کے جوان خون کے دھبے موجود تھے۔ میرے سینے میں ایک نیلی آگ روشن تھی۔ میں نے خود کو بمشکل سنبھال کر اس کے چہرے سے چادر ہٹائی، وہ سو رہا تھا۔ اپنے سارے داغ سینے میں چھپائے، اس دنیا سے کچھ خاص لیے بغیر، اس چھوٹی سی عمر میں ہی اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے تھے۔ ہمیشہ سرخ نظر آنے والے ہونٹ بھی سانولائے ہوئے تھے۔ بالکل ہلدی جیسے چہرے پر یہ سانولاہٹ اور بھی نمایاں محسوس ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ یقیناً ان نشہ آور دواؤں کی وجہ سے تھا جو وہ آج کل مسلسل استعمال کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے اتنا بے تکلف ہوچکا تھا کہ کسی وقت شرارت سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ ایسے وقت میں، میں اسے ڈانٹتا تھا یا ایک آدھ ٹانگ رسید کردیا کرتا تھا۔ وہ سخت چوٹ لگنے کا ڈراما کرتا تھا اور لڑھکتا ہوا دور جا گرتا تھا۔ کاش وہ اس وقت بھی کوئی ڈراما ہی کر رہا ہوتا۔
اچانک انیق کے سیل فون پر پھر کال کے سگنل آئے۔ میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف اس کی پھپھو تھی۔

وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ''کون بول رہا ہے...... انیق کا دوست؟''

''جی ہاں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''وہ جاگا یا نہیں، اگر نہیں جاگا تو اُسے جگاؤ۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ بس ایک بار اپنی آواز سنا دے...... پھر سو جائے۔ پتا نہیں کیوں اتنا بے حس ہو جاتا ہے یہ شہر جا کر۔ شرم ہی نہیں آتی اسے...... دو دو ہفتے فون کا جواب نہیں دیتا۔''

میں نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''خالہ جی...... اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔'' میرا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

''ہائے میں مرگئی کیا ہوا اُسے...... تم تو...... کہہ رہے تھے کہ...... صرف بخار ہے۔'' پریشان عورت ہکلا کر رہ گئی۔ وہ انیق کی ماں نہیں تھی مگر ممتا کی ساری جھلکیاں اس میں پائی جاتی تھیں۔

''بخار نہیں ہے...... اس کو...... سخت چوٹیں لگی ہیں۔ آپ دعا کریں۔ حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

عورت نے فون پر ہی رونا شروع کر دیا۔ وہ ہیجانی لہجے میں پتا نہیں کیا کیا پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اللہ کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں ہے...... میں دوبارہ فون کرتا ہوں......''

انیق کے چہرے سے چادر ابھی تک ہٹی ہوئی تھی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا کہ میں مزید اس کا چہرہ دیکھ سکوں۔ میں نے چادر اس کے سر تک کھینچ دی۔

فخر نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''یار! ہمیں خود کو سنبھالنا چاہیے، اگر وہ عورت یہاں پاکستان میں موجود ہے تو پھر کچھ بھی کر سکتی ہے، عین ممکن ہے کہ وہ اکیلی نہ ہو، اس کے کئی گماشتے بھی اس کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ ابھی جب تم نے فون پر بابا جی سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے تو کیا پتا چلا تھا؟''

''وہ گاڑی پر بیٹھ کر گوٹھ سے نکلی ہے۔''

''جب تم نے انیق کے فون سے اس حرام زادی کو کال کی تھی تو تم آواز بدل کر بولے تھے لیکن اسے پتا چل گیا ہوگا کہ یہ انیق نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے خطرے کو سونگھ لیا ہو۔ اگر وہ فون کی لوکیشن وغیرہ تلاش کروا سکتی ہے تو پھر وہ یہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔''

''اللہ کرے وہ پہنچ جائے۔ مجھے اس کو ڈھونڈنا نہ پڑے۔'' میرے لہجے میں بھڑکتی ہوئی آگ نے فخر کو بھی چونکا دیا۔

خاموشی

میاں بیوی ایک بڑے میلے کی سیر کو گئے جہاں دوسری تفریحات کے ساتھ ایک چھوٹا جہاز بھی موجود تھا جس میں سوار ہو کر چار ہزار روپے میں شہر کا ایک فضائی چکر لگایا جا سکتا تھا۔

دونوں وہاں رک کر حسرت سے جہاز کو دیکھنے لگے۔ شوہر نے کہا۔ ''ہوائی سفر کا کتنا عمدہ موقع ہے۔ پتا نہیں اگلے میلے تک ہم ہوں یا نہ ہوں... کاش ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے۔''

''دل تو میرا بھی چاہ رہا ہے مگر ہم دونوں کے آٹھ ہزار روپے... کاش! ہمارے پاس اتنی رقم ہوتی۔''

پائلٹ ان دونوں کی حسرت بھری باتیں سن رہا تھا۔ ان کے قریب آ کر بولا۔ ''میں تم دونوں کو ایک شرط پر جہاز میں سیر کرا سکتا ہوں کہ دورانِ پرواز تم بالکل خاموش رہو گے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بولا تو آٹھ ہزار روپے دینے پڑیں گے۔''

انہوں نے خوشی خوشی آپس میں مشورہ کیا اور تیار ہو گئے۔

پائلٹ نے جہاز اڑایا۔ رفتار خوب تیز کی۔ جہاز کو ترچھا کیا، قلابازی کھلائی، الٹا کر کے اڑایا، کئی غوطے کھلائے مگر پیچھے بالکل خاموشی رہی۔ پائلٹ نے ہوابازی کے سارے کرتب دکھائے پھر انہیں دہرایا مگر سکوت نہ ٹوٹا۔

آخر کار اس نے جہاز اتار لیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''تم دونوں جیت گئے۔ واقعی تم بہت دلیر ہو۔ میں تمہیں خوف زدہ کر کے چیخنے پر مجبور نہیں کر سکا۔''

''ہمارے پاس رقم نہیں تھی۔'' پیچھے سے شوہر کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔ ''تم نے غوطہ مار کر میری بیوی کو جہاز سے نیچے گرایا تو میں نے بمشکل اپنی چیخ روکی تھی۔''

(ریاض سے عذرا ریاض کا آتشِ شوق)

بانا وانی کا چوڑا چکلا دبنگ چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ میرے سامنے ہوتی تو یقیناً ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہتا۔ اس نے جس لڑائی کو ہوا دی تھی، وہ اب رکنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

انیق کی موت ایک ایسا صدمہ تھا جو ایک پہاڑ جیسے وزن کے ساتھ میرے سینے کو روندتا اور کچلتا چلا گیا تھا۔ گوٹھ موراناں کلاں میں اس کی تدفین کے مناظر ایسے تھے کہ دل خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ جانا چاہتا تھا مگر میں نے یہ خونی آنسو بہنے نہیں دیے، سنبھالے رکھے، میں انہیں ضائع کر کے اس آتشیں توانائی کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا جو مجھے بانا وانی جیسی خطرناک عورت سے ٹکرانے کے لیے درکار تھی۔

انیق کے جنازے کے مناظر میرے سامنے جیسے ایک دھند میں چھپے ہوئے تھے۔ میں ایک عجیب سی غنودگی کے گھیرے میں چل رہا تھا۔ اس کے جنازے میں پورے گوٹھ کے لوگ اُمڈ آئے تھے۔ بے شمار عام چہرے تھے لیکن ان میں کچھ خاص چہرے بھی تھے۔ ان میں سے کچھ چہروں کو میں پہچانتا تھا اور کچھ کو شاید نہیں۔ جن کو میں پہچانتا تھا، ان میں سے ایک چہرہ داؤد بھاؤ کا بھی تھا۔ داؤد بھاؤ کے کچھ قریبی ساتھی بھی اس جنازے میں شریک تھے، رعب دار چہرے والا داؤد بھاؤ، سر پر رومال باندھے، سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے جنازے کے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک دو بار اس کی اچٹتی سی نظر مجھ پر پڑی لیکن وہ مجھے پہچاننے سے قاصر رہا۔ پہلوان حشمت بھی چاند گڑھی سے طویل فاصلہ طے کر کے یہاں گوٹھ پہنچا تھا، چاند گڑھی کے کچھ اور افراد بھی تھے جن کو انیق نے وہاں اپنے قیام کے دوران میں اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ ان میں چاند گڑھی کی مسجد کے نئے امام صاحب بھی شامل تھے۔ (پہلے امام صاحب مولوی فدا یعنی زینب کے والد تو عرصہ ہوا مقامی دشمنیوں کی زد میں آ کر اپنی زندگی ہار چکے تھے) رضوان ٹی بھی جنازے میں شامل ہونے کے لیے لاہور سے یہاں پہنچا تھا۔ انیق کے ساتھ اس کا تعلق زیادہ طویل تو نہیں رہا تھا مگر وہ اس کا گرویدہ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق خفیہ پولیس کے کچھ لوگ بھی اس ہجوم میں موجود تھے اور چہروں کو تاک رہے تھے۔ ایک اہم چہرہ سجاول کا بھی ہوسکتا تھا مگر یہ چہرہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ یہاں آئے لیکن وہ نہیں آیا۔

میں نے لحد میں انیق کی صورت دیکھی اور پتا نہیں کیوں میرے دل سے آواز آئی کہ اس خوبرو نوجوان نے اپنے بہت سے گناہوں کا کفارہ شاید اس زندگی میں ہی ادا کر دیا ہے۔ وہ اتنی ہی زندگی کے ساتھ دنیا میں آیا تھا۔ درحقیقت ہم نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ گوٹھ موراناں سے طویل فاصلہ طے کر کے خیبر ایجنسی پہنچے تھے، مگر گھڑی کی سوئیاں ہم سے جیت گئی تھیں۔ ممکن تھا کہ ہمیں پہاڑی راستے میں کچھ رکاوٹیں نہ ملتیں اور ہم آدھ گھنٹا پہلے موقع پر پہنچ جاتے تو انیق کی زندگی بچ جاتی۔ ہونے والا کام ہو گیا تھا اور اب ان باتوں کو سوچنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔

اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا اور ہم اس کے گھر کی طرف واپس چل دیے۔ اچانک ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور سکتہ زدہ رہ گیا۔ میرے عقب میں داؤد بھاؤ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب ہیجانی سی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے، اس کی آہنی انگلیوں کی گرفت میرے کندھے پر بے ساختہ سخت تر ہوتی جارہی تھی۔

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ''ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو پر مجھے نہیں...... یہ داؤد کی نظریں ہیں...... سمجھے ہو یہ داؤد کی نظریں ہیں۔''

میں ششدر کھڑا تھا۔ چہرے کی ساخت تبدیل ہونے کے بعد میں اپنے درجنوں شناساؤں سے ملا تھا۔ ان میں سے کچھ بہت قریبی بھی تھے مگر مجھے پہچان نہیں سکے تھے لیکن اس شخص نے...... اس عقابی نگاہوں والے شخص نے میرے بدلے ہوئے خدوخال میں سے، اور میری آواز میں سے مجھے ڈھونڈ لیا تھا۔

اب کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ میں نے خود کو نارمل کیا۔

داؤد بھاؤ نے میری کلائی مضبوطی سے پکڑی اور بولا۔ ''دو منٹ کے لیے میرے ساتھ آؤ۔'' اس کی آواز جذبات کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

ہم دوسرے لوگوں سے علیحدہ ہو کر ایک سلور رنگ کی اسٹیشن ویگن کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ داؤد بھاؤ اور اس کے تین چار ساتھی اسی ویگن پر یہاں پہنچے تھے۔ ویگن کے عقب میں جا کر داؤد بھاؤ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر بانہوں میں لے لیا۔ ہم دونوں بغلگیر ہو گئے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''دنیا کچھ اور کہتی تھی، پر میرا دل ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ تم اتنی جلدی ہمیں چھوڑ نہیں سکتے...... میرا دل یہی کہتا رہا۔''

"......سوری داؤد بھاؤ...... بہت معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو صدمہ پہنچایا...... دکھ دیا...... لیکن یہ مجبوری تھی میری......اور اب بھی یہی مجبوری ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں......سب سمجھتا ہوں...... آج کا دن میری زندگی کا انوکھا دن ہے شاہی! آج ہی مجھے اپنی زندگی کی ایک بدترین خبر ملی...... مجھے پتا چلا کہ انیق مر گیا ہے اور آج ہی یہ سب سے بڑی خوش خبری ملی کہ تم زندہ ہو۔"

اس نے مجھے بانہوں میں بھینچ لیا۔ میرا دل بھی بھر آیا تھا لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ ہاں، یہ آنسو ہی تو سرمایہ تھے۔ یہ مجھے ضائع نہیں کرنا تھے۔ کم از کم ہاناوانی کی موت تک تو نہیں۔

تھوڑی دیر بعد میں اور داؤد بھاؤ اس لگژری اسٹیشن وین کے اندر تھے۔ یہ جزوی طور پر بلٹ پروف گاڑی تھی۔ داؤد بھاؤ نے سر پر بندھا ہوا رومال اتار کر ایک طرف رکھا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ "تمہاری شکل...... خاص طور سے ناک اور آنکھوں کے اردگرد کا حصہ بہت تبدیل ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جاماجی کے دوست کرنل ڈاکٹر احرار کا کارنامہ ہے۔ وہ بہت بڑا پلاسٹک سرجن ہے۔"

"لیکن یہ پلاسٹک سرجری نہیں، کاسمیٹک سرجری ہے داؤد بھاؤ، میں جب چاہوں گا اپنی اصل صورت بحال کر سکوں گا۔"

حیرت اور سنسنی کے شدید حملے کے بعد داؤد بھاؤ اب سنبھلنا شروع ہو گیا تھا۔ انیق کی موت کا غم سانجھا تھا لیکن ہم نے اس پر زیادہ بات نہیں کی۔ شاید یہ بات کرتے ہوئے ہم دونوں کو ہی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ہم کچھ دیر تک ان حالات کا تذکرہ کرتے رہے جن میں مجھے اپنی "موت" کا تاثر دینا پڑا۔ اس کے بعد بھی جو واقعات ہوئے وہ ہم نے ایک دوسرے سے شیئر کیے۔ بالآخر داؤد بھاؤ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "مجھے یقین ہے، تم نے جو کچھ بھی کیا ہے، ان ٹیکساریوں کی وجہ سے کیا ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب وہ لاہور میں اور آس پاس کے علاقوں میں جنونیوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔"

"انہوں نے جو کچھ کیا داؤد بھاؤ، اس نے میرے دل پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ آپ کی دوست روبی، عتار جھارا اور دوسرے ساتھیوں کی دردناک موت کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ انہیں آہنی سلاخوں میں پرو دیا گیا اور مجھے لگتا ہے کہ میرا دل بھی ان ہی سلاخوں میں پرو دیا گیا۔ پھر لاہور شہر میں انہوں نے جو بے گناہ شہری مارے ان کا دکھ بھی میرے سینے میں ایک جلتے داغ کی طرح ہے......مگر ہم نے ان سے حساب چکا دیا ہے بھاؤ...... کافی حد تک چکا دیا ہے اور اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی، اللہ نے چاہا تو جلد پوری ہو جائے گی۔"

داؤد بھاؤ نے کہا۔ "ہاں...... تمہارے دوست نے مجھے اس بارے میں بتایا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"فخر۔" میں نے لقمہ دیا۔ "ابھی جنازے میں بھی اس سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے۔"

"ہاں، میں نے یہاں آتے ہی اسے پہچان لیا تھا۔ تمہیں پہچاننے میں ایک ڈیڑھ گھنٹا لگا...... مگر ناکامی نہیں ہوئی۔"

"میں آپ کی تیز نگاہی کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں بھاؤ۔"

بھاؤ نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "فخر نے مجھے بتایا ہے کہ ٹیکساری گینگ کا پرانا باس وانس وائے زندہ تھا اور اسے اس کی بچی کے ساتھ بینکاک میں بند رکھا گیا تھا۔"

"جی ہاں، اسے ہم دونوں نے ہی جان ڈیرک کے چنگل سے نکالا ہے...... یہ ایک بہت مشکل ٹاسک تھا لیکن ہم کسی طرح کر گزرے۔ اب باقی کا کام وانس وائے خود ہی کر رہا ہے۔ ٹیکساری گینگ دو دھڑوں میں بٹ چکا ہے اور دونوں دھڑے پوری قوت کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔"

"ہاں، کچھ واقعات کا پتا مجھے بھی چلا ہے...... اُن کے لوگ جنگلی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔"

"زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے بھاؤ کہ ڈیتھ اسکواڈ کے خونی باسٹرڈز بھی ایک دوسرے کی جان لے رہے ہیں۔"

"وہ گندے جانور تو سارے کے سارے تلف ہی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ وہ کڈنیپ، مرڈر اور ریپ کرنے والی مشینیں ہیں۔ لاہور میں انہوں نے بے چاری فلمی اداکارہ اروشا کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ بھلائے جانے کے قابل نہیں۔"

"بہت تھوڑی تعداد رہ گئی ہے ان کی...... جو بچ گئے ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے چھپتے پھر رہے ہیں۔" میں نے بھاؤ کو بتایا۔

کچھ دیر اسٹیشن وین میں خاموشی طاری رہی۔ ٹنٹڈ

شیشوں والی کھڑکیوں میں سے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر انیق کا سوگوار گھر نظر آرہا تھا۔ وہی درو دیوار جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی اور پھر اس کی مختصر زندگی کا آغاز ہوا تھا۔
میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! ٹیکساری گینگ تو اپنی موت آپ مر رہا ہے...... اور جو تھوڑا بہت رہ گیا ہے، وہ بھی مرے گا...... اب اصل خطرہ یہ ناگن کی آنکھوں والی ڈائن ہے جو جاماجی جزیرے سے یہاں پہنچی ہے۔''

''تم کس کی بات کررہے ہو؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''انیق کی قاتلہ کی؟''

''لیکن......انیق کی دشمنی تو سجاول سے چل رہی تھی۔ انیق کو اسی ڈکیت سجاول اور اس کے ساتھی ملک زرق خاں نے مارا ہے۔'' بھاؤ کی آواز میں دکھ کی لہر ابھری۔

''آپ یہ بھی تو سوچیں، کیوں مارا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ اس خبیث نے انیق کے ساتھ دشمنی بنا رکھی تھی، اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔'' داؤد بھاؤ کی آنکھوں میں لہو اتر آیا۔

''تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی بھاؤ۔ اگر ان دونوں میں دشمنی شروع ہوئی تو اس میں انیق کا بھی دوش تھا بلکہ اگر ہم دیکھیں تو زیادہ بوجھ انیق پر ہی آتا ہے۔ لالہ موئی میں سجاول کی بیوی بچے کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی سن گن آپ کو مل چکی ہوگی اور اب یہ کوٹلی والا معاملہ۔ اس میں تو ایک جان بھی چلی گئی......لیکن بات یہ نہیں ہے کہ دونوں میں سے زیادہ قصور کس کا تھا، بات تو یہ ہے کہ دشمنی شروع ہی کیوں ہوئی؟ شاید آپ کو یہ بات عجیب لگے لیکن حقیقت یہ ہے بھاؤ کہ اس خطرناک کھیل کی شروعات میں دونوں کا قصور نہیں تھا......ایک ذرہ بھی قصور نہیں تھا، انیق نے جو کچھ بھی کیا، وہ اس دشمنی کی وجہ بنا اور انیق نے بھی جو کچھ کیا، اس نے خود نہیں کیا، اس سے کرایا گیا۔''

''کس نے کرایا؟ میرے اور تمہارے علاوہ وہ کس کی بات مانتا تھا۔ میرے اور تمہارے سوا اور کون تھا اس کا پشت پناہ؟'' غم و غصے کی شدت سے داؤد بھاؤ کی آواز بھرا گئی۔

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ ''داؤد بھاؤ...... یہاں کچھ باتیں بہت عجیب ہیں، آپ انہیں مان نہیں پائیں گے۔ مجھے بھی شروع شروع میں یہ سب کچھ ماننے میں بہت مشکل پیش آئی لیکن حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ جاماجی جزیرے میں بہت کچھ انوکھا ہوتا رہا اور یہ انوکھا پن اب ہمارے ساتھ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔''

''تم پہیلیاں نہ بجھواؤ۔'' داؤد بھاؤ نے جھنجلا کر کہا...... پھر چونک کر بولا۔ ''ابھی تم کسی عورت کی بات کررہے تھے۔ کون جاماجی سے یہاں پہنچی ہے؟''

''وہی جس کے بارے میں، میں نے آپ کو، ایک دو مرتبہ فون پر بھی بتایا تھا، اس وقت بھی آپ کو میری بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔''

''تم شاید رائے زل کی ماں کی بات کررہے ہو، جو عمل وغیرہ کرتی ہے۔''

''جی ہاں، اسی کی بات کررہا ہوں۔ وہ بہت خاص قسم کی ہپناٹسٹ ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اچھے بھلے بندے کے اندر گھس کر اس کی ساری سوچیں اپنے ہاتھوں میں کرلیتی ہے۔ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ وہ اپنے معمول کے ذہن کو کمزور کرنے کے لیے اس پر خاص قسم کی نشہ آور ادویات کا استعمال بھی کرتی ہے۔ ہمارے انیق کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے داؤد بھاؤ! آپ نے ابھی جنازے سے پہلے اس کا چہرہ دیکھا ہوگا۔ آپ کو اس کے چہرے پر منشیات کے آثار نظر نہیں آئے؟ حالانکہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں، وہ کبھی نشہ آور چیزوں کے قریب تک نہیں گیا۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ رائے زل کی ماں یہاں ہے اور اس نے انیق پر کوئی عمل وغیرہ کیا تھا؟''

''عمل کیا ہی نہیں تھا داؤد بھاؤ...... وہ مسلسل یہاں موجود رہی ہے۔ اس نے انیق کو پوری طرح اپنے قبضے میں کر رکھا تھا، اگر آپ......''

''میں نہیں مانتا اِن باتوں کو۔'' داؤد بھاؤ نے ہاتھ لہرا کر میری بات کاٹی۔ ''کوئی اور مجھے طوطا مینا کی ایسی کہانی سناتا تو میں اس کا گریبان پکڑ لیتا......لیکن شاہی! تم میرے دل کے بہت قریب ہو۔ تمہارے لیے میری ساری سوچیں اور میرے فیصلے بدل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تم سے ملاقات ہوئی اور تم نے انیق کو مجھ سے مانگا تو میں انکار نہ کر سکا۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ انیق حقیقتاً میرے دائیں ہاتھ کی طرح تھا۔'' اس کی آواز بوجھل ہوگئی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''خیر چھوڑو اِن باتوں کو، لیکن اب مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ تم انیق اور سجاول کی اس لڑائی میں ذمے داری انیق پر ڈال رہے ہو، اور مجھے یہ سمجھا رہے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہو کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ حالانکہ ہوش و حواس میں تو تمہارا وہ ڈکیت یار سجاول نہیں تھا۔ اگر انیق نے بھی اس کی طرف اینٹ پھینکی ہے تو اس نے اس کا جواب پتھر سے دیا ہے پھر اس ڈکیت نے اس اکیلے بچے کو گھیر کر مارا ہے۔ اس کام کے لیے اس نے اپنے یار قبائلی سردار اور اس کے درجنوں گن مینوں کو بھی ساتھ ملایا، بتاؤ ملایا یا نہیں؟''

میں دیکھ رہا تھا کہ انیق کی موت کا صدمہ ابھی تازہ ہے اور داؤد بھاؤ، سجاول وغیرہ کے خلاف غم و غصے سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے فی الحال اس سلسلے میں طویل بحث مناسب نہیں سمجھی اور بتدریج گفتگو کا رخ دیگر موضوعات کی طرف موڑ دیا۔

یہ تدبیر کارگر رہی اور داؤد کے بگڑے ہوئے موڈ میں تھوڑی سی بہتری آ گئی۔ اس نے سجاول والے موضوع کو کچھ دیر کے لیے التوا میں ڈالا اور مجھ سے ٹیکساری گینگ کی موجودہ ذلت و خواری کے حوالے سے کچھ سوالات پوچھے۔ وہ بھی جیسے دانستہ اپنی توجہ انیق والے موضوع سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں بھاؤ کے ایک کارندے نے آ کر بتایا کہ مقامی تھانے کا ایس ایچ او آیا ہوا ہے اور گھر والوں سے سوال جواب کر رہا ہے۔ ایس ایچ او جیسے لوگوں سے نمٹنا داؤد بھاؤ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے باہر آ گیا...... میری اور بھاؤ کی دوسری نشست سہ پہر کے بعد اسی اسٹیشن وین میں ہوئی۔ کچھ دیر انیق کی بات ہوتی رہی۔ تب داؤد بھاؤ جیسے چونک کر بولا۔

''شاہی، آخر وہی ہوا ناں۔ تاجور تمہارے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ طاقتور سیاسی خاندان اُسے لے اُڑا...... اور تم منہ دیکھتے رہ گئے...... اور تم ہی کیا ہم سب منہ دیکھتے رہ گئے۔ جس دن اس کی شادی کی خبر ملی، مجھے لگا جیسے سینے پر کسی نے فائر دے مارا ہے...... ایک بار تو جی میں آئی کہ کچھ کر گزروں لیکن پھر سوچا کہ اس سے فائدہ کیا ہے۔ جب تم ہی دنیا میں ''نہیں'' ہو تو پھر جو ہوتا ہے، ہوتا رہے۔''

میں خاموش رہا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ اگر تاجور میرے ہاتھ سے نکلی ہے اور ہم دونوں جدا ہوئے ہیں تو اس کے پیچھے بھی انیق اور اس کی مجبوریاں ہیں۔ وہی تھا جس نے نکاح سے صرف ایک دو دن پہلے تاجور کو ایک اذیت ناک انکشاف کے ذریعے اشکوں میں ڈبویا اور وہ ایک ایسے فیصلے پر پہنچ گئی جس نے مجھے ہی نہیں، اسے بھی دکھ کی دیوار میں چن دیا۔

داؤد بھاؤ نے نئے سگار کا کونا توڑتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے؟''

''ہاں داؤد بھاؤ معلوم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ جو کچھ ہو رہا، ہے اس کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ اس کے بعد تو پھر زبردستی ہی رہ جاتی تھی اور آپ کو معلوم ہے کہ اگر اسے اس کی مرضی کے بغیر حاصل کرنا ہوتا تو پھر اس سے پہلے بھی بہت موقع تھے میرے پاس۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہوا ہے لیکن اس کی مرضی کیوں ہوتی، میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وارج کے ساتھ شادی سے صرف دو دن پہلے، اپنی مہندی کے موقع پر وہ کہیں نکل گئی تھی......''

داؤد بھاؤ بولتے بولتے ایک دم رک گیا۔ اس نے جیسے چونک کر میری طرف دیکھا اور گہرا کش لے کر بولا۔

''ایک بات سچ بتانا۔ کیا تاجور کو پتا تھا کہ تم زندہ ہو، مطلب ہے کہ دھماکے سے بچ گئے ہو؟''

''ہاں، اُسے پتا تھا۔''

''تو پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے شاہی کہ...... وہ اپنی مہندی کے موقع پر گھر سے غائب ہی اس لیے ہوئی تھی کہ وہ تم تک پہنچنا چاہتی تھی...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ...... تم ہی...... اسے لے کر گئے ہو۔'' وہ اپنی بڑی بڑی جہاندیدہ آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

اس کی ذہانت فطانت کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا اور اب اس کا ثبوت بھی مل رہا تھا۔ وہ کڑی سے کڑی جوڑ کر درست صورتِ حال تک پہنچ گیا تھا۔

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں داؤد بھاؤ، جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہو چکا ہے مگر مجھ سے جھوٹ تو نہ بولو شاہی، مجھے سچ بتاؤ۔ شادی سے پہلے تاجور تمہارے پاس تھی؟ وہ کتنے دن رہی تمہارے پاس...... اور پھر واپس کیوں گئی۔ سنا ہے کہ اس نے واپس جا کر اپنے باپ سے اور اپنے ہونے والے سسرال سے رو رو کر معافی بھی مانگی تھی۔ ایسا کیا ہوا تھا جو اس نے یوں ہتھیار ڈال لے؟''

میں نے نشست پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو بتا دوں گا داؤد بھاؤ۔ سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت انیق کی موت کے صدمے نے گھیر رکھا ہے۔ کچھ بھی کہنے سننے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

''ٹھیک ہے مگر مجھے صرف اتنا بتا دو کہ...... وہ شادی سے پہلے چند دن تمہارے پاس رہی تھی یا نہیں؟'' وہ زور

دے کر بولا۔

''آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ رہی ہے لیکن خدانخواستہ اس کے رہنے میں کسی طرح کا بھی کچھ غلط نہیں تھا۔ آپ مجھے جانتے ہیں...... اگر......''

''تمہیں صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں شاہی۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔''

''اب اس چیپٹر کو کلوز ہی رکھا جائے تو بہتر ہے بھاؤ۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

وہ نشست سے ٹیک لگا کر کہنے لگا۔ ''میرے خیال میں شاہی! یہ چیپٹر ابھی پوری طرح کلوز نہیں ہے۔ میری سی آئی ڈی بتا رہی ہے کہ تاجور اپنے سسرال میں سکھی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جس کی توقع تھی۔ وہ سؤر کا بچہ دارج اپنی پاور کے نشے میں اس کمزور کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جو آقا اور کنیز والا ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی تڑوا کر بستر پر پڑا ہوا ہے پھر بھی خبیث کو چین نہیں ہے۔ سنا ہے کہ اس کا نچلا دھڑ بالکل ناکارہ ہو گیا ہے۔ حاجتیں وغیرہ بھی اُسے ''آرٹی فیشل'' طریقے سے پوری کرائی جاتی ہیں۔''

''یہ بات مجھے آپ ہی سے معلوم ہو رہی ہے...... میرا تو خیال تھا کہ شاید اس کی طبیعت اتنی خراب نہیں ہے۔''

''یہ اندر خانے کی باتیں ہیں شاہی۔ یہ لوگ پبلک کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیلتے ہیں۔ ان کا ہر کام ان کے ایجنڈے کے مطابق ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں دی آنا کا کوئی بہت بڑا سرجن پہنچا ہے اسلام آباد...... اس نے بڑے داراب صاحب کو یقین دلایا ہے کہ وہ دو تین ماہ میں بغیر کسی بڑے آپریشن کے اس کے بیٹے کو بحال کر دے گا۔ بحال کرنا تو اوپر والے کا کام ہے، کرتا ہے کہ نہیں کرتا۔ یہ ''میڈیکل شعبے'' کے انٹرنیشنل لٹیرے تو بس مال کھاتے ہیں گے کروڑوں کے حساب سے۔''

داؤد بھاؤ کی باتوں سے مجھے حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ ہو رہا تھا کہ دارج صرف [illegible] زیادہ [illegible] ہے۔ ریڑھ کی [illegible] [illegible] معذور [illegible] ہے تاجور [illegible] بیوی کی حیثیت سے [illegible] خدمت میں مصروف ہے [illegible] سلوک کا [illegible] ہو رہی ہے۔

''کیا سوچنے لگ گئے ہو؟'' داؤد کی گرج دار آواز [illegible]

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بولا۔ ''شاہی! تمہارے زندہ سلامت ہونے کی خوشی میں جانتا ہوں یا میرا دل جانتا ہے۔ یہ میری زندگی کی ایک انوکھی خوشی ہے مگر یہ خوشی تب ہی مکمل ہو گی جب میں انیق کے قتل کے ذمے داروں کو ان کے انجام تک پہنچا لوں گا۔ تمہیں اچھا لگے یا برا، لیکن میں خیالوں پر نہیں جاؤں گا، سالڈ بات کروں گا، میرے نزدیک تو اس قتل کا ذمے دار وہ سیالکوٹیا (سجاول) ہی ہے۔ اچھا ہے کہ وہ یہاں میرے آس پاس موجود نہیں۔ ورنہ آج کا سورج اس کی موت کے ساتھ ڈوبتا تھا۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، لگژری اسٹیشن وین کی خاموش ائرکنڈیشنڈ فضا میں داؤد بھاؤ کے قیمتی سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد وہ کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا، اسپیکر کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز مطلق میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ داؤد بھاؤ بھی اسی ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے یہ شک ہوا کہ یہاں جو گفتگو ہو رہی ہے وہ کسی طور سجاول اور اس کے قریبی ساتھیوں زرق خاں وغیرہ کے بارے میں ہی ہے۔

بات کرتے ہوئے داؤد بھاؤ اپنی لگژری وین سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک مانا ہوا گینگسٹر تھا اور درجنوں مقدمات میں پولیس کو مطلوب بھی، لیکن وہاں موجود ایک پولیس افسر نے اسے 'ادب' سے سلام کیا۔ وہ بات کرتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔ میں فخر اور یونس پمپ والا کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ جنازے کے بعد سے وہ غائب تھے۔ پہلوان حشمت بھی جس طرح خاموشی سے آیا اسی طرح واپس چلا گیا تھا۔ اس نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے، دوسروں کے سامنے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لواحقین اور دور سے آنے والے عزیزوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے انیق کی پھپو کی ایک جانب [illegible] اس عورت نے اس [illegible] بچے کو ماں بن کر [illegible] تھا اور [illegible] [illegible] داؤد بھاؤ [illegible] اور اس کے قریبی ساتھی [illegible] [illegible] اور کل واپس لاہور روانہ ہوں گے۔ میں بھی کل ہی یہاں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ ہماری توقعات کے عین مطابق مادام ہاناوانی اس گوٹھ سے اُڑن چھو ہو چکی تھی۔ اس کے بارے میں انیق کے گھر والوں کو کچھ پتا نہیں تھا۔

رات نو بجے تک فخر سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تو مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ گاڑی بھی لے گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سیل فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور اس مرتبہ رابطہ ہو گیا۔ ”ہیلو فخر، یار کہاں غائب ہو گئے ہو بغیر بتائے؟“

”بس آرہا ہوں گوٹھ۔ تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔ دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

دس پندرہ منٹ بعد وہ میرے ساتھ گوٹھ کی ایک اندھیری گلی میں کار کے اندر بیٹھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ”اظہارِ تشکر فرمانا چاہیے تمہیں۔ پچھلے تین چار گھنٹے میں اس خاکسار نے ایک بڑی لڑائی کو سر سے ٹالا ہے۔ یہاں پانی پت سے چھوٹا معرکہ نہیں ہونا تھا میرے فہم و ادراک کے مطابق۔“

”وہ کس کی لڑائی کس کے ساتھ؟“ میں نے استفسار کیا۔

”سجاول سیالکوٹی کی لڑائی، تمہارے داؤد بھاؤ کے ساتھ۔ اس وقت تک دونوں میں سے ایک کی لاش تو یقیناً کپڑے سے ڈھکی پڑی ہوئی تھی۔“

”یارا! صاف بات کرو، کہاں گئے تھے تم اور یونس؟“

”سجاول کو روکنے۔ وہ کالی آندھی کی طرح یہاں گوٹھ موراناں آرہا تھا اور یہاں یہ داؤد بھاؤ پہلے ہی اس کا ٹیٹوا دبانے کے لیے پوری طرح تیار اور کمربستہ تھا۔“

”سجاول! وہ کیوں آرہا تھا یہاں؟ جنازہ تو ہو چکا تھا۔“

”وہ شاید جنازہ پڑھنے نہیں ایک اور جنازہ نکالنے آرہا تھا۔ اس بدبخت ہاناوانی کو جہنم واصل کرنے کے لیے تشریف لا رہا تھا۔ اس کو سب پتا چل چکا ہے شاہی! وہ جان چکا ہے کہ یہاں گوٹھ میں کیا گھناؤنا کھیل کھیلا گیا ہے۔ اس نے اس ساری صورتِ حال پر یقین بھی کیا ہے اور اس کی وجہ شاید وہی ہے جو تم نے بتائی تھی۔ تم نے بتایا تھا کہ جاماجی میں سجاول خود بھی ایک موقع پر اس عورت کے غلط بات کا شکار ہوا تھا......“

میں فخر کی باتیں سن رہا تھا اور سناٹے میں تھا۔ صورتِ حال بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی اور کچھ سمجھ بھی آرہی تھی۔ میں نے فخر سے پوچھا۔ ”اگر تمہاری بات درست ہے تو پھر سجاول کو یہاں ہاناوانی کی موجودگی کے بارے میں کس نے بتایا؟“

”یہ کام یونس نے کیا ہے، جب انیق ’’باغ‘‘ کے اسپتال میں تھا اور زندگی موت کی لڑائی لڑ رہا تھا تو میں اور تم ہاناوانی کے موضوع پر کھل کر بات کر رہے تھے، اس حوالے سے راستے میں بھی ہماری گفتگو ہوتی رہی تھی۔ کافی باتیں یونس کے کانوں تک پہنچ چکی تھیں۔ اس نے اپنے پشت پناہ سجاول کو ان سے آگاہ کیا اور وہ ہاناوانی کا سامنا کرنے کے لیے گوٹھ موراناں کی طرف جھپٹ پڑا۔ اس نے پچھلے سولہ گھنٹے مسلسل سفر کیا اور اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ ’’بھوگلا‘‘ تک پہنچ گیا۔ جب مجھے یونس کی زبانی اس بات کا پتا چلا، تم داؤد بھاؤ کے ساتھ اس کی اسٹیشن وین میں محوِ گفتگو تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اگر سجاول اور داؤد بھاؤ کے درمیان خونریز تصادم سے بچنا ہے تو سجاول کو یہاں پہنچنے سے پہلے ہی روک لینا چاہیے۔ میں نے یونس کو ساتھ لیا اور چل پڑا۔“

”اب کہاں ہے سجاول؟“

”یہاں سے قریباً دس کلومیٹر دور...... بھوگلا کے ایک ہوٹل میں۔ میں جس طرح اس کو روکنے میں کامیاب ہوا ہوں کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا ہے شاہی، اسے احساس ہو گیا ہے کہ جاماجی والی دشمنی یہاں تک آن پہنچی ہے۔ اس دشمنی کی وجہ سے اس سے کتنا بڑا ناقابلِ تلافی نقصان ہو گیا ہے لیکن ایک بات بتا دوں، وہ طیش سے تقریباً دیوانہ ہو رہا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کا دل تو شاید یہی چاہتا ہے کہ تمہارا سامنا کرنے سے پہلے ہاناوانی کا قصہ تمام کر دے تاکہ تھوڑی بہت سرخروئی اسے مل جائے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے اُس سے ملنا چاہیے؟“ میں نے فخر سے رائے طلب کی۔

”ضرور ملنا چاہیے۔ تم سے مل کر ہی وہ کچھ سنبھل سکے گا۔ حالانکہ میں اسے دس بار بتا چکا ہوں کہ ہاناوانی اب گوٹھ میں نہیں ہے مگر اس کی نظریں گوٹھ کی طرف ہی ہیں۔ اگر وہ آج رات اس طرف نکل آیا تو داؤد بھاؤ سے اس کا تصادم ہو کر رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں فخر۔“ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں اور فخر اس درمیانے درجے

کے ہوٹل میں موجود تھے جہاں صوبے کا خطرناک ترین ڈکیت سجاول اپنی تمام تر گمبھیرتا کے ساتھ موجود تھا۔ ہوٹل کا منیجر کچھ سہما سہما سا نظر آتا تھا۔ سجاول کا دبنگ کارندہ باقر اور دو مزید ساتھی بھی اپنی لمبی قمیصوں کے نیچے اسلحہ سجائے آس پاس موجود تھے۔ میں اور فخر سیڑھیاں چڑھ کر اس ڈبل روم میں پہنچے جہاں سجاول ٹھہرا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے چونکنا پڑا۔ ایک کمرے کا تقریباً سارا فرنیچر برباد ہو چکا تھا۔ فریم شدہ تصویریں چکنا چور تھیں۔ ایک دیوار پر کئی جگہ سے پلاستر تک اکھڑا نظر آیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ وحشیانہ توڑ پھوڑ سجاول نے ہی مچائی ہے۔ میں ساتھ والے کمرے میں گیا۔ اس نے تیز ترین وہسکی کی بوتل سامنے رکھی ہوئی تھی۔ اس میں بس چند گھونٹ الکحل ہی بچا تھا۔ سجاول کی بڑی بڑی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ ایک ہاتھ لہولہان ہو رہا تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس کا طوفانی مُکا پتھر میں بھی دراڑیں ڈال دیتا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں جو بربادی نظر آئی تھی یقیناً اسی غیر معمولی گھونسے کی کرشمہ کاری تھی۔ شدید غم و غصے اور ڈپریشن کی شدت میں اس نے اپنے گرد نظر آنے والی ہر شے کو توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ ہوٹل کے عملے میں جو خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ اس کی وجہ بھی یقیناً یہی تھی۔

میں نے آج تک سجاول کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے لیکن آج مجھے یہ نظر آئے۔ میری اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ ہم دونوں نے اپنا ایک قریبی دوست اور ساتھی کھویا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ اسے کسی اور نے نہیں، ہم نے ہی مار ڈالا تھا۔ ہم اس کی ساری اذیتوں، مجبوریوں اور لاچاریوں سے بے خبر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہمارا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ ہم بھول گئے تھے کہ ہم جاماجی میں ایک خطرناک دشمنی چھوڑ کر آئے ہیں اور وہ دشمنی ہمارا تعاقب کر کے یہاں پہنچ سکتی ہے۔

کچھ دیر تک کمرے میں ایک گمبھیر اور بوجھل خاموشی طاری رہی۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ”سجاول!“ میں نے اسے پکارا۔

وہ اٹھا اور میری طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے اپنا چہرہ مجھے دکھانا نہ چاہتا ہو۔ اس کے زخمی ہاتھ سے اب بھی تھوڑا بہت خون رس رہا تھا۔

”سجاول۔“ میں نے اسے دوبارہ بلایا۔

وہ اسی طرح پشت کیے کھڑا رہا۔ اس نے جبڑے بھینچ رکھے تھے۔ میں نے اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے کھینچ کر اپنی طرف کیا۔ ”جو ہونا تھا، وہ ہو چکا سجاول، اب ہوش میں آجاؤ......“

”شاہی! میں جب تک اس سُورنی کو مار نہیں لوں گا، مجھ پر آرام حرام ہے۔“ وہ شعلہ بار آنکھوں کے ساتھ آتشیں لہجے میں بولا۔ ایک خوفناک ٹھہراؤ تھا اس کی آواز میں۔

”وہ ہماری سانجھی دشمن ہے سجاول! ہم اُس سے انیق کی موت کا یادگار بدلہ لیں گے لیکن تم جوش میں آ کر کوئی غلطی نہ کرنا۔ تمہیں پتا ہے وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی اسے بھگت چکے ہیں۔ تمہیں یاد ہی ہوگا کہ اس نے جاماجی میں کس طرح تمہیں ہمارے خلاف لا کھڑا کیا تھا۔“

سجاول کی آنکھوں میں مسلسل انگارے دہک رہے تھے۔ اس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس نے خود پر بڑی دشواری سے ضبط کر رکھا ہے۔ یہ واقعی فخر کا کمال تھا کہ اس نے سجاول کو گوٹھ تک پہنچنے نہیں دیا تھا اور یہاں روک لیا تھا۔

میں اور فخر قریباً ایک گھنٹا مزید سجاول کے پاس رکے۔ میرے سمجھانے بجھانے پر وہ کسی حد تک نارمل دکھائی دینے لگا۔ بہرحال انیق کی موت کا دکھ اس کی آنکھوں میں کسی جوت کی طرح روشن تھا۔

اس نے آخر میں بوتل سے منہ لگا کر چند تلخ بدبودار گھونٹ گلے سے نیچے اتارے اور اپنے بالوں بھرے ہاتھ سے اپنے ہونٹ پونچھ کر بولا۔ ”اس نے کوٹلی میں جو کچھ کیا، اس نے میرے ہوش مجھ سے چھین لیے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اسے مار دوں یا خود مر جاؤں، اگر، جو کچھ آج مجھے پتا چلا ہے، پرسوں چل جاتا، یا کل بھی چل جاتا تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ کل صبح آٹھ نو بجے تک بھی وہ زندہ تھا اگر اُس وقت بھی تمہاری کال مجھے مل جاتی تو ہم اپنے ہاتھ روک لیتے۔“

سجاول کی آنکھوں میں گہرا تاسف تھا اور اس تاسف میں یقیناً اپنی قریبی عزیزہ کی موت کا دکھ بھی تھا۔

میں نے ایک بار پھر سجاول کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی یہ یقین بھی دلایا کہ ہم ایک آدھ دن میں ہی باناوانی کی گردن تک ضرور جا پہنچیں گے۔ اگر وہ واپس جاماجی فرار نہیں ہوگئی تو پھر یہیں پر اُس کا ”مقبرہ“ بنے گا۔

سجاول میری باتوں پر خاموش تھا۔ ایک طرح اس

صورتِ حال کو سجاول کی نیم رضامندی کہا جا سکتا تھا لیکن میں اس کی آتش مزاجی سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ ساتھ والے کمرے میں جو فرنیچر چکنا چور پڑا تھا، وہ اس آتش مزاجی کا ایک چھوٹا سا ثبوت تھا۔

سجاول نے عندیہ دیا کہ وہ آج رات اس ہوٹل میں قیام کرے گا اور کل کسی وقت کوٹلی والے ڈیرے پر واپس چلا جائے گا۔ بہرحال مجھے اس بارے میں بھی شک تھا۔ سجاول سے رخصت ہوتے وقت میں نے ایک احتیاط کی۔ میرا پن ہول اسمارٹ کیمرا اس سے پہلے بھی کئی بار میرے زبردست کام آچکا تھا۔ نیم مدہوش سجاول کی نگاہ بچا کر میں نے کیمرا جیب سے نکال کر ہاتھ میں کرلیا تھا جونہی مجھے موقع ملا، میں نے یہ ننھا سا ڈیوائس ایک کارنس ٹیبل پر چپکا دیا۔

سجاول سے رخصت ہو کر میں اور فخر واپس روانہ ہوئے۔ یونس پمپ والا بھی نیچے ہوٹل کی لابی میں موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں فخر بہت احتیاط کرتا تھا اور مجھے وقاص کے نام سے ہی بلاتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے یونس کو سمجھایا۔ ”تمہارے سجاول صاحب، اس وقت پوری طرح ہوش میں نہیں ہیں۔ کسی وقت بھی اُبال آگیا تو یہاں سے نکل کھڑے ہوں گے اور یہ خطرناک ہوگا۔“

”میں آپ کی بات پوری طرح سمجھ رہا ہوں وقاص بھائی، اگر مجھے کوئی ایسی بات ہوتی نظر آئی تو میں آپ کو بتاؤں گا۔ ویسے وہ جتنی چڑھا چکے ہیں میرا خیال ہے کہ کچھ دیر میں سو جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے تم چوکس رہو، میرا گوٹھ واپس جانا ضروری ہے، ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں اِدھر ہی رک جاتا۔“

جس وقت ہم ہوٹل کی مختصر پارکنگ سے نکلے رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ناشتے کے بعد سے ہم دونوں نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا۔ بھوک ہی مری ہوئی تھی۔ بہرحال جسم کو توانائی کے لیے ایندھن کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک قدرے بارونق سڑک پر ایک درمیانے درجے کا سندھی ہوٹل نظر آیا اور ہم وہاں رک گئے۔ ہلکا پھلکا کھانا کھایا اور چائے پی، اس دوران میں بھی انیق کی دردناک جدائی کی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ چھوٹی چھوٹی یادیں تھیں، چھوٹے چھوٹے واقعات تھے، جو اس کے غم کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ وہ ایک مسلسل عذاب میں مبتلا رہا اور ہم اس کی تکلیف سے بے خبر رہے۔ پتا نہیں کیوں...... ہم میں سے کسی ایک کا ذہن بھی اس طرف جا ہی نہیں سکا۔ جاماجی کی دشمنی والا حوالہ جیسے ہمارے ذہنوں سے محو ہی ہو گیا تھا۔

انیق نے میرے ساتھ جو آخری تصویر بنوائی تھی، وہ جاماجی ہی کی تھی۔ بلند پام پیڑوں کے نیچے وہ شرارت کے موڈ میں کھڑا تھا، اس نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ میں نے اس کی گردن اپنی بغل میں لے رکھی تھی۔

کچھ دیر تک میں اور فخر یہ تصویریں دیکھتے رہے پھر میں نے یونہی اپنے پن ہول کیمرے کو کونیکٹ کیا۔ میں کمرے کا رزلٹ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ رزلٹ بہت خراب تھا۔ اسکرین پر لہریں دکھائی دے رہی تھیں۔ کیمرے کا زاویہ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ مجھے سجاول کا بس ایک کندھا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ مگر باقی جو کچھ مجھے نظر آیا، وہ اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے یوں لگا کہ سجاول والے کمرے میں کوئی شدید قسم کی گڑبڑ ہے۔ مجھے ایک شخص فرش پر اوندھا پڑا دکھائی دیا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ سجاول کا ساتھی ہے یا کوئی اور......

کوئی شخص کڑک کر بولا مگر آواز ٹوٹ کر آرہی تھی۔ الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آئے۔ اس کے ساتھ ہی یوں بھی لگا کہ کوئی خاتون بھی کمرے میں موجود ہے کیونکہ ایک زنانہ چادر کی جھلک دکھائی دی تھی۔

”کیا ہوا؟“ فخر نے میرے تاثرات دیکھے اور چونک کر کہا۔

”کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے سجاول کے کمرے میں منی کیمرا چھوڑا تھا۔“ میں نے نگاہیں اسکرین پر مرکوز رکھے رکھے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

فخر بھی اٹھ گیا اور اسکرین کو دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”یہاں سگنل کمزور ہیں کچھ بھی ٹھیک سے پتا نہیں چل رہا۔“

فون کے اسپیکر پر آڈیو سنائی دی۔ کسی نے انگلش میں گرج کر کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا......“ اس کے ساتھ ہی سگنل کمزور ہو گئے اور آڈیو کے بجائے شائیں شائیں سنائی دینے لگی۔

میں اور فخر تقریباً بھاگتے ہوئے ہوٹل سے نکلے۔ نکلنے سے پہلے فخر نے ایک بڑا کرنسی نوٹ میز پر چھوڑ دیا تھا۔ ہم مہران کار میں بیٹھے اور واپس اس ہوٹل کی طرف بڑھے جہاں ایک گھنٹا پہلے سجاول کو چھوڑ کر آئے تھے۔ سڑک پررش کم تھا، فخر برق رفتاری سے کار چلانے لگا۔ ہم ایک راؤنڈ اباؤٹ سے مڑے تو موبائل کے ”ویڈیو ریسیور“ کے سگنل ایک دم کلیئر ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر سے پاؤں تک سنسنی کی تیز لہریں دوڑ گئیں۔ میرے سامنے سجاول

والے کمرے میں ایک سنگل صوفے پر باناوانی موجود تھی۔ اپنے پورے طمطراق اور شان وشوکت کے ساتھ۔ اس کے بھاری بھر کم جڑاؤ زیورات ٹیوب لائٹ میں چمک رہے تھے۔ اس کی ایک کلائی کے گرد لپٹی ہوئی منکوں کی تسبیح بھی نمایاں دکھائی دے رہی تھی۔ حسب دستور اس نے رات کے وقت بھی گہرے سیاہ شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔

"باناوانی۔" میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

فخر بھی چونک کر میرے سیل فون کی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ کمرے کا منظر تہلکہ خیز تھا۔ باناوانی کے کم از کم چار مسلح ساتھی ہوٹل کے اس کمرے میں موجود تھے۔ ان میں سے تین اپنے ملایشین خدوخال کی وجہ سے صاف پہچانے جا رہے تھے۔ کمرے میں سجاول کے ایک ساتھی کی لاش صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک اور غیر متحرک جسم کی ٹانگ بھی کیمرے کے فریم میں دکھائی دیتی تھی۔ کمرے کے اندر توڑ پھوڑ کے آثار تھے۔

فخر نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ سجاول کو کرسی سے باندھ دیا گیا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سجاول کو جکڑنے والی بندشیں دکھائی دے رہی تھیں...... سجاول کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ٹیپ چسپاں کر دی گئی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں پہلے ہی مدہوش تھا۔ غالباً اس پر غلبہ پانے میں باناوانی اور اس کے ساتھیوں کو بہت زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"فرش پر کافی خون نظر آرہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں فائرنگ وغیرہ نہیں ہوئی۔ شاید تیز دھار آلہ استعمال کیا گیا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" فخر لرزاں آواز میں بولا۔ "اگر فائرنگ ہوتی تو پورے ہوٹل کا عملہ اور گیسٹ یہاں جمع ہو جاتے۔"

"وہ کچھ کہہ رہی ہے یہ عورت۔" میں نے کہا اور آواز کا حجم بڑھانے کی کوشش کی۔ آواز سنائی دینے لگی۔ اور یہ اسی منحوس باناوانی کی آواز تھی۔ انیق کی قاتلہ کی آواز تھی۔ ہم اُسے ڈھونڈنا چاہتے تھے، سجاول بھی اسے ڈھونڈنا چاہتا تھا، اور وہ خود سجاول کے پاس پہنچ گئی تھی۔ معلوم نہیں کہ کیسے اور کیونکر......؟ یقیناً وہ لمبے ہاتھوں والی ایک انوکھی اور خطرناک عورت تھی۔ وہ سجاول سے مخاطب ہو کر بولی۔ "میری چھاتی میں آگ بھڑک رہی ہے آگ...... جب تک تم لوگ زندہ ہو، مجھے کسی پل چین نہیں آئے گا۔" اس نے یہ الفاظ ملایشین زبان میں ادا کیے تھے۔ یقیناً سجاول کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ ہاں ایک عرصہ جاماجی میں قیام کے بعد مجھے مقامی زبان کی "شدبد" ہو گئی تھی۔

سیاہ چشمہ ابھی تک باناوانی کی آنکھوں پر تھا۔ وہ یوں پھیل کر صوفے پر براجمان تھی جیسے کسی اجلاس کی صدارت کر رہی ہو۔ سجاول کی کرسی کو شاید اس نے ٹانگ رسید کی تھی۔ سجاول کا رخ تھوڑا سا تبدیل ہو گیا تھا اور اب اس کے چہرے کی ایک سائڈ بھی کیمرے کے فریم میں نظر آرہی تھی۔

سجاول کی پیشانی پر تازہ چوٹ کا گہرا نشان تھا اور خون رس کر اس کی چوڑی ٹھوڑی تک آرہا تھا۔ سفید شلوار اور قمیص کے گھیرے پر بھی خون کے آثار تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہمیشہ ایک عقابی چمک رہتی تھی، بے ساختہ بند ہوتی چلی جارہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ صرف وہسکی کا تیز نشہ نہیں ہے، سجاول کو یہاں کچھ اور بھی "کھلایا پلایا" جا چکا ہے۔ یا عین ممکن تھا کہ کوئی انجکشن لگا دیا گیا ہو۔ وہ بالکل نڈھال اور مجہول نظر آرہا تھا۔ بس غنودگی بھری آنکھوں اور ڈگمگاتے سر کے ساتھ باناوانی کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔

وہ کچھ بڑبڑائی پھر فون کے اسپیکر کے ذریعے اس کا ایک اور فقرہ میرے کانوں تک پہنچا۔ وہ جنونی انداز میں بول رہی تھی۔ "میں نے قسم کھائی تھی...... ہاں قسم کھائی تھی میں نے، میں تم میں سے کسی کو نہیں ماروں گی ہاتھ تک نہیں لگاؤں گی، تم خود ہی ایک دوسرے کو مارو گے۔ اس حرامی انیق نے تمہاری بھگوڑی بیوی کو مارنے کی ناکام کوشش کی لیکن تمہاری کوشش ناکام نہیں رہی۔ تم نے اس حرامی کو مار دیا۔ اب تم اس کے گرو کو مارو گے...... اس بھینسے کے منہ والے داؤد بھاؤ کو مارو گے...... پھر تم اپنی بیوی کا خون کرو گے، اس کے بچے کا گلا کاٹو گے...... اگر تمہاری کارکردگی اچھی رہی تو...... اور مجھے یقین ہے کہ اچھی رہے گی...... میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی، تم اس ناگن قسطینا کے بیڈروم میں گھسو گے، اسے خوار کر کے مارو گے، اس خارش زدہ سانپ فارس جان کے ٹکڑے کرو گے۔ تم کرو گے سب کچھ کرو گے۔" وہ بول رہی تھی اور اس کے منہ سے جیسے طیش سے جھاگ بہہ رہے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟" فخر نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے مختصراً بتایا۔ ہماری کار اب اس درمیانے درجے کے ہوٹل کے قریب پہنچ چکی تھی جہاں سجاول ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم صرف ڈیڑھ گھنٹے بعد دوبارہ یہاں آئے تھے اور اس دوران میں بہت کچھ یہاں بدل چکا تھا۔

میں نے فخر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہوٹل

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے آس پاس بھی ہاناوانی کے لوگ موجود ہوں گے۔ تم گاڑی یہیں روک لو۔“

فخر نے میرے مشورے پر عمل کیا۔ ہم ہوٹل سے قریباً 100 میٹر کے فاصلے پر ایک پیٹرول پمپ کے سامنے رک گئے۔ ہوٹل کے سامنے دو لگژری جیپیں پُراسرار انداز میں موجود تھیں۔ ایک پر اسلام آباد کا نمبر دکھائی دیتا تھا۔ میرا منی کیمرا آگاہ کر رہا تھا کہ کمرے میں منظر مزید سنسنی خیز ہو گیا ہے۔ ہاناوانی نے غالباً اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور کمرے میں سے فالتو افراد باہر نکل گئے۔ اب وہاں ہاناوانی تھی اور ایک تنومند ملائیشین مؤدب انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمکیلا خنجر دکھائی دے رہا تھا۔ دیوار پر لرزتے ہوئے ایک سائے سے پتا چلتا تھا کہ ایک اور بندہ بھی موجود ہے لیکن وہ دکھائی نہیں دیتا تھا پھر شاید اسی بندے نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور کوئی دوسری پورٹ ایبل لائٹ آن کر دی۔ اس لائٹ سے مختلف رنگوں کی روشنیاں نکل کر پورے کمرے میں چکرانے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب سحر انگیز سا ماحول طاری ہو گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ جزیرہ جاماجی کی اس انوکھی ساحرہ نے سیاہ شیشوں والی عینک اتار کر میز پر رکھ دی ہے۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ سارے بیش قیمت طلائی گہنے بھی جو اس کے فربہ جسم پر جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔ اس مرتبہ مجھے اس کی گود میں کوئی جانور بھی نظر آیا۔ اس سے پہلے میری نظر اس پر نہیں پڑ سکی تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ یہ ایک بندر یا تھی۔ تصویر واضح نہیں تھی لیکن میرا دل گواہی دینے لگا کہ یہ وہی بندر یا لوسی ہے جس نے جاماجی میں حق نمک ادا کیا تھا اور اپنے مالک (خانساماں) کی موت کا بدلہ لیتے ہوئے، آقا جان کو بوقتِ فرار ہیلی کاپٹر میں سے کھینچ کر چھت پر لا پھینکا تھا۔ ہاناوانی اب سحر کار نظروں سے سجاول کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی غیر مرئی طاقتیں بیان سے باہر تھیں۔ صوبے کا یہ خطرناک ڈکیت جس کے رعب سے ایک خلقت کانپتی تھی، اس وقت قطعی بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ شراب تو اس نے پہلے ہی اندھا دھند پی رکھی تھی، اب کچھ خاص قسم کی نشہ آور دواؤں نے اس کے دل و دماغ کو بالکل ماؤف کر دیا تھا۔ ہاناوانی اس پر اپنی طلسمی آنکھوں سے کارگر وار کرنے کے لیے بالکل تیار نظر آتی تھی۔

میں نے فون بند کرتے ہوئے فخر سے کہا۔ ”ہمیں اس عورت کو روکنا ہوگا۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے نشست کے نیچے سے بھرا ہوا بریٹا پسٹل نکال لیا۔

بری مرچیں

☆ تمہاری گردن پر ایک چیز ہے جسے دیکھ کر خوف آتا ہے۔

کیا چیز ہے وہ؟

تمہارا چہرہ۔

☆ وہ اس کا جڑواں بھائی ہے جو ہو بہو اس کے مشابہ ہے۔ ایک ہی روز پیدا ہونے والے ان بہن بھائیوں میں معمولی سا فرق ہے اور وہ یہ کہ بھائی کی عمر ”اتنی“ سال ہے جبکہ وہ ابھی ”انتالیس“ سال ہی کی ہے۔

☆ ایک بیوٹیشن کی سربراہ اپنے کسٹمر کے شوہر سے ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگیں۔ ”میں نے آپ کی بیگم کو ملتانی مٹی کا ماسک لگانے کا جو مشورہ دیا تھا، اس سے کچھ چہرہ بہتر ہوا؟“

”جی ہاں! جب تک ماسک لگا رہتا ہے، چہرہ کافی بہتر رہتا ہے۔“ شوہر نے جواب دیا۔

☆ شوہر کسی سوچ میں غرق تھے کہ بیوی نے ٹھوکا دیا۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“

میاں نے نہایت نمناک آواز میں جواب۔ ”تاج محل کا خیال آیا تو سوچا کہ تمہاری قبر پر کس قسم کا کتبہ ٹھیک رہے گا؟“

بیوی فوراً بولی۔ ”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ سادگی کا زمانہ ہے بس مرزا مرحوم کی بیوی کافی ہوگا۔“

مرحا گل، رمنا گل، درابن کلاں

فخر نے اپنے پاؤں کے قریب رکھی ہوئی چھوٹی نال کی سیون ایم ایم اٹھالی۔ ”میرا خیال ہے میں چادر کی بُکل مار لیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں ٹھیک رہے گا۔ ہم عام انداز میں درمیانی رفتار سے چلتے ہوئے اندر داخل ہوں گے۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود افراد ہمیں پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، وہ ہمارے اوپر جانے پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔“

”ہمیں...... کرنا کیا ہے؟“ فخر نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے سینے میں انسان کے بجائے ایک شیر کا دل دھڑکنا شروع ہو گیا ہے۔ وہ بلاشبہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہ لوگ ہمارا کوئی لحاظ نہیں کریں گے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہمیں بھی نہیں کرنا۔ سیدھا فائر کریں گے...... اگر موقع ملا تو اُڑا دیں گے اُس کو بھی۔"

"کس کو؟"

"اسی حرام زادی کو۔ قاتلہ ہے یہ ہمارے انیق کی۔"

میرے لہجے میں تیلی آگ بھڑک رہی تھی۔ فخر نے سر ہلا کر میرے خیال کی تائید کی۔

ہم نے اپنے ہتھیار چیک کیے اور مہران کار سے باہر نکل کر درمیانی رفتار سے ہوٹل کے داخلی راستے کی طرف بڑھے۔ ایک لگژری جیپ کے قریب سے گزرے تو اس کے اندر کچھ افراد کی موجودگی کا اندازہ ہوا۔ مگر رنگ دار شیشوں کی وجہ سے کچھ بھی واضح دکھائی نہیں دیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزر کر ہم اوپر جانے والی قالین پوش سیڑھیوں تک پہنچے۔ سیڑھیاں طے کر کے جب ہم فرسٹ فلور کی پہلی راہداری کے سامنے آئے تو خطرے کا احساس شدید ہو گیا۔ یہی راہداری تھی جس میں آگے جا کر سجاول والا ڈبل روم تھا۔ راہداری کے وسط میں دو ہٹے کٹے افراد کھڑے تھے۔ یہ پینٹ کوٹ میں تھے اور ان میں سے ایک مقامی لگتا تھا۔ ان لوگوں کو فخر کی چادر کی بُکل نے شک میں مبتلا کیا تھا۔ "جی بھائی صاحب، کہاں جانا ہے آپ کو؟" مقامی شخص نے ہمیں روکتے ہوئے کہا۔

"28 نمبر کمرے میں۔" میں نے یونہی اٹکل سے جواب دیا۔

چادر میں سے رائفل کی نال کا ابھار اس شخص کو شاید دکھائی دے گیا تھا۔ اس نے ابھار کو چھو کر دیکھا اور ایک دم دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ کوٹ کے نیچے سے ہتھیار نکالنا چاہ رہا ہے۔ اب انتظار فضول تھا۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی آتشیں ہتھیار یا تیز دھار آلہ نکال لیتا میں نے پسٹل کا فائر کیا جو سیدھا مقامی شخص کے سینے میں لگا اور وہ لڑکھڑا کر ایک بڑے گل دان پر گرا۔

یہ پہلا فائر ایک زوردار ہنگامے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ کوریڈور کے آخری سرے سے ایک رائفل بردار ملائیشین بھاگتا ہوا آیا۔ فخر نے بھی چادر اتار پھینکی تھی اور لوڈڈ رائفل اپنے ہاتھ میں کر لی تھی۔ فخر کی چلائی ہوئی گولیاں رائفل بردار کی ٹانگوں میں لگیں اور وہ لڑھکتا ہوا ہم سے دس پندرہ فٹ کی دوری پر آن گرا۔

میں اور فخر بروقت ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ ایک طویل برسٹ نے ہمارے اردگرد کی کئی اشیا کو تنکوں کی طرح ہوا میں اُڑا دیا۔ ہوٹل کے درودیوار میں جیسے کہرام سا مچ گیا تھا۔ چلّانے کی مردانہ و زنانہ آوازیں ہر سمت گونج رہی تھیں۔ "بچو شاہ زیب۔" فخر نے پکار کر کہا۔

میں نے دیکھا بائیں پہلو کی طرف سے موٹی ناک اور سوجی سوجی آنکھوں والا ایک شخص ہاتھ میں برچھی نما آلہ لیے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ میں نے بروقت خود کو جھکا کر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ وہ جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے میرے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک دیوار گیر کھڑکی سے ٹکرایا اور اس کا شیشہ توڑتا ہوا نیچے کہیں گلی میں جا گرا۔

ہمیں ایک محفوظ اوٹ میسر آ گئی تھی۔ ہر طرف پگھلا ہوا سیسہ پرواز کر رہا تھا۔ شیشے ٹوٹ رہے تھے، دیواریں لرز رہی تھیں۔ پھر ایک برسٹ ہمارے عقب میں موجود بجلی کی 'ڈی پی' میں جا لگا۔ فرسٹ فلور پر تاریکی چھا گئی۔

"فخر کسی طرح اس ڈائن ہاناوانی تک پہنچنا ہے۔" میں نے جھک کر فائر کرتے ہوئے کہا۔ ہم اندازے سے اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں وہ موجود ہو سکتی تھی۔

دو عورتوں کی چلاتی ہوئی پرچھائیاں ہمارے پاس سے گزریں، سیڑھیوں پر پہنچ کر وہ دونوں گر پڑیں اور لڑھکتی ہوئی نیچے گئیں۔ ان کے عقب میں آنے والے ایک نوجوان کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ جھک کر دوڑتا ہوا سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا، میں نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھینی اور اس کی روشنی میں ایک دیوار کی اوٹ لیتا ہوا سجاول والے کمرے کی جانب بڑھا۔ فخر میرے عقب میں تھا اور مجھے کور دے رہا تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی مختلف کمروں کے دروازوں پر ڈال رہا تھا۔ ان دروازوں پر کمروں کے نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ بالآخر ہم سجاول والے 'ڈبل روم' کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ پہلے میں نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں پھینکی پھر اندر گھس گیا۔

"تم دروازے پر رہو فخر۔" میں نے پکار کر کہا۔

"تم بےفکر رہو۔" وہ بھی جوشیلے لہجے میں پکارا۔

کمروں میں کم از کم تین لاشیں موجود تھیں۔ ایک لاش پہلے کمرے میں تھی۔ باقی دو اس کمرے میں جہاں سجاول کو باندھا گیا تھا۔ سجاول کرسی سمیت اوندھا پڑا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ محفوظ دکھائی دیتا تھا۔ سر سے بہتا ہوا خون اس کی پہلی چوٹ کا ہی تھا۔

باہر سے فخر نے پوچھا۔ "کہاں ہے حرام زادی؟"

"یہاں نظر نہیں آ رہی......"

ابھی میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ تاریکی سے ایک پرچھائیں سی مجھ پر جھپٹی۔ مجھے دبوچنے کی یہ بڑی کمزور سی

کوشش تھی۔ میں نے خود کو بچایا۔ جھپٹنے والا اوندھے منہ فرش پر گرا۔ یہ وہی ملائیشین تھا جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے اپنے پن ہول کیمرے کے ذریعے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خم دار خنجر تھا۔ میں نے اس کے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پر پاؤں رکھا اور سخت ٹھوکر اس کے چوڑے تھوبڑے پر رسید کی۔ اس کے دو تین دانت ضرور اس کے حلق میں چلے گئے ہوں گے۔

اسی دوران میں لائٹ پھر آن ہوگئی۔ ملائیشین کو دیکھ کر میرے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلے اور بلند ہوگئے۔ ہاں یہی لوگ تھے جنہوں نے جاماجی سے یہاں پہنچ کر ہمارے اینق کو ہم سے جدا کیا تھا۔ مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے ٹھوکروں اور گھونسوں سے اسے روئی کی طرح دھنک دیا۔

''چھوڑ دو شاہ زیب، اسے جان سے نہیں مارنا۔'' فخر چلّایا اور مجھے اس شخص سے دور ہٹایا۔

ہوٹل کے عملے کے دو تین افراد جن میں ایک مسلح گارڈ بھی شامل تھا، اندر گھس آئے تھے۔ نہوں نے زور لگا کر سجاول والی کرسی سیدھی کی۔ پارکنگ کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ کی آوزیں آئیں، کئی برسٹ چلے۔

فخر چلّایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ فرار ہو رہے ہیں۔''

''انہیں روکنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

ہم سجاول کو وہیں چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف لپکے۔ سیڑھیوں پر سجاول کا زخمی ساتھی باقر ملا۔ ''سردار سجاول کہاں ہیں؟'' اس نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

''وہ اوپر ہے۔ اس کے پاس پہنچو۔'' فخر نے جواب دیا۔

جب تک ہم پارکنگ میں پہنچے، وہاں موجود دونوں لگژری جیپیں منظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ ہم دونوں اندھا دھند بھاگتے ہوئے اپنی مہران کار تک آئے لیکن اس میں بیٹھنے سے پہلے ہی ہمیں پتا چل گیا کہ اس کے دونوں اگلے ٹائر برسٹ کردیے گئے ہیں۔

ہم ان تین چار گاڑیوں کی طرف لپکے جو ہوٹل کے سامنے کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک ٹویوٹا کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص موجود تھا۔ فخر نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور کھینچ کر اس شخص کو باہر نکال لیا۔ وہ پہلے ہی فائرنگ سے از حد ڈرا ہوا تھا۔ کچھ بولنا چاہ رہا تھا مگر اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے اس کی گاڑی کی ڈکی کے پاس گولیوں کے دو تین سوراخ نظر آئے۔ تب میں نے اس کے ٹائروں پر نگاہ دوڑائی۔ اس گاڑی کا ایک ٹائر... مکمل طور پر بیکار ہو چکا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں فخر۔'' میں نے ٹائر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فخر، جو گاڑی میں گھسنا چاہ رہا تھا، رک گیا۔ ٹائر دیکھ کر اس نے دانت پیسے اور ''ڈرٹی باسٹرڈز'' کہہ کر رہ گیا۔

اب پتا چل رہا تھا کہ پارکنگ کی طرف، چند سیکنڈ پہلے جو اندھا دھند برسٹ چلائے گئے تھے، ان کا مقصد ان تین چار گاڑیوں کو بے کار کرنا ہی تھا۔ اب تعاقب کا خیال عبث تھا۔

''نکل گئی موٹی سٹوری۔'' فخر نے زمین پر تھوک کر کہا۔

ہم دوبارہ ہوٹل میں گھسے۔ یہاں مسلسل ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔ بے تحاشا فائرنگ کے سبب کئی افراد زخمی بھی ہوئے تھے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ سجاول کو ایک دوسرے کمرے میں منتقل کیا جا چکا تھا اور اس کے سر سے بہنے والا خون بند کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ہم سجاول والے ڈبل روم میں پہنچے۔ یہاں ایک ڈاکٹر، ملائیشین کو طبی امداد یا یوں کہہ لیں کہ فرسٹ ایڈ دینے میں مصروف تھا۔ انکشاف ہوا کہ میری مار پیٹ کے دوران میں ہی اس شخص نے اپنے گلے پر خنجر چلا لیا تھا۔ اس کی حالت خطرے میں تھی لیکن اسے بچانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

میں نے فخر سے کہا۔ ''میں یہاں سجاول اور یونس وغیرہ کو دیکھتا ہوں۔ تم اس ملائیشین کے ساتھ اسپتال جاؤ، یہ ہمارے لیے بہت اہم ہے۔''

فخر نے اپنی رائفل میرے سپرد کی اور میرے والا بریٹا پسٹل اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا۔ زخمی ملائیشین کو فوراً ڈنڈا ڈولی کر کے سیڑھیوں کی طرف لے جایا گیا۔ یہاں تین لاشیں پڑی تھیں۔ دو سجاول کے ساتھیوں کی تھیں جن کو تیز دھار آلے سے قتل کیا گیا تھا۔ تیسری ہاناوانی کے ساتھی کی تھی جسے کاؤنٹر فائرنگ میں چار گولیاں لگی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی اور ان دونوں کمروں کے چپّے چپّے کی تلاشی لی جائے گی۔ بہتر تھا کہ میں اپنا جادوئی کیمرا یہاں سے ہٹا لیتا۔ کیمرے کو کارنس ٹیبل سے علیحدہ کر کے میں نے محفوظ کرنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں ہے۔ میں نے تیزی سے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ ننھا سا کیمرا لکڑی کے ایک ٹکڑے سمیت قالین پر پڑا تھا۔ دراصل شدید فائرنگ کے دوران میں اس کارنس ٹیبل کے کچھ پرخچے قالین پر گرے تھے۔ کیمرا بھی انہی میں تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

باقر مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا مگر میرے بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ پہچاننے سے قاصر تھا۔ اس سے بات کرتے

ہوئے میں ویسے بھی آواز میں تھوڑی سی ”میں“ بنا لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یونس کہاں ہے؟“

وہ پریشان آہنگ میں بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ مجھے بھی گن پوائنٹ پر ایک جیپ میں بٹھا لیا گیا تھا، جب یہ لوگ بھاگ رہے تھے تو مجھے جیپ سے نکلنے کا موقع مل گیا۔“

”یہ لوگ سجاول تک پہنچے کیسے؟“ میں نے جھلّا کر کہا۔ ”تم پانچ چھ بندے تھے یہاں، تم انہیں روک نہیں سکے؟“

”وہ لوگ بڑی پلاننگ کے ساتھ آئے ہیں۔ وہ سامنے والی سڑک پر ایک موٹر رکشا الٹ گیا۔ اس میں سواریاں تھیں۔ وہ زخمی ہو گئیں۔ ایک دو منٹ کے لیے سب کی توجہ اس طرف چلی گئی۔ اسی دوران میں یہ لوگ اندر گھس گئے۔ لگتا ہے کہ اس رکشا کو بھی جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی تھی۔“

”تم بھی تماشا دیکھنے والوں میں شامل تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس، ایک آدھ منٹ کی غلطی مجھ سے بھی ہوئی۔ میری جگہ شاید کوئی بھی ہوتا، اس سے غلطی ہو جاتی۔“ باقر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ اس نے اپنی کنپٹی کے خون اگلتے زخم پر ایک کپڑا رکھ کر دبایا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے پکڑا انہوں نے؟“

میں ان بڑی بڑی جیپوں کو دیکھ کر ان کی طرف گیا تو کسی نے پیچھے سے آ کر میرے سر پر چوٹ لگائی۔ میں گر گیا۔ دو بندوں نے مجھے گھسیٹ کر جیپ میں ڈال لیا۔ وہاں یونس پہلے سے پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر پستول رکھا ہوا تھا اور اس کے منہ پر سلور کلر کی ٹیپ لگائی جا رہی تھی۔“

”کتنے بندے تھے جیپ میں؟“

”مجھے تو تین ہی نظر آئے۔ ان میں سے ایک پاکستانی تھا، باقی دو، باہر کے لگتے تھے، کوئی دوسری زبان بول رہے تھے۔“

سجاول کے جو دو ساتھی کمرے کے اندر مارے گئے تھے انہیں بے دردی سے [illegible]

”کیا اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شاید نہیں لیکن آپ زخم کی مرہم پٹی ابھی کرا لیں۔“ میں نے وہیں کھڑے کھڑے فخر کو فون کیا۔ پہلی ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کی۔

”کہاں ہو فخر؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم اسپتال پہنچ گئے ہیں۔ ڈاکٹرز، زخمی کو دیکھ رہے ہیں۔ شاید اس کے لیے خون وغیرہ کی ضرورت پڑے۔“

”اس کی جان بچنی چاہیے فخری، جو بھی ہو سکے کرو۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ اس کے باوجود میں نے داؤد بھاؤ کو فون کیا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو کون؟“ اس کی اونگھتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

”شاہ زیب بول رہا ہوں بھاؤ، آپ سے کہا تھا ناں کہ انیق کی طرح سجاول کی زندگی کو بھی خطرہ ہے۔ جب یہ ہاناوانی یہاں ہے تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ بھاؤ نے چونک کر پوچھا۔

”سجاول سیالکوٹی پر حملہ ہوا ہے۔ اس کے دو بندے مارے گئے ہیں۔ دو تین زخمی ہوئے ہیں۔ ایک کو اغوا کر کے لے گئے ہیں ہاناوانی کے لوگ۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں سے بات کر رہے ہو تم؟“

”ایک قریبی قصبے سے۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ سجاول طیش سے بھرا ہوا ہے اور ہاناوانی سے دو دو ہاتھ کرنے گوٹھ موراناں کی طرف آ رہا ہے لیکن مجھے خطرہ تھا کہ کہیں آپ میں اور اس میں ٹکر نہ ہو جائے۔ میں نے اسے اس قصبے ”بھوگلا“ میں ہی رکوا دیا لیکن یہ بدبخت ہاناوانی پتا نہیں کیسے وہاں جا پہنچی۔ کافی مارا ماری ہوئی ہے یہاں کے ہوٹل میں۔ سجاول بھی زخمی ہے۔“

”تم نے ہاناوانی کو خود دیکھا ہے وہاں؟“ بھاؤ نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

”جی ہاں، خود دیکھا ہے ... اور فرار ہوتے بھی دیکھا ہے۔ اب آپ کو اس نے فون کیا ہے کہ آپ اپنے [illegible]

[illegible] بھاؤ! میرا خیال

ہے کہ پولیس پہنچ گئی ہے، مجھے تھوڑی دیر کے لیے دائیں بائیں ہونا پڑے گا۔" اس کے بعد میں نے بھاؤ کو جلدی جلدی دونوں جیپوں کے رنگ اور ماڈل وغیرہ بتا کر فون بند کر دیا۔

میں نے نیم بے ہوش سجاول پر ایک نگاہ ڈالی، پھر میں اور فخر اس ہوٹل سے کھسک گئے۔ (فخر کو بھی پولیس سے مڈھ بھیڑ کا اندیشہ تھا اس لیے وہ زخمی ملائیشین کو کوالیفائڈ ڈاکٹرز کے سپرد کر کے واپس آ گیا تھا) یہ تو یقینی بات تھی کہ اب ہاناوانی واپس گوٹھ موراناں کا رخ نہیں کرے گی لیکن ابھی داؤد بھاؤ وہیں موجود تھا اور یہ بات اب یقینی ہو چکی تھی کہ ہاناوانی ہر اس شخص کو مارنا چاہتی ہے جس کا کسی طرح بھی میرے اور سجاول کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کسی کو بھی ہاتھ لگائے بغیر ان سب کی جان لے گی۔ وہ انیق کو مار چکی تھی اور یونس کو اپنے ساتھ لے جا چکی تھی۔ ابھی پتا نہیں کہ کون کون اس کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ اس حساب سے تو فخر، پہلوان حشمت، رضوان ٹی اور تاجور کو بھی خطرات لاحق ہو سکتے تھے اور ان کے علاوہ بھی کئی لوگ اس گھیرے میں آ سکتے تھے۔

ہماری مہران کار تو اب چلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ہم نے منہ مانگے کرائے پر ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور اسے گوٹھ موراناں جانے پر راضی کر لیا۔ اب رات کے قریباً چار بج چکے تھے۔ اس مضافاتی علاقے کی چھوٹی سڑکیں بالکل خالی تھیں۔ بس کسی وقت کوئی موٹر بائیک یا ٹریکٹر ٹرالی دکھائی دے جاتی تھی۔ سجاول ابھی تو ہوش میں نہیں تھا لیکن وہاں موجود باقر سارے معاملات سنبھال سکتا تھا۔ سجاول نے بھی جلد ہوش میں آ جانا تھا اور پھر "ہیوی ویٹ بااثر لوگوں" سے اپنے تعلقات کی بنا پر وہ اس سارے بکھیڑے سے خود کو مکھن کے بال کی طرح نکال سکتا تھا۔ فی الوقت ہم یہی سوچ رہے تھے کہ ہاناوانی یوں آناً فاناً سجاول اور یونس وغیرہ تک کیسے پہنچ گئی؟ وہ غیر معمولی صلاحیتوں والی ہپناٹسٹ ضرور تھی مگر کوئی غیب دان نہیں تھی، اور نہ ہی مجھے ایسی باتوں پر بھروسا تھا، اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ جب سجاول ٹنڈ بگڑے کی طرح اس علاقے میں داخل ہوا تو ہاناوانی کے ساتھیوں میں سے ہی کسی نے اسے یا اس کی گاڑی کو پہچانا اور اسے ٹریس کر لیا۔ اسی سوچ بچار کے دوران میرا دھیان اپنے ننھے کیمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ لکڑی کے ٹکڑے سمیت میری جیب میں تھا۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا۔ اس کا چھوٹا سا لینس دھندلایا ہوا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کیمرا بھی DAMAGE ہوا ہے۔ میں نے اسے اپنے موبائل کے ساتھ کونیکٹ کر کے چیک کیا تو یہ اندیشہ درست نکلا۔ وہ کام نہیں کر رہا تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ اس جدید ترین کیمرے کی ریپئرنگ آسان کام نہیں تھا۔

ہم جس وقت گوٹھ موراناں کے قریب پہنچے دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ کھیت کھلیان اور درخت پودے سب جیسے صبح کی آمد کو محسوس کر رہے تھے، پتوں پر شبنم چمک رہی تھی اور راستوں کی مٹی بھی نم تھی۔ دور ہی سے گوٹھ موراناں کی مسجد کا مینار اور چند اونچے گھر دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک فخر نے ٹھٹک کر ایک طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو۔"

میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور چونک گیا۔ وہ قوی ہیکل داؤد بھاؤ تھا۔ سر پر رومال باندھے وہ گوٹھ کے قبرستان میں سے باہر نکل رہا تھا۔ یقیناً انیق کی قبر سے ہو کر آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں اس کا مسلح شوٹر چل رہا تھا لیکن یقینی طور پر یہ اکیلا شوٹر یہاں نہیں تھا۔ آس پاس دو چار اور مسلح افراد بھی موجود تھے اور ایسے لوگ ہمہ وقت بھاؤ کے اردگرد موجود رہتے تھے۔

عجیب منظر تھا۔ ایک بدنام زمانہ گینگسٹر، ایک خطرناک جرائم پیشہ، جو ہر وقت جان لینے اور جان دینے کے لیے تیار رہتا تھا جس کے ایک اشارے پر اس کے خونخوار ساتھی انسانی جسموں کو گولیوں سے چھلنی کر دیتے تھے..... سر جھکائے، سر پر رومال باندھے، دل گرفتہ حالت میں قبرستان سے باہر آ رہا تھا۔

میں اور فخر ٹیکسی سے اتر آئے۔ ڈرائیور کو کرایہ دے کر ہم بھاؤ کے پاس پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور بھاؤ اسی لگژری اسٹیشن وین میں بیٹھے تھے جہاں کل میری اور بھاؤ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ فخر کو میں نے انیق کے گھر بھیج دیا تھا۔

بھاؤ کی آنکھیں ورم زدہ تھیں اور چہرے پر دکھ کی گہری پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ انیق کے دکھ کو ہم دونوں نے ایک ہی شدت سے محسوس کیا تھا لیکن انیق کی ناگہانی موت کے حوالے سے ہم دونوں کے خیالات مختلف تھے۔

بھاؤ نے عجیب لہجے میں کہا۔ "شاہ زیب! میں نے زندگی میں بہت کم قسم کھائی ہے، لیکن آج کھائی ہے کہ میں انیق کی موت کے ذمے داروں کو بری موت ماروں گا۔"

"میرا بھی یہ ارادہ ہے، آپ سے مختلف نہیں ہے۔"

"لیکن ہمارے مجرم شاید مختلف ہیں۔" داؤد بھاؤ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے روکھے پن سے کہا۔ اس کا لہجہ میرے سینے پر جیسے زوردار گھونسے کی طرح لگا۔

میں نے داؤد کے بالوں بھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھاؤ! ہمارا مجرم ایک ہی ہے اور میں ثابت کروں گا کہ وہ کون ہے۔''

''تمہارے نزدیک وہ رائے زل کی ماں ہاناوانی ہے جو اچھے بھلے بندے کو اپنے جادو سے دیوانہ کر دیتی ہے اور اس نے ہمارے انیق کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔'' داؤد کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

''بدقسمتی سے ایسا ہوا ہے داؤد بھاؤ۔''

داؤد بھاؤ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر سے ہٹایا اور اپنی دکھ سے بھری آنکھیں میرے چہرے پر جما کر بولا۔ ''شاہ زیب! سچ کہتا ہوں تمہارے زندہ ہونے کی جو خوشی مجھے ہوئی ہے، وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ خوشی بُری طرح گہنائی ہوئی ہے۔ اسے انیق کی موت نے گہنایا ہے۔ میری بات کا برا نہ ماننا، جب تم ہاناوانی کی بات کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے بے وقوف بنا رہے ہو، ہپناٹزم، مسمریزم، ٹیلی پیتھی وغیرہ کے بارے میں، میں بھی ضروری انفارمیشن رکھتا ہوں، آج کل ہمارے ملک میں اور باہر کے ملکوں میں ہپناٹزم کی پریکٹس کس طرح ہو رہی ہے اور اسے کس طرح علاج معالجے میں استعمال کیا جا رہا ہے، اس کے بارے میں بھی مجھے پتا ہے، لیکن جو بات تم کر رہے ہو یہ تو خالص فلمی اور داستانی انداز کی ہے...... اس حرام زادی کھوسٹ نے اپنی آنکھوں کے زور پر انیق کو اپنا تابع کیا اور وہ ہفتوں اور مہینوں کے لیے اپنے دوستوں اور اپنے پیاروں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یہ باتیں سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔''

''یہ باتیں میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھیں داؤد بھاؤ...... جاماجی میں کافی عرصے تک میں اسے زبانی جمع خرچ سمجھتا رہا، یہاں تک کہ ایک موقع پر اس انوکھی عورت سے میری ایک تکلیف دہ ملاقات ہو گئی۔ یہ عام عورت نہیں ہے داؤد بھاؤ۔ نہ عام HYPNOTIST ہے۔ اگر آپ پوری تفصیل تک جائیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ کس طرح براہِ راست اور فون کے ذریعے مستقل طور پر انیق سے چمٹی ہوئی تھی...... آپ نے......''

''میری بات سنو شاہ زیب۔'' داؤد نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''جو بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تم اسے زبردستی میرے دماغ میں ٹھونس نہیں سکتے اور میرے خیال میں یہ بات بے شمار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔''

''بھاؤ! آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں، میں آپ کو......''

''پلیز شٹ اَپ۔'' بھاؤ نے پھر تیوری چڑھا کر میری بات کاٹی۔ ''تم اس طرح کی باتیں کر کے صرف اپنی ذہنی کمزوری کا اظہار کر رہے ہو، جو کچھ ہوا ہے وہ بالکل کلیئر ہے، یہ بات جاماجی میں ہی اوپن ہو گئی تھی کہ انیق اور اس ڈکیت میں چپقلش چل رہی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے۔ وہاں اس شخص نے انیق کو جان سے مارنے کی کوشش بھی کی، اور یہ بات اُس وقت کسی اور نے نہیں تم نے ہی مجھے بتائی تھی۔ ہمارا انیق اسی دشمنی کی بھینٹ چڑھا ہے۔''

''آپ ایک بات سوچیں بھاؤ، اگر انیق نارمل تھا تو پھر وہ آپ سے بھی دور کیوں ہو گیا تھا۔ کیوں اس نے عرصے تک آپ سے بھی رابطہ نہیں کیا......''

''یہ...... یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ جب کسی سے اس کی ذاتی رنجش چل پڑتی تھی تو پھر ہم کو اس میں ''انوالو'' نہیں کرتا تھا۔ اپنا معاملہ خود نمٹانے کی کوشش کرتا تھا۔''

''میرے پاس مکمل ثبوت ہیں بھاؤ۔ اور ایک ثبوت تو بالکل تازہ ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس عورت نے سجاول پر ہلّا بولا ہے۔ اس نے اسے باقاعدہ بے بس کر کے اپنے ٹرانس میں لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ سجاول کی بیوی کو اور آپ کو بھی سجاول کے ذریعے جانی نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ میرے پاس اس سارے منظر کی وڈیو ریکارڈنگ موجود ہے۔''

''کہاں ہے ریکارڈنگ؟'' بھاؤ ہر طرح کی بحث پر آمادہ نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میرے پاس چھوٹا اسپائی کیمرا ہے، اس میں وہ مناظر محفوظ ہیں مگر ابھی کیمرے میں کچھ فالٹ آ رہا ہے۔ آپ یقین رکھو داؤد بھاؤ میں آپ کو سب کچھ دکھا دوں گا بلکہ آپ کو انیق کے بارے میں بھی کچھ چیزیں دکھاؤں گا۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ وہ یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کر رہا تھا۔''

''اچھا، جب تم کوئی ثبوت دو گے تو پھر دیکھیں گے۔'' داؤد بھاؤ نے بیزاری سے ہاتھ لہرا کر کہا۔ وہ اب یہاں سے اٹھنا چاہ رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بھاؤ! میری صرف ایک بات مان لیں۔ کسی کے خلاف کچھ بھی کرنے سے پہلے مجھے صرف...... صرف پانچ چھ دن کی مہلت دیں۔

اگر میں آپ کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو آپ اپنی مرضی کرنے میں آزاد ہوں گے۔“

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے نوجوان ”دستِ راست“ کی موت کا غم کسی جوت کی طرح روشن تھا۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی بہت سخت بات کہنے جا رہا ہے لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور وہ بات کہی نہیں۔ شاید میرے ”مر کر پھر زندہ ہونے“ کی جو تہلکہ خیز خبر اُسے ملی تھی اس نے اس کے پتھر یلے دل میں میرے لیے کچھ نرمی پیدا کر رکھی تھی۔

اسی دوران میں داؤد بھاؤ کے بیش قیمت سیل فون پر ایک کال آگئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا اور ”ہوں، ہاں“ میں جواب دیتا رہا۔ آخر میں بولا۔ ”ٹھیک ہے لیکن...... ابھی تم واپس آجاؤ...... بعد میں بات کریں گے۔“

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ مبہم گفتگو کسی نہ کسی طور سجاول اور زرق خاں وغیرہ کے حوالے سے ہی تھی۔ میں نے موضوع بدلنے کے لیے داؤد بھاؤ سے پوچھا کہ کیا اس نے ہاناوانی کو ٹریس کرنے کے لیے کچھ کیا ہے۔ اس نے میرے سوال کا جواب ڈھیلے ڈھالے انداز میں دیا اور کہا کہ اس نے دو بندوں کی ڈیوٹی اس کام پر لگائی ہے۔ اس کے مقامی زمیندار دوست کا ایک بندہ بھی تلاش میں شریک ہے۔

میرے اور داؤد بھاؤ کے درمیان اس لگژری وین میں ہونے والی نشست بوجھل انداز میں ختم ہوئی اور میں انیق کے گھر چلا گیا۔ ابھی جوان موت کا غم تازہ تھا۔ درو دیوار سوگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے اندر سے خواتین کی سسکیاں بھی سنائی دیتی تھیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں اور فخر بھی اہلِ خانہ کے پاس بیٹھے رہے اور انہیں اس غم میں اپنی شرکت کا احساس دلاتے رہے۔ انیق کی پھپھو کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ انہوں نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پتا ہے، میرے انیق پر کسی نے کچھ کر دیا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہوش حواس میں ہی نہیں لگتا تھا۔ کسی نے بڑا سخت عمل کیا ہوا تھا اُس پر۔ بی بی صاحب بھی یہی کہتی تھیں کہ اسے بہت زیادہ علاج کی ضرورت ہے مگر وہ کسی کی سنتا ہی کب تھا......“

میں اس سادہ لوح عورت کو کیسے بتاتا کہ وہ جس سے انیق کا ”علاج“ کرانا چاہتی تھی وہی تو اس کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ وہ ایک خونخوار ڈائن تھی جو اپنے سینے میں انتقام کے شعلے سمیٹے، ہزاروں میل کا فاصلہ سمیٹ کر یہاں پہنچی تھی...... اور اب بھی یہیں کہیں تھی۔

اہلِ خانہ انیق کی چھوٹی چھوٹی یادیں تازہ کر کے آنسو بہا رہے تھے۔ ہم نے اس خوبرو لڑکی کی فریم شدہ تصویر بھی دیکھی جو کبھی انیق کی منگیتر تھی اور جس کو پیش آنے والے ایک حادثے نے انیق کی زندگی کا رخ بدلا تھا۔ میں اس گھر میں اور ان لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس وقت نہیں تھا۔ ہاناوانی ایک قاتل آسیب کی طرح ان فضاؤں میں چکرا رہی تھی۔

اسی دوران میں میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ رضوان ٹی تھا۔ میں نے رضوان کو مولانا حبیب اللہ کے آس پاس رکھا ہوا تھا تا کہ وہ ان کی صحت و سلامتی کی طرف سے پوری طرح باخبر رہے۔ وہ جنازے میں شرکت کے بعد لاہور واپس چلا گیا تھا۔ رضوان کی اس بے وقت کال پر مجھے تشویش ہوئی۔ کہیں مولانا حبیب اللہ کا کوئی مسئلہ تو نہیں تھا۔ کال ریسیو کرتا ہوا میں باہر نکل گیا۔ ”مولوی جی تو خیریت سے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی شاہ زیب بھائی۔ وہ خیریت سے ہیں مگر ایک اور تکلیف دہ خبر ہے...... تاجور صاحبہ کے والد دین محمد صاحب کے بارے میں۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”وہ بہت زیادہ پریشان ہو رہے ہیں اپنے داماد کے ہاتھوں......“

رضوان سے بات کرتا ہوا میں کھلی جگہ پر نکل آیا تھا۔ یہاں دور تک کھیت تھے اور درختوں کے سلسلے تھے۔ رضوان نے کہا۔ ”جیسا کہ آپ کو بھی پتا ہے تاجور اور ان کے میاں میں تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ پہلے بھی ایک دو بار تاجور صاحبہ اپنے میکے جا چکی ہیں اور کچھ دن وہاں گزار کر آئی ہیں۔ اب بھی قریباً دو ہفتے سے وہ سکھیرا گاؤں میں تھیں...... کل رات دارج دار اب انہیں لینے کے لیے سکھیرا پہنچا اور زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ بات میڈیا تک پہنچی ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ دارج کے آدمیوں نے دین محمد صاحب کو دھکے بھی مارے ہیں۔“

”لیکن وہ تو بستر پر پڑا ہوا ہے۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بستر پر تو ہے مگر جہاں جانا ہوتا ہے وہاں پہنچ بھی جاتا ہے۔ ایسا انتظام ہے کہ اس کی وہیل چیئر اس کی ہائی روف جیپ کے اندر ہی چلی جاتی ہے لیکن کل رات وہ جیپ

کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ اس کی بڑی بہن اور دو ملازمائیں دین محمد صاحب کے گھر گئیں۔ بڑی بہن پہلے نرمی سے تاجور صاحبہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن جب بات نہیں بنی تو دارج طیش میں آگیا۔ اس کے کارندے اسے وہیل چیئر سمیت دین محمد صاحب کے گھر کے اندر لے گئے۔ دارج نے تاجور صاحبہ کی کلائی پکڑلی اور انہیں اپنے کارندوں کی مدد سے کھینچتا ہوا گاڑی میں لے آیا۔ اس موقع پر اس نے اور اس کے کارندوں نے دین محمد صاحب کو دھکے بھی دیے۔ دارج نے کہا کہ وہ اپنی منکوحہ بیوی کو لے کر جارہا ہے اور لے جاسکتا ہے۔"

میرے سینے میں پھر ایک انگارا سا دہکنے لگا۔ یہ دین محمد صاحب ہی تھے جنہوں نے اس رشتے کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبایا تھا اور اپنی ضد پوری کر کے رہے تھے۔ اب چند ماہ میں ہی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی بچی سمیت دارج داراب کے جبر اور قہر کا شکار ہو رہے تھے۔ ایک طاقتور شخص کی طرف سے تاجور کو اس کی سادگی، کمزوری اور شاید خوب صورتی کی سزا دی جارہی تھی۔

میں تاجور اور اس کے حالات کی طرف سے اپنا منہ موڑ لینا چاہتا تھا مگر حالات بار بار مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ میرے دل نے جیسے پکار کر مجھ سے ایک سوال کیا۔ "شاہ زیب اگر تمہاری زندگی کی سب سے محبوب ہستی کے ساتھ زبردستی ہو رہی ہے۔ اسے ذہنی اور جسمانی اذیت سے گزارا جارہا ہے تو کیا، تم پھر بھی ایک خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہو گے؟"

مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنے آپ کو بہ زبان خاموشی سمجھایا۔ "جس کے ساتھ زبردستی ہو رہی ہے، وہ خاموش ہے اور اس کو زبردستی سمجھتی ہی نہیں ہے تو پھر تمہاری ہر کوشش مداخلتِ بے جا ہی کہلائے گی۔ شاید یہ بھی کہا جائے کہ تاجور کے حالات اور اس کا گھر خراب کرنے میں تمہارا ابھی عمل دخل ہے۔ لہٰذا جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ہونے دو۔ بس اس کے لیے دعا کرو اور اس کی سلامتی چاہو۔"

دل نے کہا۔ "لیکن وہ کمزور لوگ ہیں۔ دین محمد اور ان کی بیوی اگر چاہیں بھی تو تاجور کو اس شکاری کے پنجوں سے نہیں چھڑا سکتے۔ کیا ایک عام شخص کی حیثیت سے بھی تم ان لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے۔"

رضوان کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔
"آپ کہاں گم ہو گئے جناب؟"

"اچھا رضوان! اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ تم بس مولوی جی کا خیال رکھو۔" میں نے کہا اور گفتگو ختم کر دی بلکہ فون بھی آف کر دیا۔

پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ تاجور کی ازدواجی زندگی اور اس کے دیگر حالات کے بارے میں کوئی خبر بھی میرے کانوں تک نہ پہنچے۔ سینے میں آگ سی دہکنے لگی تھی۔ میں نے صبح کی تازہ دیہاتی ہوا میں چند لمبی سانسیں لیں اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے ایک پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔

ہاناوانی کا چہرہ اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ پردۂ تصور پر نمودار ہو گیا۔ یوں لگا کہ وہ ابھی کسی جانب سے نمودار ہو گی اور اپنی تمام تر ہلاکت خیزی کے ساتھ میرے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔

ایک درخت کے نیچے دو دیہاتی بچے کھیلتے دکھائی دیے۔ ان کی عمریں چھ سات سال کے لگ بھگ ہوں گی۔ انہوں نے اسکول کی یونیفارم پہن رکھی تھیں اور کراٹے کے انداز میں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر شرما گئے اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "یہ کیا کھیل رہے تھے؟"

ایک بچہ بولا۔ "اس کو جوڈو کراٹے کہتے ہیں۔ آپ کو نہیں آتی؟"

"ہاں...... مجھے بھی تھوڑی تھوڑی آتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

ایک بچے کی شکل دیکھ کر پتا نہیں کیوں مجھے خورسنہ کا بچہ ذیشان یاد آگیا۔ بالکل اسی کی طرح گول مٹول تھا یہ بھی۔ اور پھر ایک دم میرے ذہن میں آندھی سی چل گئی۔ خورسنہ کے بچے کا خیال آتے ہی یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ خورسنہ اور اس کا بچہ لالہ موسیٰ کے کسی گھر میں ہیں۔ اس گھر کو سجاول نے اپنے خاص بندوں کی خفیہ نگرانی میں رکھا ہوا تھا لیکن اب ایک ایسا شخص ہاناوانی کے قبضے میں جا چکا تھا جو ساری سیکیورٹی کے باوجود سجاول کے گھر میں بہ آسانی داخل ہو سکتا تھا اور وہ تھا یونس...... یونس پمپ والا...... ایک دم میرے ذہن میں خطرے کی کئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ لالہ موسیٰ کے اس نامعلوم مکان میں خورسنہ اور اس کا بچہ شدید خطرے میں تھے۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دوڑ

تمکین رضا

کھیل اور کھلاڑی کسی کی زندگی کا محور ہوتے ہیں... ان کی زندگی کا لین دین... کھیل اور کھلاڑی سے وابستہ ہوتا ہے... ایسے ہی ماحول اور کرداروں سے سجی کہانی... جو آپ کی آنکھیں کھول دے گی... ایسی حقیقتوں کا انکشاف جو اَب تک پسِ نقاب تھیں، بے نقاب ہوگئیں... کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اگر کھیل تک محدود رہے تو دکھ و تکلیف جان لیوا نہیں ہوتے... مگر یہاں کامیابی اور ناکامی طے شدہ فیصلوں سے منسلک تھیں...

انتقام...... بدلے کی آگ سے بجھ جانے والے چراغوں کا المیہ......

ایک چھوٹا سا پتھر کھڑکی کے راستے کلاس روم میں آکر گرا۔ یہ پتھر افضل کی ڈیسک سے ٹکرا کر نیچے گرا تھا۔ اس کی آواز نے پوری کلاس کو چونکا دیا۔ بلیک بورڈ کی طرف متوجہ ماسٹر حمید کی پیشانی پر بَل پڑ گئے۔ ”کون ہے یہ بدتمیز؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”ماسٹر صاحب، یہ پتھر باہر سے آیا ہے جی۔“ ایک لڑکے نے بتایا۔ ”سلیم نے پھینکا ہوگا۔“

”تمہیں کیسے معلوم کہ سلیم نے پھینکا ہوگا؟“

”ماسٹر صاحب، وہ ایسا ہی کرتا ہے۔“ دوسرے لڑکے نے بتایا۔ ”جب اسے افضل کو بُلانا ہوتا ہے، وہ اسی طرح ایک پتھر پھینک دیتا ہے۔“

”تم سب جاؤ اور اسے پکڑ کر لاؤ۔“ ماسٹر حمید نے حکم دیا۔ ”وہ پتھر پھینک کر دور نہیں گیا ہوگا۔“

سب لڑکے شور مچاتے ہوئے کلاس روم سے باہر آگئے۔ انہیں سلیم کو پکڑنے کا ایک کام مل گیا تھا۔ سلیم باہر میدان میں درخت کے پاس ہی کھڑا تھا۔

اپنی طرف لڑکوں کو آتے دیکھ کر اس نے دوڑ لگا دی۔ دوسرے لڑکے اس کے تعاقب میں تھے۔

ماسٹر حمید کلاس میں ہی بیٹھا لڑکوں کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا لیکن اس کے ہونٹوں پر

ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔

کچھ دیر بعد لڑکے ہانپتے ہوئے واپس آ گئے تھے۔

''کیا ہوا پکڑا اس بدمعاش کو؟'' ماسٹر حمید نے پوچھا۔

''نہیں ماسٹر صاحب، وہ کہاں ہاتھ آتا ہے۔'' ایک لڑکے نے کہا۔ ''اس کے پیروں میں تو بجلی ہے۔ ہم تو اسے چھو بھی نہیں پاتے۔''

ماسٹر حمید کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ ''اچھا چلو، اپنا سبق یاد کرو۔'' اس نے کہا۔ ''معاشرتی علوم کی کتاب نکالو۔''

یہ اسکول ایک دور دراز کے قصبے کا اسکول تھا، وہ قصبے کا واحد اسکول تھا۔ اسکول کی عمارت کا رنگ و روغن خراب ہو چکا تھا۔ یہاں صرف آٹھویں تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے بعد جس کو پڑھنے کا شوق ہوتا، وہ شہر چلا جاتا۔

یہ اسکول ایک بڑے میدان میں تھا۔ اس میدان سے پرے دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اسکول کے قریب نیم، ٹاہلی اور املی کے اونچے اونچے درخت تھے۔ ان درختوں سے ہوائیں ٹکرا ٹکرا کر اسکول کی کھڑکیوں کے ذریعے کلاس روم میں آیا کرتی تھیں اور لکڑی کی کھڑکیاں تیز ہوا میں دھڑ دھڑ کیا کرتیں۔

اسکول کا ایک لمبا سا برآمدہ بھی تھا۔ اس برآمدے کے دونوں سروں پر اونچی اونچی گھڑونچیاں رکھی تھیں جن میں پینے کا پانی ہوتا اور ساتھ ہی پلاسٹک کے کئی گلاس بھی ہوتے۔

قصبے سے باہر مستان بابا کا مزار تھا۔ جہاں ہر سال ان کا عرس ہوتا اور بڑے شہروں سے قوال بلائے جاتے۔ دو دنوں تک خوب رونق رہتی تھی۔

چھوٹے علاقوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس قصبے کے لوگ بھی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

پھر اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا امتیاز علی۔ جس کی عزت کی جاتی اور ماسٹر حمید تھا۔ جو بچوں کو علم کی روشنی دیا کرتا۔ ان کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ تھے۔

قصبے میں عشق اور محبت کی داستانیں زیادہ عام نہیں تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہا کرتے۔

البتہ کچھ عرصہ پہلے ایک داستان بہت مشہور ہوئی تھی۔ ایک کسان کی بیٹی تھی زبیدہ۔ بہت خوب صورت اور دوسرا کمالے تھا۔ نائی کا بیٹا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے بہت محبت کی۔ لیکن کسی وجہ سے کسان اور نائی کے درمیان سخت رنجش ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبیدہ اور کمالے کی شادی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ پھر دونوں ایک دن قصبے سے بھاگ گئے۔

انہوں نے کسی بڑے شہر میں جا کر شادی کر لی تھی۔

کسان اور نائی دونوں نے اپنی اولاد کو عاق کر دیا۔ یہ پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس واقعے کے بعد قصبے میں کوئی اور کہانی نہیں سنی گئی۔

سب سے دلچسپ کہانی خود ماسٹر حمید ہی کی تھی۔ وہ ایک ایتھلیٹ تھا۔ اس نے اپنے اسکول سے دوڑ کے مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ پہلے پورے اسکول کا چیمپئن بنا، پھر پورے قصبے کا چیمپئن بن گیا۔

اس کے بدن میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ گرچہ اس نے کسی قسم کی ٹریننگ وغیرہ نہیں لی تھی۔ اس کے باوجود اس کے دوڑ کا انداز ورلڈ کلاس کھلاڑی جیسا تھا۔

خیال کیا جاتا تھا کہ وہ آگے چل کر شاید اولمپک میں بھی حصہ لے لیکن ایک حادثے نے اسے زخمی کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اس کی ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اب وہ بیساکھی پر چلا کرتا تھا۔

اس نے انٹر تک تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ اسی لیے اسے قصبے کے سرکاری اسکول میں نوکری مل گئی۔ اس وقت سے وہ اسی اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔

اس نے بھی عشق کیا تھا۔ لیکن یہ بہت سیدھا سادہ عشق تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ والدین سے بات ہوئی اور شادی ہوگئی۔

حمیدہ کا تعلق بھی اسی قصبے سے تھا۔ وہ ایک دکاندار کی بیٹی تھی۔

قصبے کے بچوں کے کھیل بھی سیدھے سادے تھے۔ کھوہ کھوہ، گلی ڈنڈا اور پتنگ بازی۔ ہاں وہاں ایک ایسی دکان بھی تھی جس میں پتنگ بازی کا سامان ملا کرتا تھا۔ رنگ برنگی پتنگیں اور مانجھے۔ بچے شام کے وقت پتنگیں اڑایا کرتے۔

یہ تھی قصبے کی سیدھی سادی زندگی۔ اس سیدھی سادی زندگی کی کہانی اس دن سے شروع ہوئی جب سلیم کلاس روم میں پتھر پھینک کر بھاگا تھا اور لڑکے اسے پکڑنے میں ناکام رہے تھے۔

ماسٹر حمید اسکول میں چھٹی کے بعد اپنے دوست فضلو کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔

میکسیکو ہیئر کٹنگ اسی فضلو کی تھی۔ دوپہر کے بعد اور بھی لوگ اسی دکان میں آ کر بیٹھ جاتے اور بہت دیر تک گپ شپ ہوا کرتی۔

لیکن اس دن ماسٹر حمید اپنی بیساکھی پر کھٹ کھٹ کرتا ہوا فضلو کی دکان کے سامنے سے گزر گیا۔ اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ اس نے دکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں کی طرف دیکھ کر صرف ہاتھ ہلا دیا تھا۔

اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے زوردار دستک

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دی۔ دروازہ کھولنے والی اس کی بیوی حمیدہ تھی۔ وہ ماسٹر حمید کو جلدی گھر آتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ''خیریت تو ہے ماسٹر جی، آج دوستوں کے ساتھ نہیں بیٹھے؟'' حمیدہ بھی اپنے شوہر کو ماسٹر جی ہی کہا کرتی تھی۔

''وہ نالائق کہاں ہے؟'' ماسٹر حمید نے غصے سے پوچھا۔

''وہ دوسرے کمرے میں ہے۔''

''اس کو بلاؤ۔ آج میں اس کی ہڈیاں برابر کردوں گا۔''

''آخر بات کیا ہوگئی۔ کیوں اتنے ناراض ہورہے ہو؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

''آج تمہارے لاڈلے نے اسکول میں ایسی شرارت کی کہ بس کچھ مت پوچھو۔ میں تو اسی وقت اس سے سمجھ لیتا لیکن وہ کسی کے ہاتھ ہی نہیں آیا۔'' یہ بتاتے ہوئے ماسٹر حمید ہولے سے مسکرا دیا۔

حمیدہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ماسٹر کا غصہ کم ہوگیا۔ اسی لیے اس نے آواز لگائی۔ ''اے پتر، ادھر آ۔ ماسٹر جی بلا رہے ہیں، جلدی آجا۔''

سلیم معصوم سی صورت بنائے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

''بول، تو نے کلاس روم میں پتھر کیوں پھینکا تھا؟'' ماسٹر جی نے پوچھا۔

''ابا، میں افضل کو اسی طرح بلاتا ہوں۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''بس آج پتھر میز سے ٹکرا کر نیچے گر گیا تھا۔''

ماسٹر حمید کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔

''اور میں نے جب لڑکے بھیجے تو پھر تو ان کے ہاتھ کیوں نہیں آیا؟''

''واہ ابا، ان کے ہاتھ کیسے آتا؟'' سلیم ترخ کر بولا۔ ''کوئی مجھے پکڑ ہی نہیں سکتا تھا۔''

ماسٹر حمید کو اپنے پرانے دن یاد آنے لگے۔ وہ بھی چیلنج کرکے دوڑتا اور کوئی اسے پکڑ نہیں پاتا تھا۔ ''ایک بات بتا، کیا تجھے دوڑنے کا بہت شوق ہے؟''

''ہاں ابا، کسی سے بھی مقابلہ کروالو۔ کوئی مجھے چھو بھی نہیں سکتا۔'' سلیم نے بتایا۔ ''میں ٹرک کے پیچھے دوڑ کر اس سے جیت جاتا ہوں۔''

ماسٹر حمید کے لیے یہ ایک دلچسپ انکشاف تھا۔ ''کس ٹرک کی بات کررہا ہے؟''

''وہی جو سبزیاں لے کر آتا ہے۔'' سلیم نے بتایا۔ ''وہ جو پرانا ٹیلا ہے نا۔ میں وہیں کھڑا رہتا ہوں اور جیسے ہی ٹرک اس طرف سے گزرنے لگتا ہے، میں اس کے پیچھے دوڑ لگا دیتا ہوں۔''

ماسٹر حمید اپنے بیٹے سلیم میں اپنی جھلک دیکھ رہا تھا۔ وہی تیور، وہی انداز۔ ''اچھا، تو اپنا یہ کھیل مجھے دکھا سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں ابا۔ کل صبح ہی دکھا دوں گا۔'' سلیم اس بات سے پرجوش ہورہا تھا کہ اس کے باپ نے اس کے کھیل میں دلچسپی لی تھی۔

''چل، کل صبح تیرا یہ کھیل بھی دیکھ لیں گے۔'' ماسٹر حمید نے کہا۔ ''لیکن یاد رکھ اگر تو نے اس چکر میں پڑھنے لکھنے سے بے پروائی کی تو ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں گا۔''

''رہنے دو ابا۔ کھیل اپنی جگہ پڑھائی اپنی جگہ۔ میں ہمیشہ فرسٹ بھی تو آتا ہوں۔''

ماسٹر حمید کو اس بات کا بھی اعتراف تھا کہ سلیم لکھنے پڑھنے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔

دوسری صبح دونوں باپ بیٹے پرانے ٹیلے کے پاس پہنچ گئے۔ ماسٹر حمید نے اسکول کہلا بھیجا تھا کہ وہ ذرا دیر سے آئے گا۔ ٹرک کی آمد دس بجے ہوا کرتی تھی۔

ٹرک کا ہارن دور ہی سے سنائی دے گیا۔ ''ہوشیار ابا، ٹرک آرہا ہے۔'' سلیم نے چیخ کر بتایا۔

ذرا سی دیر میں سبزیوں والا ٹرک دکھائی دے گیا۔ راستے کی ناہمواری کی وجہ سے اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ ایسی رفتار میں تھا جو کسی انسان کی رفتار سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

ٹیلے کا موڑ کاٹتا ہوا ٹرک جب سامنے سے گزرنے لگا تو سلیم نے کسی چیتے کی طرح جست لگائی اور اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔

ٹرک کا ڈرائیور اور اس کا معاون سلیم کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے سلیم کی حوصلہ افزائی کی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر آواز لگائی۔ ''شاباش پتر، شاباش۔''

سلیم کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ ماسٹر حمید حیرت اور فخر سے اپنے بیٹے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں اس کی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کے آنسو تھے۔

وہ بھی اپنی بیساکھی پر کھٹ کھٹ کرتا ہوا بازار کی طرف چل دیا۔ سبزیوں کی دکانوں پر سبزیوں کی بوریاں اتار کر ٹرک آگے کی طرف جاچکا تھا جبکہ سلیم ایک دکان کے سامنے کھڑا ہوا دکھائی دے گیا۔

سلیم اپنے ابا کو دیکھ کر دوڑتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ ماسٹر حمید نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ ''شاباش پتر، اب کل سے میں تیری ٹریننگ شروع کروں گا۔''

☆☆☆

کچھ لڑکے ریسنگ ٹریک پر سیٹی بجنے کے انتظار میں الرٹ تھے۔

دوڑ شروع ہونے والی تھی۔ یہ دوڑ شہر کے ایک گراؤنڈ میں ہو رہی تھی۔ یہ تین سو میٹر کی دوڑ تھی۔ گراؤنڈ چونکہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ اس لیے کئی راؤنڈ لینے پڑتے تھے۔

دوڑ کو دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ موجود تھے۔ ان میں تنویر اور فیاض بھی تھے۔ موٹے موٹے جسموں اور کرخت چہروں والے۔

یہ انسانوں کی دوڑ پر پیسے لگایا کرتے۔ گھڑ دوڑ سے ہٹ کر انہوں نے پیسے کمانے کا یہ نیا طریقہ سوچا تھا۔ ان دونوں کے ایتھلیٹ کلب تھے۔ ان میں دوڑنے والوں کو تربیت دی جاتی۔ انہیں دوڑنے کا ہنر بتایا جاتا اور تھوڑا، بہت ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا۔

دوڑنے والے پندرہ سولہ سال تک کی عمر کے بچے ہوا کرتے تھے۔ جن کے لیے یہی بہت ہوتا تھا کہ انہیں کلب میں دوڑنے کا موقع مل رہا ہے اور پیسے بھی مل رہے ہیں۔

یہ مقابلے دیکھنے کے لیے جو لوگ آتے، ان سے ٹکٹ لیے جاتے تھے۔ یہ سارا کام قانونی طور پر ہوتا تھا۔ دوڑ کے مقابلے کروانا، لڑکوں کو تربیت دینا، ان کے مقابلوں پر ٹکٹ لگانا، یہ سب قانونی تھا۔ غیر قانونی اس وقت ہوتا جب خفیہ طور پر ان دوڑنے والوں پر شرطیں لگائی جاتیں۔

اس قسم کی شرطیں لگانے والے شہر کے وہ جواری ہوتے جو پہلے گھڑ دوڑ میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اب انہیں بچوں کی دوڑ کا نیا تماشا دیکھنے کو ملتا تھا۔ گھوڑوں کی جگہ اب بچوں پر شرطیں ہوتیں۔

تنویر اور فیاض دونوں کے کلب سے تین تین بچے دوڑ میں حصہ لیا کرتے۔ تنویر کے کلب کے بچوں کی جرسی اور نیکر نیلے رنگ کی ہوا کرتی اور فیاض کے کلب کے بچے گہرے زرد رنگ کی جرسی پہنا کرتے۔

ان پر لگنے والی شرط لاکھوں میں ہوتی تھی۔

لیکن یہ سارا کام بہت خفیہ طور پر ہوتا۔ شرط لگانے والے ان دونوں سے رابطہ کرتے اور اپنے اپنے کھلاڑیوں کے نمبر بتا دیتے۔

ہارنے والے کلب کے پیسے جیتنے والے کلب کو چلے جاتے تھے۔ اس طرح بظاہر بے ضرر سا نظر آنے والا یہ کھیل لاکھوں میں پہنچ جاتا تھا۔

بہت ہی ایمانداری کے ساتھ شرط لگا کر جیتنے والوں میں رقم تقسیم کر دی جاتی تھی جبکہ جیتنے والے کلب کا مالک اپنا کمیشن الگ سے رکھ لیتا تھا۔ یہ کمیشن بھی لاکھوں میں پہنچ جاتا تھا۔

آج کی اس دوڑ میں تنویر کے کلب کے نمبر دو پر بہت پیسے لگائے گئے تھے۔ تنویر کو یقین تھا کہ آج وہ یقیناً فیاض کے کلب کے نمبر تین کو شکست دے دے گا۔

فیاض، تنویر کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ ''کیا سوچ رہے ہو مسٹر تنویر؟''

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آج جب تمہارا تین نمبر ہارے گا تو تمہارا چہرہ دیکھنے والا ہوگا۔'' تنویر نے کہا۔

فیاض ہنس پڑا۔ ''کیوں ایسے خواب دیکھ رہے ہو۔ میرا تین نمبر پچھلے چھ مہینوں سے تمہارے کلب کو ہراتا چلا آ رہا ہے۔''

''لیکن اس بار ایسا نہیں ہونے والا۔ میں نے اپنے کھلاڑی پر بہت محنت کی ہے۔ ملک کے مایۂ ناز کوچ سے ٹریننگ دلوائی ہے تم دیکھ لینا، تمہارا تین نمبر اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکے گا۔''

''چلو دیکھ لیتے ہیں۔'' فیاض بے پروائی سے بولا۔ ''دوڑ شروع ہونے والی ہے۔''

اور سیٹی کے ساتھ دوڑ شروع ہو گئی۔ تیز، اور تیز۔ نیلی اور زرد جرسیاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔

دیکھنے والوں کے پیسے لگے ہوئے تھے۔ لاکھوں کا گیم تھا۔ تیسرا چکر فیاض کا کھلاڑی بچہ جو ابھی تک دوسرے یا تیسرے نمبر پر تھا، اس نے اچانک اپنی رفتار تیز کر دی۔ تیز اور تیز۔ اور تیز۔ اور وہ سب سے آگے نکل گیا۔ وہ جیت چکا تھا۔ تنویر کے کلب کو ایک بار پھر شکست ہوئی تھی۔

تنویر کے کھلاڑی نے دوسری پوزیشن حاصل کی تھی لیکن ایسے گیم میں دوسرے یا تیسرے کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ پیسے لگانے والوں نے پہلے کے لیے پیسے لگائے تھے۔ ایک بار پھر اسے لاکھوں کا نقصان ہو گیا تھا۔

فیاض اپنے جیتنے والے بچے کے گلے میں ہار ڈال کر اسے شاباش دے رہا تھا۔ اس نے سامنے کھڑے ہوئے تنویر کی طرف دیکھ کر شرارت سے کہا۔ ''مسٹر تنویر! کیا میرے کھلاڑی کو مبارکباد نہیں دو گے؟''

تنویر برا سا منہ بنا کر ایک طرف بڑھ گیا۔ اس نے لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں سنیں۔ وہ سب اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

اپنے آفس پہنچ کر اس نے ٹریننگ دینے والے کو بلا بھیجا۔ کوچ کچھ دیر بعد اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''جمالی صاحب! یہ آپ نے کیسی ٹریننگ دی ہے؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ ''مجھ کو تو اس سے بہت امیدیں تھیں

اور خود آپ نے بھی یقین دلایا تھا کہ اس کے سوا اور کوئی جیت ہی نہیں سکتا۔"

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں سر۔ آپ نے تو خود دیکھا ہوگا کہ میں نے اس کے لیے کتنی محنت کی ہے۔" کوچ نے کہا۔

"کیا فائدہ ایسی محنت کا۔" تنویر غصے سے بولا۔ "آج پھر میرا لاکھوں کا نقصان ہوا ہے۔"

"میں ٹریننگ اور سخت کر دوں گا سر۔" کوچ نے کہا۔ "خدا نے چاہا تو اگلی بار رزلٹ بہت اچھا ہوگا۔"

"جمالی صاحب، ہم کسی اور کو بھی تو ٹرائی کر سکتے ہیں؟"

"کر تو سکتے ہیں سر، لیکن فی الحال ہمارے گروپ میں اور ایسا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

"باہر سے ٹرائی کریں۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور ہوگا جو اس کم بخت کو نیچا دکھا سکے۔ تم نے دیکھا نہیں جیت جانے کے بعد اس کے کیا تیور تھے۔ وہ کس طرح میرا مذاق اڑا رہا تھا۔"

"یس سر، آپ مطمئن رہیں۔ میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

☆☆☆

ماسٹر حمید، سلیم کو سانسوں کی مشق کرا رہا تھا۔

"دیکھو بیٹے یہ سانسیں ہی سب کچھ ہوتی ہیں۔ اصلی توانائی سانسوں میں ہوتی ہے۔ پھیپھڑوں کو مضبوط بناتے جاؤ۔ تم ہی جیتو گے۔"

"ابا! ایک بات بتاؤ۔ یہاں تو میں سب کو ہراتا رہتا ہوں۔ اب اور کیا جیتنا۔"

"یہاں نہیں۔ تمہاری ٹریننگ مکمل ہو جائے تو پھر تمہیں اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا۔" ماسٹر حمید نے بتایا۔ "وہاں کھیلوں کے محکمے میں میری پرانی واقفیت ہے۔ تمہارے لیے وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیں گے۔"

"ٹھیک ہے ابا۔" سلیم خوش ہو گیا۔

"تو کل صبح سے بہت سویرے اٹھ کر ٹریننگ کرنی ہے۔" حمید نے کہا۔

"میں تیار ہوں ابا۔"

"اور ہاں، بازار کی چیزیں نہیں کھانی۔ ان سے اسٹیمنا ختم ہو جاتا ہے۔"

"یہ کیا ہوتا ہے ابا؟"

"طاقت، دوڑنے کی طاقت۔" حمید نے کہا۔ "چلو اب واپس چلتے ہیں۔ تیری اماں راستہ دیکھ رہی ہوگی۔"

دونوں میدان سے واپس آ گئے۔ یہ میدان پرانے ٹیلے کے پرلی طرف تھا۔ اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کھیت اور میدان کے بیچے ہی ایک بڑا سا چبوترہ تھا۔ نہ جانے کس نے اور کب کس موقع پر اس چبوترے کو بنوایا ہوگا۔ لیکن اب اس پر دنیا بھر کی گرد جمی رہتی تھی۔

ماسٹر حمید نے جھاڑو لا کر پہلے اس چبوترے کی صفائی کروائی تھی۔ اس کے بعد سلیم کو اسی چبوترے پر بیٹھا کر سانسوں کی مشقیں کروایا کرتا۔

دونوں باپ بیٹے گھر پہنچے تو حمیدہ نے ناشتا تیار کر رکھا تھا۔ مکھن، دودھ کی نمکین لسی اور پنیر گھر کی روٹیاں۔ سلیم کو طاقت کی جو ضرورت تھی۔

"ابا!" ناشتے کے دوران سلیم نے کہا۔ "آج میں اسکول نہیں آؤں گا۔"

"کیوں؟" ماسٹر حمید نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیوں نہیں آئے گا؟"

"ابا، آج بہت تھکا ہوا ہوں۔"

"خبردار، آئندہ ایسا کبھی مت کہنا۔ مجھے دیکھ، صبح تیری ٹریننگ کرتا ہوں پھر بچوں کو پڑھانے اسکول چلا جاتا ہوں۔ کیا تو مجھ سے بھی زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ بس میں نکل رہا ہوں تو ناشتا کر کے سیدھے اسکول آ جانا۔"

ماسٹر حمید جب اسکول پہنچا تو ہیڈ ماسٹر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ کمرا کیا ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس کو ہیڈ ماسٹر نے اپنے آفس کا مرتبہ دے رکھا تھا۔

"ماسٹر صاحب بیٹھ جائیں۔ میں نے غلام رسول سے کہہ دیا ہے۔ وہ اچھی سی چائے لا رہا ہوگا۔"

ماسٹر حمید اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

ہیڈ ماسٹر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد حمید کی طرف دیکھا۔ "ماسٹر صاحب! مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سے جو کچھ کہوں گا وہ آپ ہی تک رہے گا۔"

"جی فرمائیں۔"

"ماسٹر صاحب میں فرزانہ کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

ماسٹر حمید کو یاد آ گیا کہ فرزانہ کون ہو سکتی تھی۔ وہ گاؤں کی ایک لاوارث بچی تھی۔ جب وہ صرف پانچ برس کی تھی تو اس کے ماں باپ گاؤں کے ایک گہرے کنویں میں گر کر ہلاک ہو چکے تھے۔

پورے گاؤں میں اس کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس وقت ہیڈ ماسٹر صاحب سامنے آئے۔ انہوں نے

فرزانہ کو اپنے پاس رکھ لیا۔

اس وقت ان کی شادی کو چھ سات برس ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب جب فرزانہ کو اپنے گھر لے کر آئے تو ان کی بیوی کو بھی بہت خوشی ہوئی تھی۔

فرزانہ اس گھر میں پرورش پاتی رہی۔ پھر تین سال کے بعد خود ہیڈ ماسٹر صاحب کے یہاں بھی ایک اولاد ہو گئی۔ کچھ دنوں تک تو صحیح رہا۔ اس کے بعد بیوی کا رویہ فرزانہ سے خراب ہوتا چلا گیا۔

ماسٹر حمید کو یہ ساری کہانی معلوم تھی۔ اسی لیے جب ہیڈ ماسٹر نے فرزانہ کی طرف سے فکر کا اظہار کیا تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔

''جی ہاں ہیڈ ماسٹر صاحب، میں سمجھ رہا ہوں۔'' ماسٹر حمید نے کہا۔ ''کیا اب کوئی نئی بات ہو گئی ہے کیا؟''

''بدقسمتی سے میری بیوی کا رویہ اس یتیم اور بے سہارا لڑکی کی طرف سے بہت خراب ہو گیا ہے۔'' ہیڈ ماسٹر نے بتایا۔ ''میں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن عورت کی سمجھ ہی نہیں آتا۔''

''تو جناب، فرمائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' ماسٹر حمید نے پوچھا۔

''ماسٹر صاحب، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ فرزانہ کو اپنے پاس رکھ لیں۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

''کیا؟''

''جی ہاں، اب وہ دس برس کی ہو چکی ہے۔ ماشاء اللہ بہت ہوشیار اور ذہین بچی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اس کے اخراجات میں برداشت کرتا رہوں گا۔''

''جناب، آپ نے یہ اخراجات والی بات کر کے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔'' ماسٹر حمید نے کہا۔ ''فرزانہ تو بہت اچھی بچی ہے۔ میں خود اس سے پیار کرتا ہوں۔ آپ بے جھجک میرے پاس بھیج دیں۔ جو خدا توفیق دے گا اسی طرح اس کی پرورش کرتا رہوں گا۔''

''جزاک اللہ ماسٹر صاحب۔ آپ نے تو میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔ میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگا تھا۔''

☆☆☆

فرزانہ دوسرے دن ہی ماسٹر حمید کے گھر آ گئی تھی۔

ویسے بھی وہ اس گھر کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ کئی بار سلیم کے ساتھ کھیلنے کے لیے آ چکی تھی۔ ماسٹر حمید کی بیوی نے بھی بڑی خوش دلی سے کے ساتھ اسے قبول کیا تھا۔

''چلو ماسٹر صاحب، ہمارے گھر میں ایک لڑکی کی کمی تھی۔ اللہ نے وہ بھی بھیج دی۔''

سلیم بھی فرزانہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ فرزانہ اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور اب تو خود اس کے گھر میں رہنے کے لیے آ گئی تھی۔

فرزانہ دو تین دنوں تک اُداس اُداس رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اسے اپنے ماں باپ بھی یاد تھے۔ وہ پہلے ان کے ساتھ رہا کرتی۔ پھر وہ اس دنیا میں نہیں رہے تو وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر میں جا کر رہنے لگی۔

وہ تو بہت اچھے تھے۔ کیا نئے منے کے آنے کے بعد چاچی کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر فرزانہ سے مار پیٹ کرنے لگتی تھی۔

اور اب وہ ماسٹر حمید اور سلیم کے گھر میں آ گئی تھی۔

یہ سب اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

بچے تو اپنے گھر میں رہتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں تھا۔ اسے کیوں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جا رہا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ اس گھر میں اسے کتنے دنوں تک رہنا تھا۔

دو چار دنوں تک وہ بہت اُداس رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کے لیے ہر شام کو آ جایا کرتے تھے۔ وہ اس کے لیے بازار سے پھل وغیرہ بھی لے آتے تھے۔

اور ان کے جانے کے بعد فرزانہ، سلیم کو آواز دیتی۔

''ادھر آؤ، میرے پاس۔''

''کیا ہے؟'' سلیم اس کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا۔

''لو یہ کیلے کھا لو۔ یہ سیب لے لو۔''

''واہ، میں کیوں لوں۔ یہ سب تو تمہارے ہیں۔'' سلیم کہا کرتا۔ ''ہیڈ ماسٹر صاحب تمہارے لیے لائے ہیں۔''

''جاؤ، میں تم سے نہیں بولتی۔'' فرزانہ ناراض ہو جاتی۔ ''کیا میری چیز تمہاری نہیں ہے؟ میں بھی تو تمہارے گھر میں رہ رہی ہوں۔ کیا تمہارا گھر میرا نہیں ہے۔''

''اچھا بابا۔'' سلیم ہنس پڑتا۔ ''تو بہت باتیں کرنے لگی ہے۔'' وہ کچھ پھل لے لیتا۔

پھر رات کے وقت دونوں اپنی کتابیں نکال کر بیٹھ جاتے۔ فرزانہ تیسری میں تھی۔ سلیم چھٹی کی تیاری کر رہا تھا۔ فرزانہ صبح کے وقت ماسٹر حمید اور سلیم کے ساتھ جاتی۔ وہ سلیم کو ٹریننگ کرتے ہوئے دیکھا کرتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ماسٹر صاحب بے چارے سلیم سے اتنی محنت کیوں کرواتے ہیں۔"

ایک بار اس نے سلیم سے پوچھا۔ "یہ بتا تو اتنی محنت کیوں کررہا ہے؟"

"دوڑنے کے لیے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ دوڑنا تو سب کو آتا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔ "مجھے دیکھ میں بھی تو تیرے ساتھ دوڑتی ہوں۔"

"ارے، یہ دوسری دوڑ ہے۔" سلیم اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ "اس میں بہت پیسے ملتے ہیں۔ بہت انعام ملتے ہیں۔ شہروں میں دوڑنے کے مقابلے ہوتے ہیں۔ جو جیت جائے اس کے مزے آجاتے ہیں۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تیری سمجھ میں اس وقت آئے گا جب اخباروں میں میری تصویر چھپے گی۔"

"واہ، پھر تو بہت مزہ آتا ہوگا۔"

سلیم کی ریس ٹرک کے ساتھ ابھی بھی ہوا کرتی۔ اس وقت ماسٹر حمید اور فرزانہ دونوں ہی اس کو دوڑتے دیکھا کرتے۔ فرزانہ خوب زور زور سے تالیاں بجاتی۔

دوسری طرف ہیڈ ماسٹر بھی اس بات پر بہت خوش اور مطمئن تھا کہ ماسٹر حمید فرزانہ کی دیکھ بھال بہت اچھی طرح کررہا تھا۔

ماسٹر حمید اور اس کی بیوی نے ایک رات خاموشی سے یہ فیصلہ کرلیا کہ انشاء اللہ سلیم کے جوان ہونے کے بعد اس کے لیے رشتہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ فرزانہ گھر کی لڑکی ہے اور گھر ہی میں رہ جائے گی۔

"میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ فرزانہ ابھی سے سلیم کا بہت خیال رکھنے لگی ہے۔" حمیدہ نے کہا۔

"ظاہر ہے دونوں ساتھ ہی تو رہتے ہیں تو ایسا تو ہونا ہی ہے اور ویسے بھی فرزانہ دل کی بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"خدا اس کے نصیب اچھا کرے۔"

"مجھے یقین ہے کہ میرے سلیم کے ساتھ وہ بہت خوش رہے گی۔"

☆☆☆

کلب کے کوچ جمالی کی پریشانی ایک دن اچانک ختم ہو گئی تھی۔

وہ ایک ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ جب اس نے ایک آدمی کی آواز سنی۔ "بالے، میں تجھ سے سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ ٹرک کے ساتھ دوڑ لگاتا ہے۔"

"جا یار کیسی بات کررہا ہے؟"

"سچ کہہ رہا ہوں یار، کیا پریکٹس ہے اس بچے کی۔ تجھے یقین نہیں آتا تو اکرم سے پوچھ لے۔ وہ بھی صبح میرے ساتھ ہی ہوتا ہے۔"

جمالی کی دلچسپی بڑھ گئی۔ وہ اپنی میز سے اٹھ کر ان دونوں کے پاس آگیا۔

"السلام علیکم بھائی۔" اس نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔" ٹرک ڈرائیور نے سلام کا جواب دیا۔

"کوئی کام ہے بادشاہو؟"

"بھائی صاحب، ابھی آپ کس لڑکے کی بات کررہے تھے جو آپ کے ٹرک کے ساتھ دوڑ لگاتا ہے؟"

"ہاں بھائی کیا اسپیڈ ہے اس کی۔ بجلی ہے بجلی۔"

"اور وہ ہوتا کہاں ہے؟"

"نزدیکی قصبے میں صاحب۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "قصبہ یہاں سے سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہمارا ٹرک روزانہ سبزیاں اور فروٹ لے کر وہاں جاتا ہے۔ ہمارے ٹرک کو دیکھتے ہی وہ لڑکا ٹرک کے ساتھ ریس لگانا شروع کر دیتا ہے۔"

"کمال ہے بھائی، کیا تم مہربانی کر کے مجھے وہ لڑکا دکھا سکتے ہو؟"

"کیوں بھائی، تم کیا کرو گے اس کا؟"

"میں ایک کوچ ہوں۔ میں تربیت دیتا ہوں۔ ہمارا ایک کلب ہے۔ جہاں اس قسم کے بہت سے بچے ہیں۔ ہم ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر انہیں آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ پورے ملک میں ان کا نام روشن ہوجاتا ہے۔"

"بھائی، یہ تو بہت اچھا کام ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔ "تم آج ہی رات تین اور چار کے درمیان سبزی منڈی آجاؤ۔ ہمارا ٹرک ساڑھے چار بجے چل دیتا ہے۔ کئی جگہوں سے سبزیوں کی بوریاں اتارتا ہوا سات بجے قصبے پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سبزیاں اتار کر پھر ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔"

"کیا وہ لڑکا اس وقت وہاں ہوتا ہے؟"

"ہاں، وہ تو سات سے بہت پہلے آجاتا ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گا۔"

"میرا نام حیات خان ہے۔ کسی سے بھی پوچھ لینا۔"

جمالی وقت پر سبزی منڈی پہنچ گیا۔ ٹرک پر بوریاں لادی جارہی تھیں۔ حیات خان نے اس کا استقبال کرتے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوئے اسے چائے بھی پلائی تھی۔
"یار، تم تو واقعی اپنی لگن کا سچا آدمی معلوم ہوتا ہے۔" حیات خان نے اس کی تعریف کی۔
"بھائی، میرا تو کام ہی یہی ہے۔" جمالی نے ایک گہری سانس لی۔ "جہاں بھی صلاحیت دیکھتا ہوں، اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہوں۔"
"چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"
سبزیاں ٹرک پر لادی گئیں۔ کلینر آج پیچھے جگہ بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ ساڑھے چار بجے ٹرک روانہ ہو گیا۔
جمالی کے لیے صبح کی بیداری کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ ٹریننگ دینے کے لیے بہت جلدی اٹھ جاتا تھا۔ کلب ہی کی عمارت میں اس کی رہائش کا بندوبست بھی کر دیا گیا تھا۔
صبح کا یہ سفر اس کے لیے بہت خوش گوار ثابت ہو رہا تھا۔ حیات خان ایک باتونی آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ادھر ادھر کے قصے سنانے شروع کر دیے۔ وہ اپنے تجربات بتا رہا تھا۔ جمالی اس کی ہر بات پر ہوں ہاں کرتا جاتا۔ کبھی کبھی وہ بھی اپنے تجربات شیئر کر لیتا تھا۔
صبح ہو چلی تھی۔ جب حیات خان نے اعلان کیا۔ "ہوشیار۔ قصبہ آنے والا ہے اور وہ لڑکا بھی مل جائے گا۔"
میدان سے گزر کر ٹرک جیسے ہی ٹیلوں کے درمیان آیا۔ ایک بچہ ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوا اس نے ٹرک کے ساتھ دوڑ لگانی شروع کر دی۔
جمال کو ایسا ہی لگا جیسے واقعی بجلی سی کوند گئی ہو۔ کیا رفتار تھی اس کی۔ کیا اسٹیمنا تھا۔ وہ جیسے اڑا چلا جا رہا تھا۔
کلینر نے پچھلے حصے سے کیلوں کا ایک گچھا اس کی طرف اچھال دیا۔ کیلے زمین پر گر گئے۔ وہ لڑکا ان کیلوں کو اٹھا کر پھر برق رفتاری کے ساتھ ٹرک کے برابر آ گیا۔
"شاباش۔" جمالی نے داد دی۔ "واہ، واہ۔" پھر اس نے حیات خان سے کہا۔ "خان ٹرک روک دو۔ مجھے اس لڑکے سے بات کرنی ہے۔ تم اپنا سامان لے کر آگے چلے جانا۔"
"تم کو واپس جانا ہو تو بتا دو۔ ہم ٹرک لے کر ادھر جائے گا۔"
"نہیں خان، تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں اس لڑکے سے اور اس کے گھر والوں سے باتیں کر کے بس سے واپس چلا جاؤں گا۔"
"وہ ٹھیک ہے نا؟"
حیات خان نے ٹرک روک دیا۔ جمالی اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا ٹرک سے نیچے آ گیا۔ سامنے سے سلیم دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ سلیم کے لیے یہ نئی بات تھی کہ کوئی شخص ٹرک سے اتر کر اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا ہو۔ وہ بھی جمالی سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔
"ادھر آؤ بیٹے، نام کیا ہے تمہارا؟" جمالی نے پوچھا۔
"سلیم۔"
"تمہارے ابو بھی؟"
"ہاں، وہ بھی آ رہے ہیں۔" سلیم نے بتایا۔ "ابو مجھے دوڑنا سکھاتے ہیں۔ ٹریننگ دیتے ہیں۔"
"کیا؟" جمالی حیران رہ گیا۔ "تمہارے ابو ٹریننگ دیتے ہیں؟"
"جی ہاں، وہ دیکھیں، وہ سامنے سے آ رہے ہیں۔"
جمالی نے دیکھا ایک آدمی بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ سلیم دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ "ابا، یہ ٹرک سے اترے ہیں۔ آپ کا پوچھ رہے تھے۔"
ماسٹر حمید، جمالی کے پاس آ گیا۔ "مجھے ماسٹر حمید کہتے ہیں۔"
"ٹرک ڈرائیور نے مجھے آپ کے بیٹے کے بارے میں بتایا تھا۔" جمالی نے کہا۔ "مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں اس کو دیکھنے کے شوق میں یہاں تک آ گیا ہوں۔"
"جی، بڑی مہربانی آپ کی۔"
"مجھے یہ سن کر بھی حیرت ہوئی کہ آپ اسے باقاعدہ ٹریننگ دیتے ہیں۔"
"جی ہاں، کیونکہ میں خود بھی دوڑ کا قومی چیمپئن رہ چکا ہوں۔" حمید نے بتایا۔
"اوہو، یاد آیا۔ میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ پھر ایک حادثے میں......"
"جی ہاں، اس حادثے نے مجھے بیساکھی دلوا دی۔" ماسٹر حمید مسکرا کر بولا۔ "خیر جو رب کی مرضی۔ اب میں مقامی اسکول میں بچوں کو پڑھاتا ہوں اور سلیم کو ٹریننگ دے رہا ہوں۔"
"حمید صاحب، میرا نام جمالی ہے۔" جمالی نے اپنا تعارف کروایا۔ "میرا تعلق ایک ایسے کلب سے ہے جو باصلاحیت کھلاڑیوں کو تیار کرتا ہے۔ میں وہاں ٹرینر ہوں۔ آپ کے بیٹے میں بے پناہ صلاحیت ہے۔ میں اس کی دوڑ دیکھ چکا ہوں۔ میں اس کو اپنے کلب میں آنے کی آفر دیتا ہوں۔"
"بہت بہت شکریہ آپ کا۔ چلیں گھر چل کر بات کرتے ہیں۔ آپ اتنی دور سے آئے ہیں۔ مہمان ہیں ہمارے۔"
ماسٹر حمید اور سلیم، جمالی کو گھر لے آئے تھے۔

فرزانہ اس دن حمید اور سلیم کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ گھر پر ہی تھی۔ حمیدہ نے جلدی جلدی جمالی کے لیے ناشتے کا بندوبست کر دیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر چائے کے دوران جمالی نے حمید سے کہا۔ ''حمید صاحب، آپ اپنے بیٹے کو ہمارے کلب لے آئیں۔ اس کو جدید انداز سے ٹریننگ دی جائے گی۔ کیونکہ پرانے طریقے اب بدل چکے ہیں۔ اس کی رہائش بھی وہیں ہو گی۔ اس کو کھانا پینا بھی کلب ہی کی طرف سے ملے گا۔ اس کے ساتھ پانچ ہزار مہینے کا وظیفہ بھی۔''

حمید کے لیے یہ سب جیسے خواب کی طرح تھا۔

پانچ ہزار روپے مہینہ، رہائش، کھانا پینا، یہ سب سلیم کو ملنے والا تھا۔ اس کے علاوہ جب اسے مکمل ٹریننگ مل جاتی اور وہ بڑے بڑے مقابلوں میں جیت کر پورے ملک میں مشہور ہو جاتا تو اس وقت اس کے سپنے پورے ہو جاتے۔

اس نے بھی تو سلیم کے لیے کچھ ایسا ہی سوچ رکھا تھا۔

''مجھے آپ کے جواب کا انتظار ہے، حمید صاحب۔'' جمالی نے کہا۔

''میں ذرا گھر میں مشورہ کر لوں۔''

''ضرور۔'' جمالی نے گردن ہلا دی۔

حمیدہ اور فرزانہ رونے لگ گئیں۔ ''نہیں، میں اپنے بیٹے کو نہیں جانے دوں گی۔'' حمیدہ نے کہا۔

''بے وقوف، اس کا مستقبل بن جائے گا۔'' ماسٹر حمید نے بتایا۔ ''وہ بڑے بڑے مقابلوں میں حصہ لے گا۔ تم یہ دیکھ چکی ہو کہ لکھنے پڑھنے میں اس کا زیادہ دل نہیں لگتا تو کسی ایک طرف تو ہو جائے۔''

''اور وہ آئے گا کب؟''

''جمالی بتا رہا تھا کہ مہینے میں ایک دفعہ تین چار دنوں کی چھٹی ملے گی۔ میں خود ہی اس کو جا کر لے آیا کروں گا۔'' بڑی مشکلوں سے ان دونوں نے اجازت دے ہی دی۔

☆☆☆

تنویر کے سامنے اس کے کلب کا منیجر بیٹھا ہوا تھا۔

''کوچ کا فون آیا تھا سر۔'' منیجر نے بتایا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ایک ٹیلنٹ دریافت کر لیا ہے اور وہ اس کو لے کر آنے والا ہے۔''

''کہاں ہے وہ ٹیلنٹ؟''

''ایک قصبے میں۔'' منیجر نے کہا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس بچے کے لیے اتنی دور آیا ہے۔ بڑی تعریف کر رہا تھا۔''

''ہمیں ہر حال میں اگلی ریس جیتنی ہے۔'' تنویر نے منیجر کی طرف دیکھا۔ ''ہر حال میں، ورنہ ہمارا یہ کلب ڈوب جائے گا۔ اس کم بخت فیاض کو دیکھو، مونچھوں پر تاؤ دیتا پھر رہا ہے۔''

''سر جی، ایک بات بتاؤں۔ جمالی نے جیسا کہا ہے اگر وہ لڑکا ویسا ہی ہے تو بھی وہ اگلی ریس میں تو حصہ نہیں لے سکے گا۔''

''وہ کیوں؟''

''اگلی ریس اگلے مہینے ہے سر۔'' منیجر نے کہا۔ ''وہ لڑکا ابھی پوری طرح ٹرینڈ نہیں ہو گا۔ اس کو کم از کم دو مہینے درکار ہوں گے۔ کیونکہ ویسے دوڑنا ایک اور بات ہے اور پروفیشنل ہو کر دوڑنا دوسری بات ہے۔''

''ہاں ہاں، آگے کہو، کیا ہے تمہارے ذہن میں؟'' تنویر نے پوچھا۔

''سر، فیاض کے پاس بس ایک ہی لڑکا ہے۔ تین نمبر۔ فیاض کو اس پر بہت غرور ہے۔ بہت فخر کرتا ہے اس پر۔''

''فخر نہیں، اتراتا پھرتا ہے۔'' تنویر نے برا سا منہ بنایا۔

''یس سر، تو کیوں نہ ہم اسی لڑکے کو فیاض کے کلب سے توڑنے کی کوشش کریں۔''

''بے وقوف ہو تم۔ ایگریمنٹ کے لحاظ سے وہ ایک سال تک کوئی دوسرا کلب جوائن نہیں کر سکتا۔''

''یس سر، دوسرا کلب جوائن تو نہیں کر سکتا۔ لیکن بیمار تو پڑ سکتا ہے نا۔'' منیجر کے ہونٹوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ تھی۔ ''میں اس کے باپ کو جانتا ہوں۔ وہ ایک لالچی آدمی ہے۔ اگر اس کو پندرہ بیس ہزار روپے مل جائیں تو وہ اپنے بچے کو عین وقت پر بیمار کر سکتا ہے۔ پیٹ کا درد، بخار، کچھ بھی ہو سکتا ہے اس کو۔''

''اس سے کیا ہو گا، ریس تو پھر بھی ہو گی۔''

''ریس تو ہو گی سر، لیکن اس کے پاس تین نمبر کے کیلیبر کا کوئی اور بچہ نہیں ہے۔'' منیجر نے کہا۔ ''میدان خالی ہو جائے گا پھر ہمارا اعمران میدان مار لے گا۔''

''ہوں۔'' تنویر کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ''ترکیب تو اچھی ہے۔''

''یہی ایک ترکیب ہے سر۔''

''ٹھیک ہے کر کے دیکھ لو۔ اور جمالی سے کہو اس لڑکے کو جلدی لے آئے۔ میں بھی تو دیکھوں وہ کیا ہے۔''

منیجر کو ایک ٹاسک مل گیا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

☆☆☆

دوسرے کلب کے مالک فیاض کے سامنے اس وقت جو شخص بیٹھا ہوا تھا، وہ پچھلے سال اسی کلب میں کوچ کی خدمات انجام دے چکا تھا۔

پھر فیاض نے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے نکال دیا تھا اور آج وہ فیاض کے پاس دوبارہ آیا تھا۔

"کیوں آئے ہو میرے پاس؟" فیاض نے اپنی گرج دار آواز میں پوچھا۔

"سر، میں آپ کے لیے ایک خبر لے کر آیا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "میں تو آپ کے لیے کام کر چکا ہوں سر، پھر آپ کا کیا کلب کا بُرا کیسے دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیا برائی ہونے والی ہے میرے یا میرے کلب کے ساتھ؟"

"سر! برائی یہ ہونے والی ہے کہ آئندہ ہر ریس تنویر کا کلب جیتا کرے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"سر، اس کے کوچ جمالی سے میری جان پہچان ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے ایک لڑکا کھوج لیا ہے جو دوڑتا نہیں پرواز کرتا ہے۔ اس کو قدرت کی طرف سے یہ صلاحیت دی گئی ہے اور اگر اس کو تھوڑی سی ٹریننگ مل جائے تو وہ اولمپک میں بھی جا سکتا ہے۔"

"اوہ۔"

فیاض پھنکارا۔ "تم معلوم کرو وہ لڑکا کب آرہا ہے۔"

"سر، آپ مجھے حکم دیں۔ میں کیا کروں؟"

"اس لڑکوں کو تنویر کا کلب جوائن نہیں کرنا چاہیے۔" فیاض نے کہا۔ "کسی بھی قیمت پر۔ لیکن اس سے پہلے یہ کنفرم ہو جائے کہ کیا اس لڑکے میں ایسی صلاحیت ہے بھی یا نہیں؟"

"سر، اس کے لیے آپ کو اس کی ٹریننگ دیکھنی ہوگی۔ اس دوران اس کا ٹیلنٹ سامنے آجائے گا۔ اگر بس یوں ہی ہے تو فکر کی کوئی بات نہیں ہے اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس کے لیے کچھ سوچنا ہوگا۔"

"چلو، وہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت ہمارے کلب کی پوری توجہ اگلے مہینے کی ریس پر ہے۔" فیاض نے کہا۔ "ہمارا تین نمبر بھی کسی سے کم نہیں ہے۔"

"یس سر، یہ بات تو ہے۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے سر؟"

"تمہارے لیے۔" فیاض سوچنے لگا۔ "ٹھیک ہے۔ تم کل سے کلب جوائن کر لو لیکن اس بار کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر۔ میں آپ کو ناراض کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

"اور اس لڑکے کی پوزیشن مجھے بتاتے رہنا، اب جاؤ۔"

کوچ کے جانے کے بعد فیاض نے تنویر کا نمبر ملایا۔ وہ اسے کریدنا چاہتا تھا۔ "ہاں بھائی فیاض کیسے یاد کر لیا؟"

"یہ یاد دلانے کے لیے فون کیا ہے کہ اگلے مہینے کی ریس بھی ہم کو ہی جیتنی ہے۔"

"چلو، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ کیا صرف یہی بتانا تھا؟"

"ہاں بس یہی۔"

"تو پھر خوامخواہ زحمت کر دی۔ ریس ہوگی تو پورے شہر کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ کون جیت رہا ہے۔"

فیاض نے برا سا منہ بنا کر فون بند کر دیا۔ تنویر سے اسے اس لڑکے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

☆☆☆

ایک مشہور روزنامے کا اسپورٹس رپورٹر اپنے دفتر میں ہونے والی میٹنگ سے خطاب کر رہا تھا۔

"یہاں اسپورٹس کے نام پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ بہت شرمناک ہے۔ تنویر اور فیاض کے کلب اسپورٹس اور بچوں کی سرپرستی نہیں کر رہے، بلکہ اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ لاکھوں کا جوا ہوتا ہے۔ اور شہر کے امیر ترین لوگ اس جوئے میں حصہ لیتے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو۔ نئے ٹیلنٹ تو سامنے آرہے ہیں نا۔" کسی نے کہا۔

"بہت ہی غلط انداز سے سامنے آرہے ہیں۔" اسپورٹس رپورٹر راحت بھپر کر بولا۔ "ان بچوں کو اس طرح پالا جاتا ہے جیسے وہ ریس کے گھوڑے ہوں۔ ان پر لاکھوں کی شرطیں لگائی جاتی ہیں اور یہ سارا کام انتہائی ہوشیاری اور خفیہ طور پر ہو رہا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ریس دیکھنے کے لیے جو لوگ جمع ہوتے ہیں، وہ دوڑ دیکھنے کے شوقین ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ وہ سب جواری ہوتے ہیں۔"

"اس لعنت کو بند ہو جانا چاہیے۔" کسی نے کہا۔

"کس طرح؟" راحت نے کہا۔ "ان کے پاس یہ کہنے کا جواز ہے کہ خدا نے ان کو دیا ہے تو وہ باصلاحیت بچوں پر خرچ کر رہے ہیں۔ تاکہ آگے چل کر یہ ملک اور قوم کا نام روشن کر سکیں۔ وہ بے چارے تو ملک اور قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ ہارنے یا جیتنے والا کب یہ اعتراف کرے گا کہ اس نے بچوں پر شرطیں لگائی تھیں۔ وہ تو

یہی کہے گا کہ وہ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کی دوڑ دیکھنے جاتا ہے۔"

"تو پھر اس سلسلے کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟"

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ خود حکومت ایسے کلب کو اپنی سرپرستی میں لے لے۔" راحت نے کہا۔ "سرکاری نگرانی میں ٹریننگ دلوائی جائے اور مقابلے کروائے جائیں اور یہ مقابلے اوپن ہوں۔ یعنی ان پر کوئی ٹکٹ وغیرہ نہ ہو۔ تب شاید یہ سلسلہ ختم ہو سکے۔ کیونکہ اس طرح کسی کا کوئی مفاد ہی نہیں رہے گا۔"

"تو آپ کے ذہن میں کیا ہے راحت صاحب؟"

"میں کھیلوں کے سیکریٹری سے مل کر انہیں سچویشن بتانے کی کوشش کروں گا۔" راحت نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ اس معاملے پر ضرور توجہ دیں گے۔"

☆☆☆

جمالی قصبے سے جا چکا تھا۔

اب ماسٹر حمید کو سلیم کو لے کر شہر جانا تھا۔ اس کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پرانے جوڑوں کی مرمت کی جا رہی تھی۔ کپڑے دھوئے جا رہے تھے۔ استری کیے جا رہے تھے۔

پورے قصبے والوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شہر والوں نے سلیم کو بلایا ہے۔ وہ اس کو بہت بڑا کھلاڑی بنا دیں گے۔

دونوں ہیئر کٹنگ سیلونز میں اسی بات کے چرچے تھے۔

"ارے بھائی، اس کے تو آثار ہی ایسے تھے۔ دیکھتے نہیں، ہوا کی طرح اڑتا تھا۔"

"دیکھ لینا، یہ سلیم ایک دن قصبے کا نام روشن کرے گا۔"

"بے چارہ ماسٹر حمید بھی تو دوڑ کا چیمپئن رہ چکا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ لیکن اس بے چارے کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بہت برا ہوا۔"

قصبے والوں کے تبصروں سے بے نیاز سلیم اور فرزانہ گھر کی چھت پر پتنگیں اڑانے میں لگے ہوئے تھے۔ دوڑ کے بعد پتنگ بازی سلیم کا محبوب مشغلہ تھا۔

"فرزانہ میری پتنگ کو دیکھ رہی ہے نا، کتنا اونچا جا رہی ہے۔"

"ہاں، ارے سلیم تو نے تو بہت اونچی اڑا دی۔"

"دیکھ لینا۔ ایک دن میں بھی اتنا اونچا اڑوں گا۔" سلیم نے کہا۔ "جہاں جانا ہو گا ہوائی جہاز پر بیٹھ کر جایا کروں گا۔ ابا بتا رہے تھے کہ جو کھلاڑی ہوتے ہیں نا، وہ دوسرے ملکوں میں بھی جاتے ہیں۔"

"پھر تو تو مجھے بھول جائے گا؟"

"ایسا کیسے ہو گا۔ تجھ کو میں ساتھ لے چلوں گا بلکہ اماں اور ابا بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔"

جس وقت وہ دونوں یہ باتیں کر رہے تھے، اس وقت ماسٹر حمید کے پاس فیاض کے کلب کا وہ کوچ بیٹھا تھا جس کو فیاض نے سلیم کو حاصل کرنے کا ٹاسک دیا تھا۔

"ماسٹر حمید صاحب، آپ کے بیٹے میں بہت صلاحیت ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "جمالی کے کلب میں بھیج کر آپ اسے تباہ کر دیں گے۔"

"دیکھیں بھائی، میں ایک سیدھا سادہ ایتھلیٹ تھا۔" حمید نے کہا۔ "اس کے بعد حادثہ ہوا پھر اسکول میں ماسٹر ہو گیا۔ ان دونوں پیشوں میں سیاست اور سازش نہیں ہوتی۔ کم از کم ہم جیسے لوگ ان چکروں سے دور رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آخر ایسا کون سا کلب ہے یا کیا ہو رہا ہے کہ میرے بچے کو خریدنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"ماسٹر حمید صاحب! میں صرف آپ کے بچے کا فیوچر بہتر بنانا چاہتا ہوں، آپ نے بتایا ہے کہ جمالی نے پانچ ہزار وظیفہ دینے کی بات کی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"میرا کلب آپ کے بچے کو دس ہزار مہینہ دے گا۔ یہ بہت بڑی رقم ہے۔"

"یہ تو بڑی رقم، لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس سے آپ کے کلب کو کیا فائدہ ہو گا؟"

"کوئی فائدہ نہیں۔ فیاض صاحب ایک بہت بڑے دل کے آدمی ہیں۔ مہینے میں لاکھوں کا کاروبار ہے ان کا۔ اگر پچاس ساٹھ ہزار روپے اپنے ملک کے بچوں پر لگا دیتے ہیں تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔"

"مجھے بہت خوشی ہوئی یہ سن کر۔ لیکن میرے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

"وہ زمانہ اور تھا ماسٹر صاحب۔ اب سب کچھ ماڈرن ہو گیا ہے۔ ہر شعبے میں نئی ٹیکنالوجی آ گئی ہے۔ آپ کے زمانے میں کھلاڑیوں کی ایکسرسائز کیا ہوتی ہو گی۔ یہی ڈنڈ بیٹھک وغیرہ۔ لیکن اب تو جدید مشینیں ہیں جن کو دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔"

"چلیں، یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن معاف کیجیے گا۔ میں ایسا کر نہیں سکتا کیونکہ میں دوسرے کلب کے جمالی صاحب کو زبان دے چکا ہوں۔"

"ارے صاحب، یہ کمرشل لائف ہے۔ اس میں زبان

وغیرہ کی طرف کون دھیان دیتا ہے۔ آپ کو جو اس نے ایڈوانس دیا ہے۔ وہ اس کے منہ پر ماریں اور ہمارے ساتھ معاہدہ کرلیں۔"

"ارشد صاحب، میں ایک سیدھا سادہ کھلاڑی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ رہ چکا ہوں۔ اسی لیے اپنی زبان کی پاسداری کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

"مرضی ہے آپ کی۔ میں تو آپ دونوں کی بہتری کے لیے اتنی دور آیا تھا۔"

"بہت شکریہ آپ کا، لیکن میں مجبور ہوں۔"

ارشد واپس چلا گیا۔ یہ بات بھی قصبے والوں کو پتا چل گئی تھی۔ اب ہر طرف یہ نیا چرچا ہونے لگا تھا۔ "ارے بھائی کیا قسمت ہے اس کی۔ اس کے لیے بڑھ چڑھ کر بولیاں لگ رہی ہیں۔"

"ہاں یار، قسمت ہو تو ایسی ہو۔ ایک میرا لونڈا ہے کم بخت۔ دوڑنا تو بہت دور کی بات ہے، کم بخت دس قدم چل کر ہانپنے لگتا ہے۔"

اس چھوٹے علاقے میں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بہت اہمیت کی ہوتی ہیں۔ سب ہی سلیم کے مستقبل کی طرف سے پُرامید تھے۔ سلیم قصبے کا نام روشن کرنے جارہا تھا۔

جس وقت دونوں باپ بیٹا روانہ ہونے لگے، اس وقت بس اسٹاپ پر قصبے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جو سلیم کو رخصت کرنے آئے تھے۔

ان میں حمیدہ اور فرزانہ بھی تھیں۔ فرزانہ نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجالی تھیں۔ اسے ابھی سے یہ احساس دِلا دیا گیا تھا کہ سلیم اس کی آئندہ زندگی کا ساتھی ہے اور وہ ساتھی اس سے بہت دور جارہا تھا۔ کچھ ہی دنوں کے لیے سہی۔ لیکن دوری تو پھر دوری ہوتی ہے۔

بس آئی۔ دونوں باپ بیٹا بس میں سوار ہوگئے۔ قصبے والے بہت دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے تھے۔ سلیم کی زندگی کا نیا سفر شروع ہونے والا تھا۔

☆☆☆

اسپورٹس رپورٹر راحت دونوں کلب کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

اسے یہ یقین تھا کہ بچوں کی ریس کے نام پر جوا ہوا کرتا ہے اور وہ بھی اعلیٰ پیمانے کا لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

وہ اس وقت ایک کلب کے مالک تنویر کے سامنے بیٹھا اس کا انٹرویو لے رہا تھا۔

"تنویر صاحب، یہ فرمائیں کہ آپ کے ذہن میں یہ خیال کہاں سے آیا کہ بچوں کی ریس کا سلسلہ شروع کیا جائے؟"

"ارے بھائی، میں ورلڈ چیمپئن شپ اور اولمپک وغیرہ کے مقابلے دیکھ دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ آخر ہمارے ملک میں ایسی کیا کمی ہے کہ ہمارا کوئی کھلاڑی عالمی سطح کا کھلاڑی نہیں بن سکا۔ یہ بتائیں کیا آج تک کسی نے اولمپک میں گولڈ میڈل حاصل کیا ہے؟"

"نہیں، کسی نے نہیں۔" راحت نے اعتراف کیا۔

"تو اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے تربیت کا نہ ہونا۔ پریکٹس کا فقدان، جو دو چار دوڑنے والے ہیں بھی تو وہ بے چارے یا تو کسی دفتر میں کام کرتے ہیں یا کہیں مزدوری کرتے ہیں۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"تو بھائی، خود سوچیں۔ جب وہ بے چارے رات دن دال روٹی کے چکر میں رہیں گے تو دوڑ کی پریکٹس کے لیے ٹائم کہاں سے نکالیں گے۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ کیوں نہ بچوں کی تربیت سے اسٹارٹ لیا جائے۔ کیونکہ بچوں میں ابھی آگے بڑھنے کے امکانات ہیں۔ وہ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ تو بس میں نے ان کے لیے ایک کلب بنا لیا اور بچوں کو آسانیاں دینے لگا۔ آپ خود دیکھ لیں۔ ہمارے کلب کے پاس کیا نہیں ہے۔ جمنازیم، سوئمنگ پول، ٹریک، کوچ، سب کچھ ہے۔ لاکھوں روپے مہینے کا خرچ ہے۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن آخر کیوں؟ آپ تو ایک بزنس مین ہیں۔ آپ کا اپنا کاروبار ہے پھر آپ ان چکروں میں کیوں پڑ گئے؟"

"بھائی، وہی ملک اور قوم شہرت کے لیے۔ میں چاہتا ہوں کہ اولمپک کے میدان میں اپنے ملک کا جھنڈا بلند ہوتے ہوئے دیکھوں۔"

"یہ تو بہت اچھا خیال ہے آپ کا۔ ایک بات بتائیں۔ یہ جو دوسرا کلب ہے فیاض صاحب کا، وہ بھی تو یہی کام کر رہا ہے؟"

"اس کی تو بات ہی نہ کریں۔" تنویر نے برا سا منہ بنایا۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ اس نے میری دیکھا دیکھی یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ ابتدا تو میں نے کی ہے۔"

"جی ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ تنویر صاحب، آپ ریس پر ٹکٹ بھی تو لگاتے ہیں۔" راحت نے پوچھا۔

"جی ہاں، صرف بیس روپے۔" تنویر نے بتایا۔ "بیں

روپوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ سو دو سو آدمی اگر دیکھنے بھی آگئے تو اس سے کیا بنتا ہے؟"

"جی ہاں، ان سے تو واقعی کچھ نہیں بنتا لیکن بچوں کی ریس پر جو لاکھوں کی شرط لگتی ہے، جو ہوتا ہے وہ کس کھاتے میں جاتا ہے؟"

"بھائی کیسی بات کر رہے ہیں؟" تنویر اچانک بھڑک اٹھا۔ "یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"پورے شہر میں یہ باتیں گردش کر رہی ہیں۔"

"سب بکواس ہے۔ کسی کے پاس کوئی ثبوت ہے تو سامنے لائے یا کوئی ایک ایسا آدمی دکھا دے جو شرط میں جیتا یا ہارا ہو؟"

"یہی تو مصیبت ہے کہ ایسا کوئی آدمی آج تک سامنے نہیں آیا۔"

"تو بھائی اسے جھوٹ سمجھیں۔ افواہ سمجھیں۔" تنویر نے کہا۔ "یہی تو پرابلم ہے ہمارے یہاں کہ جب کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ کرے تو اس کو بدنام کرنے کی سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔"

"اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟"

"چلیں، کہہ دیں۔" تنویر نے ناگواری سے کہا۔

"آپ یہ سب کچھ اپنی جیب سے کرتے ہیں؟"

"ہاں صرف اپنی جیب سے۔"

اسی وقت تنویر کے انٹرکام کی گھنٹی بول پڑی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کچھ سنا پھر ریسیور رکھ کر راحت کی طرف دیکھا۔

"جناب، میرا خیال ہے کہ آپ کے سوال جواب کا سلسلہ ختم ہو گیا ہوگا۔"

"جی ہاں، مجھے اب کچھ نہیں پوچھنا، آپ کے وقت دینے کا شکریہ۔"

راحت کے جانے کے بعد تنویر نے انٹرکام اٹھا کر کہا۔ "بھیج دو ان کو۔"

اس کمرے سے باہر ایک دوسرا کمرا تھا جو تنویر کے ملاقاتیوں کی انتظار گاہ کا کام کرتا تھا۔ راحت، تنویر کے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں آیا۔ باہر جانے کا وہی راستہ تھا۔ اس کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ راحت ان میں سے ایک کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ وہ ماسٹر حمید تھا۔

راحت ماسٹر حمید کے پاس آگیا۔ "آپ حمید صاحب ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔ "وہ تھیے والے۔"

"ہاں، میں وہی ہوں اور تم؟"

"یقیناً آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہوگا۔" راحت نے کہا۔

"جب آپ نیشنل چیمپئن بنے تھے تو میں نے آپ کا انٹرویو لیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔"

"ہاں، اس کے بعد تو میں......" حمید نے اپنی بیساکھی کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"جی جناب، مجھے اس سانحے کا علم ہوا تھا۔ آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن آپ دور جا چکے تھے اور آج آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔"

"میں اپنے بیٹے کو لے کر آیا ہوں۔" حمید نے سلیم کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا اس کلب سے معاہدہ ہو گیا ہے اور یہ ہیں اس کلب کے کوچ جمالی صاحب۔"

"ہاں، ان کو تو میں جانتا ہوں۔" راحت نے کہا۔

"بہرحال گڈلک۔ آپ کا بچہ بہت پیارا ہے۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔"

"مجھے اور بھی اطمینان ہو گیا۔" ماسٹر حمید نے ایک اطمینان کی سانس لی۔ "یہ یہاں اکیلا ہے۔"

اسی دوران تنویر نے انٹرکام پر ان تینوں کو اپنے پاس بھیج دینے کی ہدایت کی تھی۔ راحت نے ماسٹر حمید اور سلیم سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر آگیا۔

اسے ماسٹر حمید جیسے سیدھے اور خالص ایتھلیٹ کا اس طرح سے کلب کے ساتھ وابستہ ہو جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ شاید بے چارے حمید کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اس قسم کے کلب میں کیا کیا ہوا کرتا ہے۔

تنویر نے بڑی خوش دلی سے حمید اور سلیم کا استقبال کیا تھا۔ "جناب، میں نے تو آپ کا بہت نام سنا ہے۔ ظاہر ہے۔ جس کا باپ ایسا ہو، اس کا بیٹا کیسا ہوگا؟ وہ تو کہیے کہ قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ورنہ آپ پاکستان کے پہلے اولمپک چیمپئن ہوتے۔"

"اب یہی خواب میں اپنے بیٹے کے لیے دیکھا کرتا ہوں۔"

"یہ خواب ضرور پورا ہوگا۔ آپ نے ہماری آفر قبول کر کے عقل مندی کی ہے۔"

"جی ہاں، اس امید پر بچے کو چھوڑ رہا ہوں کہ اس کا مستقبل بہتر ہو جائے گا۔"

"جمالی صاحب، کیا بچے کی پرفارمنس نہیں دکھائیں گے؟" تنویر نے پوچھا۔ "ذرا باقاعدہ ٹریننگ سے پہلے کچھ دیکھ تو لیں۔"

"کیوں نہیں سر، سلیم میاں تو ہر وقت دوڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

"اور حمید صاحب کو سلیم کے رہنے کا کمرا اور دوسری چیزیں بھی دکھا دو تاکہ یہ پوری طرح مطمئن ہو جائیں کہ ہمارے یہاں انٹرنیشنل معیار کا کام ہو رہا ہے۔"

"میں ضرور دیکھوں گا جناب۔ کیونکہ یہ سب ایک زمانے میں میرا بھی شعبہ رہ چکا ہے۔"

☆☆☆

قصبے میں حمیدہ اور فرزانہ دونوں ہی سلیم کے جانے سے اداس ہو گئی تھیں۔

فرزانہ نے ابھی محبت کی ابتدا کی تھی۔ اگرچہ اسے اس جذبے کا ابھی پوری طرح احساس تو نہیں تھا۔ پھر بھی سلیم کے ساتھ رہ کر اس کے اندر ایک ہلچل سی مچ جاتی تھی۔

سلیم اسے سب سے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی زیادہ۔ چاچا حمید اور چاچی حمیدہ سے بھی زیادہ۔ اس کی خواہش ہوتی کہ سلیم ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہا کرے۔ لیکن اب وہ اتنی دور چلا گیا تھا۔

لیکن سب یہ بتا رہے تھے کہ شہر جا کر وہ بہت بڑا آدمی بن جائے گا۔ بہت مشہور ہوگا۔ اس کی فوٹو اخباروں میں چھپے گی۔ فرزانہ کے لیے اتنا بہت تھا۔

اسے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ وہ سلیم کی ہے۔ اس وقت سے اسے سلیم سے تھوڑی سی شرم بھی آنے لگی۔ یہ اس کے اندر کی فطرت تھی۔ ایک لڑکی کی فطرت۔ جس نے ابھی تک سوائے ہیڈ ماسٹر صاحب، ماسٹر حمید اور سلیم کے اور کسی سے بے تکلفی نہیں کی تھی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اور حمید صاحب تو اس کے باپ کی طرح تھے لیکن سلیم کی بات تو کچھ اور تھی۔ اس کے ساتھ تو اس کا رشتہ ہی کچھ اور تھا۔

ایک انہونے سے پیار کا رشتہ جس کی قدر و قیمت سے خود وہ بھی واقف نہیں تھی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب ایک شام جب فرزانہ سے ملنے آئے تو کچھ خاموش تھے۔ حمیدہ نے ان کے لیے چائے بنا کر ان کے سامنے رکھ دی تھی۔

"خیریت تو ہے ہیڈ ماسٹر صاحب، آپ کچھ پریشان سے ہیں؟"

"ہاں، پریشان تو نہیں البتہ ایک معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

"کون سا معاملہ؟"

"کچھ دیر بیٹھ جاؤ اور فرزانہ سے کہنا کہ وہ اپنے کمرے میں رہے۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"خدا خیر کرے۔" حمیدہ نے فرزانہ کو اپنے کمرے میں رہنے کی تاکید کی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے بیٹھ گئی۔ "کیا ہوا ہیڈ ماسٹر صاحب؟"

"بہن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کتنی خود غرض اور بے رحم دنیا ہے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔ "کل تک اس کمینی کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس نے ایک یتیم و یسیر لڑکی کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔ کتنی بے رحمی کی تھی اس کے ساتھ۔ اور آج...... آج وہ اس کے لیے مری جا رہی ہے۔ فرزانہ کی محبت جاگ اٹھی ہے۔"

"تو اس میں کون سی بڑی بات ہو گئی ہیڈ ماسٹر صاحب؟"

"بڑی بات یہ ہے کہ اس میں اس کی غرض پوشیدہ ہے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔

"کیسی غرض؟"

"اس نے کل پرسوں فرزانہ کو دیکھ لیا ہے۔ ماشاءاللہ تمہارے یہاں آنے کے بعد اس کا چہرہ پھولوں کی طرح ہو گیا ہے۔ اس کمینی عورت کے ساتھ تو وہ مرجھا کر رہ گئی تھی۔ تم دونوں میاں بیوی نے اسے بہت پیار سے رکھا ہے۔"

"ہم نے تو اپنے نبی جی کے کہنے پر عمل کیا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب۔" حمیدہ نے کہا۔ "انہوں نے کسی بے سہارا کو سہارا دینے پر کتنا زور دیا ہے۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب عقیدت بھری نگاہوں سے اس عورت کو دیکھتے رہ گئے۔ جو بظاہر پڑھی لکھی تو نہیں تھی لیکن اس کے سینے میں عشقِ رسولؐ کی حدت تھی۔

"ایک بات تو بتائیں ہیڈ ماسٹر صاحب، ہوا کیا ہے؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"میں یہ بتا رہا تھا کہ اس نے فرزانہ کو کہیں دیکھ لیا ہے۔ ورنہ اتنے دنوں کے بعد اسے ایک بار بھی بچی کا خیال نہیں آیا اور اب وہ اس کی شادی اپنے کمینے اور نکمے بھانجے سے کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا؟" حمیدہ دھک سی رہ گئی تھی۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے تو فرزانہ کو اپنے سلیم سے منسوب کر دیا ہے۔ یہ ہمارا پکا ارادہ ہے۔"

"ہاں، ہاں جانتا ہوں میں۔" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "میں خود بھی اس کمینے بھانجے کے حق میں نہیں ہوں۔ مجھے چڑ ہے اس ناکارہ سے۔ میں ایسا کبھی ہونے نہیں دوں گا۔"

"پھر آپ کیا کریں گے؟" حمیدہ نے کہا۔

"یہ کوئی زبردستی نہیں ہے حمیدہ بہن۔" ہیڈ ماسٹر اس کی

طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ لیکن بس یہ ہوشیار کررہا ہوں کہ فرزانہ کو زیادہ باہر آنے جانے مت دو۔ وہ ایک نمبر کا کمینہ انسان ہے۔ انکار پر بچی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔“

”ہائے ربّا۔“ حمیدہ سہم گئی۔ ”میں تو اس کو اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ کبھی کبھی اپنے ساتھ بازار لے جاتی تھی۔“

”نہیں، وہ ٹھیک ہے۔“ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ ”بس میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اکیلی نہ نکلا کرے۔ تم اس کے ساتھ ہو تو اچھا ہے۔“

”یہ بیٹھے بٹھائے کون سی مصیبت پڑ گئی۔“

”ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں لیکن تم فکر مت کرو۔ جب تک میں زندہ ہوں، فرزانہ کو کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گا۔“

☆☆☆

تنویر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اس نے سلیم کو دوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسٹارٹنگ پوائنٹ سے بجلی کی طرح روانہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اختتام تک پہنچ گیا۔

یہ دوڑ دیکھنے کے لیے ماسٹر حمید بھی موجود تھا۔ وہ ایک رات کے لیے وہیں رک گیا۔ آج شام کو اسے روانہ ہونا تھا۔

”بہت زبردست، مارویلیس۔“ تنویر نے بے ساختہ داد دی۔ پھر حمید سے مخاطب ہوا۔ ”حمید صاحب، آپ کا بچہ آفت ہے۔ آندھی ہے۔ طوفان ہے۔ میں نے ایسی اسپیڈ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“

”اب ہم اس کو ٹرینڈ کریں گے تاکہ پراپر دوڑ سکے۔“

”جی جناب، اسی لیے تو یہ آپ کے پاس آیا ہے۔“

”مسٹر جمالی، کیا خیال ہے اگلے مہینے کی ریس میں دوڑا دیا جائے؟“

”نو سر، میں ابھی اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ جمالی نے کہا۔ ”ابھی اس کو مزید پرفیکٹ ہو جانے دیں۔ اس کے بعد پھر جو ریس ہوگی، وہ ہماری ہوگی۔“

”حمید صاحب، اب آپ اپنے بیٹے کی طرف سے فکر ہو کر واپس جائیں۔ اب یہ ہماری نگرانی میں ہے۔ یہ ہمارے کلب کی زینت ہے۔ ہم اس کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔“

”یہ تو خیر مجھے بھی معلوم ہے تنویر صاحب۔ اور مجھے اطمینان ہے کہ میرا بچہ اچھے ہاتھوں میں ہے۔“

سلیم اپنے باپ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ حمید نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! اب میں واپس جا رہا ہوں۔ تمہاری کامیابی تمہاری ماں اور فرزانہ کو بتاؤں گا تو وہ کس قدر خوش ہوں گی۔“

”ہاں بابا، سب کو میرا اسلام دیجیے گا اور ہاں قصبے کے دوستوں کو بھی۔ خاص طور پر افضل کو۔ جس کو میں پتھر پھینک کر بلایا کرتا تھا۔“

یہ بولتے ہوئے سلیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ماسٹر حمید رخصت ہو گیا۔ بوجھل دل کے ساتھ۔ لیکن دوسری طرف اس امید کے ساتھ کہ اب اس کا بیٹا بہت آگے جائے گا۔ بہت آگے۔

اسٹاپ پر اسے وہ آدمی دکھائی دے گیا جو کسی اور کلب سے اس کے پاس آیا تھا۔ وہ بھی سلیم کے لیے آفر لایا تھا۔ دس ہزار کی۔ لیکن حمید نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔

اس نے بھی ماسٹر حمید کو دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آگیا۔ ”کیا حال ہے ماسٹر صاحب، خیر تو ہے نا؟“

”ہاں سب خیر ہے۔“

”کیا ہوا، بیٹے کو تنویر کے حوالے کر دیا؟“

”ہاں بھئی، اس کو زبان دے چکا تھا۔“

”چلیں، جو ہوا اچھا ہوا۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے آپ ہماری بات مان لیتے تو فائدے میں رہتے۔“

”میاں، فائدہ اور نقصان تو اللہ کی ذات سے ہوتا ہے اور ویسے بھی ہم کھلاڑیوں کا یہ مزاج نہیں ہوتا۔ زیادہ اور کم کے چکر میں نہیں رہتے۔ جو مل جائے وہی بہت ہوتا ہے۔“

بس آگئی تھی۔ یہ بس سیدھی قصبے سے ہوتی ہوئی چندو نگر تک چلی جاتی تھی۔ ماسٹر حمید اس بس میں سوار ہو گیا۔

فیاض کے منیجر کے ہونٹوں پر اس وقت ایک گہری طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

مہینے والی ریس کا دن آپہنچا تھا۔

تنویر کو اپنے منیجر اور کوچ کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس کا کوئی بھی بچہ فی الحال فیاض کے تین نمبر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور اس کے پاس جو سلیم تھا اس کو اس ریس میں حصہ نہیں لینا تھا۔

اس کے منیجر نے تین نمبر کے باپ کو توڑ لیا تھا۔ اس کے لیے بیس ہزار اچھی خاصی رقم تھی۔ اس کو عین وقت پر بیمار ہو جانا تھا۔

یہ پوری پلاننگ طے ہو چکی تھی۔

اس ریس کو دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ آئے تھے۔ کاروباری لوگ، موٹی گردنوں اور ابھرے ہوئے پیٹ والے بدنما کرخت چہروں والے لوگ۔ جن کے پاس سرمایہ تھا اور جو اپنی دولت سے بچوں کو ریس میں دوڑا سکتے تھے۔ لڑکیوں کے مجرے کروا سکتے تھے۔ یہ سب ان کے لیے جائز تھا کیونکہ وہ پیسے والے تھے۔

ان پیسے والوں نے دوڑنے والے بچوں پر لاکھوں کی شرطیں لگائی تھیں اور بدلے میں ان بچوں کو کیا ملنے والا تھا؟ تھوڑے سے روپے اور شاباش، بس۔

جبکہ دونوں کلب کے مالکان کی تجوریاں ہار یا جیت کے بعد مزید نوٹوں سے بھر جاتیں۔

ریس دیکھنے والوں میں فیاض اور تنویر دونوں شامل تھے۔ سلیم بھی اپنے کوچ جمالی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ وہ اس وقت بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے کوچ سے کہا۔ ”سر، مجھے بھی حصہ لینے دیں نا۔“

”نہیں، ابھی نہیں۔“ جمالی نے کہا۔ ”ابھی تمہاری ٹریننگ چل رہی ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں بڑے ایونٹ کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارا سالانہ ایونٹ ہوتا ہے۔“

”اور وہ کب ہوتا ہے سر؟“

”اگلے مہینے ہونے والا ہے۔ تم بس اس ریس کو دیکھو اور بلیو کلر کی جرسی والے بچوں پر نظر رکھو۔ تم کو ان کی ریس کا اندازہ ہو جائے گا۔“

اچانک ریفری نے سیٹی بجا دی۔ ریس شروع ہو گئی۔ تنویر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ فیاض کے کلب کا 3 نمبر بھی میدان میں موجود تھا اور وہ اس ریس میں حصہ لے رہا تھا۔

اس نے برابر بیٹھے ہوئے کوچ سے سرگوشی کی۔ ”یہ کیا ہو گیا۔ اس کو تو بیمار پڑ جانا تھا۔ پھر یہ کیوں حصہ لے رہا ہے؟“

”پتا نہیں سر، میں...... میں تو......“ کوچ کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ ”میں تو اس کے باپ کو......“

”شٹ اپ۔“ تنویر نے اسے جھڑک دیا۔ ”تم نے خاک کام کیا ہے۔ یہ ریس بھی وہی جیتے گا۔“

نیلی اور زرد جرسیاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہو رہی تھیں۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ سیٹیاں بج رہی تھیں۔ کبھی ایک وردی آگے ہو جاتی کبھی دوسری۔

یہ پانچ میٹر کی دوڑ تھی۔ یعنی دوڑنے والے بچوں کو پانچ چکر مکمل کرنے تھے۔

پھر نیلی، زرد، زرد نیلی۔ بالآخر فیاض کے کلب کے 3 نمبر نے میدان مار لیا تھا۔ تنویر بھنّا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کے لاکھوں ڈوب گئے تھے جبکہ فیاض فاتحانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تنویر نے منیجر سے کہا۔ ”تم ذرا میرے ساتھ آفس میں آؤ۔“

”یس سر۔“

آفس پہنچتے ہی تنویر اس پر برس پڑا۔ ”کیا ہوا ہے یہ سب۔ یہ کیا تماشا ہے۔ تم نے کیا خاک بات کی تھی۔ میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔“

”سر، اب میں کیا کروں، میں نے تو اس کے باپ......“

”کیا باپ، باپ لگا رکھا ہے۔ جاؤ پکڑ و اس کو۔ پوچھو اس نے ایسا کیوں کیا؟ ٹانگیں تڑوا دو اس کی۔ خدا کی پناہ۔ پورے سات عدد کا نقصان ہوا ہے اور بے عزتی الگ ہوئی ہے۔“

”میں ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں سر۔“ منیجر نے کہا۔

☆☆☆

منیجر تین نمبر ارشد کے باپ پر برس پڑا تھا۔

”کیوں دھوکا دیا تم نے مجھے۔ ہم سے پیسے بھی لے لیے اور اپنے بیٹے کو دوڑا بھی دیا۔ کیوں معاہدہ کیا تھا۔ تم بے ایمان انسان ہو۔“

”منیجر صاحب۔“ ارشد کے باپ نے پانچ ہزار نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ”یہ آپ اپنے پیسے رکھ لیں جی۔ بات یہ ہے کہ آپ کے جانے کے بعد میں نے بہت سوچا۔ بہت سوچا۔ پھر میرا دل نہیں مانا، میرا ضمیر......“

”جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا ضمیر۔“ منیجر غصے سے پھٹ پڑا۔ ”ہمارا تو نقصان ہو گیا نا۔ بے عزتی ہو گئی ہماری، میری نوکری بھی خطرے میں پڑ گئی۔“

”منیجر صاحب، میں اس کے لیے معافی مانگتا ہوں جی۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

”جہنم میں جاؤ تم۔“

منیجر غصے میں بھرا ہوا واپس آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ تنویر اسے اب اپنے ساتھ نہیں رکھے گا۔ تنویر کے کلب میں شاید اب اس کی گنجائش ختم ہو گئی تھی۔

اور ہوا بھی یہی۔ وہ جب تین نمبر کے باپ کے واپس کیے ہوئے پانچ ہزار لے کر تنویر کے پاس پہنچا تو تنویر اس کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔ ”یہ پانچ ہزار میز پر رکھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

''سر، میری بات تو سنیں۔ میں نے اس کے باپ سے بات کی تھی۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا۔ میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ مجھے جو نقصان ہوا ہے، وہ تمہارا باپ بھی پورا نہیں کرسکتا۔''

''سر پلیز، اس طرح کی باتیں نہ کریں۔''

''میں نے کہا نا کہ جاؤ یہاں سے۔ اور بعد میں آ کر اپنا حساب کتاب کر لینا۔ میرے کلب کو تم جیسے نکموں کی ضرورت نہیں ہے۔''

منیجر بہت بوجھل دل اور شدید بے عزتی کا احساس لیے ہوئے تنویر کے دفتر سے باہر آ گیا۔ اس وقت وہ غم اور غصے کی آگ میں سلگ رہا تھا۔

تنویر کے خلاف اس کے دل میں نفرت کے سانپ کلبلانے لگے تھے۔ اس نے اس کلب کو چلانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کلب کے دو بہترین دوڑنے والے بچے خود اس کے لائے ہوئے تھے اور اب ذرا سی بات پر تنویر نے بے عزت کر کے اسے دفتر سے نکال دیا تھا۔

اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ تنویر سے بھڑ جاتا۔ گالیوں کے جواب میں اسے بھی گالیاں سنا دیتا لیکن یہ سب اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ تو صرف جل بھن سکتا تھا۔

اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ ابھی تو تنویر کا کلب ہار میں جا رہا ہے۔ لیکن اگلے مہینے سے اس کے دن بدلنے والے ہیں۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں سلیم جیسا ایک شاہین آ گیا تھا۔

اس نے ٹریننگ کے دوران سلیم کی ریس دیکھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ فیاض کے کلب کا تین نمبر بھی اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکے گا۔

اس کے بعد تنویر کے وارے نیارے ہو جائیں گے لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ وہ تنویر کے کلب سے نکل کر سیدھا فیاض کے کلب میں پہنچ گیا۔

فیاض، تنویر کے منیجر کو اپنے پاس دیکھ کر حیران ہوا۔

''آؤ بھئی، تم یہاں کیسے؟''

''سر، میں آپ کے لیے ایک خبر لے کر آیا ہوں۔''

''ہاں بتاؤ، تم کیسی خبر لائے ہو۔''

''سر، تنویر صاحب کے کلب میں جو بچہ آیا ہے، وہ سب کی چھٹی کر دے گا۔''

''اوہ۔'' فیاض کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''تم بھی اس کی خبر لے کر آئے ہو۔''

''سر، کیا کسی اور نے بھی بتایا ہے آپ کو؟''

''ہاں، میرے ایک پرانے کوچ نے بتایا تھا۔'' فیاض نے کہا۔ ''اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کوچ نے سلیم کے لیے اس کے باپ سے معاہدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ناکام ہو کر واپس آ گیا تھا۔''

''سر، یہ میری پیش گوئی ہے کہ آپ اگلے مہینے سے ہر ریس ہارا کریں گے۔''

''میرے کلب کا تین نمبر اس کے لیے تیار ہے۔''

''تین نمبر اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے سر۔'' منیجر نے کہا۔ ''وہ لڑکا غیر معمولی ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟'' فیاض نے پوچھا۔ ''کیا یہی خوش خبری لے کر کہ اگلے مہینے سے میرے برے دن آنے والے ہیں؟''

''نو سر، میں تو اس لیے آیا ہوں کہ میں آپ کی شاید کوئی مدد کر سکوں۔''

''کیسی مدد؟''

''یہی کہ میں اس لڑکے کو یا تو آپ کا کلب جوائن کروا دوں یا کسی طرح اس کو ریس میں حصہ لینے سے روک سکوں۔''

''میرا خیال ہے کہ تنویر سے تمہاری اَن بن ہو گئی ہے۔'' فیاض معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''یس سر۔'' منیجر نے اعتراف کیا۔ ''اس آدمی نے میری بہت بے عزتی کی ہے۔ وہ اپنی ہار کا ذمے دار مجھے سمجھتا ہے۔ اس نے نکال دیا ہے مجھے۔''

''وہ ایسا بے وقوف آدمی تو نہیں ہے کہ اپنی ہار کا ذمے دار تمہیں سمجھنے لگے؟''

''ایسا ہی ہے سر۔''

''چلو ٹھیک ہے، تم سوچ کر مجھے بتا دینا کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ تم کس طرح یہ کام کر سکو گے۔''

☆☆☆

حمیدہ کے سامنے ہیڈ ماسٹر کی بیوی ممتاز کھڑی تھی۔

حمیدہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ممتاز خود ہی اس کے پاس چلی آئے گی۔

''آئیں جی...... بیٹھیں جی۔'' حمیدہ نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں لسی لے کر آتی ہوں۔ بہت مزے کی بنی ہے۔''

''حمیدہ لسی وسی کو رہنے دو۔ میں تو تمہارے پاس اپنی امانت واپس لینے آئی ہوں۔''

''کون سی امانت؟''

''وہی فرزانہ جو تمہارے پاس ہے۔'' ہیڈ ماسٹر کی بیوی نے کہا۔ ''ہائے ربا، کتنے دن ہو گئے، اس کی صورت دیکھے

مسحور کن کہانیاں و دلچسپ مستقل سلسلے لیے جون 2018 کا معطر شمارہ......
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
شیریں حیدر اور رفعت سراج کے شاہکار ناول......
محبت لفظ ہے لیکن...... حیا بخاری کا دل گداز ناولٹ......
نگہت سیما نے ایمن مرتضیٰ کو دکھلائی ایک خوب صورت راہ
اپنے ناولٹ...... کوئی شہر یار وفاؤں کا ہیں......
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور
اختر شجاعت کے بصیرت افروز مقالے......
ڈراما نگاری میں معتبر نام لیجنڈ حسینہ معین سے کرائی
ہما بیگ نے دلچسپ ملاقات
رمضان المبارک اور عید الفطر کی مناسبت سے عقیلہ حق، شمع تفسیر،
حنا بشریٰ، مریم شیراز، نزہت جبیں ضیا کی متاثر کن تحریریں
اس کے علاوہ
اس کے ساتھ، ساتھ ہماری دیگر محنتی رائٹرز کی حسین کہانیاں جن میں طیبہ عنصر مغل،
خولہ عرفان، فہمی فردوس، تمثیلہ زاہد، شمسہ الطاف شامل ہیں
علاوہ ازیں شعر و شاعری، دلچسپ اور سبق آموز تراشے، خوش ذائقہ پکوان اور سب سے بڑھ کر
گوشہ ظرافت کی صورت معیاری طنز و مزاح...... صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے......

ہوئے۔"

"ہیڈ ماسٹرنی، آپ نے وہ بچی امانت کے طور پر تو نہیں بھجوائی تھی۔ وہ بے چاری تو مجبور ہو کر ہمارے پاس آئی تھی اور ہم نے اسے سینے سے لگالیا تھا۔"

"حمیدہ، میں تم سے یہ بحث کرنے نہیں آئی۔ تم فرزانہ کو میرے پاس لاؤ، تم دیکھ لینا وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے گی۔"

"ہیڈ ماسٹرنی، اگر وہ خود سے جانا چاہے گی تو پھر مجھے کیا اعتراض ہوگا۔"

فرزانہ سہمی سہمی سی دونوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"بیٹا!" ہیڈ ماسٹر کی بیوی نے بڑے نرم انداز اور لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "میرے ساتھ چلو گی نا اپنے گھر جہاں تم رہتی تھیں۔"

"نہیں، میرا گھر یہ ہے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔"

ہیڈ ماسٹر کی بیوی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ "حمیدہ یہ لڑکی تمہارے یہاں آ کر کتنی بدتمیز ہو گئی ہے۔ ورنہ اس کی کیا مجال تھی کہ میری بات ٹال سکے۔"

"ہیڈ ماسٹرنی، اب میں اس پر زور تو نہیں دے سکتی نا۔"

"ایسا لگتا ہے جیسے تم لوگوں نے اس پر جادو کر رکھا ہے۔"

"پیار اور محبت کو اگر آپ جادو سمجھتی ہیں تو شاید ایسا ہی ہے۔"

ہیڈ ماسٹر کی بیوی تلملا کر اور غصے میں بک بک کرتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی فرزانہ دوسرے کمرے سے نکل کر حمیدہ کے پاس آ گئی۔ وہ دوسرے کمرے میں چھپ کر ساری باتیں سنتی رہی تھی۔

"نہیں چاچی، میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"ہاں بیٹا، تو یہیں رہے گی۔ میرے سوہنے رب نے چاہا تو سب بخیر ہوگا۔ تیرا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔"

ہیڈ ماسٹر کی بیوی غصے میں بک بک کرتی ہوئی اپنے گھر پہنچ گئی۔ ہیڈ ماسٹر گھر ہی میں موجود تھا۔ بیوی اس کو دیکھتے ہی برس پڑی۔ "ہیڈ ماسٹر! میری بات ذرا دھیان سے سنو۔ تم کو ایک کام کرنا ہے۔ کل ہی کرنا ہے۔"

"بتاؤ تو سہی، کیا کام ہے؟"

"تم ماسٹر حمید کو نوکری سے نکال دو۔"

"کیا؟" ہیڈ ماسٹر یہ انوکھا کام سن کر حیران رہ گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ماسٹر حمید کو نوکری سے نکال دوں؟"

"ہاں نکال دو اس کو۔"

"خدا کی بندی، وہ اسکول میرے باپ کا نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں اس کا مالک ہوں۔ وہ سرکاری اسکول ہے۔ نکالنا رکھنا سب سرکار کا کام ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر تم کس بات کے ہیڈ ماسٹر ہوئے؟"

"میں صرف دیکھ بھال کا انچارج ہوں۔" ہیڈ ماسٹر نے بتایا۔ "چل یہ بتا آخر بات کیا ہے۔ آج تو ایسی فرمائش کیوں کر رہی ہے؟"

"میں فرزانہ کو واپس لینے گئی تھی۔" ہیڈ ماسٹر کی بیوی نے بتایا۔ "بہت دنوں سے دیکھا نہیں تھا۔ اسی لیے اس کی یاد آ رہی تھی۔"

"یاد آ رہی تھی یا اپنے اسی نکمے بھانجے کی فرمائش پوری کرنے گئی تھی؟" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "یاد رکھ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے تو کچھ ہی کر لے۔"

ہیڈ ماسٹر کی بیوی بڑبڑا کر خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

منیجر نے جو سازش تیار کی، وہ بہت بھیانک تھی۔

اسے پتا چل گیا تھا کہ تنویر کے کلب کے بچے سیر کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ سیر مہینے میں ایک بار ہوا کرتی۔ اس کا انتظام خود تنویر اپنی نگرانی میں کرواتا تھا۔ وہ دن بچوں کے لیے بہت خوشی کا ہوا کرتا۔ بچے اس دن اپنی جرسیوں سے نجات پا کر عام لباس میں جایا کرتے۔۔۔۔ وہ روڈ ایکسیڈنٹ میں سلیم کو مروانا چاہتا تھا مگر اس میں دوسرے بچوں کی جانوں کا بھی خطرہ تھا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے اس سازش کو رد کر دیا۔

پھر اس کے سازشی ذہن نے ایک اور ترکیب سوچ لی۔ یہ نسبتاً ایک آسان ترکیب تھی۔ وہ سید صابر کتے کے پاس پہنچ گیا۔

بر کتے کسی زمانے میں اس کے محلے میں رہا کرتا تھا۔ اس نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا چھوٹے موٹے جرائم سے کی تھی اور آگے جا کر وہ بڑے بڑے جرائم کرنے لگا تھا۔ اغوا، ڈاکے، قتل نہ جانے کتنی بار وہ جیل بھی جا چکا تھا۔ لیکن قتل کے جرم میں اسے کبھی سزا نہیں ہو سکی تھی۔ آدمی بہت شاطر تھا دامن پر کوئی چھینٹ اور خنجر پر کوئی داغ ہی نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوتا تھا۔

منیجر جب اس کے نئے محلے اور نئے گھر میں اس کے پاس پہنچا تو وہ حیران رہ گیا۔ "اوہ، خیر تو ہے۔ آج کیسے بھول پڑے۔ کتنے برسوں کے بعد دیکھ رہا ہوں تم کو۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"برکتے، میں تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔"

"کہو کہو، دوستوں کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔"

منیجر نے اسے ساری سچوئیشن بتا دی۔ اب تک کی ساری کہانی۔

"سمجھ گیا، تو تم اس تنویر سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟"

"نہیں یار، سمجھا کر، بدلہ تو صرف ایک بار کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا ہوں۔ ایک ایک کوڑی کا محتاج کر کے۔ تاکہ وہ بھیک مانگتا پھرے۔"

"کام مشکل ہے...... معاوضہ میری مرضی کا ہوگا؟"

"جو تم کہو گے میں دوں گا۔ بس لڑکے کو اغوا کر لو۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ وہ بچہ تنویر کے کلب کے کس کمرے میں رہتا ہے۔ کیا وہ اکیلا رہتا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا ہے۔ کمرے میں کھڑکی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کی دوسری طرف کیا ہے۔ یہ ساری تفصیل چاہیے۔ کیونکہ یہ کام رات میں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پوری تفصیل بتا دیتا ہوں لیکن تم اس لڑکے کو رکھو گے کہاں؟"

"اب یہ میرا کام ہے۔ تم صرف یہ بتا دو کتنے دن رکھنا ہے؟"

"کم از کم دو مہینے۔" منیجر نے کہا۔ "تاکہ یہ ریس اور اس کے بعد والی ریس دونوں نکل جائیں۔ اس کے بعد بچے کو اس کے گھر پہنچا دیں گے۔"

"چلو بتاؤ، کیا پوزیشن ہے۔ پوری تفصیل سے بتانا اور ہاں کوئی چوکیدار وغیرہ تو نہیں ہوتا؟"

"نہیں، کوئی نہیں ہوتا۔"

"چلو، یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ ہمارے آدمیوں کا کام آسان ہو جائے گا۔" برکتے نے کہا۔

☆☆☆

راحت نے سلیم کے باپ ماسٹر حمید سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سلیم کی نگرانی کرتا رہے گا۔ سلیم اسے بہت اچھا لگا تھا۔ بہت پیارا بچہ تھا۔ بہت مہذب۔ راحت نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ اس بچے کو ان دونوں بدمعاش کلب کے گینگ سے نکال کر قومی ٹیم میں شامل کروا دے گا۔

پہلے صوبائی سطح پر۔ پھر ملکی سطح پر۔ اسے اس بچے کے مستقبل سے بہت امیدیں تھیں۔ وہ اکثر سلیم سے ملنے اس کے پاس چلا جایا کرتا۔

تنویر کو یہ پسند تو نہیں تھا لیکن وہ مجبور اس لیے تھا کہ سلیم کا باپ ماسٹر حمید سلیم کو راحت کی نگرانی میں دے گیا تھا۔ اس لیے راحت اس سے ملنے اور اس کی خیریت معلوم کرنے آجایا کرتا۔

وہ اس کے لیے اس کی پسند کے چاکلیٹ بھی لایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا۔ "دیکھو بیٹا، یہ ٹھیک ہے کہ دوڑنے میں تمہارا جواب نہیں ہے۔ تم آگے جا کر بہت کامیابیاں حاصل کرو گے۔ لیکن اس کو اپنی منزل مت سمجھ لینا۔ تمہیں تعلیم کی طرف بھی توجہ دینی ہے۔"

"انکل، مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔"

"ہاں بیٹا، تعلیم کو اپنی منزل سمجھنا۔ دوڑنے والوں کی پروفیشنل لائف کتنے برسوں کی ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ سال۔ اس کے بعد وہ ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ یہ تعلیم ہے جو آخری عمر تک ساتھ دیتی ہے۔"

"میں بھی پڑھوں گا انکل۔"

"شاباش، ابھی تو کلب میں فارغ ہوتے ہو نا، میں تمہیں کتابیں لا دیا کروں گا۔ ان کو پڑھتے رہنا۔"

اس رات بھی وہ سلیم سے ملنے گیا تھا۔

اس رات اسپورٹس کلب کی طرف سے ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دعوت سے فارغ ہو کر اس نے سلیم کے لیے اس کی پسند کے چاکلیٹ خریدے۔ اگلی صبح کی فلائٹ سے اسے ایشین چیمپئن کی کوریج کے لیے بینکاک جانا تھا۔

وہاں سے اس کی واپسی ایونٹ کے ختم ہونے کے بعد ہوتی۔ یہ ایونٹ بیس دنوں کا تھا۔ ان بیس دنوں تک وہ سلیم سے مل نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے اسے سلیم کا خیال آگیا۔

کلب میں رات دس بجے کے بعد تقریباً سناٹا ہو جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی۔ جس میں تین چار کمرے تھے۔ ہر کمرے میں کھلاڑی رہا کرتے۔ سلیم کے لیے ایک کمرا الگ سے مخصوص کیا گیا تھا۔

راحت نے اپنی گاڑی گیٹ سے کچھ فاصلے پر روک دی۔ دو چار دفعہ گھنٹی بجائی لیکن جواب نہ ملنے کی صورت میں اس نے گیٹ کو دھکا دیا۔ گیٹ اندر سے بند نہیں تھا۔ وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا تھا۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوا..... دو طرف لان تھا۔ ایک جانب میں عمارت تھی جن کی کھڑکیاں لان یا باغ کی طرف کھلتی تھیں۔

راحت جس وقت اندر داخل ہوا، اسی وقت اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ ایک کھڑکی کے نیچے دو تین آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اندر کمرے میں اندھیرا ہو رہا تھا۔

لان کے ساتھ اونچے اونچے پودے بھی لگائے گئے تھے۔ راحت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

یہ کون لوگ ہیں۔ وہ ایک اونچی جھاڑی کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔
وہ لوگ یا تو اندھیرے اور آڑ کی وجہ سے اسے دیکھ نہیں پا رہے تھے یا پھر وہ اپنے کام میں اتنے مگن تھے کہ انہوں نے راحت کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔
اچانک ایک کھڑکی سے چادر میں لپٹی ہوئی کوئی چیز باہر نکالی گئی۔ کمرے کے اندر بھی ایک آدمی تھا۔ باہر کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں نے اس چادر کو سنبھال لیا تھا۔
راحت کو احساس ہوا جیسے اس چادر میں کوئی انسانی جسم ہے۔ کوئی بچہ۔ کوئی لڑکا۔ اور یہ...... یہ سلیم ہی ہو سکتا تھا۔
راحت اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کمرا سلیم کا ہے۔
وہ سناٹے کے عالم میں یہ سب دیکھتا رہ گیا۔ گٹھری میں لپٹے ہوئے جسم کو لے کر ان دونوں نے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ کھڑکی والا بھی کود کر باہر آ گیا تھا۔
تینوں گیٹ سے باہر نکل گئے۔
راحت نے بھی باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے اسے احساس دلا دیا کہ وہ سلیم کو گاڑی میں لے کر فرار ہو رہے ہیں۔
اس وقت سوچنے سمجھنے اور کسی کو ہوشیار کرنے کا موقع نہیں تھا۔ راحت نے بھی اپنی گاڑی کی طرف دوڑ لگائی۔
دونوں گاڑیاں تیز رفتاری کے ساتھ ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی تھیں۔
اگلی گاڑی کے ڈرائیور کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کا تعاقب بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ کچھ بوکھلایا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔
اچانک اگلی گاڑی سے ایک فائر ہوا۔ یہ فائر راحت کی گاڑی پر کیا گیا تھا لیکن گولی برابر سے گزر گئی تھی۔
اور اسی وقت ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ اگلی گاڑی سامنے سے آنے والے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔

☆☆☆

کیا کیا جائے؟ ہوسِ زر، انتقام، سازش، بدنصیبی، کیا نام دیا جائے۔ کس طرح ان شاطروں کے ہاتھوں زندگی برباد کر دی جاتی ہے۔
کس طرح ایک سیدھے سادے کھیل میں بھی دولت شامل ہو جاتی ہے اور اس دولت کے ساتھ طرح طرح کی سازشوں کا میلہ لگ جاتا ہے۔
کیسے کیسے مکروہ چہرے سامنے آتے ہیں۔ یہ دوڑنے والے بچے کے ایک ایک قدم پر جوا ہوتا ہے۔ اس کی تیز رفتاری کو بھانپ کر لاکھوں کی شرطیں لگائی جاتی ہیں۔
انہیں دوڑانے والے انہیں انسان کا بچہ نہیں گھوڑے کا بچہ سمجھتے ہیں اور جب تک وہ بچہ ریس کے میدان میں دوڑنے کے قابل رہے، اس وقت تک اس کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اور جب وہ کمزور پڑ جائے تو پھر اسے عضوِ معطل کی طرح ایک طرف پھینک دیتے ہیں۔
اگرچہ کسی کلب کی تاریخ میں ایسا حادثہ پہلی بار ہوا تھا لیکن اس کے ڈانڈے ہزاروں سال پہلے کے کسی واقعے سے ملے ہوئے تھے۔
جب کسی انسان نے پہلی بار سونے چاندی کے سکوں کی لالچ کی ہوگی۔ جب اس نے پہلی بار دولت کو اپنا خدا سمجھا ہوگا۔ جب اس نے پہلی بار زر زیادہ کے حصول کے لیے کوئی سازش تیار کی ہوگی۔
یہ ایک عام حادثہ نہیں تھا۔
بہت بڑا حادثہ تھا۔ ایک شاندار مستقبل کو برباد کر دیا گیا تھا۔
اس حادثے میں ڈرائیور اور ایک آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ جبکہ ایک بچہ جس کا نام سلیم بتایا جاتا ہے، اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی تھی۔
کہا جاتا ہے کہ اس بچے کے امکانات بہت روشن تھے۔ وہ دوڑ کا عالمی چیمپئن بننے کے قابل تھا لیکن ایک گھناؤنی اور بدنما سازش اس کے مستقبل کو کھا گئی تھی۔
منیجر اور برکتے گرفتار بھی ہو گئے تھے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔

☆☆☆

سائیں سائیں ہوا چل رہی تھی۔
کھڑکی کے پٹ اس تیز ہوا میں دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔
ماسٹر حمید بچوں کو معاشرتی علوم پڑھا رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر افضل کی ڈیسک پر آ کر گرا۔
اس کی آواز نے سب کو چونکا دیا تھا۔ ماسٹر حمید نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور زور سے بولا۔ ”جاؤ، پکڑ کر لاؤ بدمعاش کو۔“
کچھ بچے دوڑتے ہوئے کلاس سے باہر چلے گئے۔
بچے کچھ ہی دیر میں سلیم کو گھیر لائے تھے۔ جو ایک بیساکھی پر کھٹ کھٹ کرتا ہوا ان کے ساتھ آ رہا تھا۔ وہ دروازے کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بابا، میں دوڑ تو نہیں سکتا تھا نا۔“
ماسٹر حمید رو رہا تھا۔ سلیم رو رہا تھا اور پوری کلاس کے بچے سکتے میں تھے۔ قصبے کا روشن ہونے والا نام اچانک بجھ گیا تھا اپنے ہی ملک کے لوگوں کی سازش کا شکار ہو چکا تھا۔

رقیبِ محبت

منظر امام

محبت کرنے کو لڑکے لڑکیاں بڑے بے چین رہتے ہیں... ذرا سا موقع ملے اور وہ محبت کے سمندر میں ڈوب جائیں... ایک ایسے ہی نوجوان کی دلچسپ کتھا... وہ محبت کرتا تھا... مگر ساتھ ہی اپنے تایا کی باتوں سے خوشہ چیں بھی رکھتا تھا... زندگی کو تہ و بالا کردینے والے نادر و نایاب مشوروں کا کمالِ ہنر...

ہنستی مسکراتی......دل لبھاتی کہانی کے دلچسپ موڑ......

میں نے جس سے محبت کی تھی، وہ ایک بھرے پُرے خاندان کی لڑکی تھی۔

میرے تایا بہت مزے کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ایک بار نصیحت کی تھی۔ ''دیکھو بیٹا۔ محبت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تمہاری عمر کے لڑکے اور محبت نہ کریں تو اور کیا کریں۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ......''

''وہ کیا شرط ہے تایا؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو۔ محبت کے لیے پوری شدت اور خلوص کی

ضرورت ہوتی ہے۔'' تایا نے کہا۔'' آج کل کے نوجوانوں کی طرح محبت کو وقت گزارنے کا ذریعہ نہ بناؤ بلکہ اس میں اپنے آپ کو ضم کردو۔ سچی محبت کی تین شرائط ہوتی ہیں۔''

''وہ کیا ہیں تایا؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی شرط یہ ہے کہ محبت کے پوری طرح ہو جاؤ اسی میں کامیابی ہے۔''

''لیکن تایا اس زمانے میں ایسی محبت ہوتی کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہی تو پرابلم ہے پھر جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ اسے محبت نہیں کہتے۔ وہ کچھ اور ہوتی ہے۔''

''تو پھر بتائیں۔ میں ایسی محبت حاصل کرنے کے لیے کیا کروں؟''

''یہ اپنے آپ سے پوچھو کہ تم اس میں کتنے مخلص ہو۔'' تایا نے کہا۔

''چلیں اور دوسری شرط کیا ہے تایا؟''

''دیکھو۔ ایک بات بہت اہم ہے۔'' تایا نے کہا۔ ''اور وہ ہے چھن جانے کا خوف۔ یہ جتنا زیادہ ہوگا، محبت کی اتنی قدر ہوگی۔ اگر محبت کے راستے میں کوئی رقیب آجائے تو محبت کی شدت دگنی ہو جاتی ہے، یہ انسان کی نیچر ہے۔''

''اس بات کو تو میں بھی مانتا ہوں تایا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں نے اپنی زندگی کے لیے جس لڑکی کو پسند کیا ہے۔ وہ ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اسی لیے میرا کوئی رقیب ہی نہیں ہے۔''

''رقیب نہیں ہے تو پیدا کرو۔'' تایا نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''اپنے کسی دوست کی اس سے ملاقات کروا دو۔'' تایا نے کہا۔ ''اور وہ بھی ایسا ہو کہ وہ لڑکی اس کی طرف راغب ہو جائے۔ پھر تم خود دیکھ لینا۔ محبت میں کیسے حدت اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ تمہارے دل میں جذبۂ رقابت پیدا ہونا ضروری ہے۔''

''تایا یہ تو خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لینے والی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ شعر یاد رکھو۔'' تایا نے یہ کہہ کر شعر بھی سنا دیا۔

میں اپنے عشق میں سچا ہوں اور یہ کہتا ہوں...... میری رگوں میں بہت زہر ہے رقابت کا۔'' میرے بچے رگوں میں رقابت کا زہر پیدا کرو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''تایا اگر وہ اسی کی ہو گئی تو کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہو گی۔'' تایا نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' میں تایا کی یہ الٹی بات سن کر خود الٹا ہو گیا تھا۔

''ایک بات بتاؤ۔ تم نے محبت شروع کی ہے۔ تو کیا تم نے محبت کرنے والوں کے بارے میں سنا ہے؟ بتاؤ۔ دنیا میں ایسے کتنے محبت کرنے والے ہیں جن کی داستانیں امر ہو چکی ہیں۔''

''جانتا ہوں تایا۔ شیریں فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں۔ وامق عذرا۔ ہیر رانجھا۔ رومیو جولیٹ۔ وغیرہ۔''

''شاباش۔ یہاں تک تو جانتے ہو۔ اب یہ بتاؤ۔ ان میں سے کتنوں کو ان کی محبتیں حاصل ہوئی ہیں؟''

''کسی کو نہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''سب ہی ناکام ہوئے ہیں۔''

''بس یہی تو وہ نقطہ ہے۔ میرے بچے ان لوگوں کی داستانیں اسی لیے زندہ ہیں کہ یہ محبت میں ناکام ہوئے تھے۔ اگر کامیاب ہو جاتے تو آٹے دال کے چکر میں پڑ کر ساری محبت بھول جاتے۔ ان کے ہوش ٹھکانے آجاتے۔ بیوی کی فرمائشیں پوری کرتے کرتے ان کو نانی یاد آجاتی۔''

''تایا آپ کی باتوں نے تو میرے ہوش اڑا دیے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میرے بیٹے۔ اسی لیے مشورہ دے رہا ہوں کہ اگر محبت میں امر ہونا ہے تو وہی کرو جو ان بزرگوں نے کیا تھا۔''

''لیکن تایا میں ایسا طوفانی عشق نہیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے حاصل ہو جائے۔''

''پھر بھی اس کی چاہت میں شدت تو پیدا کرو۔'' تایا نے کہا۔ ''اور اس کا وہی طریقہ ہے جو میں نے بتایا ہے۔ اس کو کسی دوست سے بھڑا دو۔ اس کے بعد تم دونوں کی محبت ہمیشہ کے لیے ہو جائے گی۔ اس کو دنیا کی کوئی طاقت بھی ختم نہیں کر سکے گی۔ یہ ایک بڑا امتحان ہوگا۔''

''ہاں۔ یہ تو میں کر ہی سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو کل ہی سے اس مہم پر نکل جاؤ۔'' تایا نے کہا۔ ''اور مجھے اپنا حال بتاتے رہنا۔ تاکہ میں تمہارا مشاہدہ کرتا رہوں۔''

''اور تیسری شرط کیا ہے تایا؟'' میں نے پوچھا۔

''تیسری شرط میں بعد میں بتاؤں گا۔'' تایا نے کہا۔ ''لیکن مجھے برابر رپورٹ دیتے رہنا۔''

''ظاہر ہے تایا۔ ساری رپورٹ آپ ہی کو دینی ہے۔'' میں نے کہا۔

میں نے رقیہ کو فون کیا۔ میری آواز سن کر وہ لہک اٹھی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھی۔ کیوں کہ بہت دنوں سے میں نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ''ارے کہاں تھے تم؟'' اس نے پوچھا۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے؟ تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے لیے کتنی پریشان رہی ہوں؟''

''جانتا ہوں میں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ذرا کچھ کاموں میں پھنس گیا تھا۔ تم یہ بتاؤ کب مل رہی ہو؟''

''جب تم کہو۔''

''آج رات اسی پارک میں۔'' میں نے کہا۔ ''جہاں ہم ملا کرتے ہیں۔''

رقیہ نے ہاں کر دی۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک دوست سلیم کو فون کیا۔ اس کو بھی میں نے اسی پارک میں بلا لیا۔ میں نے اس سے ابھی کچھ نہیں کہا تھا۔

میں یہ چاہتا تھا کہ وہ آجائے تو اس سے بات کروں۔ ویسے وہ رقیہ کو میرے حوالے سے جانتا ہی تھا۔

دوسری شام مقررہ وقت پر دونوں آگئے۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے لیکن اس بات پر حیران بھی ہو رہے تھے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ ہم کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں سلیم کو ایک طرف لے آیا۔

''یار تم سے ایک کام ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں کہو۔''

''ایک بات بتاؤ۔ اس میں کوئی جھجکنے والی بات نہیں ہے۔ تمہیں رقیہ کیسی لگتی ہے؟''

''یہ کیسا سوال کیا ہے تم نے؟'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''کسی وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''جواب دو۔ کیسی لگتی ہے؟''

''ظاہر ہے بہت اچھی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بلکہ اچھی خاصی خوبصورت ہے۔''

''میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس سے عشق شروع کر دو۔'' میں نے کہا۔

''کیا فالتو بات کر رہے ہو؟'' وہ بھڑک گیا تھا۔

''اس میں بھڑکنے والی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں کسی مصلحت سے ایسا کہہ رہا ہوں۔ تم یقین جانو۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تم میری ناراضگی کا اندیشہ کرو۔ اس میں میری مرضی شامل ہے۔''

''لیکن کیوں؟'' وہ حیران ہوا جا رہا تھا۔

''یہ میں تمہیں بعد میں بتا دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''چلو رقیہ کے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں کسی کام کا بہانہ کر کے چلا جاتا ہوں۔ کچھ دیر میں واپس آجاؤں گا۔ تم اس دوران اس سے باتیں کر کے اسے اپنی طرف متوجہ کر لینا۔''

''یار میں تو حیران ہو رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مذاق ہے یا کیا ہے؟''

میں اسے اسی بینچ پر لے آیا جس پر رقیہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''میٹنگ ختم ہو گئی تم دونوں کی؟'' اس نے پوچھا۔

''یار۔ سلیم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' میں نے کہا۔ پھر سلیم کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں بیٹھو۔ میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں واپس آجاؤں گا۔''

اس سے پہلے کہ رقیہ کوئی سوال کرتی، میں اس پارک سے باہر آگیا۔ میں پھر اس کی طرف گیا ہی نہیں بلکہ گھر واپس آگیا۔ میں نے یہ سب اپنے دل پر پتھر رکھ کر کیا تھا۔ صرف محبت میں شدت پیدا کرنے کے لیے۔

اور واقعی ایک بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ تایا کا نسخہ کام کرنے لگا تھا۔ اپنی حماقت پر افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ دنیا میں کسی نے اپنی محبت کسی اور کے حوالے نہیں کی ہوگی۔ لیکن میں خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر آگیا تھا۔

جب رہا نہیں گیا تو میں نے رقیہ کا موبائل ملایا۔ اسی نے جواب دیا تھا۔

''سوری رقیہ۔'' میں نے کہا۔ ''میں پارک سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک جاننے والے مل گئے۔ انہوں نے میری جان عذاب میں کر دی۔ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' رقیہ نے کہا۔ ''تمہارے دوست تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت ہنسایا۔ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔''

''ہاں وہ ایسا ہی ہے۔ یہ بتاؤ۔ گھر واپس آگئی ہو؟''

''ابھی تو نہیں۔ ابھی ان کے ساتھ کھانا کھانے جا رہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

اس کے بعد مجھ سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔

پھر وہی ہوا جو اس قسم کے مشوروں پر عمل کرنے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ رقیہ نے مستقل طور پر مجھے چھوڑ دیا اور سلیم ہی کی ہو کر رہ گئی۔ میں نے بھی اس پر لعنت بھیج دی۔ مجھے سلیم پر غصہ تو بہت آیا تھا لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ غلطی تو خود میری تھی۔

میرا خیال تھا کہ میرے لیے اب زندگی میں کوئی چارم نہیں رہا۔ رقیہ کے بعد کسی اور کے آنے کی امید ہی نہیں تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک اور لڑکی آگئی۔ جمیلہ نام تھا

اس کا۔ میرے ساتھ ایک اور ٹریجڈی رہی ہے کہ مجھے ماڈرن نام کی کبھی کوئی لڑکی نہیں مل سکی قدسیہ۔ رقیہ۔ عفت آرا۔ اور اب جمیلہ۔

ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ کیسے کیسے خوبصورت ناموں کی لڑکیاں ہیں۔ زنوبیا۔ زوبی۔ سارہ اور نہ جانے کیا کیا۔ نہ اب مجھے جمیلہ ملی تھی۔ خیر وہ بھی غنیمت تھی۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔

جمیلہ بہت اچھی تھی۔ میں نے اس میں ایک بات محسوس کر لی تھی کہ وہ وفادار قسم کی لڑکی تھی۔ کیوں کہ اس نے زندگی بہت محرومیوں میں گزاری تھی اور جب محرومیاں ساتھ ہوں تو بے وفائی کا چانس ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے گھر میں اس کی ماں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اور میرے ساتھ بھی پوزیشن یہ تھی کہ ایسا کوئی بزرگ نہیں تھا کہ جس کو رشتے کی بات کے لیے بھیجا جاتا، سوائے تایا کے۔

میں ایک بار پھر ان کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے جب ان سے کہا کہ میں نے جمیلہ سے شادی کا ارادہ کر لیا ہے... تو بہت خوش ہوئے۔ ''ہاں یہ تم نے عقلمندی کی بات کی ہے۔'' تایا نے کہا۔ محبت بھی کی اور اب شادی کا ارادہ بھی کر لیا ہے۔ مجھے سن کر خوشی ہوئی۔ بتاؤ۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تایا۔ آپ وہاں میرے رشتے کی بات کرنے جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''کل شام پانچ بجے۔ میں نے جمیلہ سے بات کر لی ہے۔ اس نے اپنی امی کو بتا دیا ہے۔ دیکھیں بھولنا نہیں ہے۔ کل شام پانچ بجے۔ میں خود آپ کو لے جاؤں گا۔ میں تو اندر نہیں جاؤں گا لیکن دور سے آپ کو اس کا گھر دکھا دوں گا۔''

تایا کو بار بار یقین دہانی کی ضرورت اس لیے تھی کہ تائی کے انتقال کے بعد ان کی یادداشت بہت خراب ہو گئی تھی۔ کچھ یاد ہی نہیں رہتا تھا۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ میں جب تایا کو لینے ان کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ ابھی تک سو رہے ہیں۔ میں نے ہنگامہ کر کے جگایا تو معذرت کرنے لگے۔ ''یار کیا بتاؤں۔ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ بہر حال میں دس منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں۔''

اور تایا دس منٹ میں تیار بھی ہو گئے۔

میں اس دن بہت خوش تھا۔ زندگی میں پہلی بار محبت کسی انجام تک پہنچنے والی تھی۔ میں آوارہ گردی سے اب تنگ آ چکا تھا۔

تایا نے پرانی روایت کے مطابق راستے سے مٹھائی بھی لے لی تھی۔

جمیلہ کے گھر کے سامنے پہنچ کر میں نے گھر دکھا دیا۔

''وہ دیکھیں تایا۔ وہ گھر ہے۔ آپ جائیں میں سامنے والے ہوٹل میں انتظار کر رہا ہوں۔''

میں ہوٹل کی طرف اور تایا جمیلہ کے گھر کی طرف چل دیے۔ تایا کی واپسی ایک گھنٹے میں ہوئی تھی۔ اس دوران میں تین کپ چائے پی چکا تھا۔ تایا بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''تایا لگتا ہے خوشی کی خبر ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بیٹا۔'' تایا نہال ہو کر بولے۔ ''اگلے مہینے اس لڑکی سے میری شادی ہے۔''

''لڑکی سے شادی ہے؟'' میں حیران سا ہو گیا۔ ''آپ اپنی شادی کی کیا بات کر رہے ہیں؟''

''بیٹے جمیلہ نام ہے اس لڑکی کا۔ اسی سے میری شادی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ جمیلہ سے آپ کی شادی ہے؟''

''ہاں بھائی۔ تم ہی نے تو میرے رشتے کے لیے اس کے گھر بھیجا تھا۔ وہ لوگ مان گئے ہیں۔''

میں اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔

اور اس وقت ایک دل جلا ہوا قطعہ یاد آنے لگا تھا۔

رشتے کی بات کرنے کو بھیجا تھا شوق سے...... پر کیا کروں اپنی تو قسمت خراب ہے۔

خود ہی بیاہ لائے وہ میری جمیلہ کو...... تایا کے بھول جانے کی عادت خراب ہے۔

میں بھنا کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔

کئی دنوں کے بعد ایک دن راستے میں تایا سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا۔ ''بیٹے اب میری یادداشت بہت بہتر ہو گئی۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے تم کو محبت کے حوالے سے کہا تھا کہ تین باتیں یاد رکھنا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے تم کو دو باتیں بتا دی تھیں۔ یعنی محبت کے مکمل طور پر ہو جاؤ۔ ادھوری محبت نہ کرو۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ اپنا رقیب ضرور رکھو۔ اس سے محبت میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ اور تیسری بات آج بتا رہا ہوں کہ محبت کے معاملے میں کبھی کسی پر بھروسا نہ کرو۔ چاہے وہ تایا ہی کیوں نہ ہو۔''

وہ ہنستے رہے اور میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

زندگی کے رنگ

سرور اکرام

زندگی کے رنگ کتنے دلکش ہوتے ہیں... یہ وہی بتا سکتا ہے جس نے اس کی خوب صورتی... دلکشی اور رعنائی دیکھی ہو... وہ نہیں بتا سکتا جس کے حصے میں کبھی زندگی کے ان رنگوں نے اپنی بہار نہ دکھائی ہو... زندگی کی چمک دمک... رعنائی اور بدنمائی کو نمایاں کرتی ایک حساس پُراثر تحریر...

ہمارے معاشرے کی سوچوں اور احساسات کے
تاریک اور روشن پہلوؤں کی دردناک تصویر......

اس نے بچے کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔

بچے کی عمر تین چار ماہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بہت ستواں نقوش تھے اس کے۔ اور اس کی آنکھیں؟ ان آنکھوں میں ابھی سے جادو سا تھا۔ اتنی بڑی بڑی اور چمکتی ہوئی آنکھیں اس نے اب تک کسی بچے کی نہیں دیکھی تھیں۔

اس بچے کو سینے سے لگا کر لے جانے والی لڑکی کا نام ماہرہ تھا۔ وہ خود بھی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا تعلق ایک اوسط

فیملی سے تھا۔

سب پڑھے لکھے سفید پوش تھے۔ اس کے والد کسی فرم میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ اس کے دونوں بھائی ماسٹرز کر رہے تھے۔ خود اس کی ماں بھی اپنے زمانے میں انٹر کر چکی تھی۔ ماہرہ نے بھی ماسٹر کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس کی دلچسپی کچھ اور تھی۔ وہ لٹریچر میں ماسٹر کرنا چاہتی تھی۔ اس کی ابھی شادی طے نہیں ہوئی تھی۔ ویسے اس کے رشتے آ رہے تھے۔ اور ایک خوب صورت سی محبت اس کے ساتھ تھی۔

وہ محبت وقاص کی تھی۔ ماہرہ کی طرح وہ بھی ایک سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ ایک سوشل ورکر۔ اگرچہ اس کا سبجیکٹ بھی یہی تھا۔ لیکن وہ اپنے اندر سے بھی ایک ہمدرد نوجوان تھا۔ اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم بنائی تھی جس کا نام آکسیجن رکھا گیا تھا۔

بچے نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ ماہرہ نے اسے اپنے سینے سے کچھ اور قریب کر لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بچے کو کس طرح چپ کروائے۔ ہر طرف ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ گاڑیوں پر، بائیکس پر۔ پیدل۔ زندگی جیسے اچانک ہی انتشار کا شکار ہو گئی تھی۔

پے در پے بموں کے دو دھماکے ہوئے تھے۔ ان دھماکوں نے پورا ماحول پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ جیسے کوئی جادوگر اپنی چھڑی گھما کر سب کچھ بدل دیتا ہے۔ جہاں زندگی ہنس رہی تھی، بول رہی تھی۔ وہاں اب چیخیں تھیں۔ زخمیوں کی چیخیں۔ ایمبولنس کے سائرن۔ لوگوں کا شور۔ ایک قیامت سی تھی جو ہر طرف برپا ہو گئی تھی۔

ویسے آج کی صبح بھی ہمیشہ کی طرح بہت خوش گوار تھی۔ بادلوں کے سفید ٹکڑے آسمان پر اڑتے پھر رہے تھے۔ پرندے اپنی خوب صورت آواز کا سحر جگا رہے تھے۔ ہوائیں کئی دنوں کے حبس کے بعد اس صبح بہت خوش گوار ہو گئی تھیں۔

ماہرہ کو اپنے آفس جانے کے لیے کچھ دور تک پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔ وہاں سے اسے اس روٹ کی گاڑی مل جاتی جو اس کے دفتر تک جاتی تھی۔ وہ گھر سے اسٹاپ تک کے راستے کو انجوائے کرتے ہوئے چلتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک دوست انیسہ بھی ہوا کرتی۔ انیسہ اس کے گھر کے پاس ہی رہتی تھی۔ اسی لیے دونوں ایک ساتھ ہی جایا کرتیں۔ راستے میں اونچے نیچے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔

اسی جھنڈ کے ایک درخت کے نیچے ماہرہ کو ایک پرندے کا چھوٹا سا بچہ مل گیا تھا جو درخت کی شاخ سے نیچے گر پڑا تھا اور اپنی ننھی سی چونچ کھولے کوں کوں کر رہا تھا۔

اس کی ماں اپنے بچے کے لیے بے تاب ہو کر اڑتی پھر رہی تھی۔ کبھی وہ ایک طرف جاتی کبھی دوسری طرف۔ اور کبھی اپنے بچے کے گرد منڈلانے لگتی۔

وہ دونوں اس بچے کو دیکھ کر رک گئی تھیں۔ ماہرہ نے اپنے ہاتھوں پر اس بچے کو اٹھا لیا۔ ''انیسہ یہ بے چارہ اوپر سے گر گیا ہے۔ ادھر سے کوئی کتا یا بلی گزری تو اسے کھا جائے گی۔''

''یہ تو ہے لیکن ہم اس بے چارے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟'' انیسہ نے کہا۔

''ہم اسے اٹھا کر اس کے گھونسلے میں رکھ سکتے ہیں۔'' ماہرہ نے گھونسلے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھو زیادہ اونچا بھی نہیں ہے۔''

''درخت پر کیسے چڑھیں گے؟'' انیسہ نے پوچھا۔

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں درخت پر چڑھنا جانتی ہوں۔ تم بس کھڑی ہو کر دیکھتی رہو کہ کوئی اس طرف تو نہیں آ رہا۔ اور ویسے بھی کوئی آ گیا تو کیا فرق پڑے گا۔ ہم کون سا غلط کام کر رہے ہیں۔''

ماہرہ نے درخت پر چڑھنے میں بڑی مہارت دکھائی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ بچے کو اس کے گھونسلے میں رکھ کر نیچے اتر آئی تھی۔

''یار تو نے تو کمال ہی کر دیا۔'' انیسہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میری جان، میں نے بچپن میں بہت پریکٹس کی ہے۔'' ماہرہ نے بتایا۔ ''ہماری ننھیال میں پورا ایک باغ تھا جس میں سیکڑوں درخت لگے ہوئے تھے۔ ہم سب خالہ زاد ماموں زاد بھی سب کیا کرتے۔ درختوں کے درمیان جا کر چھپ جاتے۔ کئی بار چوٹیں بھی لگیں۔ لیکن یہ ہنر آ گیا۔''

''اور آج تیرا یہ ہنر معصوم پرندوں کے کام آ گیا ہے۔'' انیسہ نے کہا۔

''ہاں یار، اب تیز چلتے ہیں۔ دیر ہو رہی ہے۔''

سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ دفتر کے وہی معمولات جو ہوا کرتے ہیں۔ فلاں فائل کہاں ہے۔ فلاں اگریمنٹ سائن ہوا یا نہیں۔ سب کچھ ہمیشہ کی طرح۔ لیکن اس دن سب کچھ ہمیشہ کی طرح نہیں ہونے والا تھا۔

اس دن لاشیں گرنے والی تھیں۔ دہشت گردی ہونے والی تھی۔ موت کے ہرکارے اپنی آفتیں نازل

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کرنے والے تھے۔ کئی مائیں اپنی اولادوں سے اور کئی اولادیں اپنی ماؤں سے بچھڑنے والی تھیں۔

سب کچھ معمول کے مطابق ہونے کے باوجود بہت الگ تھا۔ آج انیسہ کو دفتر سے اپنے کسی رشتے دار کے ساتھ کہیں اور جانا تھا۔ اسی لیے وہ پہلے چلی گئی تھی۔ ماہرہ کو اکیلے ہی اس اسٹاپ کی طرف جانا تھا جہاں سے اسے اپنے روٹ کی گاڑی مل سکتی تھی۔

لیکن اس سے پہلے ہی بہت کچھ ہو گیا۔ ایک قیامت سی برپا ہو گئی۔ اتنے شدید دھماکے اس نے کبھی نہیں سنے تھے۔ وہ خود اڑ کر ایک طرف جا گری تھی۔ جیسے زمین نے اچھال کر پھینک دیا ہو۔

اس کے حواس غائب ہو چکے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ زمین اتنی بے رحم کیوں ہو گئی ہے۔ آسمان پر یہ گہرے گہرے کالے دھوئیں کی زنجیریں کیوں بن رہی ہیں؟

پھر اس نے کسی بچے کی آواز سنی۔ کوئی بچہ رو رہا تھا۔ بلند آواز سے۔ جو اس کے آس پاس ہی تھا۔

اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ خود اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ بس ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس بچے کی آواز نے اسے پوری طرح بیدار کر دیا تھا۔

وہ کھڑی ہو کر بچے کے پاس چلی گئی۔ اگرچہ اس وقت بھی اس کے پیر لرز رہے تھے۔ لیکن اس کے اعصاب اس کے کنٹرول میں تھے۔ وہ پیارا سا بچہ بے یارومددگار پڑا ہوا تھا۔

کوئی نہیں تھا اس کا۔ اگر کوئی ہوگا تو اس افراتفری میں نہ جانے کہاں ہوگا۔ ایمبولنس آرہی تھی۔ زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا اٹھا کر لے جا رہی تھی۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

ماہرہ کو خدشہ تھا کہ ممکن ہے کہ یہ بچہ کسی کے پیروں تلے آکر کچل کر ہلاک ہو جائے۔ رو رو کر اس بچے کا برا حال ہو رہا تھا۔ ماہرہ نے لپک کر بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس افراتفری میں اس کے والدین کی تلاش سے زیادہ اہم اس کی جان بچانا تھا۔ اس نے بچے کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ وہ ایک ایسے پرندے کا بچہ تھا جو اپنے گھونسلے سے گر پڑا تھا۔

☆☆☆

سب کا یہی خیال تھا کہ راشد بیوی کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے۔ اسے سوائے عافیہ کے اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ عافیہ کی محبت نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوسروں کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ راشد نے بڑی دعاؤں کے بعد عافیہ کو حاصل کیا تھا۔

کالج میں دونوں ایک ساتھ تھے۔ راشد اس وقت اس سے متاثر ہوا تھا جب عافیہ نے ایک ڈیبیٹ میں حصہ لیا تھا۔ موضوع بہت زبردست تھا۔

''ہمارے معاشرے میں انسانی حقوق کی ناقدری''

اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ man is a social animal لیکن بدقسمتی سے وہ صرف اینیمل رہ گیا ہے۔ سوشل ویلیوز ختم کر چکا ہے۔ اسی لیے بے دھڑک خون بہا دیتا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ جس کو مار رہا ہے۔ وہ کون ہے؟ کیا

ہے؟

عافیہ اور راشد کے خیالات ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ اسی لیے بہت جلد دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ ان کے گھر والوں کو بھی اس ملاپ پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

تھوڑی تگ و دو کے بعد دونوں کی شادی بھی ہو گئی۔ محبت کی زندگی شادی سے شروع ہوئی تھی۔ عافیہ، راشد کے لیے ایک بیوی بھی تھی۔ دوست بھی اور محبوبہ بھی۔ اسی طرح اسی قسم کی حیثیت عافیہ کی نگاہوں میں راشد کے لیے تھی۔

دونوں کو سمندر اور پہاڑوں سے عشق تھا۔ دونوں بادلوں اور پھولوں سے پیار کرتے تھے۔ دونوں زندگی کو خوب صورت اور مسکراتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

دونوں اس بات پر حیران ہوا کرتے کہ آخر انسان ایک دوسرے کا خون کس طرح بہادیتا ہے۔

خدا نے کتنے متضاد قسم کے انسان بنائے ہیں۔ ایک طرف تو ایسے لوگ ہیں جو کسی کو ٹھیس بھی لگ جائے تو اس کا دکھ برداشت نہیں کر سکتے۔ اور دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو زندہ انسانی جسموں میں ڈرل کر کے خوش ہوتے ہیں۔

انسان ایک طرف پھولوں کی سجاوٹ کے اعلیٰ ترین نمونے دکھا دیتا ہے تو دوسری طرف وہ انسانی کھوپڑیوں کے مینار بھی تعمیر کر دیتا ہے۔ یہ کیسا تضاد ہے؟

انتہائی خوب صورت دنوں کے درمیان ایک بیٹے کی پیدائش بھی ہو گئی۔ اس کا نام دونوں نے مل کر رکھا تھا۔ خیال۔ خیال راشد۔ یہ ایک منفرد نام تھا۔ ان کا بیٹا آنے والے خوب صورت دنوں کا خیال تھا۔ اچھی زندگی اور روشن سویرے کا خیال تھا۔ وہ تھا بھی کسی خوب صورت خیال کی طرح، نازک اور خوب صورت۔

اس دن دونوں خیال کے لیے شاپنگ کرنے گئے تھے۔ عید آنے والی تھی۔ خیال ابھی صرف تین مہینے کا تھا۔ وہ عافیہ کی گود میں تھا۔ دونوں شاپنگ سینٹر سے نکل کر روڈ کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک ایک دھماکا ہوا۔

دھماکا اتنا زبردست تھا کہ ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ایک قیامت تھی جو ان کے قریب ہی برپا ہوئی تھی۔ ہر طرف انسانی جسم بکھر کے رہ گئے تھے۔ لاشیں اور زخمی۔ چیخیں اور آہیں۔

راشد کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی محبوبہ، اس کی بیوی اس کی عافیہ کہاں ہے۔ خیال اس کی گود میں تھا۔ اب خیال کہاں ہے۔ وہ خود بے ہوش ہو گیا تھا۔ کوئی ایمبولنس اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

وہ دو دن تک اسپتال میں پڑا رہا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے عافیہ اور خیال کا خیال آیا تھا۔ لیکن ہزار تلاش کے بعد عافیہ کی لاش تو مل گئی تھی لیکن خیال کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔

☆☆☆

ماہرہ جب اس بچے کو لیے گھر پہنچی تو اس وقت گھر میں کہرام برپا تھا۔ سب گھر والے ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کو ان ہولناک دھماکوں کی خبر مل چکی تھی۔ ماہرہ کے ماں باپ اور دونوں بھائی گھر ہی میں تھے۔

اس کی دوست انیسہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ وقت سے پہلے دفتر سے چلی گئی تھی۔ اس نے دھماکے کی خبر ٹی وی پر سنی تھی۔ اس نے ماہرہ سے رابطہ کرنے کی بار بار کوشش کی لیکن ماہرہ کا نمبر بند مل رہا تھا۔

گھر والوں کا بھی ماہرہ سے کوئی رابطہ نہیں ہو پارہا تھا۔ دفتر سے معلوم ہوا تھا کہ ماہرہ اپنے وقت پر دفتر سے جا چکی ہے۔ انیسہ گھبرا کر ماہرہ کے گھر چلی آئی تھی۔

اسی وقت ماہرہ داخل ہوئی تو اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر خراشیں تھیں اور اس کی گود میں ایک بچہ تھا جو رو رہا تھا۔

سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے کہ وہ زندہ سلامت واپس گھر پہنچ گئی تھی۔

ماہرہ نے بچے کو اپنی ماں کے حوالے کر دیا۔ ''امی اس کو سنبھالیں۔ بھوکا ہے بے چارہ۔''

''کون ہے یہ؟''

''یہ انسان کی درندگی کا شکار ایک لاوارث بچہ ہے۔'' ماہرہ نے کہا۔ ''جس کو ابھی گناہ اور ثواب کا مفہوم بھی نہیں معلوم لیکن اس کو بم دھماکے کا سامنا کرنا پڑا ہے۔''

پھر اس نے بتا دیا کہ یہ بچہ اسے کہاں اور کن حالت میں ملا تھا۔

''اللہ انسان کو نیک ہدایت دے بیٹا۔'' اس کے باپ نے کہا۔

''بہت مشکل ہے بابا۔ انسان ہمیشہ سے وحشی تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنے

نظریات کے لیے دوسروں کا خون بہاتا رہے۔"

"ماشاء اللہ کتنا پیارا بچہ ہے۔" اس کی ماں نے افسوس کا اظہار کیا۔ "نہ جانے کس کی آنکھوں کا نور ہے۔"

"ماما یہ بھوکا ہے۔" ماہرہ نے کہا۔ "اس کے دودھ کا بندوبست کریں۔"

"اوہو۔ تمہیں تو اس کی فکر ہونے لگی ہے۔"

"ہاں ماما۔ کیونکہ میں ایک عورت ہوں۔ اور خدا نے عورت کو پیدا ہی ماممتا کے جذبے کے ساتھ کیا ہے۔" ماہرہ نے کہا۔

ماہرہ کی ماں نے اسی وقت اپنے بیٹے کو بازار بھیج کر دودھ منگوالیا تھا۔

ایک سوال ان کے ذہنوں میں رینگ رہا تھا کہ اس بچے کا کیا کیا جائے۔ اسے اسی گھر میں رکھا نہیں جا سکتا تھا۔ کون پرورش کرتا اس کی۔

"اس کے لیے اخبار میں اشتہار دینا ہوگا۔" ماہرہ کے باپ نے کہا۔ "اس کے علاوہ اس کو ٹریس کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"اگر اس پر بھی اس کے والدین کا پتا نہ چل سکا تو؟" ماہرہ کے ایک بھائی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھائی۔ پھر میں اس کی پرورش کروں گی۔" ماہرہ کے لہجے میں اعتماد تھا۔

بچہ اسی گھر میں پرورش پاتا رہا۔ ماہرہ نے اس کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لی تھی۔ اس کو فیڈ کرانا، اس کی صفائی۔ سب وہی کیا کرتی۔ بالکل کسی ماں کے خوب صورت اور ان تھک جذبے کے ساتھ۔

اس کے باپ نے اخبار میں اشتہار بھی دیا۔ لیکن بچے کے والدین کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔

دوسری طرف ماہرہ کے لیے دشواریاں شروع ہو گئیں۔ پہلے تو دبی دبی سرگوشیاں تھیں۔ پھر کھل کر یہ بات کہی جانے لگی۔ عورتیں جب اکٹھی ہوتیں تو عام طور پر اسی موضوع پر بات ہوتی۔

"ارے میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ اس لڑکی کے تیور کچھ اور ہیں۔ دفتر میں کام تو سب ہی کرتی ہیں۔ لیکن اس کے لباس دیکھتی ہو۔"

"ہاں۔ نئے نئے فیشن کے ڈریسیز پہنتی ہے۔ کیسی کیسی کٹنگ ہوتی ہے اس کے ڈریس کی۔"

"ظاہر ہے پھر تو یہ سب ہونا ہی تھا۔ جواب سامنے آیا ہے۔"

ماہرہ کے والدین کو ان الزامات کا پتا چل گیا۔ اس کی ماں نے ایک دن ماہرہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو بیٹا۔ انسان کی نیت اور اس کے افعال تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن ہمارا یہ معاشرہ بہت ہی کمینہ ہے۔ خدا جانے محلے والے اس بچے کے حوالے سے کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں امی۔ میں نے بھی یہ باتیں سنی ہیں۔" ماہرہ نے کہا۔ "لیکن ہم لوگوں کے حصے میں اللہ جو نیکیاں لکھ رہا ہے، ان لوگوں کی باتوں میں آکر ہم اس سعادت سے محروم ہو جائیں۔ یہ بہت بڑا ثواب ہے ماما۔ اور اس ثواب کے لیے خدا نے ہمارے گھر کا انتخاب کیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا۔ لیکن اس کا اثر کیا ہو رہا ہے۔ ان کمینوں نے تمہیں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔"

"ماما۔ تو کیا ہم ان لوگوں کے خوف سے اپنی نیکی کو بھول جائیں۔ نہیں ماما۔ مجھے اس بچے سے انسیت ہو گئی ہے۔ میں اسے گھر سے جانے نہیں دوں گی۔"

"اور اگر اس کے وارث سامنے آگئے تو؟"

"وہ ایک دوسری بات ہوگی۔ لیکن اس طرح محلے والوں کے ڈر سے تو میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔"

ماہرہ کو اندازہ نہیں تھا کہ زندگی اس کے لیے کتنی دشوار ہو جائے گی۔ اس کے رشتے آنے بند ہو گئے۔

ایک بار نامر نام کے ایک شخص کا رشتہ آگیا۔ وہ پڑوس کی کسی عورت کا رشتے دار تھا۔ اسے اس بچے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اسے کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔

ماہرہ کے گھر والوں نے اسے ایک شام بلا لیا تھا۔ ماہرہ کو بھی وہ بہت معقول دکھائی دیا۔ پھر اس نے ایک ایسی بات کہی کہ ماہرہ غصے سے بھڑک اٹھی تھی۔

اس نے کہا تھا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے اس بچے کو اپنا کر ایک بڑا کام کیا ہے۔ میں تو تیار ہوں۔ لیکن سوال صرف میرا نہیں پورے معاشرے کا ہے۔ خاندان کا ہے۔"

"تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟" ماہرہ نے تلخ ہو کر پوچھا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔"

"چلیں وہ بھی بتا دیں۔"

"میں ایسے کئی اداروں سے واقف ہوں جہاں اس

قسم کے بے سہارا بچوں کی بہت مناسب دیکھ بھال کی جاتی ہے۔"

"ناصر صاحب! پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بے سہارا نہیں ہے۔ اللہ اس کے ساتھ ہے اور میں اس کا سہارا ہوں۔ یہ میرے ساتھ ہی رہے گا۔ اگر آپ اس شرط پر میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ خدا حافظ۔"

ماہرہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

اس رات وہ بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ کیا ہو رہا تھا یہ سب؟ کیا لوگ ایسے ہو گئے تھے کہ کسی بے سہارا بچے کو اپنانے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ اس کو اپنا نام بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ معاشرہ کیا کہے گا۔ کیا سوچے گا۔ کون ہوتا ہے یہ معاشرہ۔ کیا ایسے نام نہاد شریفوں کے معاشرے سے خوف زدہ ہو کر کوئی اچھا کام نہ کیا جائے؟ اس کا قصور ہی کیا تھا؟ اس کی زندگی تو ٹھیک ٹھاک گزر رہی تھی۔ پھر ایک حادثہ اس بچے کو اس کے پاس لے آیا اور وہ اسی بچے کی ہو کر رہ گئی۔

اب وہ چار سال کا ہو گیا تھا۔ جس وقت اس کے پاس آیا تھا۔ اس وقت وہ کتنا چھوٹا سا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ماہرہ نے کس طرح اس کی پرورش کی تھی۔ وہ اس کی اولاد نہیں تھی۔ پھر بھی اس کی روح بن کر رہ گیا تھا۔

اب لوگ اس سے کہہ رہے تھے کہ وہ اس بچے کو خود سے الگ کر دے۔ ورنہ شادی نہیں ہوگی۔ کوئی اسے نہیں اپنائے گا۔ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے گا۔

وہ ایسا نہیں کرے گی۔ چاہے زندگی اسی طرح گزر جائے۔

گھر والے اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے کہ پھر ایک رشتہ آ گیا۔ کسی ایسے آدمی کا تھا جس کی بیوی مر چکی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ ہی ہوگی۔

اس کی امی نے سمجھایا۔ "دیکھو بیٹا، اس کو انکار مت کرنا۔ اور نہ ہی اس کے سامنے بچے کا ذکر کرنے بیٹھ جانا۔ ہم اس کی پرورش کے لیے ابھی زندہ ہیں۔ تم بس اپنی زندگی دیکھو۔"

ماہرہ نے کچھ نہیں کہا۔

دوسری شام کو وہ شخص اکیلا ہی آیا تھا۔ ماہرہ کو پہلی نظر میں وہ ایک معقول شخص دکھائی دیا۔ ماہرہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک بڑی فرم میں ایک اچھے عہدے پر ہے۔ ماہرہ اسے اپنے بارے میں بتاتی رہی۔ اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔

اسی دوران وہ بچہ دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

اس کے ہاتھ میں ایک کھلونا گاڑی تھی۔ "مما یہ دیکھیں، میری گاڑی ٹوٹ گئی ہے۔"

ماہرہ سن سی ہو کر رہ گئی۔ اس شخص سے جس بات کو چھپایا جا رہا تھا وہ اچانک سامنے آ گئی تھی۔

"یہ...... یہ بچہ۔" اس نے ہکلا کر کہا۔ "مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کی شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"آپ کو ٹھیک ہی بتایا گیا تھا۔" ماہرہ نے کہا۔ "یہ بچہ مجھے قدرت نے انعام کے طور پر دیا ہے۔ اب سے چار سال پہلے ایک بم بلاسٹ ہوا تھا۔ یہ بچہ مجھے ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے بے بس پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اس کو اٹھا لیا تھا۔ اور اب تک اس کی پرورش کر رہی ہوں۔ یہ ہے اس بچے کی کہانی۔"

"تم یہ بتاؤ کہ یہ بچہ تمہیں کس شاپنگ سینٹر کے سامنے ملا تھا؟" اس نے جذباتی ہو کر پوچھا۔

"اس شاپنگ سینٹر کا نام نورین شاپنگ سینٹر ہے۔" ماہرہ نے بتایا۔

اچانک اس نے رونا شروع کر دیا۔ "یہ...... یہ میرا ہی بچہ ہے۔" اس نے روتے روتے کہا۔ "اس منحوس دن میں اور میری بیوی اس بچے کے ساتھ شاپنگ کرنے گئے تھے کہ اچانک ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اس قیامت میں میری بیوی جان سے چلی گئی۔ یہ بچہ اس کے ہاتھ سے گر گیا ہوگا۔ میں نے بہت تلاش کیا۔ بیوی کی لاش تو مل گئی تھی لیکن یہ نہیں ملا تھا۔"

"میرے اللہ...... یہ کیسا اتفاق ہے۔" ماہرہ نے کہا۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس وقت بھی اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔

اب وہ بچہ دس سال کا ہو چکا ہے۔ زندگی ایک راستے پر آ گئی ہے۔ اس بچے کو ماں کی صورت میں ماہرہ اور باپ کی صورت میں حقیقی باپ مل چکا ہے۔

لیکن ماہرہ اب بھی یہ سوچتی ہے کہ ایسے نہ جانے کتنے بچے ہوں گے جن کے ماں یا باپ کو کسی بم دھماکے نے ان سے الگ کر دیا ہوگا۔

کسی کے پاس اس سوال کا جواب ہے؟

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

قسط نمبر: 50

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو تلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو تلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڑیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو تلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تلسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھونک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا

تھا۔ سی جی بجھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور گبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بجھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بجھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریئلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بجھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور گبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانجے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے گبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور بینکاک ائرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ وزیر خان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپاکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپاکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپاکو [illegible] کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ شہزی، روڈلف کے ساتھ کیٹ اور روجینٹ کو زخمی کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''پستول ...... ہے تمہارے پاس بڑی؟''

روڈلف نے مجھے محتاط انداز میں کھڑے ہوتے دیکھ کر ہولے سے پوچھا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنے ایک ہاتھ سے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بغیر آواز پیدا کیے دروازے کی طرف لپکا۔

گڑبڑ کا احساس وہ دبی دبی کچھ آوازیں تھیں جس سے مجھے کسی غیر معمولی پن کی بھنک محسوس ہوئی تھی۔ جیسے کوئی کسی کو زدوکوب کررہا ہو اور ان آوازوں میں گھبراہٹ بھی شامل تھی۔

میں دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک دروازہ دھڑ سے کھلا اور میں تیزی سے اس کے عقب میں سائڈ کی دیوار سے چپک گیا۔ ایک شخص ہاتھ میں لمبی نال والا پستول لیے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا، یہ سائلنسر تھا۔ اس نے دائیں بائیں محتاط انداز میں دیکھا۔ جب اس کی نظریں سامنے بیڈ پر دراز روڈلف پر پڑیں تو بلا دیر اس نے ٹریگر دبا دیا۔

اس کے سائلنسر لگے پستول سے ہلکی ''چززز'' کی آواز برآمد ہوئی، میں ابھی اس پستول بدست پر حملہ کرنے کی درست پوزیشن میں نہیں تھا، گولی چلی، نشانہ روڈلف ہی تھا جو خود بھی تھوڑا اُٹھ کر اسی طرف دیکھ رہا تھا، اس نے فوراً اس نووارد پستول بدست شخص کو دیکھتے ہی بیڈ سے یک دم پلٹ کر خود کو نیچے گرالیا۔ پستول بدست نے اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر روڈلف پر دوبارہ خاموش فائر کرنے کے جوش میں تھوڑا اور اندر سرک آیا تو میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔

میرے دائیں ہاتھ کی مخصوص انداز کی ضرب اس کے پستول والے ہاتھ پر پڑی اور بائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی کنپٹی پر لگا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور وہ حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج کرتے ہوئے چند قدم لڑکھڑا کر گر پڑا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے، اسی حملہ آور کے عقب میں بھی کسی کی جھلک دیکھی ..... اس کے ہاتھ میں بھی ایسا ہی سائلنسر لگا پستول تھا۔

''خبردار ......! اب کوئی حرکت مت کرنا۔'' اس کے حلق سے وحشیانہ غراہٹ برآمد ہوئی۔ میں اپنی جگہ جامد ہو کر رہ گیا۔

''اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کرلو۔'' اس نے تحکمانہ درشتی سے دوسرا حکم صادر کیا۔ تب تک پہلا والا اس کا ساتھی اپنا معزوب سر جھٹکتا ہوا، سنبھلنے کی کوشش میں تھا۔ کنپٹی پر لگنے والے میرے گھونسے نے اسے بری طرح ہلا کر رکھ ڈالا تھا۔

تب ہی اچانک ایک تیسرے شخص کو دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بینکاک کا ...... ''ہُوا'' ...... اور تھائی لینڈ کا ایک بڑا ڈان کاسپاکو تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے بھینسے جیسی جسامت کے ساتھ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے کھڑا میری طرف قہر بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین لیس اسٹیل کا خطرناک پسٹل چمک رہا تھا جس کی نال کا رخ میری جانب ہی تھا۔ اس کی شعلے برساتی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور چربیلا چہرہ غصے اور طیش کے مارے سرخ اور کریہہ انگیز دکھائی دیتا تھا۔

''شہزی! تم نے ذرا بھی حرکت کی تو ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر تمہاری پیشانی میں سوراخ کردوں گا۔'' وہ کسی خونخوار بھینسے کی طرح ہی ڈکرا کے بولا۔ اس کی آواز اور لہجے سے انتقام اور خطرناک عزائم کی بُو آرہی تھی۔

میرے کتنے ہی دشمن تھے جو جگہ جگہ بُوگیر کتوں کی طرح میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے، بلاشبہ ان میں کاسپاکو اور اس کے خونی ہرکارے بھی شامل تھے۔ لیکن خود بہ نفسِ نفیس کاسپاکو کو سامنے دیکھ کر میرے رگ و پے میں لمحہ بھر کو ہی سہی، پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ اس کی وجہ شاید روڈلف کا زخمی حالت میں اس کمرے میں موجود ہونا تھا اور وہ کاسپاکو جیسے سفاک بھیڑیے کا پہلا اور ٹاپ ٹارگیٹڈ شکار بھی تھا۔

''تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میرے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہیں اور میں نہتا بھی ہوں۔''

میں نے بظاہر پُرسکون آواز میں کہا، جبکہ میرے تنے ہوئے وجود میں آمدِ طوفان کا سا ارتعاش طاری تھا۔ میں کسی چوکنّے چیتے کی طرح اس بھیڑیے کو پچھاڑنے کی تدبیر پر غور کررہا تھا۔

''اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' کاسپاکو بھیڑیے سے مُشابہ آواز میں غرا کر بولا۔ ''اسی طرح باہر آجاؤ ......''

وہ پھر زہرخند آواز میں تحکمانہ درشتی سے بولا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

اس کے دوسرے پستول بدست ہرکارے نے بھی ہنوز مجھے گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا جبکہ اس کا پہلا والا معزوب ہرکارہ جو اَب تک خود کو سنبھال چکا تھا، اس نے اپنا گرا ہوا پستول سنبھالتے ہی روڈلف کو بھی گن پوائنٹ پر لے لیا تھا، میں نے ذرا گردن موڑ کر اس کی یہ کارگزاری

دیکھی تھی۔

روڈلف بے چارہ اس کے خاموش پسٹل کی چلائی ہوئی گولی سے بچ تو گیا تھا مگر نرغے سے نکل نہیں سکا تھا۔ اس مذکورہ بدبخت ہرکارے نے موقع ملتے ہی اسے بھی میری طرح مغلوب کر ڈالا تھا۔

کمرے سے باہر آ کر مجھے اور روڈلف کو ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ روڈلف زخمی تھا اور اس کے لیے کھڑا ہونا محال تھا اسی لیے..... وہ دیوار کے ساتھ اپنی پشت لگائے فرش پر بیٹھ چکا تھا۔ یاسمین خانم کے منگیتر ڈاکٹر حماد نے اس کی مائنر سرجری کر کے گولی نکال لی تھی، اسی لیے روڈلف کا اُوپری بدن برہنہ تھا اور نیچے لفافہ ٹائپ شلوار تھی۔

پہلے والے ہرکارے کی چلائی ہوئی گولی سے بچنے کے لیے وہ اپنے بیڈ سے ایک دم لڑھک کر نیچے فرش پر گر پڑا تھا جس کے باعث اب اس کے زخم پر لگی پٹی سرخ ہونے لگی تھی۔ وہاں سے اب خون رسنے لگا تھا۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے کاسپاکو......!'' میں نے کہا۔ اشارہ روڈلف کی طرف تھا۔ ''اسے بیڈ پر......''

''شٹ اَپ......'' کاسپاکو ایک گونجدار دہاڑ کے ساتھ بولا اور میری آواز حلق میں ہی دب گئی۔ تب ہی کاسپاکو نے اپنے ایک ہرکارے کو کوئی مخصوص اشارہ کیا تھا، جس نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو خفیف سی اثباتی جنبش دیتے ہوئے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے سائلنسر لگے پستول کو اس کی طرف بڑھا دیا، جسے کاسپاکو نے اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیا...... اپنا خطرناک پسٹل آرسنل وہ اپنے بائیں ہاتھ میں منتقل کر چکا تھا۔

میری دھڑکتی نظریں اس کی ہر حرکت پر مرکوز تھیں اور یکلخت میری کنپٹیوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

''میں ابھی اسے اس مشکل سے نجات دلائے دیتا ہوں......'' کاسپاکو نہایت سفاکی سے بولا اور ہرکارے سے لیا ہوا پستول دائیں ہاتھ میں تھامتے ہی اس کی لمبی نال کا رخ... دیوار سے پشت لگائے زخمی روڈلف کی طرف کر دیا۔ مارے دہشت کے روڈلف کا منہ کھل گیا، آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، یقینی اور صرف ایک پل کے فاصلے پر کھڑی موت کو سر پر دیکھ کر اس کے چہرے کی رنگت بھی زرد پڑ گئی تھی۔

''نن...... نہیں...... کاسپا......'' میرے منہ سے ابھی اتنا ہی برآمد ہو سکا تھا کہ سائلنسر لگے پستول سے یکے بعد دیگرے دو خاموش فائر ہوئے، دو شعلے چمکے اور روڈلف کا سینہ خون سے تر ہو گیا۔

میرے پورے وجود میں کرب کی لہر دوڑ گئی، دل دکھ کے شدید احساس سے بھر گیا اور میں جیسے سب کچھ بھلا کر روڈلف پر جھک گیا۔ پھر اکڑوں بیٹھ کر اسے سنبھالنے لگا اور ساتھ ہی گردن موڑ کر کاسپاکو کی طرف خوف ناک نظروں سے گھور کر پورے جسم و جاں کی طاقت سے اس قدر دہاڑ کر بولا کہ میری آواز تک پھٹ گئی۔

''کاسپاکو...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا......''

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے نفرت و غیظ کے شعلے پھوٹنے لگے تھے۔ کاسپاکو کے مکروہ چربیلے چہرے پر سفاکانہ مسکراہٹ اور میچی میچی آنکھوں سے کینہ پروری کی چمک ہویدا ہو رہی تھی۔

''شش...... شہزی......!''

روڈلف نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ مجھے پکارا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مم...... ماریا سے ضرور ملنا...... اُسے بتا دینا...... کہ...... مم...... اب......'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ موت کا خوفناک سایہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

میرے چہرے سے کرب انگیزی مترشح تھی، حلق میں رقت سی اُترنے لگی تھی۔

''ورنہ وہ...... بب...... بے چاری میرا انتظار ہی کرتی......'' وہ جملہ پورا نہ کر پایا اور...... اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے، گردن موڑ کر سامنے کھڑے اس درندہ صفت کاسپاکو کی طرف بڑی خوف ناک نظروں سے دیکھا اور پھر روڈلف کے بے سدھ وجود کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا کاسپاکو......!''

''تمہیں اس کا افسوس نہیں ہونا چاہیے...... یہ تو میرا پرانا شکار تھا اور تم نے اسی کے ساتھ ہی تو مل کر میرے منہ سے نوالہ چھیننے کی کوشش کی تھی۔'' کاسپاکو بولا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی تھی۔''

''بس......!'' اس نے وہ پستول دوبارہ اپنے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

''اب یہ کہانی ختم کرو...... اور آگے چلو...... ورنہ تمہارا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔''

کاسپاکو سے اب بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے ایک غمزدہ سی نظر مردہ روڈلف پر ڈالی۔ جس کا سر سینے کی جانب جھکا ہوا تھا اور سینے سے اس کے ہنوز بھل بھل خون جاری تھا۔

میرے تصور میں روڈلف کا ہنستا مسکراتا چہرہ اُبھر آیا۔ اس کی زندہ دلی کی باتیں اور مسکراتے جملے میری زخمی سماعتوں میں گونجنے لگے۔ اس کا مخصوص انداز میں مجھے پکارنا۔

''ہے بڈی......! تم نے ہی تو میرے اندر جینے کی اُمنگ جگائی ہے۔ ورنہ تو میں زندگی سے ہی مایوس ہوگیا تھا۔ میرے دل میں اپنی بیوی ماریا، بیٹے انتونی اور بیٹی جولی سے ملنے کی چاہت اب اور بھی زور پکڑ گئی ہے۔''

جب ہم بینکاک میں تھے، وہ اکثر اپنی بیوی بچوں کی باتیں کرتا تھا۔

یہی نہیں اس نے میرے ساتھ امریکا پہنچ کر عابدہ کی رہائی وغیرہ کے سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کرنے کے عزم کا بھی اظہار کیا تھا۔

درمیان میں یاسمین خانم والے پُراسرار معاملے میں میری اس سے غلط فہمی ہوگئی تھی، جو اس نے فوراً ہی رفع کر دی تھی، یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ اس کے مرنے سے پہلے ہمارے دل صاف ہوگئے تھے، ورنہ میرے دل میں کسک باقی رہتی۔

ایک طرح سے یاسمین خانم والے معاملے میں بھی اس کا مقصد میری مدد کرنا ہی تھا۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ امریکا میں لولوش جیسا دشمن بے چینی سے میرا منتظر بیٹھا تھا۔ وہ مجھے اس موذی سے نبردآزما ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش میں تھا کہ میں کم ازکم لولوش کے معاملے میں...... اسے کوئی عام انسان سمجھنے کی غلطی نہ کروں۔

''کوئی فائدہ نہیں اس کا غم کرنے کا۔ آخری بار کہہ رہا ہوں...... آگے بڑھو......''

میں نے ایک نگاہ اس کے مکروہ چہرے پر ڈالی اور نفرت وغیظ کی ایک لہر سی اپنے اندر اُٹھتی محسوس کی اور ناچار آگے قدم بڑھا دیے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ان رذیلوں نے یاسمین خانم اور اس کے منگیتر حماد کا کیا حشر کیا تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ دونوں سونے کے لیے جا چکے تھے۔

مجھے جس کمرے میں لایا گیا تھا، وہ نشست گاہ تھی، وہاں روشنی تھی۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے چونکنا پڑا تھا۔ میں نے وہاں صرف یاسمین خانم کو بے ڈھنگے انداز میں نفیس قسم کے آرام دہ صوفوں کے درمیان قالین پر پڑے پایا۔ اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا، میں زخم کے اس نشان کو صحیح طرح نہیں دیکھ پارہا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ اسے کوئی معمولی چوٹ لگی تھی یا گولی......

پتا نہیں وہ زندہ تھی یا بے ہوش...... تاہم میری کھوجتی نظروں نے اس کے وجود کو مزید ٹٹولنے کی کوشش چاہی تھی کہ شاید کہیں اور بھی کوئی زخم کا نشان نظر آجاتا۔

ایک اُلجھن مجھے ڈاکٹر حماد کے سلسلے میں بھی ضرور محسوس ہوئی تھی کہ وہ کہاں تھا......؟

وہاں دو ہرکارے اور بھی موجود تھے، جنہیں میں فوراً ہی پہچان گیا تھا۔ یہ اسی کے بینکاک والے ساتھی تھے۔ وہ دونوں کاسپاکو کے مخصوص اشارے پر فوراً ہی حرکت میں آگئے، ایک نے اپنے کوٹ کی جیب سے رسی نکالی اور...... مجھے رسن بستہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ دوسرے نے مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوکے اپنی گن تان لی۔

مجھے تین مسلح ہرکاروں نے گن پوائنٹ کی زد میں لے رکھا تھا جبکہ کاسپاکو نے بھی اپنا خطرناک آرسنل پسٹل مجھ پر تان رکھا تھا۔ یہ لوگ بے حد محتاط نظر آرہے تھے۔ انہوں نے سیاہ اور گرے کلر کے کوٹ سوٹ پہن رکھے تھے، جبکہ کاسپاکو نے اپنے بھینسے جیسے وجود پر بھی ہلکے سبز رنگ کا سوٹ ''پھنسا'' رکھا تھا۔

ان کا چوتھا ساتھی نائیلون کی ڈوری تھامے میری طرف بڑھا۔ میرے دونوں ہاتھ ہنوز سر سے بلند تھے۔

''اپنے ہاتھ نیچے کرو......'' اس نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کی جانب کر دیے۔ میرا بدستور تیزی سے کام کرتا ہوا ذہن، ان کی گرفت سے آزاد ہونے کی تدبیر سوچنے میں محو تھا مگر میں محض سوچتا ہی رہ گیا اور وہ مجھے رسن بستہ کر چکا تھا۔

اُس خبیث نے میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے باندھ دیے تھے۔ پھر یہی کام اس نے قالین پر بے سُدھ پڑی یاسمین خانم کے ساتھ بھی کیا تو مجھے اس کی طرف سے کچھ تسلی ہوئی کہ وہ زندہ تھی، وہ شاید اسے بھی میری طرح اپنے ساتھ ہی کہیں لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔

میرے رسن بستہ ہوتے ہی انہوں نے اپنے پسٹل

فوراً جیبوں میں ٹھونس دیے۔
اس کے بعد چوتھے ہرکارے نے مجھے دروازے کی طرف دھکیلا...... ایک نے بے ہوش یاسمین کے وجود کو اپنے کندھے پر اُٹھالیا تھا۔
میں اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے ان سمیت دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔
ایک بڑے سے گیٹ سے گزر کر ہم باہر نکل آئے۔
یہاں دو چمکتی ہوئی کاریں کھڑی تھیں۔ میں نے بغور ان کا جائزہ لیا۔ دونوں ہی مجھے کرائے کی محسوس ہوئی تھیں کیونکہ سائز اور شیپ میں یہ دونوں کاریں ایک جیسی تھیں اور ان کی نمبر پلیٹوں سے بھی کچھ اسی طرح کی مجھے بھنک پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔
بنگلے کے گیٹ کے سنگِ مرمر والے ستونوں پر نصب گلوب روشن تھے۔
یہ سب لوگ پھرتی کے ساتھ دونوں گاڑیوں میں سوار ہوئے۔
میرے دونوں ہاتھ باندھنے کے باوجود یہ مجھ سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے تھے۔
جس کار میں کاسپا کو سوار ہوا تھا۔ اسی میں مجھے سوار کرایا تھا۔ ایک میرے دائیں جانب عقبی نشست پر بیٹھ گیا تھا اور دوسرے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی، کاسپا کو اسی کے برابر والی سیٹ پر ٹھنسا بیٹھا تھا۔ باقی دونوں ہرکارے دوسری... کار میں سوار ہو گئے تھے۔ یاسمین کو انہوں نے اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔
ذرا ہی دیر بعد دونوں کاریں اسٹارٹ ہوئیں اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئیں۔
کاسپا کو میری تلاش میں بینکاک سے یہاں منیلا پہنچ چکا تھا، جس کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا، کیونکہ اس سے پہلے بھی میرا اس کے ساتھیوں سے ٹکراؤ ہو چکا تھا، جو مجھے اپنے ساتھ ایک ٹھکانے پر لے گئے تھے اور وہیں مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کا باس بھی بینکاک سے یہاں منیلا پہنچنے والا تھا لیکن......
مجھے اس بات کی بالکل بھی توقع نہ تھی کہ وہ اچانک یاسمین کے اس بنگلے پر شب خون مارے گا، بھلا اسے یہاں کا کیسے علم ہوا تھا؟ اور یہ بھی کہ میں بھی اسی بنگلے میں موجود تھا مگر دوسرے ہی لمحے میرے تیزی سے کام کرتے ذہن میں ایک خیال ''کلک'' ہوا۔
مجھے یاد آیا جب سے جی کو ہارا ہمیں یرغمال بنا کے اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا تو ایک ویرانے میں اس کے ایک ساتھی کو ایک کار پر شبہ ہوا تھا کہ وہ ان کے تعاقب میں تھی۔ کیا خبر وہ کاسپا کو کے ساتھیوں کی ہو...... جو میری تلاش میں منیلا کا کونا کونا چھانتے پھر رہے تھے۔
رات کافی سے زیادہ بیت چکی تھی، سڑک تقریباً ویران ہی نظر آ رہی تھی۔ دونوں کاریں ایک دوسرے کے آگے پیچھے سنسان سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھیں۔
مجھے رہ رہ کر روڈلف کی اس طرح اچانک اور غیر متوقع موت پر افسوس ہو رہا تھا اور دل و دماغ بالکل بوجھل سا تھا۔ اعصاب ہنوز میرے تنے ہوئے تھے مگر جان بے جان سی محسوس ہوتی تھی، روڈلف کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔
اس کا میرا جتنا بھی ساتھ رہا، وہ بھائیوں جیسا ہی رہا۔ اس کا مجھے بار بار لولوڈش کی جانب سے محتاط کرنا اور اس سے ٹکراؤ کے لیے مخصوص تیاری کے لیے نصیحتیں کرنے کا پُرفکر انداز یاد آئے جا رہا تھا۔ اس کا سارا زور اسی بات پر ہی ہوتا کہ میں لولوڈش کو اپنے دوسرے خطرناک دشمنوں کی طرح کمزور نہ سمجھوں نہ ہی اسے لائٹ لینے کی کوشش کروں......
مجھے روڈلف سے بس ایک ہی اختلاف رہتا تھا کہ وہ لولوڈش کو کوئی ماورائی شخصیت سمجھتا تھا۔ اس کا زور اسی بات پر ہوتا تھا کہ میں بھی اس کے لیے ''کیل کانٹے'' پہلے سے تیار رکھوں جو اسی انداز کے ہوں...... شاید وہ بے چارہ اسی لیے...... یاسمین والی مہم میں مجھے شریک کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا اور میں نے اسے غلط سمجھا تھا۔
جانے کیا بات تھی کہ اب روڈلف دنیا میں نہ رہا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ اس کی باتیں قابلِ غور ہی نہیں بلکہ لائقِ عمل بھی تھیں۔
نجانے بعض چیزوں کا اثر بعد میں کیوں ہوتا ہے۔ جب کوئی ایسا اچانک اور غیر متوقع واقعہ رونما ہو جائے، تب ہی احساس ہوتا ہے کہ اس سے جو تھا وہ غلط نہ تھا، اسی طرح مجھے روڈلف کی لولوڈش سے متعلق بتائی گئی باتوں کی اثر پذیری کا احساس اب ہو رہا تھا۔
یوں میرے دشمنوں نے منیلا کو بھی میرے لیے شہرِ خرابہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ کاسپا کو اچانک آن ٹپکا تھا، اگرچہ اس کا ''ٹپکنا'' غیر متوقع نہ تھا، دوسری طرف سے جی کو ہارا الگ یہاں میری تلاش میں بھوکے بھیڑیے کی طرح سرگرداں تھا۔ پتا نہیں اور کتنے میرے جاں نثار ساتھیوں کا ان کے ہاتھوں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ابھی باقی تھا۔
''ان لوگوں کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا......؟''

اچانک کاسپاکو نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کن لوگوں کی بات کر رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، وہ اپنے طور پر اندازہ قائم کرتے ہوئے خود ہی جواب میں بول پڑا۔

''شاید یہ دونوں مرد عورت تمہارے اور روڈلف کے ساتھی بن چکے تھے اور تم لوگوں نے وہ مجسمہ اُڑانے کا مشترکہ پلان بنا رکھا تھا اور...... انہی لوگوں نے ہی کیپٹن رانسے کو بھی ہلاک کیا تھا مگر دیکھ لو، میرے آدمی سائے کی طرح یہاں بھی تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے اور بالآخر تمہیں چھاپ لیا۔ تمہارے ساتھیوں سمیت......'' اس کے لہجے میں طاقت کا زعم اور غرور صاف عیاں تھا۔

''مسٹر کاسپاکو......!'' میں نے نہایت... سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کاش! تم مجھ سے متعلق اپنی تمام قیاس آرائی کو ایک طرف رکھ کے اور بدگمانی کی عینک اُتار کر کچھ حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو تو کافی حد تک تمہیں صرف سچائی کا ادراک ہو جائے گا۔''

میں نے دانستہ اسے ''باس'' کہنے کے بجائے اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر ہی نہیں گردن پر بھی اس قدر چربی کی تہیں جمی ہوئی تھیں کہ وہ گردن موڑ کر میری طرف عقب میں دیکھنے سے بھی قاصر ہی تھا۔ اسی لیے ونڈ اسکرین کے اُوپر لگے بیک ویو پر ہی مجھ پر نظریں گاڑے بات کر رہا تھا۔

میں بھی اسی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بہت آسان لفظوں میں، تمہیں میں نے ایک گہری بات سمجھانے کی کوشش چاہی ہے۔'' میں اسے پھر شیشے میں اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سمجھ رہا ہوں تمہاری بات میں...... اس فضول بحث کو چھوڑ دو اب...... یہ سب کچھ اس وقت تک تھا جب میرے اور تمہارے درمیان اعتماد کی فضا قائم تھی۔ مگر اب...... تم جو کچھ کرو گے، میری نظروں کے سامنے کرو گے۔''

میں اس خبیث درندے کی بات سن کر بے اختیار ایک گہری ہمکاری خارج کر کے رہ گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ کاسپاکو بار بار میرے جھانسے میں آنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے بھی موضوع بدلتے ہوئے اس سے سوال کر ڈالا۔

''تم نے ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' میرا اشارہ یاسمین خانم اور اس... کے منگیتر ڈاکٹر حماد کی طرف تھا۔

''ہاہا...... ہاہا......'' کاسپاکو نے جواب دینے کے بجائے ایک بے ہنگم سا قہقہہ بلند کیا۔ ''آخر تمہیں ان کی جانب سے تشویش ہوئی ناں......، پھر تم کیسے کہہ رہے ہو کہ تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں......؟'' اس نے اپنے تئیں مجھے لاجواب کرنا چاہا تو میں بھی ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''دیکھا......! میری بات سچ ثابت ہوئی ناں...... مسٹر کاسپاکو...... تم اپنی طرف سے غلط اندازے قائم کرتے ہو اور خود ہی فیصلہ صادر کر ڈالتے ہو، حالانکہ میں نے تم سے یہ کہا ہی نہیں ہے کہ میرا ان مذکورہ مرد عورت سے تعلق ہی نہیں......''

کاسپاکو کی پیشانی پر میری یہ مدلل بات کسی گولی طرح ہی لگی تھی۔ وہ خودلا جواب سا ہو کر رہ گیا تھا۔

چند ثانیے سوچتی ہوئی سی خاموشی میں بیت گئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ آگے کچھ کہے گا مگر وہ بدستور چپ رہا تو میں نے بھی بولنا مناسب نہیں سمجھا، البتہ مجھے ڈاکٹر حماد اور یاسمین خانم کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔ نجانے اس درندہ صفت انسان نے ان لوگوں کے ساتھ کیا حشر کیا ہوگا۔

نصف گھنٹے کی تیز رفتار اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد ہم مضافاتی علاقے میں داخل ہو گئے۔ مجھے یہاں آ کر حیرت ہوئی تھی۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق انہیں اسی مکان کا رخ کرنا تھا جہاں پہلے اس کے ہرکارے مجھے اور روڈلف کو ائرپورٹ سے لے کر.... گئے تھے مگر یہ ان کا کوئی اور ٹھکانا تھا۔ جو شہر کے قدرے مضافات میں تھا۔

کار سے اُترنے اور اس ٹھکانے کے اندر داخل ہونے تک میں نے اطراف اور اس عمارت کا بغور جائزہ لینا ضروری سمجھا تھا۔

یہ بھی کوئی ایسا ہی مکان تھا، جیسا کہ ایسے مضافات میں ہونا چاہیے تھا، لکڑی کا بنا ہوا ایک منزلہ مکان...... ڈھائی تین سو گز سے زیادہ اس کا رقبہ نہ تھا۔ مکان کی عمارت کافی خستہ نظر آتی تھی جس پر نیلا اور زیادہ تر سفید رنگ کیا ہوا تھا۔

کار سے اُترتے ہی پہلے کاسپاکو کا ایک آدمی اندر داخل ہوا تھا۔ کوئی تالا چابی نہ تھا۔ وہ دروازہ کھول کر ایسے ہی اندر داخل ہو گیا تھا اور اس کے بعد اندر باہر روشنی ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک بڑے سے کمرے میں

English
تیرا روپ
بہت خوب
English

تھے۔ یہاں پر رکھے مختصر فرنیچر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کاسپاکو کا یہ نیا ٹھکانا عارضی تھا۔

یاسمین کو ہوش آچکا تھا۔ اسے بڑی بیدردی کے ساتھ ایک صوفے پر پھینک دیا گیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ سی نظر آرہی تھی، اس کے چہرے پر پہلے تو خوف اور پھر شدید ذہنی کرب کے آثار نظر آرہے تھے، اس کی خوبصورت کشادہ آنکھوں میں مجھے نمی بھی اُتری ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ وحشت زدہ سی نگاہوں سے ان سب کو تکے جارہی تھی اور...... مجھ پر بھی اس کی نگاہ پڑی تھی۔

میں نے خود کو دانستہ ایسے رخ پر کھڑا کرلیا تھا کہ میرے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کسی ہرکارے کی نظروں میں نہ آسکیں اور نہ ہی وہ میری اس ''کارگزاری'' کو دیکھ سکیں جو میں نے کار میں ان کے ساتھ بیٹھتے ہی شروع کردی تھی۔

ہاں......! میں نے موقع پاتے ہی اپنے ہاتھوں کے جکڑ بند کی مضبوطی جانچنے کے لیے انہیں دھیرے دھیرے حرکت دینا شروع کردی تھی۔ نائیلون کی ڈوری جتنی مضبوط ہوتی ہے اُتنی ہی ''پھسلواں'' بھی ہوتی ہے۔ بس، یہی اس میں ایک خرابی ہوتی ہے، بندھے ہوئے ہاتھ اگر کسی کی نظروں میں نہ ہوں تو انہیں مستقل حرکت دیتے رہنے کے سبب ان کی مضبوطی کمزور تو کی جاسکتی ہے مگر کھولی پھر بھی نہیں جاسکتی۔

تاہم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ایک خاص ٹیکنک کو اپلائی کرتے ہوئے ہاتھوں اور اُنگلیوں کو مسلسل حرکت دینے سے ان کا ''حلقہ'' کشادہ کیا جاسکتا ہے۔ میں اسی کوشش میں اسی وقت سے ہی جُت گیا تھا جب مجھے کار میں سوار کرایا گیا تھا۔ اب بھی میری یہی کوشش جاری تھی۔ میرے اندر اس سے ایک طوفانِ بلاخیز کروٹیں لے رہا تھا اور ایک جوالہ مکھی پھٹ پڑنے کو بے چین تھا۔ روڈلف کا مردہ چہرہ، اس کی بے بسی کی موت جو میری آنکھوں کے سامنے واقع ہوئی تھی، وہ مجھے ایک جنونِ لہورنگی میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ کاسپاکو اس سے یکسر بے خبر تھا۔

ادھر کاسپاکو نے اپنے سوٹ کی جیب سے پستول نکال لیا...... اور اس کا رخ صوفے پر آڑی ترچھی پڑی یاسمین کی طرف کردیا۔

''شہزی......! مجھ سے تمہیں اب دوٹوک بات کرنا ہوگی۔ تم نے اب ذرا بھی جھوٹ بولا تو...... میں اِسے بھی گولی ماردوں گا اور تم جانتے ہو، جو میں کہتا ہوں وہ کرتا بھی ہوں۔''

میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔ تیزی سے سوچتے ذہن نے بھانپ لیا تھا کہ...... کاسپاکو اس وقت مجھ پر بُری طرح اُدھار کھائے بیٹھا ہے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ...... مجھے بھی ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر گولی ماردیتا۔

یوں وہ اپنے دل کی بھڑاس میرے ساتھیوں کو بیدردی سے قتل کر کے نکل رہا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر حماد اور یاسمین خانم سے میرا کوئی ایسا تعلق ابھی قائم نہیں ہوا تھا جس برتے پر میں انہیں اپنا ساتھی کہتا، لیکن بہرحال روڈلف کے وہ ساتھی ضرور تھے۔ وہ زندہ تھا تو اور بات تھی، لیکن اب اس کے مرنے کے بعد...... جانے کیا بات تھی کہ روڈلف کی مجھ سے کہی ہوئی باتوں کو میرا دل اب جھٹلانے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

اس نے بہت ہی پُرزور لہجے اور انداز میں مجھ سے کہا تھا کہ میں انہیں غیراہم مت جانوں، ان کے مشن کی کامیابی لولووش کی ناکامی اور ان کے مشن کی ناکامی، لولووش کی کامیابی ہے۔ مگر میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور بدستور اپنی فی الفور امریکا روانگی پر مُصر رہتے ہوئے روڈلف سے بھی صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ...... بے شک چاہے تو یاسمین وغیرہ کے ساتھ ان کے شریکِ مہم رہ سکتا ہے، لیکن بعد میں روڈلف نے میری ضد کے آگے سر جھکا دیا تھا اور...... میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، وہ بھی میرے ساتھ ہی امریکا جانے پر تیار ہوگیا تھا۔

لیکن اب بات اور تھی، عجیب بات تھی کہ انسان زندہ ہوتا ہے تو اس کی اہمیت اور ہوتی ہے اور مرجاتا ہے تو...... روڈلف مرچکا تھا، مگر اس کی باتیں مجھے اب کھدیڑنے لگی تھیں۔

لہٰذا میں نے بظاہر نہایت پُرسکون نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کاسپاکو سے کہا۔

''کیا پوچھنا چاہتے ہو......؟''

''میرے منہ سے چھینے ہوئے نوالے کو تم نے اپنے ذاتی لالچ سے گنوادیا، اب اس کے دوبارہ حصول کے سلسلے میں تم نے اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ کون سی نئی پلاننگ بنا رکھی تھی؟''

کاسپاکو کے پستول کی نال کا رخ ہنوز یاسمین خانم کی طرف تھا۔ یہ ایک ایسا خطرناک لمحہ، بلکہ ''ڈیتھ پوائنٹ'' تھا کہ اگر میں کاسپاکو کی سوچ کے برخلاف کچھ کہنے کی کوشش

کرتا تو یہ درندہ بلا دیر یاسمین کو شوٹ کر دیتا۔ اس وقت کاسپا کو صرف اپنی سوچ اور مرضی کے مطابق جواب سننے کا متمنی تھا، چاہے اس کا خیال غلط فہمی پر ہی کیوں نہ مبنی ہوتا۔
''تمہاری بات صحیح ہے۔''
بالآخر میں نے کہا۔ حسبِ توقع کاسپا کو کے بدہیئت ہونٹوں پہ مکروہ اور فتح انداز میں مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔
''میں جانتا ہوں شہزی! تمہیں اپنا ہر ساتھی عزیز ہے۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے وہ سارے ساتھی عزیز تھے جنہیں تم نے دھوکے سے ہلاک کیا اور کروایا۔ مجھے وہ مجسمہ چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔ اس کے حصول کے لیے اپنا پلان میرے سامنے واضح کرو جو تم پہلے ہی سے بنائے ہوئے ہو۔'' کاسپا کو نے مکاری سے کہا۔
اس نے اپنا پستول اب دوبارہ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں نے اندر ہی اندر سکون کی سانس لی۔
''میں وہی کر رہا تھا، لیکن تم نے..... کیپٹن رانسے کو درمیان میں ڈال کر معاملہ خراب کر دیا۔''
''وہ چیپٹر کلوز کر دو اور آگے کی بات کرو، خبردار......! اب کوئی نئی چالا کی چلنے کی کوشش مت کرنا۔ تمہاری یہ خوبصورت ساتھی میرے قبضے میں رہے گی جب تک تم..... میرے منہ سے چھینا ہوا نوالہ مجھے واپس نہیں لوٹا دیتے۔ کیا سمجھے.....؟''
''میں نے کب انکار کیا ہے؟'' میں بولا۔ حالات کی مجبوری تھی کہ مجھے اس کی مرضی کے مطابق ہی جوابات دینے تھے جبکہ حقیقت یہی تھی کہ میں خود گوتم بدھ والا معاملہ کلوز کر چکا تھا۔
''یاد رکھنا شہزی! میں اب سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گا اور تمہاری ایک ایک حرکت پر خود نگاہ رکھوں گا۔''
''اچھی بات ہے، میں خود اب اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا ہوں، تمہاری دشمنی مجھے خاصی مہنگی پڑنے لگی ہے۔'' میں نے اس کی فطرت کے مطابق شکست خوردہ لہجہ اختیار کرنا ضروری سمجھا۔
میری توقع کے عین مطابق اس نے..... ایک پُرغرور سا قہقہہ لگایا... اور اسی لہجے میں بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ کاسپا کو تمہیں پاتال میں بھی..... تلاش کر لے گا، نہیں چھوڑے گا تمہیں، اب تمہیں یہ حقیقت سمجھ آگئی ہے......''
''بہت اچھی طرح......'' میں ہولے سے بولا۔
''لیکن...... اس مجسمے کے حصول کے لیے کچھ اور طاقت ور لوگ بھی کوشاں ہیں۔ وہ ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اسی لیے میں اب تک اس کے حصول کے لیے ناکام رہا ہوں۔'' میں نے جھوٹ کی منزلیں مارنا شروع کر دیں۔ درحقیقت مجھے اب تک خود بھی پتا نہ تھا کہ وہ مجسمہ ابھی تک فلپائن کے اسی جزیرے میں تھا یا..... واپس تھائی لینڈ روانہ کیا جا چکا تھا۔
ٹھیک اسی وقت شاید اس کے کسی ہرکارے کو مجھ پر کسی ''کارگزاری'' کا شبہ ہوا تھا۔ میں نے بھی فوراً پشت پر بندھے ہاتھوں کی مسلسل اور مخصوص انداز میں حرکات و سکنات کو موقوف کر دیا۔
اس خبیث نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے دبوچ کر درمیان میں کھڑا کر دیا اور خود میرے عقب میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ یوں میرا منصوبہ ہی چوپٹ ہو گیا۔ شکر تھا کہ اس نے میرے ہاتھوں پر بندھی ڈوری کا غور سے جائزہ لینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ورنہ وہ اس کا ''ڈھیلا پن'' فوراً بھانپ لیتا۔
اسی وقت کاسپا کو کی پُرغرور آواز اُبھری۔
''کاسپا کو اپنے سامنے آنے والی ہر دیوار کو گرا دینے کی طاقت رکھتا ہے شہزی!''
ایک لمحہ رک کر اس نے دوبارہ کہا۔
''تم نہیں جانتے کہ اس وقت میرا پورا گینگ فلپائن پہنچ چکا ہے۔ کچھ ایجنٹ گومبورا بھی پہنچ چکے ہیں۔''
''گومبورا کی کیا اطلاعات ہیں؟ کیا مجسمہ ابھی تک اسی جزیرے پر موجود ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔
''تم اتنے انجان تو نہیں ہو سکتے کہ تمہیں معلوم ہی نہ ہو کہ اس وقت مجسمہ کہاں ہے؟'' کاسپا کو نے گھور کر کہا۔
اب میں اس بے وقوف کو کیا بتاتا کہ میں تو اس منحوس مجسمے سے کوسوں دور ہو چکا تھا اور نہ ہی اس کا حصول میرا بھی مقصد رہا تھا بلکہ میں تو خود چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد اپنے اصل ٹھکانے تک پہنچا دیا جائے، نجانے کیوں ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا تھا؟
میں نے بات بناتے ہوئے اسے جواب دیا۔
''یہاں میرے لیے کچھ ایسے مسائل پیدا ہو گئے تھے جن کے باعث میں ان میں اُلجھا رہا تھا، تم دیکھ ہی رہے ہو اسی لیے میں آج کل ڈیواؤ کے بجائے یہاں منیلا کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔''
''مقصد کے حصول کے لیے اصل ٹارگٹ سے دور رہ

کر ہی اچھی پلاننگ بنتی ہے، شہزی! مجھے اب مزید گولی دینے کی بھول کر بھی کوشش مت کرنا۔'' کاساپا کو زہرخند لہجے میں بولا اور میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ میری طرف سے بہت بددل ہو رہا تھا۔ یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا مگر میں اسے اصل بات باور کرا سکتا تھا نہ ہی اس کا یقین دلا سکتا تھا۔

''پھر بھی بتائے دیتا ہوں......'' اچانک کاساپا کو نے کہا۔ ''تاکہ تم بھی جان لو کہ غافل میں بھی اب تک نہیں بیٹھا ہوا۔''

میں نے اُس کی جانب آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔

''کچھ میکینیکی وجوہات اور ڈاکومینٹیشن کے سبب مجسمہ دوبارہ تھائی لینڈ پہنچانے میں تاخیر رہی تھی مگر اب وہ مکمل ہو چکی ہیں۔ تاہم مجسمہ اب لانچ کے ذریعے گومبورا سے ڈیواؤ لے جایا جا چکا ہے۔ وہاں سے ایک ٹرانسپورٹ طیارے کے ذریعے واپس تھائی لینڈ لے جایا جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طیارے کو ہی ہائی جیک کر کے ''ڈارک آئی لینڈ'' تک پہنچا دیا جائے۔''

میں نے دانستہ متاثر کن انداز میں اپنی بھویں اُچکا لیں۔ میں اپنی خفیہ کارگزاری کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے بے چین تھا مگر میرے پیچھے کھڑے اس ہرکارے نے سارا منصوبہ چوپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

تاہم مجھے اتنا تو اندازہ ضرور ہو چلا تھا کہ میں اپنی ابھی تک کی ''کوشش'' میں کافی حد تک کامیاب ہو چکا ہوں۔ اب بس ذرا غیرمحسوس انداز میں ہاتھوں اور انگلیوں کو دو تین اور بل دینے کی ضرورت باقی تھی مگر اس خبیث ہرکارے نے میری یہ آخری اور فیصلہ کن کوشش ناکام بنا ڈالی تھی۔

''حیرت ہے، تمہارے پاس اتنے ٹاپ کے پروفیشنل آدمی موجود ہیں، پھر تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو......؟'' میں نے دانستہ ایسا کہا تھا۔ وہ ایک دم مشتعل ہو گیا اور اس نے دوبارہ اپنا خطرناک پسٹل آرسنل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور اس کی دوہری نال کا رخ میری جانب کر کے شعلہ بار لہجے میں بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے......تمہارا کیا فائدہ...... میں تمہیں گولی مار کر یہ قصہ ہی ختم کیے دیتا ہوں......'' کہتے ہوئے اس نے ٹریگر دبا دیا۔ میرے اوسان ایک دم خطا ہو گئے، دھماکا ہوا، یاسمین کے حلق سے لرزتی ہوئی چیخ بلند ہوئی...... اور میں لڑکھڑایا، پھر اسی انداز میں دانستہ صوفے پر گرتے گرتے ٹک کر بیٹھ گیا۔

کاساپا کو جیسے درندہ صفت انسان سے کسی بھی لمحے کسی بھی قسم کی اچانک درندگی اور خوں ریزی کی توقع کی جا سکتی تھی۔

اس نے گولی چلائی ضرور تھی مگر اس کا نشانہ میں نہیں تھا، اس نے محض مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے ایک خالی فائر کیا تھا۔ اس کی اس حرکت نے بلاشبہ مجھے چند ثانیوں کے لیے دہلا دیا تھا۔ میں یہ سوچ بنا نہ رہ سکا تھا کہ اگر یہ اس کا ''ٹارگٹ فائر'' ہوتا تو...... میرا بھی روڈلف جیسا حشر ہوتا۔

اس ہرکارے نے جو شاید کسی خاص مقصد کے لیے میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا، مجھے دوبارہ اسی جگہ پر لا کھڑا کرنے کے لیے میری جانب بڑھا تھا مگر کاساپا کو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا۔

خوف و دہشت کا یہ کھیل میرے لیے سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ کاساپا کو پر اس وقت طاقت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ نشہ شراب کا ہو یا طاقت کا...... دونوں ہی صورتوں میں...... آدمی کا خانہ خراب کر سکتا ہے۔ صوفے کی پشت گاہ کی آڑ ملتے ہی میں نے اپنی خفیہ اور غیرمحسوس ''کوشش'' ایک بار پھر تیز تر کر دی۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش تمہیں اب مہنگی پڑ جائے گی شہزی......!'' کاساپا کو نے اس بار خونخوار لہجے میں کہا اور اسی زعم اور جوش میں وہ چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آ گیا اور مجھ پر جھک گیا۔

اس کے ہاتھ میں تھما ہوا آرسنل اپنے مہیب دہانوں سمیت میری پیشانی پر آن لگا تھا۔

یاسمین صوفے پر میرے قریب ہی آڑی ترچھی پڑی تھی، اس کے بھی دونوں ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے، کاساپا کو کے پسٹل کی نال میری پیشانی پر لگے دیکھ کر وہ سراسیمہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

''نن...... نہیں...... خ...... خدا کے لیے...... اسے مت مارو...... تم ہمیں غلط سمجھ رہے ہو۔ ہمارا اس مجسمے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہمیں تو معلوم بھی نہیں ہے کہ......''

''شٹ اَپ...... یو بچ......!'' کاساپا کو غضب ناک انداز میں دہاڑ کر بولا اور اپنے پسٹل کا رخ اس کی جانب کر لیا۔ میرا پورا وجود لرز اُٹھا۔

یاسمین کو اپنے لیے اس قدر متفکر اور تشویش زدہ پا کر

میرے دل میں بھی اس کے لیے نرم جذبہ بیدار ہونا ایک فطری امر تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ کس درندے سے وہ رحم کی بھیک مانگ رہی ہے۔ اگرچہ اسے واقعی مجسمے کے سلسلے میں معلوم نہ تھا۔

''تم اس قدر حسین نہ ہوتیں تو میں اُدھر ہی تمہارا بھی ان دونوں جیسا ہی حشر کرتا۔'' کاسپا کو سفاکانہ انداز میں غرا کر بولا۔

''دونوں۔'' اس کی کیا مراد تھی؟ میں چونک پڑا۔

ایک روڈلف اور دوسرا...... اوہ میرے خدا......! کہیں اس خبیث اور بے رحم شخص نے ڈاکٹر حماد کو بھی...... اس سے آگے سوچ کر ہی میں بُری طرح غضب ناک ہو گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب خود پر میرا کنٹرول کرنا محال ہو جاتا ہے۔

اس رذیل کاسپا کو کی...... بیہودہ گوئی جاری تھی۔ اس نے اب جھک کر اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کے حسین و گلنار چہرے کو اپنے بدنما اور کھردرے ہاتھ سے دبوچ لیا تھا۔

''حسین اور شباب آور عورتیں میری کمزوری ہیں۔ تمہارا مزہ لوں گا میں...... بہت جلد...... اس کے بعد...... ہاہاہا......'' وہ ایک بار پھر بدمست سا قہقہہ اُگلتا ہوا میری طرف متوجہ ہوا۔ یہی وہ وقت تھا جب میرا پورا وجود مثلِ آتش فشاں بن چکا تھا اور پھٹنے کے قریب بھی...... کیونکہ میں اپنی پیہم کوششوں کے بل بوتے پر اپنا ایک ہاتھ رسی کے کشادہ پڑتے حلقے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور موقع کی تلاش میں تھا، میری حالت ایسے شیر جیسی ہو رہی تھی جو بپھرا ہوا اور غضب ناک ہو رہا ہو، کسی کو بھی چیر پھاڑنے کے لیے بے چین بھی، اب ایسا شیر آزاد ہو چکا تھا۔

روڈلف کی صورت بار بار میری چشمِ تصور میں آ رہی تھی۔ کاسپا کو جیسے ہی یاسمین سے ہٹ کر پلٹا اور میری طرف بڑھنے کے لیے ایک قدم بڑھایا تو اس وقت میری دونوں ٹانگیں قالین پر پھیلی ہوئی تھیں، میں نے ایک ٹانگ تھوڑا اور آگے سرکا دی، نتیجے میں کاسپا کو اس سے اُلجھا اور اس کا بھاری بھرکم وجود ذرا ڈولا، یوں وہ لڑکھڑایا اور سیدھا میرے اُوپر آ رہا، یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے درندوں کو سدھانے والا رنگ ماسٹر ایک خونخوار اور پاگل درندے کے پنجرے میں جا پڑا ہو۔

میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کاسپا کو کو دبوچ لیا اور پہلا وار میرا اس کے ہاتھ سے آرسنل جھپٹنے پر منتج ہوا تھا...... یہ سب کچھ اس قدر پل کے پل ہوا تھا کہ سب لوگ ہک دک رہ گئے تھے۔

اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ کاسپا کو بھاری ڈیل ڈول کے ساتھ میرے ایک بازو کے نرغے میں تھا اور اس کا آرسنل میرے دوسرے بازو کی گرفت میں، جبکہ اس کے بھیانک دہانے کاسپا کو کی کنپٹی کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔

اس کے ہرکارے تو اس بُری طرح بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے تھے کہ جیسے ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو یہ سب ہو کیا گیا تھا۔

''خبردار......'' میں بولائی ہوئی آواز میں وحشیانہ غراہٹ سے بولا۔ ''کسی نے بھی اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی، میں ایک ہی فائر کر کے اس کا سر اُڑا دوں گا۔''

میرا لہجہ اور میری آواز اس قدر زوردار اور گھن گرج والی تھی کہ جیسے کوئی نقارہ پھٹ گیا ہو۔ غضب ناکی اور طیش کی چنگاریاں جیسے میرے جلتے بلکتے چہرے سے ہی نہیں بلکہ آنکھوں سے بھی مترشح ہو رہی تھیں۔

''تم سب ہتھیار پھینک کر میرے سامنے قطار کی صورت میں کھڑے ہو جاؤ جلدی......'' میں نے اگلا حکم دیا مگر کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

''تم...... بڑی بھیانک غلطی کر رہے ہو...... شہزی! یہ تمہارا حکم ہرگز نہیں مانیں گے......'' کاسپا کو اپنی طاقت کے زعم میں غراتے ہوئے بولا اور اس نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا، تب ہی میری گرفت میں ذرا کسمسایا بھی، میں نے سچویشن کی نزاکت اور خطرناکی کو بھانپتے ہی، ایک محتاط پوزیشن بنا کر کاسپا کو کو خود سے الگ کر دیا مگر دوسرے ہی ثانیے میں میرے ہاتھ میں تھما ہوا آرسنل زوردار آواز میں گرج جا۔

کاسپا کو کی بڑی لرزہ خیز چیخ اُبھری، اسی وقت میں نے آرسنل کا رخ اپنے دائیں جانب کھڑے ہرکارے کی طرف کیا اور آگے پیچھے کے دونوں ٹریگر بیک وقت دبائے۔ تلے اُوپر دو ساعت شکن دھماکے ہوئے اور اس کے ہرکارے کا سر کندھوں سے اُڑ گیا۔ شانوں کے درمیان سے خون کے فوارے اُبلنے لگے، اس کا بے جان وجود ایک لمحے کو کھڑے کھڑے لہرایا اور درمیان میں پڑی گلاس ٹاپ والی میز پر گرا اور وہاں سے لڑھک کر قالین پر آ گرا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے مشکوک حرکت کی تھی۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں...... جو کہا ہے وہ کرو ورنہ......''

میری آواز غیظ و غضب کے مارے کانپ رہی تھی۔

سر پر خون سوار ہو گیا تھا۔ روڈلف مجھے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔

کاسپاکو کی حالت ایسی تھی کہ وہ لڑھک کر اسی میز کا سہارا لیتا ہوا قالین پر اپنا زخمی پاؤں پکڑے بری طرح کراہ رہا تھا۔ آرسنل کی طاقت ور گولی نے اس کی موٹی ران کو چیر کر ہڈی توڑ ڈالی تھی۔

کسی پستول میں ایسی طاقت نہیں ہوتی، لیکن آرسنل پسٹل کی بات اور تھی، اگرچہ اس کی گولی زیادہ دور تک نہیں جاتی تھی مگر قریب سے یہ ہلاکت خیزی کا طوفان مچا ڈالتی تھی۔

"اس...... اس...... پر خون...... سوار ہے...... ی ی...... یہ جو کہہ...... رہا...... ہے...... وہ کرو...... ہری......" بالآخر کاسپاکو نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

باقی تینوں یوں بھی دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ ہتھیار پھینک کر ایک قطار میں میرے سامنے ذرا فاصلے سے کھڑے ہو گئے۔

"بول...... کاسپاکو براڈے......! کیا حشر کروں تیرا......؟" میں بھیانک لہجے میں بولا۔ "تُو نے روڈلف کو ہلاک کر کے اپنی یقینی موت کو آواز دے ڈالی ہے۔"

"دو...... دیکھو...... یہ شاید میری غلطی تھی کہ میں نے دوسری بار تمہاری راہ میں آنے کی کوشش...... چاہی۔ مجھے اپنے طور پر اپنا مشن پورا کرنا چاہیے تھا، م...... مجھے معاف کر دو......"

کاسپاکو...... میرے آگے رحم کی بھیک مانگنے لگا تھا۔ وزیر جان کے معاملے کے ایک مختصر اور پُرخطر دورانیے میں وہ میری غضب ناکی کے کئی جوہر ملاحظہ کر چکا تھا۔ ایسے گینگسٹر صرف اپنے زرخرید کتوں کے بل پر ہی اکڑتے ہیں، مگر موت...... یقینی موت کی ایک جھلک بھی انہیں نظر آجائے تو یہ بھیگی بلی بن کر رہ جاتے ہیں، کچھ ایسی ہی حالت و کیفیات اس وقت بینکاک کے ہوّا اور تھائی لینڈ کے ڈان کی ہو رہی تھی۔

"کاسپاکو...... تو نے روڈلف کو مار کے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔" میں ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ اس میں دکھ کی آمیزش شامل تھی۔ روڈلف کی ہلاکت کا سن کر یاسمین کی مجھے زوردار سسکی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ ہنوز رسن بستہ حالت میں تھی، تاہم اب وہ کسی طرح کوشش کر کے سیدھی ہو کے بیٹھ چکی تھی۔

"م...... مجھے معاف کر دو...... میرا وعدہ ہے، آئندہ تمہارے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ تم نے جو کہا...... وہ میں نے کر ڈالا۔ میں اب تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔" کاسپاکو دھیمی آواز میں بولا۔

"تم تینوں دوسری طرف منہ کر کے اور ہاتھ سر سے بلند کیے کھڑے ہو جاؤ۔ میں اپنی ساتھی کی رسیاں کھولنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کی داد و فریاد کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ہرکاروں ...... کو حکم دیا۔ انہوں نے میرا حکم ماننے میں لمحے کی بھی تاخیر نہ کی۔

میں نے یاسمین کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ...... کسمساتی ہوئی صوفے سے بمشکل اُٹھ کر کھڑی ہوئی اور میرے قریب پشت کر کے آن کھڑی ہوئی۔

یہ ایک نازک مرحلہ تھا۔ تاہم صورتِ حالات میرے قابو میں تھی۔ میں نے پسٹل اپنے منہ میں دبا لیا اور دونوں ہاتھوں سے یاسمین کے جکڑ بند کھولنے لگا۔

کاسپاکو بظاہر ایسا ہی نظر آرہا تھا کہ اپنی زخمی ران پر دونوں ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا۔ بس، ایک لمحہ کو میری نظر چوکی تھی۔ جب یاسمین کے جکڑ بند کی ایک اُلجھی ہوئی گرہ کو کھولنے کے لیے...... مجھے اس پر ذرا جھکنا پڑا تھا۔

"ہالٹ......!" اچانک یاسمین چلّائی، میں چونکا، اس نے ایک جھٹکا لیا۔ میرے منہ میں دبا پسٹل گرا۔ اس کی ایک ٹانگ حرکت میں آئی، جو کاسپاکو کے ایک ہاتھ پر لگی، جانے کس وقت وہ ...... ایک ہاتھ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف کر چکا تھا اور یاسمین کی اس وقت نگاہ پڑی جب وہ ٹیبل سے سہارا لیے بیٹھے ہوئے انداز میں پلٹ کر فائر کرنا چاہتا تھا۔ یاسمین کے پاؤں کی بروقت ٹھوکر نے پستول اس کے ہاتھ سے اُڑا دیا تھا۔

اِدھر میں جیسے ہی اپنا پسٹل اُٹھانے کو جھکا، اُدھر ان تینوں ہرکاروں نے یاسمین کے چیخنے پر یک بیک پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر شاید مجھے جھکا پا کر وہ کچھ سمجھے، پھر ان تینوں نے ہی بیک وقت ہماری طرف لپک کر پیش قدمی کی تھی۔ ایک نے تو فضا میں اُچھل کر جست بھی لگا ڈالی تھی اور سیدھا یاسمین اور پھر اس سمیت مجھ پر آن پڑا تھا، جبکہ میں ابھی آرسنل اٹھائے...... سیدھا کھڑے ہونے کی کوشش میں تھا کہ ان دونوں کے زور پر دھکا کھانے سے گرا تو نہیں البتہ چند قدم عقب میں لڑکھڑاتا چلا گیا۔

باقی دونوں میں سے ایک نے کاسپاکو کا دوسرا پسٹل جو قریب قالین پر ہی پڑا ہوا تھا۔ اُٹھانے کی کوشش کی۔

میں نے اس پلٹی ہوئی کایا کلپ پر اپنے حواس بحال

اور توجہ مجتمع رکھتے ہوئے اپنے آرسنل کا فائر اسی پر داغا۔ گولی چلنے کی دھاڑ مچی۔ وہ آخری الذکر ہرکارہ بغیر آواز نکالے وہیں ڈھیر ہوگیا۔

اول الذکر دونوں ہرکاروں نے یاسمین کو دبوچ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے میرے خلاف ڈھال کی طرح آزمانے کی کوشش کرتے، یاسمین ایک کے پیٹ پر گھٹنے کی ضرب لگا چکی تھی، وہ کراہا اور چند قدم پیچھے کو لڑکھڑایا، سنبھلنے کی کوشش میں دوبارہ اس کی جانب لپکا تھا کہ جب تک میں نے بجلی کی سی پھرتی سے دوسرے ہرکارے کو لات رسید کر دی۔ وہ بری طرح لڑکھڑاتا ہوا پہلے والے ساتھی سے ٹکرایا۔

''یاسمین! ہٹ جاؤ آگے سے......'' میں چلّایا اور پھر میں نے پے در پے دو فائر کر ڈالے، وہ دونوں ہرکارے بیک وقت کریہہ ناک چیخ مار کے جھکتے چلے گئے۔

ان کی دونوں ٹانگوں کو میں نے نشانہ بنایا تھا۔ یاسمین ہٹ تو گئی تھی، مگر اس کی محتاط نگاہیں شاید ہنوز کاسپاکو پر جمی ہوئی تھیں، جو اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنا دوسرا پستول اُٹھانے کے لیے اپنے زخم کی پروا کیے بغیر اس طرف سرک چکا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں وہ پستول آچکا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب یاسمین نے اس پر چھلانگ لگائی تھی، بلاشبہ یہ اس کی خطرناک درانہ وار حرکت تھی، بالکل ویسی ہی جیسی وہ سے جی کو بارا کے ساتھ بھی کر چکی تھی۔

کاسپاکو نے پلٹ کر گولی چلادی، میرا دل دہک سے رہ گیا۔ یاسمین کی لرزہ خیز چیخ اُبھری مگر یوں وہ اپنی ہی جھونک میں...... کاسپاکو کے اُوپر ہی گری تھی، کاسپاکو نے ایک اور فائر داغا، گولی چلی اور یاسمین کی دوبارہ گھٹی گھٹی کراہ خارج ہوئی، میں ہول سا گیا، ایسے میں کاسپاکو پر میں گولی داغنے کی پوزیشن میں نہ تھا، لیکن اس ظالم کو یاسمین خانم پر تیسرا فائر کرنے کا کسی صورت میں بھی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

یاسمین اب بے سدھ سی اس کے اُوپر پڑی ہوئی تھی اور وہ جلاد صفت اس پر دوبارہ اتنے قریب سے مہلک وار کر سکتا تھا۔ لہٰذا مجھے فوری طور پر اور تو کچھ نہیں سوجھا، بہ سرعت جھک کر میں نے یاسمین خانم کی ٹانگ پکڑ کر اسے کاسپاکو کے اُوپر سے کھینچ لیا، مجھے اس کا نرم و نازک جسم خون میں لتھڑا ہوا نظر آیا، میرا دل بوجھل ہوگیا۔ کاسپاکو مجھ پر اپنا پستول سیدھا کرنے لگا تھا کہ میں نے آرسنل، جس کی دوہری نال کا رخ اسی کی طرف تھا، یک بیک دونوں ٹریگر دبا دیے۔

تلے اُوپر دو بھیانک دھماکے ہوئے اور کاسپاکو کو براڈے...... کی کہانی پل کے پل اپنے منطقی انجام کو جا پہنچی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔

باقی اس کے تینوں ہرکارے اپنے ڈان باس کا انجام دیکھ کر وہیں ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔

''گاڑی کی چابی پھینکو...... جلدی......'' میں نے اُن کی طرف دیکھ کر لہورنگ دہاڑ سے کہا تو ایک نے لرزتے لہجے میں بتایا کہ ایک کار کی چابی اسی کی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی ہے۔ میں نے اگلا حکم انہیں...، کامن واش روم میں گھسنے کا دیا۔ وہ لپک کر وہاں جا گھسے اور اندر سے دروازہ یوں ایک دم بند کرلیا جیسے بس ان کی مکتی کی راہ ہو۔

میں نے یاسمین کو سنبھالا اور اسے اُٹھا کر دیوانہ وار باہر دوڑا۔

ایک کار میں چابی لگی ہوئی تھی، میں نے نیم مردہ سی یاسمین کو کار کی عقبی سیٹ پر ڈالا اور اس کے زخم کا جائزہ لیا۔

اسے ایک گولی شانے پر اور دوسری پیٹ میں لگی تھی۔ وہاں بھی خون کا دھبا نظر آرہا تھا مجھے......

گولی اس کے دائیں شانے پر لگی تھی اور شکر تھا کہ ''چھاؤ'' ہو کر نکل گئی تھی، مگر خون زیادہ بہنے کی وجہ سے اس پر غشی طاری تھی۔

سفاک کاسپاکو نے اس پر قریب سے دو فائر کیے تھے، دوسری گولی کا زخم بھی مجھے جلد ہی نظر آگیا۔ وہ اس کے پیٹ میں پیوست ہوگئی تھی، شاید یہ پہلے والے فائر کی گولی تھی، یہی مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔ مجھے تشویش نے گھیر لیا۔

میں نے اسی کے لباس کا ایک کپڑا پھاڑ کر لیری سی بنائی اور پٹی کی صورت اس کے زخم پر باندھ دی تاکہ جریانِ خون کسی حد تک کم سے کم رہے۔ اس کے پیٹ کے زخم کا جائزہ لیا تو وہاں مجھے کوئی سخت سی چیز لگی نظر آئی، مجبوری تھی، اسی لیے... اس کا پیٹ بھی برہنہ کیا تو چونک پڑا۔ وہاں کوئی چمڑے جیسی سخت شے لپٹی ہوئی تھی، مگر گولی نے اس میں بھی سوراخ کر دیا تھا۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا شاید یہ کوئی بلٹ پروف اندرونی جیکٹ تھی، مگر وہ چمڑے جیسی سخت شے تھی، شاید قریب سے چلائی ہوئی گولی اس کے اندر گھس گئی تھی، تاہم وہ چمڑے کی جیکٹ آہستگی سے کھینچ لینے کے بعد مجھے اس کے پیٹ کا زخم بھی دکھائی دے گیا۔ میں نے اس کے بے سدھ وجود کو تھوڑا پلٹ کر پشت کا جائزہ لیا کہ کہیں پیٹ پر لگنے والی گولی بھی تو آرپار نہیں ہوگئی تھی، مگر مجھے ''ایگزٹ'' کا نشان دکھائی نہ دیا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ گولی ابھی تک پیٹ کے اندر ہی تھی۔

چند ہی ثانیوں بعد میری کار رات کے سناٹے میں ویران سڑک پر آندھی طوفان کی طرح دوڑے جارہی تھی۔
شکر تھا کہ مجھے یاسمین خانم کی رہائش گاہ تک کا راستہ ازبر تھا۔ یہ میری پرانی عادت تھی، میں کوئی بھی نئی جگہ کی سمت کو اپنے ذہن میں محفوظ ضرور رکھتا تھا، کیا خبر کسی اہم مجبوری کے باعث مجھے دوبارہ اس طرف کا رخ کرنا پڑ جائے، جیسا کہ اب اور اس سے پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔
رات گئے سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ میری کار اندھا دھند دوڑی جارہی تھی۔ تاہم مجھے پولیس کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا، اس قدر تیز رفتاری پر کوئی پٹرولنگ گاڑی میرے تعاقب میں لگ سکتی تھی، اور پھر میرے سامنے مسائل کا ایک طوفان سا کھڑا ہوجاتا۔
بیس منٹ کے اندر اندر میں یاسمین کی رہائش گاہ پر پہنچ چکا تھا۔ حالانکہ جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ (کاساپاکو کے ساتھ) تو کاساپاکو کے نئے عارضی ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا تھا۔
شکر تھا کہ یہاں اب بھی کوئی گڑبڑ نہیں تھی، سب کچھ ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا کچھ دیر پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ بنگلے میں اب بھی ویرانی اور خاموشی کا راج تھا۔
میں نے کار اندر پورچ میں کھڑی کی، یاسمین کے بے سدھ وجود کو کندھے پر ڈالا اور اندر کی طرف دوڑا۔
اندر آکر میں نے سیدھا اسی کمرے کا رخ کیا جہاں اس کے منگیتر ڈاکٹر حماد نے روڈلف کا آپریشن کر کے گولی نکالی تھی۔
میں نے یاسمین کو بھی اسی آپریشن ٹیبل پر لٹا دیا اور اس زخم والی جگہ کو مزید کشادہ کیا۔ (اس کے زخم پر پٹی بھی میں نے اسی جگہ کے لباس کو پھاڑ کر باندھی تھی)
اس کے پیٹ میں لگنے والی گولی زیادہ...... جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ اسی لیے سب سے پہلے میں نے اسی کا جائزہ لیا۔ یوں قریب سے جائزہ لینے کے بعد مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی یہ دیکھ کر...... کہ سیسہ کھال سے تھوڑا ہی اندر تھا۔ اسے کسی نیڈل ہولڈر فارسیپ سے تھوڑی کوشش کے ساتھ نکالا جاسکتا تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور قریب دھری سرجیکل ٹرے سے نیڈل ہولڈر فارسیپ اٹھا کر ''سپرفیشئیل'' پڑی گولی کھینچ لی۔ خون نکلا اور یاسمین بھی کراہی تھی، تاہم اب وہ کسی حد تک خطرے سے باہر تھی۔
اس کے بعد میں نے اس کے دائیں شانے کا معائنہ کیا۔ اس کا گورا گورا جسم خون میں رنگین ہوا جارہا تھا۔ کپڑے کی لیر کی عارضی پٹی میں نے کھول دی، وہاں قریب سرجیکل ٹیبل پر ٹنکچر، آیوڈین اور دیگر مرہم پٹی کا جملہ سامان پہلے سے موجود تھا، میں نے سب سے پہلے وہاں موجود گلوکوز 25 فیصد والے دو پلاسٹک کے ایمپول کھول کر یاسمین کے منہ سے لگا کر اسے پلا دیے تاکہ خون بہنے سے نقاہت جاتی رہے، حالانکہ یہ ایمپول انجکشن یعنی وریدی سرنج کے ذریعے دیے جاتے تھے، مگر ایمرجنسی یا ایسی صورت میں جبکہ سرنج استعمال نہ کیا جاسکتا ہو تو یہ براہِ راست منہ کے راستے پلا بھی دیے جاتے ہیں۔
میں نے ایسا ہی کیا، اور اس کے بعد یاسمین کے زخم کو دھو کر اس میں ''بپ پیک'' بھر دیا۔
کچھ اینٹی بائیوٹک اور پین کلر موجود تھیں وہ بھی میں نے یاسمین کو پیس کر پانی کے گھونٹ کے ساتھ کھلا دیں۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے بھی مارے اور اس کی حالت قدرے بہتر ہونے لگی۔
ہوش میں آنے کے بعد اسی نے مجھے باقی ماندہ گائیڈنس دی کہ مجھے مزید کیا کرنا چاہیے تھا۔
ڈریسنگ وغیرہ تو یوں بھی میری تربیت کا حصہ رہا تھا، کسی بھی صورت میں اس طرح کی فرسٹ ایڈ سول ڈیفنس کی ٹریننگ میں بھی دی جاتی تھی۔
میں نے یاسمین کی زندگی بچانے کے لیے جس تیزی کے ساتھ ''ایفرٹس'' لیے تھے۔ اس کے جلد ہی دوررس نتائج برآمد ہونے لگے تھے۔ وہ کافی بہتر ہونے لگی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی یہ ''بہتری'' والی حالت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی تھی، جب تک کہ اسے ''پراپر منیجمنٹ'' نہیں مل جاتی۔
میں نے اسے فریج سے نکال کر مشروبات اور کھانے کی چیزیں بھی دیں اور اس کے اصرار پر خود بھی تھوڑا بہت زہر مار کیا۔
میں نے اسے پیٹ میں لگنے والی گولی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ چند پھولی ہوئی سی سانسیں خارج کرنے کے بعد بولی۔
''میں اب بہت بہتر ہوں...... فکر کرنے کی ضرورت نہیں...... تمہاری ممنون ہوں میں......'' وہ میری طرف ذرا گردن موڑ کر ہلکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ ''میں احتیاط کے پیش نظر بھیڑ کی کھال کی جیکٹ اپنی کمر اور پیٹ پر باندھے رکھتی ہوں۔ دور والی گولی تو بالکل اثر نہیں کرتی لیکن...... قریب سے...... بھی یہ زیادہ نقصان سے بچالیتی ہے......

آہ......'' مارے درد کے اس کے منہ سے کراہ سی خارج ہو گئی، مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی۔ میں نے اس کی خیریت چاہی وہ پھر ہولے سے مسکرا دی۔

وہ ہنوز آپریشن ٹیبل پر پڑی ہوئی تھی اور میں اس کے قریب ایک کرسی پر سر جھکائے سوچوں میں گم تھا۔ اس کی ہلکی نرم مترنم آواز پر میں نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ غور سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے شاید میرے چہرے اور آنکھوں سے غم و اندوہ کی پرچھائیاں بھانپ لی تھیں۔ میں دوسری طرف اپنا رخ بدل کر کھڑا ہو گیا۔

پتا نہیں میں اس سے کیا کہنا چاہتا تھا اور آئندہ کیا کرنا چاہتا تھا، سچی بات یہ تھی کہ......پیش آمدہ حالات روڈلف کی ہلاکت سمیت بہت ہی اعصاب شکن گزر رہے تھے۔

''کیا روڈلف بے چارہ بھی اس درندے کی سفاکیت کی بھینٹ چڑھ گیا؟'' معاً عقب سے مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

''ہاں!'' میں جواب میں اتنا ہی کہہ پایا۔

''بہت نقصان ہو گیا ہمارا...... روڈلف بہت کام کا آدمی تھا، جاں نثار بھی اور دلیر بھی، اس ظالم درندے نے...... میرے منگیتر کو بھی......'' وہ فرطِ غم سے اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی اور سسکیاں لے کر رو پڑی۔

ڈاکٹر حماد کے ذکر پر میں ایک دم اس کی جانب گھوما۔ مجھے خیال ہی نہ رہا تھا کہ اس سے حماد کے بارے میں پوچھتا۔ اگرچہ اب تک مجھے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بھی کاسپاکو کی درندگی کی بھینٹ چڑھ چکا ہے اور کاسپاکو کے منہ سے بھی میں نے ایسا کچھ اشارتاً سنا تھا۔ یاسمین خانم کا حسین چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''سب کچھ...... جیسے ایک لمحے میں ختم ہو گیا...... ایک آندھی تھی، جو سب کچھ اجاڑ چلی۔'' وہ سسکتے ہوئے کہے جا رہی تھی، میرے پاس تو اسے تسلی دینے کو الفاظ بھی نہ تھے۔ ایسے میں نقصان برابر کا ہی تو ہوا تھا۔

''ہمیں اب ان ساری باتوں کو بھلانا ہوگا، ورنہ ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے اور اس وقت ہمارا اب ایک جگہ ٹکے رہنا یوں بھی مناسب نہ ہوگا اور تمہیں اب بھی پراپر ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔ ورنہ سیپٹک ہو سکتا ہے اور خون زہریلا ہو جائے گا جو تمہاری زندگی کے لیے جان لیوا ہو سکتا ہے۔'' میں نے متفکر مگر دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔

''مجھے تم اندر کسی کمرے میں لے جا سکتے ہو؟'' اس

گھڑی

گائیڈ نے عمارت کے گرد پھیلے ہوئے کھنڈروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ٹھیک دس بج کر دس منٹ پر خوفناک زلزلہ آیا اور چاروں طرف کی عمارتیں تباہ ہو گئیں۔

''لیکن یہ عمارت کیسے بچی؟'' خاتون نے حیرت سے سوال کیا۔

''اس کے مینار کی گھڑی بیس منٹ آگے تھی۔'' گائیڈ نے جواب دیا۔

جائے پیدائش

ایک صاحب دوستوں کی محفل میں بڑ ہانک رہے تھے کہ ''میں شہر کے سب اسپتالوں میں رہ چکا ہوں۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' ایک دوست نے ٹوکا۔ ''کیا تم میٹرنٹی اسپتال میں بھی رہ چکے ہو؟''

وہ صاحب جھٹ بولے۔ ''کیوں نہیں، میں پیدا ہی وہیں ہوا تھا۔''

(انتخاب، سید افتخار حسین شاہ، مظفر آباد)

مزاج

ایک امریکی، ایک فرانسیسی، ایک چینی اور ایک اسکاٹ لینڈ کا باشندہ اکٹھے بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان چاروں کے گلاسوں میں ایک ایک مکھی گر گئی۔ امریکی نے بیئر گرا دی۔ فرانسیسی نے گلاس سے مکھی نکالی اور بیئر پی گیا۔ چینی نے بیئر گرا دی اور مکھی کھا گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے صاحب نے مکھی نکال کر چینی کے ہاتھ بیچ دی اور بیئر پی گیا۔

سبق

ایک خاتون نے اپنے شرابی شوہر کو سبق سکھانے کے لیے سیاہ رنگ کا شیطانی لباس پہنا۔ منہ پر نقاب اور سر پر سینگ لگا کر گلی کے موڑ پر کھڑی ہو گئی۔ رات کو اس کا شوہر جب نشے میں دھت گلی میں داخل ہوا تو خاتون ایک بھیانک چیخ مار کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ شوہر نے خوف زدہ ہونے کے بجائے جھومتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''میں شیطان ہوں۔'' خاتون نے جواب دیا۔

شوہر نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاتھ ملاؤ یار میں تمہاری بہن کا شوہر ہوں۔''

(انتخاب، اورنگزیب الٰہی، الشرائع مکہ مکرمہ)

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے جیسے میری بات نظر انداز کر دی۔ اس نے اپنی سسکیوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔ میں خود بھی اس کمرے کے مخصوص ماحول کی یکسانیت سے بیزار اور بوجھل سا ہو رہا تھا۔

''شیور۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر اُلجھ سا گیا، وہ میری ''اُلجھن'' سمجھ کر آہستگی سے بولی۔

''پلیز! اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو...... مجھے سہارا دے دو، میں چل کر کمرے تک جا سکتی ہوں۔''

''اِٹس او کے...... آ جاؤ......'' میں نے کہا۔ وہ کہنیوں کے سہارے ٹیبل سے اُٹھنے لگی، میں نے اسے سہارا دیا، اس نے میرا بازو تھاما اور دھیرے دھیرے اپنے جسم کو حرکت دیتے ہوئے اُٹھایا اور پاؤں زمین پر رکھے تو اسے ایک دم چکر سا آ گیا، وہ لہرا کر گرنے لگی تو میں نے فوراً اسے تھام لیا، وہ میرے ساتھ پوری کی پوری لگ گئی۔ اس کی گھنی زلفیں میرے چہرے پر جیسے گھٹاؤں مینہ برسانے لگیں، میں تھوڑا گھبرایا، اسے سنبھالا دیا مگر وہ چل نہیں پا رہی تھی، اس کے شانے کا درد جاگ رہا تھا۔ میں اس کی ضد کے آگے مجبور تھا۔ وہ اپنے محبوب کا آخری دیدار کرنا چاہتی تھی، میں کیا کرتا۔ حالانکہ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ایک قدم بھی بڑھا سکے، مگر یہ اس کی خود اعتمادی تھی کہ وہ ٹیبل سے بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی، یہ الگ بات تھی کہ زمین پر اپنے پاؤں نہ جما سکی تھی اور میں نے اسے فوراً سنبھال لیا تھا۔

بہرکیف...... میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لیا، اس نے بھی سہارے کے لیے اپنی مرمریں بانہوں...... کا حصار میری گردن کے گرد حمائل کر دیا۔ اس کا شاخِ گل جیسا گل نقشیں بدن میرے مضبوط بازوؤں کے رحم و کرم پر تھا اور مجھے اس کی گدازیت کا احساس کچھ اور سوا ہوتا محسوس ہونے لگا۔

میں اسے اُٹھا کر جب اس کے کمرے میں پہنچا تو پتا چلا وہ اس کی خواب گاہ تھی۔

میں نے اسے آہستگی سے بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ بولی۔

''پاس کے کمرے میں حماد کی لاش پڑی ہے۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے اسے دوبارہ دیکھنے کی...... کیا تم اسے ایک نظر دیکھ سکتے ہو؟''

''آں...... ہاں! مجھے ایک نہیں دو لاشوں کو دیکھنا ہے۔ شاید آخری بار...... روڈلف کی لاش بھی اس طرف پڑی ہے۔'' میرے لہجے میں غم کی شدت ایک بار پھر اُمڈ آئی تھی۔

''اگر زحمت نہ ہو تو مجھے بھی ان کا آخری دیدار تو کروا دو......'' یاسمین نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا کہ میرا اپنا دل بھر آیا۔ اس کا دکھ بلاشبہ مجھ سے دوگنا تھا۔ روڈلف تو میرا دوست اور کسی حد تک دستِ راست بھی تھا مگر یاسمین کے لیے ڈاکٹر حماد اس کا منگیتر ہی نہیں بلکہ اس کی محبت بھی تھا۔

''تمہیں زحمت ہو گی، میں خود چلنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نن...... نہیں، کوئی زحمت نہیں ہو گی۔ آؤ......'' میں نے کہا اور اس کی طرف بڑھا۔

اسے پھر اُٹھایا اور پہلے ہم اس طرف آئے جہاں روڈلف مردہ حالت میں اب دیوار سے لگے ہوئے فرش پر پورا لڑھک چکا تھا۔ میرے حلق میں رقت اُترنے لگی اور دل بھاری ہونے لگا۔ یاسمین کو آہستگی سے میں نے اس کے اشارے پر روڈلف کی لاش کے قریب فرش پر ہی بٹھا دیا تھا۔ وہ روڈلف کی لاش کو بڑی کرب انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''اس نے ہمارا بڑا ساتھ دیا تھا۔ بہت دلیر اور باعزم نوجوان تھا یہ...... خدا اس کی مغفرت کرے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''آمین۔'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ اسلام اور اس کی تعلیمات سے بے حد متاثر بھی تھا، اس کے خاندان کے کچھ لوگ مسلمان...... ہو چکے تھے۔''

''میں جانتی ہوں، اس کی دادی اور بعد میں اس کی ماں بھی اسلام سے متاثر ہوئی تھی۔ اِسے بھی اسی نے ہی اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا تھا۔'' یاسمین نے کہا۔

ہم دونوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کے روڈلف کو خراجِ تحسین پیش کیا اور پھر ہم ڈاکٹر حماد کے کمرے میں آ گئے، وہ فرش پر ہی پڑا ہوا تھا، اس کی پیشانی میں سرخ روشن دان بنا ہوا تھا، جہاں اب ہلکی سی سیاہی نظر آنے لگی تھی۔

اپنی محبت، اپنے منگیتر کی لاش کو دیکھ کر یاسمین کو رونا آ گیا اور وہ بالکل بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس نے رقت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''مجھے...... اس کے قریب بٹھا دو فرش پر شہزی! پلیز۔''

میں نے ایسا ہی کیا، وہ زخمی ہونے کے باوجود اپنے منگیتر کی لاش سے لپٹ گئی اور روتی چلی گئی۔

میں نے بھی چند ثانیے کے لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تا کہ اس کے اندر کا غبار نکل جائے، وہ سارے خس و خاشاک نکل جائیں، جو بعد میں اسے اور زیادہ چبھتے رہتے۔

پھر جب وہ غم و اندوہ کے مارے ہلکان سی ہونے لگی تو میں نے اسے تسلی دی۔ اس نے آخری بار ڈاکٹر حماد کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر سسک پڑی، میں اسے اُٹھا کر اس کے کمرے میں آ گیا۔

اسے بیڈ پر لٹا کر میں اس کے قریب والی ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

”یہ اس قدر سنگ دل اور سفاک شخص کون تھا؟ جو تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا تھا؟“ یاسمین نے ذرا سنبھلنے کے بعد مجھ سے پوچھا، اس کا اشارہ جہنم واصل کاساپوکو کی طرف تھا۔

”میرے کئی دشمن ہیں، اب تمہیں کیا تفصیل بتاؤں.....؟ میرا خیال ہے ہمیں اب آگے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“ میں نے تھکے تھکے سے انداز میں جواب دیا۔

”اچھا ہوا کہ تم نے اُسے (کاساپوکو کو) اسی بے رحمی سے واصلِ جہنم کر ڈالا۔“

”وہ درندہ اسی لائق تھا۔“ میں نے ہولے سے جواب دیا۔ پھر مقصد کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں ان دونوں کی لاشوں کے بارے میں سوچنا ہوگا اور اب تو میرا بھی منیلا سے نکلنا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ تمہیں بھی میں یہی مشورہ دوں گا کہ تم اپنے والد صاحب کے ساتھ واپس تہران (ایران) چلی جاؤ۔“

”ہرگز نہیں.....“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کے باعزم ہو کر بولی۔ ”میں اپنے پاپا کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ تم مجھے کسی طرح حفیظ اللہ کے پاس پہنچا دو، باقی میں سب سنبھال لوں گی۔“

مجھے یاد آیا۔ حفیظ اللہ وہی شخص تھا جہاں اس کے باپ جمشید حمیدی بے نے روپوشی اختیار کر رکھی تھی۔ اگرچہ کوہارا نے اس کے بارے میں جھوٹ بولا تھا کہ وہ اس کے قبضے میں ہے۔ یا ممکن ہے رہ چکا ہو اور بعد میں چھڑا لیا گیا ہو۔ میں اس سے متعلق یاسمین سے پہلے بھی پوچھ چکا تھا، اس نے بھی میری بات کی تصدیق کر دی تھی۔

”ہم بھی عنقریب قاہرہ (مصر) کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔“

”اچھی بات ہے.....“ میں نے کہا۔ ”تم اپنا راستہ پکڑو اور میں اپنی منزل کی جانب رخ کرتا ہوں۔“

”کیا تم..... مصر نہیں چلو گے؟ روڈلف کی نصیحت بھلا دو گے؟ کیا کہا تھا اس نے تم سے، تمہیں یاد نہیں.....؟“ وہ قدرے حیرانی سے بولی۔

”سب یاد ہے مجھے.....“ میں نے بے دلی سے کہا۔ ”لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میری منزل کا راستہ اس طرف کو جاتا ہے، یہ میرے لیے محض وقت کا زیاں کرنے والی بات ہو گی اور کچھ نہیں۔“

میری بات پر یاسمین نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے روک دیا اور بولا۔

”پلیز! مس یاسمین، مجھے زور نہ دیں۔ میں تمہاری کامیابی کی دعا ضرور کر سکتا ہوں لیکن..... نہیں..... میں اپنی منزل کی طرف جانے والا راستہ نہیں بدل سکتا۔“

”تمہاری منزل کی طرف جانے والے کئی راستے ہیں مسٹر شہزی!“ یاسمین نے کہا۔ ”یہ بھی انہی راستوں میں سے ایک اہم راستہ ہے۔“

”تمہیں کوہارا سے از حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے اس کی بات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہا۔ ”سے جی کوہارا کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں، کاساپوکو کا روپ تم دیکھ ہی چکی ہو، سمجھو تو..... کوہارا، کاساپوکو کی ٹرو کاپی ہے بلکہ بربریت اور بے رحمی میں اس سے دو ہاتھ آگے ہی ہے اور خطرناک بھی اس سے کہیں زیادہ ہے۔

”وہ یہاں میرے مقابلے میں نہیں آیا ہے لیکن وہ اور اس کے بھیڑیے صفت ساتھی، لہو تک کی بُو سونگھ کر تمہیں اور تمہارے باپ جمشید حمیدی کو ڈھونڈ نکالیں گے، بلکہ میرا تو دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ تم دونوں قاہرہ جانے کا ارادہ اور اس عظیم تاریک اہرام کی مہم پر جانے کا پروگرام ملتوی کر کے واپس تہران لوٹ جاؤ..... کوہارا نے تمہاری بُو سونگھ لی ہے۔ میں اس کی فطرت سے واقف ہوں، وہ اب... بُوگیر کتے کی طرح تمہاری اور پروفیسر جمشید کی تلاش میں کونا کونا سونگھ رہا ہوگا۔“

میری بات پر یاسمین نے ایک گہری سانس لی پھر بولی۔ ”جس طرح تم اپنی مہم کو اُدھورا نہیں چھوڑ سکتے اسی طرح ہم باپ بیٹی بھی اسے پورا کیے بنا پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں، کیونکہ ہمیں اپنی اس خطرناک مہم کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ میں..... اگر واپس بھی پلٹ جاؤں تو پاپا ہرگز واپسی کا راستہ اختیار نہیں کریں گے، تم دیکھ ہی رہے ہو کہ

اس مقصد کی خاطر انہوں نے خود کو کس قدر چھپا کے رکھا ہوا ہے۔ ان کا خدشہ درست ہی تھا، وہ مجھے اور ڈاکٹر حماد کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے کہ...... ہم یہ بنگلا چھوڑ دیں اور ان کے پاس حفیظ اللہ کے مکان میں آ جائیں۔''

''ہوم......'' میں نے ایک خیال انگیز ہنکارا بھرا۔

''اچھی بات ہے، ہر کسی کو اپنا مشن عزیز ہوتا ہے، تمہیں تمہارا مشن مبارک ہو۔ مگر میں اب یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ مجھے جانا ہوگا۔''

''اتنی جلدی تو تم امریکا کے لیے پرواز نہیں کر سکتے۔'' یاسمین بولی۔

''چند روز ہی لگیں گے۔ میں تب تک کسی ہوٹل میں یہ دن گزار لوں گا، مگر تم پلیز ان لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست ضرور کر دینا، ورنہ ہمارا ملیلا سے نکلنا محال ہو جائے گا۔''

''ہاں! مجھے پتا ہے کہ اب حالات کس قدر حساس ہو چکے ہیں۔''

''تمہاری حالت تسلی بخش نہیں ہے اسی لیے میں تمہیں یہاں ایسے نہیں چھوڑ کر جا سکتا۔ کیا کہتی ہو جلدی بتاؤ، تمہیں گاڑی میں ڈال کر حفیظ کے ہاں لے جاؤں یا پھر...... انہیں فون پر مطلع کر دوں؟'' ایک لمحہ توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

یاسمین میری طرف بڑی کرب انگیز نگاہوں سے تکنے لگی۔ ''مجھے فون کرنا ہوگا، یہاں سے میں اس وقت تک نہیں نکل سکتی جب تک حماد اور روڈلف کی لاشوں کو صحیح مقام پر ٹھکانے نہیں لگا دیا جاتا۔''

میں اس کی ''صحیح مقام'' والی بات کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے اسے فون لا دیا جو کارڈلیس تھا، اور اس کی خواب گاہ میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ دیسی اور فارسی زبان میں کسی سے جلدی جلدی بات کی اور پھر مجھ سے بولی۔ ''اب تمہیں میرے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں...... میرے دو ساتھی یہاں پہنچ رہے ہیں۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔''

میں مطمئن ہو گیا اور اس سے اجازت چاہی تو اس کی آنکھوں میں اُداسی اور کرب کی پرچھائیں مزید گہری ہو گئی۔

''ہاتھ نہیں ملاؤ گے......؟'' وہ اچانک عجیب سے لہجے میں بولی اور میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا اس نے پُرجوش انداز میں مصافحہ کیا، اس کی کشادہ سیاہ آنکھوں...... میں بڑی حسرت و یاس کے چراغ جل بجھ رہے تھے میں نے آخر میں ازراہِ ہمدردی اس سے ایک بار پھر کہا۔

''کہو تو میں تمہیں...... حفیظ اللہ کے گھر چھوڑ دوں......؟''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں...... میں نے فون کر دیا ہے، وہ آتے ہی ہوں گے، یہاں سے زیادہ دور نہیں حفیظ اللہ کا ٹھکانا، لہٰذا میں اب محفوظ ہوں اور تم بھی جہاں جاؤ، اپنا خیال رکھنا۔''

میں ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں مسکرایا اور اس کے بنگلے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

میں بنگلے سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور فٹ پاتھ پر بے منزل اور بے مقصد سا پیدل چلنے لگا۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ ایک وقت تھا، روڈلف میرے ساتھ ہوتا تھا۔ ہوٹل ہو، اوپن ریسٹورانٹ ہوں، بار یا پب...... (بار یا پب میں اسی کی ضد پر چلا جاتا تھا، مگر اس کے ساتھ ''شغل'' نہیں کیا کرتا تھا) پیش آمدہ اور پیش آئندہ حالات پر میں اسی کے ساتھ ہی تبادلہ خیال کرتا تھا۔

کس قدر ناپائدار ہوتی ہے زندگی، سچ ہی کہا کسی نے، پانی کا بلبلہ ہے زندگی۔ ابھی چند گھنٹوں پہلے روڈلف زندہ تھا اور مجھ سے باتیں کر رہا تھا مگر اب وہ دنیا سے گزر چکا تھا۔ مجھے تنہا کر گیا تھا۔

ملیلا میں خود کو اب واقعی اس کے بغیر میں تنہا اور اکیلا ہی محسوس کر رہا تھا۔ روڈلف بار بار مجھے یاد آ رہا تھا، حالانکہ میں نے اس کے ساتھ کچھ اتنا زیادہ وقت بھی نہیں بتایا تھا۔ مگر جتنا بھی بتایا تھا، وہ شاندار اور بہت یگانگت اور یاری باشی والا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ میرے دل کو اس سے بڑا اسہارا تھا۔

روڈلف نہ بھی ملتا مجھے...... تو اور بات تھی مگر مل کے بچھڑنا اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے...... میرے لیے بے انتہا اُداسی کا سبب بنا تھا۔

دن نکل رہا تھا اور سڑکوں پر ٹریفک دھیرے دھیرے رواں دواں ہونے لگی تھی۔ لوگ گھروں، کالجز اور فلیٹوں سے نکل کر گھروں اور دکانوں کی طرف نکل رہے تھے۔ کسی کے پاس اپنی سواری تھی، کوئی بس میں لدا ہوا تھا تو کوئی ٹرام میں...... لیکن میں پیدل تھا۔ مجھے کسی دکان یا دفتر نہیں جانا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

رہائشی بلاک پار کر کے میں نے ایک چوراہا کراس کیا اور وہاں سے ایک مارکیٹ کے آثار دیکھ کر اس طرف مڑ گیا۔ وہاں دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔

ادھر ہی مجھے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ نظر آ گیا۔ اس کی دیوار شیشے کی تھی اور اس پر کافی کا ایک بڑا سا کپ، ایک بڑی لمبی بریڈ اور ایک کارٹون کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ وہ شیشے کا سنگل دروازہ تھا۔ یہ شاید یہاں مختصر خریداری کے لیے آنے والوں کو ریسٹ فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

اس قدر صبح میں بھی وہاں مجھے خاصی تعداد میں افراد بیٹھے نظر آئے تھے۔ ایک میز پر دو دو افراد براجمان تھے۔ کچھ نیند کے مارے سست سے نظر آ رہے تھے اور کچھ فریش چہرے لیے ہوئے تھے۔

میں ایک میز پر بیٹھا بے مقصد سا انہی پر غور کر رہا تھا۔ میرا دل اُداس تھا اور اردگرد کے ماحول میں دل لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یس سر......!''

اچانک ایک مترنم سی کھنکتی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ایک درمیانی عمر کی خوبصورت سی ویٹرس تھی۔ اس نے نسبتاً ڈھنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ یعنی سرخ رنگ کی پرنٹڈ فراک اور سفید قمیص تھی، اگرچہ اس کا بھی گریبان قدرے کشادہ تھا مگر عریانی نہیں بہرحال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چہرہ گول اور ناک ستواں تھی، قد درمیانہ تھا، بال سلیقے سے ربن کیے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ میں ایک رنگین سا مینیو کارڈ تھام رکھا تھا جو اس نے میری جانب مسکراتے ہوئے بڑھا دیا۔

یہ چھوٹا سا ہی ریسٹورنٹ تھا اور اسی لیے شاید اس کا مینیو بھی چھوٹا تھا، جس کے ایک طرف ہوٹے موٹے الفاظ میں...... انڈے، توس اور اسی طرح کی چند چیزوں کی تصاویر ناموں کے ساتھ بنی ہوئی تھیں اور پیچھے کی جانب تین چار اقسام کی کافی اور چائے۔

کافی کا شوقین میں کم ہی تھا۔ مینیو آئٹم چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ اسی وقت آرڈر بھی لینے پر تلی ہوئی تھی۔

میں نے مکھن توس، چائے اور ایک ابلے ہوئے.... انڈے کا آرڈر دے دیا۔

ذرا ہی دیر میں اس نے یہ چیزیں میری میز پر لگا دیں اور کاؤنٹر پر کہنی ٹکا کر جا کھڑی ہوئی۔

میں بے دلی سے ناشتا کرنے میں مصروف ہو گیا اور اسی دوران میری اس پر نگاہ پڑی تو اُسے اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا۔

مجھے دیکھتے پا کر وہ ہولے سے مسکرائی۔ ایسے میں مجھے روڈ لف یاد آ گیا، وہ ہوتا تو ضرور اس ویٹرس سے کچھ ''نازک'' لمحات کشید کرنے کا سوچتا، میں سر جھٹک کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے اس کی مسکراہٹ پر کوئی توجہ نہ دی۔

مجھ سے بمشکل ایک توس اور تھوڑا سا انڈا کھایا گیا تھا، چائے میں نے پی لی۔

میرے سامنے دو راستے تھے۔ ٹکٹ لوں اور امریکا کی طرف کوچ کر جاؤں، میرے پاسپورٹ پر امریکا کا تین سال کا ویزا لگا ہوا تھا۔ دوسرا خیال میرا سے جی کوہارا کی طرف جاتا تھا۔ اگر میں اس کے پیچھے پڑ جاتا تو...... ممکن تھا میرا آگے کا سفر تاخیر کا شکار ہو جاتا اور کسی گڑبڑ میں پھنسنے کا بھی خدشہ تھا، ایسی گڑبڑ جو فلیلا سے میری ''باعزت'' روانگی میں رخنہ انداز بھی ہو سکتی تھی۔

پہلے ہی میں یہاں بہت سی گڑبڑ کا شکار رہا تھا، شکر تھا کہ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، یوں میرے فلیلا کے ویزے کی مدت بھی ختم ہونے والا تھی۔

ایک خیال دل میں آیا تھا کہ سے جی کوہارا کو اسی جگہ پر جا کر تلاشنے کی کوشش کروں...... جہاں وہ روڈ لف، یاسمین اور مجھے لے کر گیا تھا۔ مگر یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دوبارہ وہاں مجھے ملتا۔ یہاں اس کے کئی ٹھکانے ہو سکتے تھے۔ وہ مکمل طور پر لولووش کی سپورٹ میں تھا۔

کوہارا سے میرا کبھی نہ کبھی سامنا ہو سکتا تھا۔ اگر میں اسی میں اُلجھ جاتا تو میں اصل مقصد سے دور ہو جاتا۔ جس طرح کاساپا کو نے دولت کے بل بوتے پر فلیلا کی پولیس کو کیپٹن رانسے کی صورت میں ساتھ ملا لیا تھا۔

کوہارا بھی لولووش کے توسط سے یہ سب کر سکتا تھا۔ میرے دشمنوں کی یہ کھلی بزدلی تھی۔ وہ جب مجھ سے منہ کی کھانے لگتے تھے تو اس طرح کی راہ اپناتے تھے۔ کوہارا بھی لولووش کے بل بوتے پر یہی سب کر سکتا تھا۔

یہاں میری کون مدد کو آتا؟ لہٰذا میں نے ناشتا کرنے کے مختصر سے دورانیے میں ہی آخری فیصلہ بھی کر لیا کہ پہلے اس علاقے سے نکل کر جنوبی علاقے کی طرف نکل جاؤں جدھر ائرپورٹ تھا۔ ٹکٹ لینے کی کوشش کرتا ہوں، اگر قریب کی کسی بھی فلائٹ میں سیٹ ریزرو ہو جاتی ہے تو ٹھیک۔ بصورتِ دیگر دو یا تین روز کے بعد کی ملتی ہے تو ٹکٹ خرید کر خاموشی سے انتظار میں وہیں کسی چھوٹے سے ہوٹل کے

کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔

یہ فیصلہ کر کے میں ریسٹورنٹ سے نکل آیا اور ایک تیز رفتار بس میں سوار ہو کر جنوبی علاقے میں پہنچ گیا۔

میں گردوپیش سے بھی بے خبر نہ تھا۔ کاسپا کو کو جہنم واصل کرنے کے بعد میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا تھا، اسی نے ہی خیلا میں میرے آگے روڑے اٹکا رکھے تھے۔ لیکن وہ رذیل اپنی موت کی قیمت بھی روڈلف کے قتل کی صورت میں چکا گیا تھا۔ جو میرے لیے بہت بھاری ثابت ہوئی تھی۔

یہاں ایک بکنگ آفس سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ دو دن بعد کی فلائٹ میں سیٹ مل سکتی تھی۔ میں نے ٹکٹ لے لیا اور اپنے پروگرام کے مطابق ائرپورٹ کے قریبی ہوٹل میں ایک چھوٹا اسٹوڈیو روم لے کر اس میں بند ہو کے بیٹھ گیا۔

تیسرے روز رات دس بجے کی میری فلائٹ تھی۔ یہ دو دن میں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوٹل کے اسی کمرے میں گزار دیے۔

تیسرے روز شام میں ہوٹل سے تیار ہو کر نکلا اور سیدھا ائرپورٹ کا رخ کیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچا اور اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ رکھ دیا۔ آفیسر ایک خاتون تھی۔ اُس نے کچھ روایتی قسم کے سوالات کیے اور اس دوران میرے پاسپورٹ کا بھی بہ غور جائزہ لیتی رہی۔

9/11 کے بعد سے امریکا کی امیگریشن کی شرائط بڑی سخت کر دی گئی تھیں، اسی لیے وہ بالخصوص ایک ایشین پاکستانی کو خوب جانچ رہے تھے۔ جب اسے میرے پاسپورٹ اور ویزے میں کوئی سقم نظر نہ آیا تو اس نے ایک بڑی سی گول اسٹیمپ اُٹھا کر میرے پاسپورٹ پر چسپاں کر دی۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

ڈپارچر لاؤنج میں مجھے ایک گھنٹا بیٹھنا پڑا۔ اس کے بعد مطلوبہ فلائٹ کی طرف روانگی کی اناؤنسمنٹ گونجنے لگی۔ دیگر مسافروں کے ساتھ میں بھی اُٹھا اور اپنا شولڈر بیگ اُٹھا کے چل دیا۔

ایک چمکتی دمکتی کوسٹر بس میں سارے مسافر سوار ہوئے اور بس ٹرمنل تھری کی جانب روانہ ہو گئی جہاں امریکن ائرلائنز کا دیوہیکل بوئنگ طیارہ مسافروں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

میرا ٹکٹ کیلی فورنیا کا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں جہاز کے اندر اپنی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔

طیارے نے مقررہ وقت پر ٹیک آف کیا اور فضائے بسیط کی جانب اپنی بلند پروازی کا سفر شروع کر دیا۔

میں بالآخر امریکا کی جانب پرواز کر چکا تھا۔ وہ امریکا...... جہاں میری زندگی، میری عابدہ...... جانے کس حال میں اپنی ہر آتی جاتی سانسوں کے ساتھ میری یادیں دل میں بسائے منتظر تھی کہ کوئی ایسا جادو، ایسا معجزہ ہو جائے اور وہ اپنے شہزی کو اپنی صدیوں کی پیاسی نگاہوں کے سامنے دیکھ لے...... میں خود اس کے لیے کس قدر بے چین اور بے قرار بیٹھا تھا بلکہ میں تو اس کی جدائی کے بعد سے ہی ہر لحہ ایک کرب انگیز تڑپ میں گزار رہا تھا اور اب بھی گزار رہا تھا۔ لمبی جدائیوں کے اس کرب ناک دور میں ایک لحہ ایسا بھی آیا تھا جب میرا دل بالکل ہی مایوس ہی ہو کر رہ گیا تھا کہ...... کیا عابدہ کو میں دوبارہ پا سکوں گا......؟ لیکن پھر مایوسیوں کے یہ اندھیرے اس وقت فنا ہونے لگتے تھے جب میرے اندر پہلی اور آخری محبت کے حصول اس کے تحفظ اور اسے حالات کے گرداب سے نکالنے کا جذبہ بڑی شدت کے ساتھ بیدار ہونے لگتا تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے مجھے آج تک عابدہ کے حصول کے لیے ثابت قدم رکھا تھا۔

طیارہ محوِ پرواز تھا۔ میری سیٹ کھڑکی کی طرف تھی اور وہاں سے میں تاریک آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ نیچے زمین کی ٹمٹماتی روشنیاں اب معدوم ہو چکی تھیں۔ میں سیٹ کی پشت گاہ سے سر اور کمر ٹکائے آنکھیں موندے ہوئے بظاہر پُرسکون حالت میں تھا۔ میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس طیارے کے دو اسٹاپ تھے، پہلا دبئی اور دوسرا مصر......

''ایکسکیوزمی سر......!''

معاً ایک مترنم سی آواز پر میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ ایک حسین سی ائرہوسٹس تھی۔ جو ایک ہاتھ سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا کر قدرے جھکی ہوئی میری طرف دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔

''یس......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر استفساریہ کہا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک کاغذی چٹ میری طرف بڑھا دی اور آگے نکل گئی۔

میں اُلجھ سا گیا اور چٹ کھول کر اس پر نظریں جما دیں۔ صرف یک سطری پیغام تھا میرے لیے جسے پڑھ کر

.... میرے دل و دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

"کون تھا یہ......؟ اور کیوں بلا رہا تھا مجھے......؟"

اِک سطری پیغام ایک ہی نظر میں پڑھنے کے بعد میں زیرِ لب خود کلامیہ بڑبڑایا جس میں فقط یہی لکھا تھا۔

"شہزی! ٹاپ فرسٹ کلاس کے سوئٹ نمبر تین میں، آجاؤ۔"

سکون کی چند لحات کی گھڑیاں غارت ہونے لگی تھیں۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کسی نے مذاق نہ کیا ہو، لیکن نہیں...... امریکی ائرلائنز کے اس طیارے میں میرے ساتھ ایسا مذاق جو میرا نام بھی جانتا ہو، مذاق نہیں ہوسکتا تھا۔

"مجھے اس یک سطری پیغام کو فالو کرنا چاہیے یا نہیں......؟" میں نے خود سے سوال کیا۔

جواب ایک ہی تھا کہ سرِدست اسے صرف نظر کر دیا جائے۔

اور...... میں نے ایسا ہی کیا لیکن میرا سکون غارت ہو گیا تھا۔ اس طیارے میں کوئی کھچڑی پکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ہونے والا تھا یا ہونے کی تیاری میں تھا اور جس کا سبب میں ہی تھا۔ میرے دل کو ایک پریشان کن تجسس نے گھیر لیا تھا۔ دل چاہ بھی رہا تھا کہ اُٹھ کر جا کر دیکھوں...... اس شخص سے ملوں...... کون تھا یہ......؟ جو مجھے جانتا تھا اور یہ بھی کہ میں اسی طیارے میں ہوں......

بالآخر یہ تجسس اور پریشان کن اُلجھن اس قدر بڑھ گئی کہ مجھے اپنی سیٹ چھوڑنا ہی پڑی۔

ائرہوسٹس سے میں نے ٹاپ فرسٹ کلاس کے سوئٹ نمبر تین کی رہنمائی لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس سوئٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ٹاپ فرسٹ کلاس...... کاک پٹ کے ساتھ بنے ہوئے ہوتے تھے۔ یعنی جہاز کے اگلے حصے کی طرف......

دروازے پر ایک جوان مرد فلائٹ اٹینڈنٹ موجود تھا۔ اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے اسے بتا دیا کہ مجھے سوئٹ نمبر تین میں جانا ہے۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے ایک ڈیجیٹل ڈائری نکالی اس پر پیشہ ورانہ انداز میں تیزی سے کچھ پنچ کیا اور پھر میرا نام پوچھا۔ پھر وہیں لگے ایک انٹرکام پر مطلوبہ سوئٹ میں رابطہ کیا اور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"سر...... ! مسٹر شہزاد آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"اوکے سر......! شیور......" اس نے انٹرکام ریسیور دوبارہ جھلا دیا اور پھر مسکرا کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سوئٹ میں کون سفر کر رہا ہے؟" نہ چاہتے ہوئے میں نے اس سے پوچھ لیا، حسبِ توقع وہ حیران ہوا اور اسی لہجے میں پوچھا۔

"کیا آپ کو انہوں نے اپنا نام بھی نہیں بتایا؟"

میں نے دانستہ بات آئی گئی کرنے کے لیے ہنس کر کہا۔ "جان تو گیا ہوں، یہ میرا کوئی دوست ہوگا، مجھ سے اچانک مل کر سرپرائز دینا چاہتا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس نے ڈپارچر لاؤنج میں ہی مجھے پہچان لیا ہوگا۔"

"او...... اچھا...... اچھا۔" وہ بھی سر دھنتے ہوئے خفیف سی ہنسی کے ساتھ بولا، پھر بتایا۔

"یہ سوئٹ پروفیسر جمشید حمیدی کے نام سے ریزروڈ ہے۔"

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ مجھے اس کی بات پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ میرے چہرے پر اُلجھن کے آثار دیکھ کر اٹینڈنٹ بھی سنجیدہ سا نظر آنے لگا۔ میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اندر داخل ہو گیا۔

بڑا آرام دہ اور پُرسکون ماحول تھا یہاں کا...... ہلکی روشنی تھی اور محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ایسی بہترین آسائش کا حامل اور سکون آور ماحول...... اس وقت زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر محوِ پرواز تھا۔

میں نے مطلوبہ سوئٹ کے دروازے پر پہنچ کر ہلکی دستک دی تو اس کا دروازہ لطیف سی سرسراہٹ کے ساتھ وا ہوتا چلا گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور سامنے نگاہ پڑتے ہی...... میرا پورا وجود سن ہو کر رہ گیا...... اندر ایک ناقابلِ یقین منظر منتظر تھا۔

☆☆☆

وہی لطیف سی سرسراہٹ پھر اُبھری اور میرے عقب میں دروازہ دوبارہ سلائڈ ہو کر بند ہو گیا۔ میری یک ٹک نظریں سامنے ایک آرام دہ اور نفیس قسم کے بیڈ کے دائیں جانب ایک ایزی چیئر پر بیٹھے اس شخص پر جم کر رہ گئی تھیں جو اپنے مکروہ وجود میں ایک بھیانک تعارف کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا تھا۔

اس کی بائیں آنکھ پر سیاہ رنگ کا فلیپ جھول رہا تھا اور اس سے منسلک ایک باریک ڈوری اس کے سر کے گرد بندھی ہوئی تھی۔ یہ یاسمین کے نکیلے ناخن کا رہینِ منت تھا۔ وہ اس وقت کسی بحری قزاق ہی کے روپ میں نظر آ رہا تھا۔ جبکہ بیڈ پر ایک ستر پچھتر سالہ شخص نیم دراز تھا، اس

نے اپنی پشت ایک تکیے کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا اور بیمار لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی تھوڑی خراشیں سی نظر آرہی تھیں جو یقیناً سے جی کوہارا بلکہ ''کانا کوہارا'' کی رہینِ منت ہوسکتی تھیں، مجھے اس صاحبِ فراش بوڑھے شخص کی ہیئت کذائی سے صاف لگتا تھا کہ وہ کوہارا کے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا ہے۔

اس کے سر کے بال، گھنی مونچھیں، بھویں اور مشت بھر کی داڑھی سفید دودھیا نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ قدرے بیضوی تھا۔ رنگت سرخ وسپید تھی۔ صحت قابلِ رشک مگر جسم قدرے چھریرا تھا، نیم دراز ہونے کی حالت میں بھی وہ دراز قامت ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے سر پر سیاہ رنگ کی چپٹی سی ٹوپی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ موٹے فریم کا چشمہ تھا۔ جس کے ساتھ ایک سیاہ مہین سی ڈوری منسلک تھی جو اس کے گلے سے جھول رہی تھی۔ اس شخص کے ہونٹ پتلے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا جبہ نما سا لباس پہن رکھا تھا جو بند گلے سے لے کر پیروں تک نظر آرہا تھا۔

یہ شخص میرے لیے یکسر اجنبی تھا لیکن اس کے بیڈ کے قریب ایزی لاؤنج چیئر پر جو اول الذکر بدہیئت شخص براجمان تھا، وہ میرے لیے اجنبی نہ تھا۔ وہ سے جی کوہارا...... تھا۔ وہ میری طرف بڑی زہریلی مسکراہٹ سے اپنی اکلوتی آنکھ سے مسلسل .... گھورے جارہا تھا۔ اس کے مکروہ چہرے کی مسکراہٹ سے غرور جھلکتا صاف عیاں تھا۔

''آؤ...... شہزی! میرے دلیر دشمن...... یہاں بیٹھ جاؤ...... اس طرف......'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور سامنے رکھی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

''دیکھا...... کس طرح آسیبی سائے کی طرح میں جس وقت چاہوں تمہارے سر پر مسلط ہوجاتا ہوں۔''

میرے پورے وجود میں اس وقت ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ذہن تیزی سے قیاسات کے گھوڑے دوڑا رہا تھا مگر ان پر غور کرنے کا موقع نہ تھا۔ میں نے اپنے تنے ہوئے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی غرض کی ایک گہری سانس لی اور کرسی کی طرف جاکے اس پر بیٹھ گیا۔

کوہارا کی لاؤنج چیئر کے پاس ہی ایک نفیس قسم کی چھوٹی سی ٹیبل تھی جس پر دو پیگ، ایک بوتل وہسکی کی رکھی ہوئی تھی۔ ایک پیگ خالی تھا اور دوسرا آدھ بھرا۔

میرے کرسی پر براجمان ہوتے ہی کوہارا اپنی نشست پر سے اُٹھ بیٹھا اور اس کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، پھر ایک نظر میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے ذرا گردن موڑ کر بیڈ پر نیم دراز آخر الذکر شخص پر ڈالی اور پھر میری جانب دیکھتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ کا اشارہ اسی کی طرف کرکے بولا۔

''کون ہے یہ......؟''

''میں اسے نہیں جانتا......'' میں نے جواب دیا۔

''یہ وہی بڈھا ہے جس کی تلاش میں ماسٹر نے مجھے برما سے تہران اور پھر منیلا بھیجا تھا۔ پروفیسر جمشید حمیدی......''

اس نے انکشاف کیا اور میں چونک پڑا اور آنکھیں پھاڑے اس شخص کو تکنے لگا۔ کوہارا میری حیرانگی سے حظ اُٹھانے والے انداز میں بڑی مکروہ مسکراہٹ سجائے لحہ بھر میری طرف دیکھتا رہا۔

اس انکشاف کے بعد کہ یہ بوڑھا شخص پروفیسر جمشید حمیدی تھا، میرا دھیان لامحالہ اس کی لاڈلی بیٹی یاسمین خانم کی طرف چلا گیا۔

کوہارا نے پہلے ہم سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ پروفیسر جمشید حمیدی...... اس کے قبضے میں تھا، لیکن درحقیقت وہ اب اس کی گرفت میں آیا تھا۔ اگرچہ اب بھی مجھے یہ یقین کرنے میں تامل ہی تھا کہ کیا خبر کسی خفیہ باہمی معاہدے کے تحت یہ سب ہورہا ہو۔ یوں بھی یہ سوئٹ پروفیسر جمشید حمیدی کے نام سے ہی ریزورڈ تھا یا کروایا گیا تھا۔

بہرکیف...... میں نے ایسا کوئی تاثر ظاہر کیے بنا کہ مجھے پروفیسر جمشید حمیدی کے سلسلے میں کوئی فکر و تشویش محسوس ہوئی ہو، عام سے لہجے میں کہا۔

''مجھے یہاں بلانے کا مقصد......؟''

''اوہ...... ویری اسمارٹ۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

مجھے یاسمین کی طرف سے واقعی تشویش سی ہونے لگی تھی کہ نجانے اس کا اس بدبخت قسائی نے کیا حشر کیا ہوگا، مگر میں مصلحتاً ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، یوں میرا یاسمین خانم سے روڈلف کی حد تک ہی ایک تعلق تھا یا پھر تھوڑا بہت اس وجہ سے کہ اس کے باپ پروفیسر جمشید حمیدی کو لولوش اپنے اہم مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا جبکہ خود میرے نزدیک یہ سب سوائے لغویات کے اور کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔

میں ایک حقیقت پسند انسان تھا، ٹھوس دلائل اور عقلی توجیہات کی کسوٹی پر ہی میں ہر ایسی بات کو ماننے کا قائل تھا جو اپنے اندر زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت بھی سچ رکھتی ہو۔ جبکہ

پروفیسر جمشید کی مہم کسی بوڑھے سنکی اور خبطی کے دماغی فتور کے سوا میرے نزدیک اور کوئی حقیقت نہیں تھی۔ تاہم میرے حساب سے یہ چھاہی تھا کہ اس نے لولووش جیسے ''کرائم لارڈ'' کو اپنی اس بےمحل مہم میں اُلجھائے رکھا تھا۔

''درپردہ تم ان دونوں باپ بیٹی کو سپورٹ کیے ہوئے ہو اور اب یوں انجان بن رہے ہو جیسے تمہارا ان دونوں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے؟'' اچانک کوہارا نے دوبارہ استہزائیہ لہجے میں کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر اسی طنز سے جواب دیا۔

''کوہارا...... ! تمہارے دماغ میں واقعی عقل نام کی کوئی شے نہیں پائی جاتی ماسوائے خون خرابے کے...... مجھے تو کبھی کبھی تمہارے ماسٹر لولووش پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ تم پر اتنا بھروسا کیسے......''

''فضول بکواس نہیں......'' کوہارا نے ایک دم اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کردیا۔

''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں شہزی! تم ایک نمبر کے مکار اور چکر باز انسان ہو۔''

''تم خود سوچو، اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو...... اس طیارے میں امریکا جانے کے بجائے مصر جارہا ہوتا......'' میں نے پھر کہا۔ ''افسوس تم نے میری یہاں طیارے میں موجودگی تو کنفرم کرلی لیکن ٹکٹ کنفرم نہیں کرسکے کہ میری منزل کیلی فورنیا ہے۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں کوہارا کو یہ نہیں بتاتا، لیکن یہ فلائٹ ایسی تھی کہ کچھ چھپانا بےکار ہی تھا، تاہم یہ کہہ سکتا تھا کہ میں دوبارہ پاکستان کے واپسی کے سفر میں ہوں، کیونکہ اس فلائٹ کا فضائی روٹ میانمار.......... (برما) سے انڈیا پاکستان اور سعودیہ سے مصر پھر اس کے بعد بحرِ اوقیانوس (شمالی) کے اُوپر سے گزرتے ہوئے کیلی فورنیا (امریکا) تک تھا اور وہی اس کا اینڈنگ پوائنٹ تھا۔

میں...... نہیں جانتا تھا کہ اس مردود کی کون سی منزل ہے، کیونکہ جیسا کہ مذکور ہوا...... اس فلائٹ کے صرف دو ہی اسٹاپ تھے۔ ایک دبئی اور دوسرا مصر...... تب ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ تو کیا یہ دونوں...... مصر جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے؟

یہ خیال آتے ہی میرے وجود میں ایک نامعلوم خطرے کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی، لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یہ سوچ کر تسلی ہوگئی کہ...... میں اس وقت زمین پر نہیں بلکہ ایک بڑے ملک کی بڑی ائرلائن کے جمبو جیٹ بوئنگ طیارے میں تھا۔ جس کے مسافروں کو منزل تک پہنچانے کی ذمے داری صرف کاک پٹ میں بیٹھے ہوئے دو کپتانوں کی ہی نہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے لاکھوں کے عملے پر مشتمل افراد کی تھی جو زمین پر بیٹھے اس طیارے کی سمت، رفتار اور منزل کا ہمہ وقت تعین کیے ہوئے بیدار بیٹھے تھے۔ یہاں کوہارا کی اجارہ داری قائم نہیں ہوسکتی تھی اور نہ ہی یہ میرے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی بھی کرسکتا تھا، اگرچہ یہی کچھ میرے ساتھ بھی تھا کہ میں کوہارا سے ابھی دو دو ہاتھ نہیں کر سکتا تھا۔

''روٹ اور ٹکٹ کو ٹرانزٹ کرنے میں کیا دیر لگے گی؟ تم کیا سمجھتے تھے کہ اتنی آسانی سے تم اور پروفیسر اور اس کی لاڈلی بیٹی یاسمین...... جس نے مجھے یہ تحفہ دیا......'' کوہارا نے یہ کہتے ہوئے اپنی پھوٹی ہوئی آنکھ کی طرف اشارہ کیا تھا اور میں یاسمین خانم کی طرف سے اندر سے ہول اُٹھا تھا۔ ظاہری بات تھی کہ یہ مردود یاسمین کے باپ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا تو یاسمین بھی اسی کی گرفت میں ہوسکتی تھی۔

''ختم کرو یہ بحث کوہارا...... !'' میں نے اس موضوع سے پہلوتہی کرتے ہوئے اسے اصل بات کی طرف راغب کرنے کی غرض سے بظاہر بیزاری سے کہا۔

''مجھے بتاؤ...۔ اس طیارے میں تم کیا چاہتے ہو اور یہ کہ...... اس بےچارے پروفیسر کو تم کہاں لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہو؟''

سے جی کوہارا...... نے بڑی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گھور کر دیکھا۔ قریب دھری میز پر سے اُدھ بھرا پیگ اُٹھا کر ایک گھونٹ بھرا اور پیگ ہاتھ ہی میں تھامے ہوئے اس نے ایک ذرا گردن موڑ کر...... بیڈ کی طرف دیکھا۔ جہاں نیم دراز پڑا پروفیسر مجھے بہت غور غور سے تکنے میں محو تھا، پھر وہ مجھ سے بولا۔

''شہزی! میں فقط یہی چاہتا ہوں کہ تم جہاں جارہے ہو، وہیں تک اپنا سفر جاری رکھو اور میں اپنا...... میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش مت کرنا، میں تم سے امریکا آ کر ہی اب نمٹوں گا۔''

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار اندر ہی اندر سکون کی سانس لی تھی کہ وہ خود ہی میرے راستے سے دست بردار ہورہا تھا۔

''بس! یہی کہنے کے لیے تم نے مجھے یہاں بلانے کی زحمت دی تھی؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ حیرت

سے پوچھا۔ حسب توقع اس کی اکلوتی آنکھ میں فطری خونخواری کی چمک اُبھری۔

''کسی قسم کی چالاکی تمہیں مہنگی پڑسکتی ہے شہزی!'' وہ جیسے اب بھی مطمئن نہ تھا۔ آگے بولا۔ ''اس طیارے میں میرے تین آدمی بھی موجود اور......''

یہ کہتے ہوئے اس نے پیگ میں بچا ہوا آخری گھونٹ بھی چڑھا لیا اور قدرے جھک کر ایک ہاتھ سے اپنی لاؤنج چیئر کے نیچے سے ایک گن نکال کر میرے سامنے لہرائی تو میرے اوسان خطا ہونے لگے......

''یہ دیکھ رہے ہوناں...... گن ہے یہ...... میرے ان تین میں سے ایک کے پاس بھی ایسا ہی ہتھیار ہے اور باقی دو اپنی آستینوں میں زہریلی سوئیاں چھپائے ہوئے ہیں۔ میرے ایک اشارے پر کوئی بھی ایک مسافر دوستانہ انداز میں تمہارے شانے پر ہاتھ رکھے گا اور تمہاری روح اس طیارے سے بھی تیزی کے ساتھ پرواز کر کے آسمان کی وسعتوں کی طرف گم ہوجائے گی۔''

اس بدبخت کے لہجے میں نجانے ایسی کیا بات تھی کہ میرے پورے جسم میں پھریری دوڑ گئی۔ چند ثانیوں کے لیے کہ مجھے ایک چپ سی کھا گئی۔

''بب...... بیٹا! جو یہ کہہ رہا ہے، وہی کرنا، بہت خطرناک آدمی ہے یہ......'' میں اس کمزور سی لرزتی آواز پر چونکا۔ پہلی بار یہ لب کشائی بیڈ پر نیم دراز پروفیسر جمشید حمیدی نے کی تھی اور اس کا تخاطب میں ہی تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ''بیٹا'' کہنے کا انداز مجھے ایسا بھایا تھا کہ بے اختیار میں نے بھی اپنے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ اُبھرتے محسوس کیا۔

''مم...... میری بب...... بیٹی یاسمین بھی اسی کے آدمیوں کی قید میں ہے، بیٹا! اس کی جان خطرے میں ہے، میں ایک مسلمان بھائی ایک دکھی باپ کی حیثیت سے تم سے درخواست......'' اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ کیونکہ اسی وقت کوہارا نے خوفناک غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''اسے کیا بتارہے ہو بڈھے! یہ پہلے ہی سب جانتا ہے اور تم بھی......''

کوہارا کو بڑی شدید قسم کی غلط فہمی ہوگئی تھی اور یہ میرے لیے کسی بھی وقت خطرناک صورت اختیار کرسکتی تھی۔ یہی نہیں مجھے حیرت آمیز تشویش نے بھی آگھیرا تھا، یہ دیکھ کر کہ یہ مردود آتشیں اسلحے کے ساتھ اس مسافر طیارے میں موجود تھا، بلکہ یہی نہیں اس کے تین میں سے ایک ساتھی کے پاس بھی گن تھی اور باقی دو، موت کی نیند سلانے والی سوئیوں کو آستینوں میں چھپائے ہوئے زہریلے سانپوں کی طرح چھپے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ طیارے میں کسی بھی قسم کی کوئی گڑبڑ کرسکتے تھے۔

صاف ظاہر تھا کہ کوہارا، پروفیسر جمشید کو اس طیارے میں یرغمال بنائے مصر کی پراسرار سرزمین کی جانب محوِ پرواز تھا اور...... اس کی بیٹی یاسمین خانم کو یرغمال کر رکھا تھا مگر وہ تھی کہاں......؟ منیلا میں...... یا پھر اسی طیارے میں......؟

یہ سب پل کے پل سوچ کر میرے وجود میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی تھی۔ ''میں اب چلوں گا اپنی سیٹ پر......'' مجھ سے اب مزید وہاں بیٹھا نہ گیا اور یہ کہتے ہوئے میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

درحقیقت میں اپنی سیٹ پر جا کر موجودہ مخدوش ہوتی صورتِ حالات کے بارے میں یکسوئی کے ساتھ غور وخوص کرنا چاہتا تھا۔

''تم جاسکتے ہو مگر میری نصیحت یاد رکھنا۔'' کوہارا نے اس بار...... کھڑے ہو کر مجھ سے درشت لہجے میں کہا۔ گن اس نے واپس چیئر کے نیچے رکھ دی تھی۔

''جہاں جارہے ہو، خاموشی سے وہیں تک کا سفر جاری رہنا چاہیے تمہارا...... مصر میں ہم اُتر جائیں گے مگر میرے دو آدمی تم پر کڑی نگاہ رکھیں گے، تمہیں طیارے سے اترتے دیکھا تو زہریلی سوئی تمہارا مقدر ہوگی۔''

میں نے پلٹتے سے پروفیسر جمشید کی طرف بھی دیکھا تھا۔ اس کی سفید بھنوؤں تلے بوڑھی آنکھوں میں شدید کرب اور التجا آمیز تاثرات مترشح ہورہے تھے۔

میں پلٹا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا اور...... پھر ذرا دیر بعد اپنی سیٹ پر آبیٹھا تھا۔

☆☆☆

فضائے بسیط کے تاریک اور اسرار بھرے خلائی ویرانوں میں......ٹنوں وزنی، بوئنگ 777 جمبو جیٹ پانچ سو پچھتر مسافروں کے ساتھ منزل کی جانب محوِ پرواز تھا اور طیارے میں موجود مطمئن ومسرور مسافر نہیں جانتے تھے کہ اس طیارے میں کتنا بڑا اور خطرناک عفریت موجود تھا۔ بظاہر ابھی اس سے طیارے کو کوئی خطرہ تو نہ تھا، لیکن وہ ایک خوابیدہ آتش فشاں ضرور تھا یا یوں کہہ لیں کہ ایک سویا ہوا ڈریگون تھا۔ وہ اگر بپھر جاتا تو ہزاروں فٹ کی بلندی پر محوِ پرواز اس طیارے کی سلامتی یقیناً خطرے میں پڑ جاتی۔

سے جی کوہارا اپنے تین خطرناک اور مسلح ساتھیوں کے ساتھ طیارے میں موجود تھا۔ خود اس کے پاس بھی گن تھی۔ وہ تینوں کون تھے مگر کہاں تھے؟ مجھے نہیں معلوم تھا۔ بس، انہی مسافروں میں عام لوگوں کی طرح گھلے ملے بیٹھے تھے۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کوہارا سمیت دو افراد خطرناک اسلحہ سمیت اس طیارے میں سوار ہو گئے تھے اور کسی کو پتا ہی نہ چل سکا تھا؟ منیلا کی ائرپورٹ سیکیورٹی کہاں جاسوئی تھی؟ طیارے کا امریکن عملہ جنہیں ایسے معاملات کی سخت ٹریننگ سے گزارا جاتا ہے، ان کی ساری تربیت کی کوہارا اور اس کے ساتھیوں نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔

ائرپورٹ میں.... آتشیں اسلحہ تو کیا ایک سوئی بھی طاقتور اسکیننگ سسٹم میں نظر آجاتی ہے، تو پھر کس طرح آخر ”کوہارا اینڈ کمپنی“ نے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی؟

ان سب باتوں میں سر کھپانے سے بچنے کے لیے میرے دماغ نے فقط ایک ہی توجیہہ پیش کی، وہ یہ کہ جب امریکا جیسے ملک میں دو طیارے چوری کر کے پینٹاگون اور ورلڈ ٹریڈ ٹاور سے ٹکرانا ممکن ہوجاتا ہے تو پھر یہ کیا چیز تھی۔

میں نے اگلے مرحلے پر غور کرنا شروع کر دیا۔

میرا ایک دیرینہ شکار طیارے میں موجود تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے رُوبرو بھی ہو گئے تھے، شاید ہم ایک دوسرے کے سامنے بے بس بھی تھے، یعنی ہم سامنا ہونے کے باوصف ایک دوسرے کو فوری طور پر کوئی حملہ کرنے یا نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں تھے، لیکن نہیں..... مجھے کوہارا کو خود سے الگ رکھنا ہوگا، ہاں! میری بہ نسبت وہ مجھ پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں ضرور تھا، اس کے ایک اسلحہ بدست ساتھی سے قطع نظر..... وہ دو ساتھی جو اپنی آستینوں میں زہریلی سوئی چھپائے ہوئے تھے، میرے لیے موت کا پیغام لاسکتے تھے اور تب ہی یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

کیا خبر سے جی کوہارا..... نے اپنے ان دو مذکورہ ساتھیوں کو یہ حکم دے رکھا ہو کہ مجھے اسی طرح خاموشی سے موت کی نیند سُلا دیا جائے..... اس سے کچھ بھی تو بعید نہ تھا۔

اوخدا.....! میں کس قدر شدید خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے مجھ پر نیند غلبہ طاری ہونے لگا تھا، لیکن اب تو مجھے سونے سے بھی موت کا خوف محسوس ہورہا تھا، کیا پتا چلتا اس رذیل کوہارا کا کوئی ساتھی، اِدھر سے گزرتے ہوئے ایک ذرا ہاتھ میری گردن یا شانے پر رکھتا ہوا چلا جائے اور میں عالمِ خواب میں ہی ملک عدم سدھار جاؤں۔

یہ سوچ کر ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں موت کی سرسراہٹیں ہونے لگی تھیں۔

میری چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ مجھے کوہارا کی اس بات پر بھی یقین نہیں کرنا چاہیے جو اس نے مجھ سے کہی تھی۔

”شہزی! میں فقط یہی چاہتا ہوں کہ تم جہاں جارہے ہو، وہیں تک ہی اپنا سفر جاری رکھو اور میں اپنا..... میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش مت کرنا، میں تم سے امریکا آکر ہی اب نمٹوں گا۔“

ایسا ضرور اس نے مجھے مطمئن رکھنے کے لیے کہا ہوگا، ایک خطرناک بلف کر رہا تھا کوہارا..... وہ مجھ سے اِدھر ہی نمٹنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اب تو جیسے میں اپنے سائے سے بھی چوکنا ہو گیا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب اچانک مجھے اپنے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کا خیال آیا۔

”یہ بھی تو کوہارا کا ساتھی ہوسکتا تھا۔“ تب ہی اچانک اس نے بھی ارادتاً یا یونہی میری طرف دیکھا اور اس کا ایک ہاتھ میں نے اُٹھتے دیکھا، وہ میرے شانے پر آرہا تھا، میں ایک دم اپنی جگہ سے اُچھلا اور اس کا ہاتھ پرے دھکیل دیا۔

وہ پریشان ہو گیا۔ درحقیقت وہ ایک جمائی لے رہا تھا۔ اپنے بدن کی اکڑن دور کرنے کی غرض سے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے شانوں سے بلند کر رہا تھا۔

چند اور مسافر بھی میری اس نازیبا سی حرکت پر مجھے عجیب سی نظروں سے تکنے لگے تھے۔ میں تھوڑا جھینپ سا گیا۔ میرے ساتھ بیٹھا وہ آدمی، جو درمیانی عمر کا ہی ایک یورپین دکھائی دیتا تھا۔ اپنا سر جھٹک کر ذرا پرے ہو کر بیٹھ گیا۔

مجھے کوہارا کے اسلحہ بدست ساتھیوں سے زیادہ اس کے ”زہر میں بُجھے“ ساتھیوں سے زیادہ ڈر تھا، میں.... بلاشبہ ایک ”فوبیا“ جیسی کیفیات کا شکار ہو گیا تھا۔ کیا خبر وہ کب میری بےخبری سے فائدہ اُٹھالیں؟

میری آنکھوں سے نیند اب اُچاٹ ہو گئی تھی۔ میرا ذہن اب پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا تھا۔

میں نے سب سے پہلے..... اس بات پر غور کیا کہ..... پروفیسر جمشید اور اس کی بیٹی یاسمین خانم کی مدد کرنی چاہیے تھی یا اس معاملے سے ہی صاف چشم پوشی کر جاتا؟

کچھ بھی سہی، پروفیسر جمشید حمیدی..... میرے ازلی دشمنوں کے نرغے میں تھا اور یاسمین خانم بھی ان کے رحم و کرم پر تھی۔ دونوں باپ بیٹی کی بےبسی اور شکست، میرے دشمنوں

کے حق میں جاتی تھی، پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ انسانیت کے ناتے ہی سہی، دونوں باپ بیٹی مسلمان تھے، برادر اسلامی ملک ایران سے ان کا تعلق تھا، تب ہی میری غیرت اور حمیت نے جوش مارا اور...... یک بیک میرے اندر کا جنگجو اور...... غیور شہزی ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔

خوف اور ڈر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے سب سے پہلے...... یاسمین کو طیارے کے اندر تلاشنے کا ارادہ کیا، اگر وہ یہاں کہیں بیٹھی تھی تو یقیناً...... اس کے ہمراہ کوہارا کے ہی ساتھی ہوں گے۔

یہ سوچ کر میں اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ آیا اگر یاسمین بھی ادھر اسی طیارے میں اپنے باپ کی طرح ''یرغمالی'' کی حیثیت سے موجود تھی۔ تو کہاں ہوسکتی تھی؟ اسی اکنامی کلاس میں، جہاں میں بھی موجود تھا یا پھر بزنس اور فرسٹ کلاس کے کسی سوئٹ میں......؟

میں نے اپنی کلاس کا پہلے ایک چکر لگانا ضروری سمجھا۔ میری عقلِ سلیم کو ایک خیال اور بھی سوجھا تھا۔ کوہارا...... سیدھا برما سے فیلا پہنچا تھا، اور اس کے ساتھی بھی یقیناً برمی ہو سکتے تھے، انڈیمان کے جزائر میں...... سون کھلا اور میجر کیم کھلا، ان کے برمی ساتھیوں سے میرا بہت قریب قریب سامنا ہوتا رہا تھا، اسی لیے مجھے زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت برمی باشندے پہچاننے کا تجربہ تو ہو ہی چکا تھا۔ لہٰذا مجھے اُمید تھی کہ کوہارا کے یہاں موجود ان پانچ ساتھیوں میں سے کسی نہ کسی کو تو پہچان ہی لوں گا اور ضرور یاسمین بھی انہی میں سے کسی کے ساتھ بیٹھی ہوگی۔

ایک بات پر حیرت مجھے ہوئی تھی، اگر یاسمین بھی اس طیارے میں سوار تھی تو اب تک میری یا اس کی نظر کیوں نہ ایک دوسرے پر پڑ سکی تھی؟ ہوسکتا تھا کہ ہمیں ایسی کوئی اُمید ہی نہ تھی ملنے کی......؟ میں خود بھی اپنے ہی دھیانوں میں رہا تھا۔

بہر طور...... طیارے کا ماحول بے حد پُرسکون تھا۔ بیشتر مسافر سو رہے تھے اور کچھ اُونگھ رہے تھے، ان میں چند ایسے بھی جوڑے تھے جو آپس میں ہلکی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

مجھے سیٹوں کے درمیان کسی بھوت کی طرح چکر لگاتے ہوئے دیکھ کر ایک دلکش سی فضائی میزبان میری طرف آئی اور بڑے پیشہ ورانہ اخلاق سے حاجت پوچھی۔

میں نے اسے یہی بتایا کہ میں اپنے کسی دوست کو ڈھونڈ رہا ہوں...... اس نے بھی اسی فلائٹ میں سوار ہونا تھا۔ وہ کچھ مطمئن ہوئی اور کچھ نہیں تاہم دوبارہ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور لوٹ گئی۔

میں دو رُویہ قطار کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہر ایک مسافر کے چہرے کو تکتے جا رہا تھا۔ وہ دلکش سی اسمارٹ نظر آنے والی سرو قد ائر ہوسٹس اپنے کیبن میں جانے کے بجائے ایک طرف کسی خالی نشست پر بیٹھ گئی اور میری طرف بڑے غور غور سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس کی پروا نہ کی اور اپنے ''کام'' سے لگا رہا۔

اچانک آخری رو کی تین سیٹوں سے پہلے میں ذرا چونکا۔ یہ چار رُویہ سیٹوں کی ایک درمیانی قطار تھی۔

وہ ایک گٹھی ہوئی جسامت کا آدمی تھا، رنگت ہلکی سانولی تھی۔ اس نے سیٹ کو ذرا ''ایزی'' کر رکھا تھا اور اپنا سر سیٹ سے ٹکایا ہوا تھا۔ آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ اس پر مجھے برمی باشندے کا سو فیصد یقین کی حد تک شبہ ہوا تھا۔ میری گردشی نظروں نے اس کے برابر والی سیٹ پر کسی عورت کو بھی دیکھا، اس کی آنکھوں پر ہلکے سبز رنگ کے ''پیڈ'' چڑھے ہوئے تھے، یہ عموماً مسافر لوگ آنکھوں پہ چڑھا کر بیٹھے بیٹھے گہری نیند سونے کے عادی ہوتے تھے۔ اس نے فل کوٹ پہن رکھا جس کے کالر اس طرح کھڑے کیے گئے تھے کہ اس کا نصف چہرہ چھپ گیا تھا مگر میری تاڑتی نظروں نے فوراً اس میں بھی شناسائی کو بھانپ لیا تھا۔ یہی یاسمین خانم تھی۔ اس کے برابر میں ایک عمر رسیدہ اطالوی جوڑا تھا۔ اول الذکر میرے ''مطلوبہ'' نکلے تھے۔

میں وہیں کھڑا رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ والی رو میں نظر دوڑائی۔ وہاں ایک خوبصورت سی، سرخ و سپید اور خاصی صحت مند غیر ملکی عورت بیٹھی تھی، اس نے ٹائٹ شرٹ اور اسی طرح کی خوب کسی ہوئی جینز کی پینٹ چڑھا رکھی تھی۔ شرٹ بغیر آستین کی تھی اور گلا بھی جس کا بہت کشادہ تھا۔ بال ہلکے سرخی مائل تھے۔ اس نے کانوں میں واک مین لگایا ہوا تھا اور آنکھیں موندے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس کے برابر میں سیٹ خالی تھی۔ میں نے ہولے سے اُسے ٹہوکا دیا تو اس نے فوراً اپنی آنکھیں کھول لیں۔

''آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

اس عورت نے جس کی عمر کا اندازہ مجھے تیس بتیس سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا اس کے بعد اس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور گہری گہری آنکھوں میں معنی خیز چمک اُبھری۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"شیور......" اس نے مترنم سی آواز میں کہا اور میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا بیٹھ گیا۔

"ایکسکیوز می سر......!" اچانک ایک مدھم سی نسوانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے دیکھا یہ وہی دلکش سی ائر ہوسٹس تھی، رات اور خوابیدہ ماحول کی وجہ سے وہ بہت ہلکی آواز میں بول رہی تھی۔

"آپ پلیز، اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھیں......"

"لیکن مجھے وہاں بوریت ہو رہی تھی، نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا کسی خوبصورت سے ہم رکاب ساتھی کے ساتھ بیٹھا جائے۔"

میں نے جواب میں دانستہ آخری جملہ مذکورہ خوب صورت مسافر ساتھی عورت کی طرف دیکھ کر ادا کیا تھا۔ میرا تیر نشانے پر لگا، وہ میری طرف دیکھ کر دلنشین انداز میں مسکرائی اور میری حمایت میں ائر ہوسٹس سے بولی۔

"انہیں یہاں بیٹھنے دو مجھے کوئی اعتراض نہیں...... میں خود بھی تنہا بور ہو رہی تھی۔"

ائر ہوسٹس تھوڑی دیر پُرسوچ انداز میں وہاں کھڑی ہماری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد پلٹ گئی۔

"تھینک یو......" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"شہزاد......" میں نے نام بتایا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ مصافحے کے لیے تھام لیا اور...... دلنشیں مسکراہٹ سے بولی۔

"کیمی......، تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے اپنی گہری گہری چمکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیلی فورنیا......"

"واؤ...... کیسا عجیب اتفاق ہے، میں بھی سی اف جا رہی ہوں۔" اس نے خالص امریکی خاتون ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کیلی فورنیا کا شارٹ فارم استعمال کیا تھا۔ "واؤ" کہتے ہوئے اس کا نرم وگداز دہانہ بڑے دلکش انداز میں دائرہ بنایا تھا۔

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا اور میں نے اس سے رسمی باتیں شروع کر دیں، ساتھ ہی مذکورہ سیٹ کی طرف بھی دیکھتا رہا۔ میری مشاق نظریں ان دونوں کو تکے جا رہی تھیں۔ اچانک اس برمی مسافر نے اپنی آنکھیں کھولیں، وجہ اس کے برابر میں بیٹھی عورت تھی جو ہلکے سے کسمسائی تھی۔ یہ وہی عورت تھی جس کے بارے میں مجھے یقین سا تھا کہ وہ یاسمین خانم تھی۔

"آر یو میرڈ......؟" کیمی نے روایتی سا سوال کیا۔

"نہیں......اور آپ......؟"

"میں نے شادی کی تھی، سال بھی نہ چل سکی۔ اب اکیلی اور آزاد ہوں۔" کیمی نے اپنے بارے میں بتایا۔

"اوہو......" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"واٹ ڈیو مین...... اوہو......؟" وہ حیرت سے بولی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ امریکی خاتون بال کی کھال نکالتی ہیں۔ میں گڑبڑا کر بولا۔

"میرا مطلب تھا، مجھے افسوس ہوا۔"

"کس بات کا......؟" وہ حیرت سے بولی۔ میں نے دُزدیدہ نظروں سے مطلوبہ سمت کی طرف دیکھا اور مجھے چونکنا پڑا۔ وہ برمی اس عورت کو سہارا دیے اپنے ساتھ کہیں لے جا رہا تھا۔ تب ہی میرے شبہے کی تصدیق ہو گئی جب میں نے...... یاسمین کا چہرہ پوری طرح دیکھ لیا۔ وہ نیم غنودہ سی نظر آ رہی تھی، جیسے نیند، نیم بے ہوشی یا نشے کی سی حالت میں ہو۔ پل کے پل میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ کسی نشہ آور ڈرگ کے زیر اثر تھی، صاف ظاہر تھا کہ ایسا اس کے ساتھ طیارے میں سوار ہونے کے بعد ہوا ہوگا، ورنہ ایسے مسافر کو بورڈنگ کارڈ ہی ایشو نہیں کیا جاتا۔ تو کیا...... کوہارا نے ان دونوں باپ بیٹی کو طیارے میں سوار ہونے کے بعد یرغمال بنایا تھا؟ میں اُلجھ گیا۔ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔

"مجھے آپ کی طلاق پر افسوس ہوا۔" میں نے کیمی سے جان چھڑانے والے انداز میں کہا اور عجلت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ حیران اور کچھ پریشان سی ہو گئی۔ کیمی شاید میں اس کی کسی بات پر فوراً سیٹ چھوڑ رہا تھا، یک دم گڑبڑا کر بولی۔

"لیکن مجھے تو نہیں ہوا...... تم کہاں چلے......؟"

"ٹوائلٹ...... ابھی آیا......" میں نے کہا اور اس برمی کے پیچھے ہولیا۔ شکر تھا کہ اس برمی کی ابھی تک مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ کوہارا کے سوئٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے یاسمین کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اسی طرح ہی سہارا دے رکھا تھا جیسے یاسمین بیمار ہو یا اُسے چلنے میں کوئی دشواری ہو......

جب وہ دونوں اندر چلے گئے تو میں...... چند سیکنڈ کی دانستہ تاخیر کے بعد یہاں سے گزر کر اس درمیانی خلا میں آ گیا، جدھر واش روم اور ٹوائلٹ بنے ہوئے تھے۔

میں اندر گھس گیا۔ میرے دائیں بائیں ٹوائلٹ کی قطار تھیں۔ کچھ پر "آکوپائیڈ" کے الفاظ روشن تھے۔ میں ایک خالی واش روم میں داخل ہو گیا اور وہیں خاموشی سے کھڑا سن گن لیتا رہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

میرا خیال تھا یاسمین کو کسی "حاجت" کے لیے ہی لایا گیا تھا۔ تب ہی میں چونکا۔

"تم باہر جاؤ، میں تمہاری موجودگی میں کموڈ پر نہیں بیٹھ سکتی۔"

دفعتاً ایک نسوانی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ یہ یاسمین کی آواز تھی، نحیف سی مگر غصیلا پن تھا اس میں...... شاید وہ بری بھی اس کے ساتھ اندر جا گھسا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، لیکن جلدی باہر آنا، میں دروازے سے لگا کھڑا ہوں۔"

مجھے اسی بری کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے میں تحکمانہ درشتی تھی۔ یاسمین کے مقابلے میں بری کی انگریزی شکستہ سی تھی۔ پھر دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز ابھری۔ میں نے اپنے ٹوائلٹ کا دروازہ دانستہ پورا بند نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک جھری رہنے دی تھی۔ میں نے اس سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔

آواز میرے ساتھ والے ٹوائلٹ سے اُبھری تھی، میں نے اسی بری کو بُرا سا منہ بنائے اندر سے برآمد ہوتے دیکھا، وہ ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

میں ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر چونکتا ہے یا نہیں، کیونکہ کوہارا نے یا تو میری تصویر انہیں دکھا رکھی ہو گی، یا پھر ائرپورٹ میں اس نے اپنے ان مذکورہ تین ساتھیوں کو خفیہ طور پر میری نشاندہی کر دی ہو گی۔

وہی ہوا...... وہ مجھے دیکھتے ہی اس طرح چونکا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک لیا ہو۔ میں چونک گیا، وہ متحرک ہوا، میری مشاق نظریں اس کی ایک ایک حرکات و سکنات پر گڑھ کر رہ گئیں۔ اسے میں نے جارحانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے پایا اور ساتھ ہی اس نے اپنا ایک ہاتھ بھی بلند کرتے ہوئے آستین چڑھالی اور ساتھ ہی اپنے اسی ہاتھ کی ہتھیلی کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ یک بیک میرے ذہن میں جھماکا ہوا، یہ "ہتھیار بدست" نہیں بلکہ "زہر بدست" تھا۔ کوہارا نے اپنی طاقت کے زعم اور غرور میں آ کر اپنے دو "زہریلے" ساتھیوں کے بارے میں پہلے سے مجھے بتا کر غلطی کی تھی۔ (وہ پہلے بھی ایسی غلطیاں کر چکا تھا جو میرے لیے سودمند ثابت ہوتی رہی تھیں)

میں نے اس کے بازو کی رسائی سے پہلے ہی اس کے پیٹ پر اس زور سے لات رسید کر دی کہ وہ پیچھے واش روم کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ یہاں ممکن تھا اور لوگ بھی ہوتے۔ میں بغیر وقت ضائع اور شور کیے اسے جہنم واصل کر دینے کا تہیہ کر چکا تھا اسی لیے فرسٹ کٹیگری کا خطرناک اسالٹ آزمانے کی کوشش میں تھا، اسی سبب اس کے دیوار سے ٹکراتے ہی میں اپنی جگہ سے اُچھلا اور اس کے قریب پہنچتے ہی، جب وہ سنبھلنے کی کوشش میں تھا، ایک پاور فل ہیمر پنچ اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

اسی وقت میں نے قریب کے ایک ٹوائلٹ ۔۔۔ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور میں ۔۔۔ بہ سرعت تمام...... بے ہوش بری کو دبوچ کر ساتھ کے ٹوائلٹ میں گھسیٹتا ہوا لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

اب میں باقی کا "کام" آرام سے نمٹا سکتا تھا، مجھے یاسمین خانم کو بھی "چیک" کرنا تھا، کہیں وہ ٹوائلٹ سے نکل کر اپنی سیٹ پر نہ جا بیٹھے۔

میں نے بے ہوش بری کی گردن کے گرد اپنا ایک بازو حمائل کر کے جھٹکا دیا اور زندگی کی قید سے اُسے آزاد کر دیا۔

اس کے بعد میں نے اس کی لاش کو نہایت دھیرے دھیرے ٹوائلٹ کے فرش پر دیوار کے ساتھ ٹکا کر بٹھا دیا۔ کہیں کھڑبڑ کی آواز نہ پیدا ہو۔

دروازے کی جھری بنا کر دیکھا، ایک پسنجر بیسن میں ہینڈ واش کرنے میں مصروف تھا، اس دوران میں نے جیب سے رومال نکال کر جہاں جہاں متوقع تھا، میں نے اپنے فنگر پرنٹس صاف کیے...... پھر اس نے ذرا رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر واش روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اسی طرح میں نے یہاں بھی ممکنہ حد تک یہی عمل دوہرایا۔

ٹھیک اسی وقت یاسمین خانم بھی اپنے ٹوائلٹ سے برآمد ہوئی اور مجھے دیکھتے ہی ایک لمحے کے لیے اس کی کشادہ حسین آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... اور بے اختیار "دشش...... شہزی" کہتی ہوئی میری جانب بڑھی، اسی وقت واش روم میں کوئی داخل ہوا۔

میں نے چونک کر دیکھا اور بے اختیار ایک پُرسکون سی سانس لے کر رہ گیا، وہ کیپی تھی...... وہ ہمیں دیکھ کر چونکی تھی۔ میں اسے چونکتا پا کر کچھ اُلجھن کا شکار ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یاسمین کی لرزتی ہوئی کراہتی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھ سے خوف زدہ لہجے میں کچھ کہا تھا......

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لباس کی چوری

جمال دستی

بظاہر معمولی اور غیر اہم نظر آنے والے بالآخر وقت پڑنے پر اپنی موجودگی کو ثابت کر ہی دیتے ہیں... ایک سیدھی سادی ڈریس ڈیزائنر کو پیش آنے والی پیچیدہ صورتِ حال... وہ اپنی محنت کا معاوضہ چاہتی تھی... مگر جواب میں اسے اپنی جان بچانا مشکل ہوگیا...

مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے شریف آدمیوں کی غنڈا گردی

رات میں لاس ویگاس تاریکی کے سمندر میں روشنیوں کے جزیرے کے مانند نظر آرہا تھا جو سفید، سرخ اور زرد ہیروں کے مانند چمک رہی تھیں۔ جہاز تھوڑی دیر میں ائرپورٹ پر اترنے والا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرا دھیان اس خصوصی سامان کی طرف چلا گیا جسے یہاں تک پہنچانے کے لیے میری خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ میں نے کبھی کسی معاملے میں خوش قسمت ہونے پر یقین نہیں کیا لیکن جب سمرینا رین نے میری خدمات حاصل کیں کہ میں لاس

اینجلس سے اس کا ''خوش قسمت'' لباس لے کر لاس ویگاس میں ہونے والے افتتاحی شو کے لیے پہنچا دوں جس کے ذریعے اس کی فن کی دنیا میں واپسی ہو رہی تھی تو میں کیسے انکار کرسکتی تھی۔

میرا نام اسٹیسی ڈیٹا ہے اور میں اسٹارز کے لیے فیشن ایبل ملبوسات ڈیزائن کرتی ہوں۔ میرے زیادہ تر کلائنٹ کا تعلق لاس ویگاس کے امیر ترین طبقے سے ہے اور وہ میری خدمات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے میرے لیے یہ ایک معمولی کام تھا۔ سرینا رین پہلی مشہور شخصیت نہیں تھی جس کے لیے میں نے لباس ڈیزائن کیا بلکہ وہ شہرت کے لحاظ سے بہت آگے تھی۔ میں ایک عرصے سے اس کے گانے اور ویڈیوز سنتی اور دیکھتی آرہی تھی۔

گوکہ لاس اینجلس سے لاس ویگاس تک ایک گھنٹے کی پرواز تھی لیکن میں پوری سہ پہر دوڑتی رہی۔ پہلے ائرپورٹ سے آن لائن ٹیکسی کے ذریعے لاس اینجلس کے مضافات میں واقع اس کے گھر گئی پھر وہاں سے واپس ائرپورٹ آئی۔ اس دوران پورے وقت اس کا ذاتی محافظ ریمنڈ فراسٹ میرے ساتھ رہا جس کی موجودگی مجھے بے حد ناگوار گزر رہی تھی۔

''برائے کرم اپنی ٹرے ٹیبل اوپر کرلیں اور نشستوں کو سیدھا کرلیں۔'' ہوائی جہاز کے مائیک پر آواز ابھری۔ ''ہم جلد ہی اترنے والے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر روشنیوں کے جزیرے کی طرف دیکھا۔ اب مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ افتتاحی تقریب کے لیے سرینا کو وہ لباس وقت پر پہنچا کر اس سے بھاری معاوضہ وصول کرلوں۔ مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ یہ اتنا آسان نہیں جتنا لگ رہا ہے۔ جب جہاز کے پہیے زمین سے ٹکرائے تو ایک زور کا جھٹکا لگا اور پھر جہاز رن وے پر دوڑنے لگا جیسے وہ ائرپورٹ کی دیوار سے ٹکرا جائے گا۔ میں نے اپنے ہاتھ آگے والی نشست پر رکھ لیے تو فراسٹ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھتی ہو کہ اس سے کوئی مدد ملے گی؟''

''میں نہیں جانتی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن کم از کم اس طرح مجھے بہتر محسوس ہورہا ہے۔''

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا اور ہم انتظار کرنے لگے کہ ہم سے پہلے والے لوگ اٹھیں تاکہ ہمیں بھی آگے بڑھنے کا راستہ ملے۔ جب ہم اپنا سامان لینے جارہے تھے تو وہ اچانک رک گیا اور اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔

''کیا کچھ غلط ہوگیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں اپنا سیل فون سیٹ پر ہی چھوڑ آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور واپس گیٹ کی طرف جانے لگا۔ ''تم یہیں پر میرا انتظار کرو۔''

''لیکن سامان کا کیا ہوگا؟'' میں نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔ میں نے جان بوجھ کر لباس کا لفظ استعمال نہیں کیا کہ کہیں کوئی سن نہ رہا ہو۔

''پریشان مت ہو۔'' اس نے کہا۔ ''وہ بیمہ شدہ ہے۔ میرا جاننے والا ایک لیموزین ڈرائیور ہمیں یہاں سے لے جائے گا۔''

انشورنس کے علاوہ وہ لباس جس سوٹ کیس میں رکھا گیا تھا صرف اسی کی قیمت پانچ ہزار۔ ڈالر سے زیادہ تھی۔ یہ سوٹ کیس ایک کینوس کے غلاف میں تھا جس پر گلابی رنگ میں SR کا مونوگرام کڑھا ہوا تھا اور اس کی قیمت بھی میری بھی میری چار اتواروں کی کمائی سے زیادہ تھی لیکن اصل قیمت تو اس لباس کی تھی جس میں انتہائی درخشاں ہیرے جڑے ہوئے تھے جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اگر وہ اس لباس کو چمکیلا اور نمائشی کہہ رہی تھی تو اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کی مالیت کسی جائداد یا اثاثے سے کم نہیں تھی۔ اس لیے اگر میں یہ قیمتی لباس سرینا کے حوالے کرنے میں ناکام ہوجاتی تو انشورنس کمپنی مجھے کبھی اتنی بڑی ادائیگی نہیں کرسکتی تھی۔

جب فراسٹ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میں وہاں سے چل دی۔ میں یہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ ہم دونوں کے اس جگہ اکٹھا نہ ہونے سے کون سا مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔ لہٰذا میں ٹرام میں سوار ہوکر اس جانب چل دی جہاں سے سامان ملنا تھا۔ جب دوسری طرف کا دروازہ کھلا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ فراسٹ وہاں پہلے سے کھڑا ہانپ رہا تھا جیسے وہ ٹرمینل سے دوڑتا ہوا آیا ہو۔ میں اس کے پاس گئی اور دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ تھا اور وہ بہت مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے تم سے وہیں انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔'' اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں تم نے کہا تھا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے دوسروں کا حکم ماننے کی عادت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنا کام نمٹانا ہے۔''

اس کی تیوری پر بل پڑ گئے اور وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''آئندہ ایسی کوشش مت کرنا۔ تم وہی کروگی جو میں کہوں گا، سمجھ گئیں؟''

میں نے اس کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش

رہی۔ جب ہم سامان لینے والی جگہ پر پہنچے تو مجھے خیال آیا کہ اس سے فون کے بارے میں پوچھوں لیکن اس سے پہلے ہی اس نے اپنی جیب سے وہ فون نکالا اور ایک کال کی پھر جھلاتے ہوئے اسے دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

''مجھے اپنا فون دینا۔'' اس نے کہا۔ ''میرے فون کی بیٹری ختم ہوگئی ہے۔''

میں عام طور پر اپنا فون کسی کو نہیں دیتی لیکن اس وقت مجھ پر لالچ غالب آگیا۔ میں نے سوچا کہ جتنی جلدی سامان سمرینا کے حوالے کروں گی۔ اتنی جلدی مجھے معاوضے کی ادائیگی ہوگی۔ لہٰذا میں نے اپنے کوڈ کا بٹن دبا کر فون اسے دے دیا۔ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا اور بولا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' جواب سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم وہیں رہو، ہم پہنچ رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔

''فرانسس نیچے سامان وصول کرنے والی جگہ پر موجود ہے۔''

''فرانسس؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ہمارا لیموزین ڈرائیور۔''

جب ہم نیچے پہنچے تو میں نے ایک پستہ قد بھاری بھر کم شخص کو مسٹر فراسٹ کے نام کا ہاتھ سے لکھا ہوا سائن بورڈ پکڑے دیکھا۔ فراسٹ اس کے پاس چلتا ہوا گیا اور مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

''تم نے سوٹ کیس لے لیا؟'' فراسٹ نے پوچھا۔

فرانسس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ائرپورٹ کے خنک ماحول میں بھی اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نظر آرہے تھے۔ ''ابھی تک نہیں آیا۔''

فراسٹ نے ایک بار پھر منہ بنایا اور اس جانب دیکھنے لگا جہاں کنویئر بیلٹ سے سامان اتارا جارہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب ہوگئی تاکہ سوٹ کیس کو دیکھنے میں اس کی مدد کرسکوں لیکن میں نہیں سمجھتی تھی کہ اپنی نوعیت کے منفرد سوٹ کیس کو دیکھنے میں کوئی مشکل پیش آئے گی۔

غلاف میں لپٹا ہوا ایک سوٹ کیس لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور میں نے اس پر SR کا کڑھا ہوا مونوگرام دیکھ لیا۔

''یہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، ہاں۔ میں جانتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دو لوگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا وہاں پہنچا اور سوٹ کیس اٹھالیا۔

اسے چیک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے اسے غور سے دیکھا کیونکہ اس پر میرے نام کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے فراسٹ کو مزید جھلاہٹ ہونے لگی۔ وہ بولا۔

''یہ تم کیا کررہی ہو؟''

''تصدیق کررہی ہوں کہ میرا ذاتی ٹیگ موجود ہے۔'' میں نے سوٹ کیس پر لگے ہوئے مونوگرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے ائرپورٹ والوں کا لگایا ہوا ٹیگ الگ کردیا اور سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر چل دیا۔ فرانسس ہم سے چند قدم آگے تھا اور مجھے اس کا ساتھ دینے کے لیے تیز چلنا پڑ رہا تھا۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''افتتاحی تقریب میں ابھی چار گھنٹے ہیں۔''

فراسٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا دماغ خراب ہوچکا تھا لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ مجھے تو صرف یہ سوٹ کیس سمرینا تک بحفاظت پہنچا کر تیاری میں اس کی مدد کرنا اور اپنی فیس لینی تھی۔

ہم پارکنگ ایریا میں آئے اور فرانسس ایک پرانی لیموزین کے پاس آکر رک گیا۔ وہ ریموٹ کے ذریعے ڈکی کھولنا چاہ رہا تھا لیکن فراسٹ نے کہا۔ ''یہ تم کیا کررہے ہو؟ پہلے اس کے لیے دروازہ کھولو۔''

مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ بدتمیز شخص اچانک ہی اتنا شریف بھی ہوسکتا ہے۔ فرانسس نے اس کے کہنے پر پچھلا دروازہ کھولا اور تعظیماً جھک کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد فراسٹ بھی کار میں بیٹھ گیا اور فرانسس سوٹ کیس لے کر ڈکی میں رکھنے چلا گیا۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن ڈکی کا ڈھکنا اوپر ہونے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آیا پھر فرانسس نے ڈکی بند کی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی فراسٹ بولا۔

''تیز چلو ہمیں پہلے ہی کافی دیر ہوچکی ہے۔''

کچھ دیر بعد ہی ہماری کار ایکیلون ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ وہاں ایک بڑی اسکرین پر سمرینا رین کا نام اور بڑی بڑی تصویریں دکھائی جارہی تھیں۔ فرانسس اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور ہمارے لیے دروازہ کھولنے لگا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے کی تیاری کررہی تھی لیکن فراسٹ میرے سامنے آگیا اور فرانسس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم پہلے ڈکی سے سوٹ کیس نکالو۔''

فرانسس نے سر ہلایا اور ڈکی کھولنے چلا گیا پھر میں نے ایسی آواز سنی جیسے کوئی چیز ہٹائی جارہی ہو۔ فراسٹ نے گاڑی سے باہر آنے میں کافی وقت لگایا جس کی وجہ سے

میں کار میں بیٹھی رہی۔ وہ باہر نکلنے کے بعد بھی چند لمحے دروازے کے آگے کھڑا رہا۔

فرانسس نے ڈکی بند کی اور سمرینا کا سوٹ کیس لے کر آ گیا۔ اس کے بعد ہی فراسٹ نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور مجھے گاڑی سے باہر آنے کا موقع مل گیا۔ فراسٹ نے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑا اور ہوٹل کے مرکزی دروازے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس نے فرانسس کو ٹپ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ میں نے فوراً ہی اس کا ازالہ کیا اور پرس کھول کر اسے دس ڈالر پکڑا دیے۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''شکریہ میم۔''

میں تیزی سے فراسٹ کی جانب لپکی جو پہلے ہی مرکزی دروازہ پار کر چکا تھا۔ بہرحال میں نے لفٹ کے پاس اسے پکڑ لیا۔ ''انتظار کرنے کا شکریہ۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ وہ پتھر کے مجسمے کے مانند خاموش رہا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا اور ہم لوگوں کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ میری نظر سوٹ کیس پر گئی اور دیکھا کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ سمرینا کے مونوگرام والا ٹیگ غائب تھا۔ میں یہ دیکھنے کے لیے کینوس کا غلاف اٹھانے کے لیے جھکی کہ کہیں مونوگرام ٹوٹ کر اندر تو نہیں رہ گیا لیکن فراسٹ سوٹ کیس گھسیٹتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''ایک منٹ رکو۔'' میں نے کہا۔

''جلدی آؤ، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

''میری بات سنو۔ سمرینا کا ٹیگ غائب ہے۔''

''اوہ۔'' اس نے پہلے مجھے اور پھر سوٹ کیس کو غور سے دیکھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

لفٹ کا دروازہ بند ہونے لگا تو میں بھی اندر آ گئی۔ اس نے اٹھارویں فلور کا بٹن دبا دیا۔ سمرینا کے منیجر جے رائیڈر نے صرف یہی نہیں بلکہ اس کے نیچے والا فلور بھی اسٹاف کے لیے کرائے پر لے لیا تھا جس میں تین چوتھائی سے زیادہ کمرے خالی تھے۔ جیسے ہی لفٹ اوپر جانے لگی۔ میں نے سوٹ کیس کی طرف دوبارہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا کہ اس کے مخصوص مونوگرام والا ٹیگ غائب ہے۔ اگر یہ غلاف کے اندر نہیں تو شاید ٹوٹ کر ڈکی میں گر گیا ہو۔''

''تمہیں یقین ہے کہ وہ ٹیگ اس پر لگا ہوا تھا؟''

''میں نے غلاف کو نیچے کی طرف موڑ کر دیکھا تھا۔ یاد کرو جب ہم ائرپورٹ سے روانہ ہو رہے تھے۔''

فراسٹ تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ اس بے وقوف فرانسس کی وجہ سے ہوا ہے۔ ضرور وہ ٹیگ نکل کر ڈکی میں گر گیا ہوگا۔ تم مجھے اپنا فون دو۔''

میں نے پرس سے فون نکال کر اسے پکڑا دیا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کی بھی زحمت نہیں کی اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لفٹ رک گئی اور ہم باہر آ گئے۔ فراسٹ نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا تم ابھی تک وہیں ہو؟''

''اس کا جواب سننے کے بعد وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں دو منٹ میں نیچے آ رہا ہوں۔''

اس نے سلسلہ منقطع کر کے فون مجھے واپس کر دیا اور ہم خالی راہداری سے گزرتے ہوئے کمرا نمبر 1855 کی طرف بڑھ گئے۔ فراسٹ نے دروازے پر دستک دی پھر اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھول دیا اور خود اندر جانے کے بجائے میرے لیے دروازہ کھولے کھڑا رہا۔ جس پر مجھے خاصی حیرت ہوئی کہ اس میں اتنی تمیز کہاں سے آ گئی۔ میں نے اندر قدم رکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کمرا سرخ اور سفید گلاب کے پھولوں اور سمرینا کے پرستاروں کے پیغامات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ لیونگ روم کے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی جیسے کسی میگزین کے سرورق کے لیے تصویر بنوا رہی ہو۔ کمرے کے دوسرے کونے میں ایک دبلا پتلا شخص قمیص اور جینز پہنے آگے پیچھے ٹہل رہا تھا۔ اس سے میرا پہلے ہی مختصر تعارف ہو چکا تھا۔ وہ سمرینا کا پرانا منیجر جے رائیڈر تھا۔

سمرینا نے غیر جذباتی انداز میں ہمیں دیکھا اور سگریٹ کا ایک طویل کش لیا۔ پندرہ برس پہلے اس نے گلوکاری کا آغاز کیا۔ مسحور کن آواز قیامت خیز جسم کی بدولت اس نے تماشائیوں کو اپنا دیوانہ بنا لیا۔ وہ دس سال تک سیزرز کے اسٹیج پر ہیروں سے مزین لباس پہن کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہی پھر اس کا مشکل دور شروع ہو گیا۔ اس کے بارے میں کثرتِ شراب نوشی، نشہ آور اشیا کا استعمال اور ایک ناکام شادی کی افواہیں گردش کرنے لگیں جس سے اس کا کیریئر زوال کی جانب بڑھنے لگا اور ایک دن بالکل ہی ختم ہو گیا۔

جب بیٹی فورڈ کے بحالی مرکز میں اس کے داخلے کی خبر آئی تو بہت سے لوگ اس کا نام بھی بھول چکے تھے۔ اب وہ آٹھ ماہ بعد واپسی کے لیے پُراعتماد تھی۔ وہ اب بھی پہلے جیسی پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ رائیڈر نے سوٹ کیس کی طرف

دیکھا اور سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ تقریباً وقت پر ہی آ گئے۔“ پھر وہ سمرینا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ لوگ وقت پر آ جائیں گے۔“

سمرینا نے جواب دینے کے بجائے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا۔ رائیڈر نے فراسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور تم نے فون کیوں نہیں کیا؟“

فراسٹ نے اپنی جیب سے فون نکال لیا۔ ”یہ برنر فون خراب ہو چکا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے کوئی دوسرا فون دو۔“

رائیڈر نے اپنے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔ فراسٹ نے اس میں ہاتھ ڈال کر ایک نیا فون نکال لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ لوگ اسمارٹ فون کے بجائے سستے برنر فون استعمال کر رہے تھے۔

”اس کے علاوہ کوئی اور مسئلہ؟“ رائیڈر نے پوچھا۔

”صرف ایک۔“ فراسٹ سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا مونوگرام والا ٹیگ نکل کر گاڑی میں گر گیا۔“

”کیا؟“ سمرینا نے تیز آواز میں کہا۔

”آرام سے ہنی۔“ رائیڈر بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ریمنڈ اسے ڈھونڈ لے گا۔“

”میں تو پہلے ہی جانے والا تھا۔“ فراسٹ نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ ایک ہینڈسم شخص اسے ہٹاتے ہوئے اندر آ گیا۔ فراسٹ نے فوراً اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس شخص نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور بولا۔ ”مجھے روکنے کی کوشش مت کرو۔“

میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ سمرینا کا سابق شوہر ڈیوین ولیمز تھا۔ فراسٹ اس سے ایک بار پھر الجھنا چاہ رہا تھا لیکن سمرینا نے چلاتے ہوئے اسے روک دیا۔

”تم یہاں کیسے آ گئے؟“ رائیڈر نے پوچھا۔

”لفٹ کے ذریعے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ دیکھنا بہت آسان تھا کہ تمہارا یہ کتا کس فلور پر اترتا ہے۔“

فراسٹ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ ڈیوین کے دو ٹکڑے کر دے گا گو کہ وہ بھی کسی لحاظ سے کم نہیں تھا تاہم باڈی گارڈ کا وزن اس سے کم از کم پچاس پونڈ زیادہ تھا۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میری کوشش تھی کہ اپنے آپ کو اس جھگڑے سے ممکنہ حد تک دور رکھوں۔ فراسٹ نے کہا۔ ”مجھے اجازت دو کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں۔“

رائیڈر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”ہاں ڈیوین۔“ سمرینا نے کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

اس نے دس سیکنڈ تک اسے دیکھا اور پھر بولا۔ ”تم بہت اچھی لگ رہی ہو بے بی۔ وہاں تمہارا اچھا علاج ہوا۔“

سمرینا نے دوبارہ سگریٹ اپنے ہونٹوں سے لگایا اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔

رائیڈر نے کہا۔ ”میں نے تم سے ایک سوال پوچھا ہے۔“

ڈیوین نے اسے نفرت سے دیکھا اور بولا۔ ”میں یہاں اپنے سرمائے کا تحفظ کرنے آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا وہ قیمتی شے اسی میں ہے؟“

”اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔“ رائیڈر سوٹ کیس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اب تم جاؤ۔“

ڈیوین نے سمرینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ لباس اب بھی ہماری مشترکہ ملکیت ہے۔ جب تک ہماری طلاق کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ تم اسے فروخت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

”فروخت؟“ سمرینا نے تعجب سے کہا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

رائیڈر ان کے درمیان آتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم نہیں گئے تو میں ریمنڈ سے کہوں گا کہ وہ تمہیں باہر نکال دے۔“

”اگر اس گینڈے نے مجھے ہاتھ لگایا تو......“

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے فراسٹ نے اس کا بازو پکڑ کر مروڑنا شروع کر دیا۔ ڈیوین کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہونے لگے۔

”تم کیا کرلو گے؟“ فراسٹ نے پوچھا۔

”اسے تکلیف مت پہنچاؤ۔“ سمرینا نے چلاتے ہوئے کہا۔

”واہ زبردست۔“ رائیڈر بولا۔ ”ہمارا شو شروع ہونے میں چار گھنٹے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے اور اب یہ مصیبت نازل ہو گئی۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم نے کیا منصوبہ بنایا ہے۔“ ڈیوین دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ برینی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بی اس عمارت میں موجود ہے۔ اس نے مجھے پہلے ہی فون کر دیا تھا اور اپنے کمرے کی چابی بھی دے دی ہے۔''

''برینی بی؟'' سمرینا حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ہے۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

''مجھے کیا معلوم؟'' رائیڈر نے جواب دیا پھر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ریمنڈ، اسے فوراً باہر نکال دو۔''

فراسٹ نے ایک بار پھر ڈیوین کا بازو مروڑا تو وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ''تم میرا بازو توڑ دو گے۔''

''ہاں، اگر تم فوراً یہاں سے نہیں گئے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ان کے جانے کے بعد سمرینا نے پوچھا۔ ''وہ برینی بی کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟''

رائیڈر نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''اس نے مجھے اس ہفتے کے شروع میں فون کیا تھا۔ وہ تمہارا لباس خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ میں اسے کبھی نہیں بیچوں گی۔''

رائیڈر نے دوبارہ کندھے اچکائے اور بولا۔ ''میں نے اسے یہ بات بتادی تھی۔''

میں اس وقت اپنے آپ کو گاڑی کا پانچواں پہیا سمجھ رہی تھی۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنا کام ختم کروں اور معاوضہ لے کر یہاں سے چلی جاؤں لیکن میں نے سمرینا کا لباس تبدیل کرنے میں مدد دینے پر بھی رضامندی ظاہر کی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس سے کچھ اعزازی پاس مانگوں گی لیکن اب مجھے وہ بھی نہیں چاہیے تھے۔

سمرینا نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ پینے کی طلب ہو رہی ہے۔''

رائیڈر تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں صحت یاب ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا۔ یاد ہے کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ شراب سے دور رہنا تمہارے لیے بہتر ہے۔''

میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم چاہو گے کہ میں سوٹ کیس سے وہ لباس باہر نکالوں۔''

''تم مجھے دو۔'' رائیڈر سوٹ کیس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور اسے گھسیٹتا ہوا صوفے کے پاس لے آیا پھر اس نے جلدی سے غلاف اتار کر ایک طرف پھینکا اور سوٹ کیس کو کشن پر رکھ دیا۔ جب وہ اسے کھول رہا تھا تو وہ سوٹ کیس مجھے مختلف لگا۔ کیا سوٹ کیس بدل گیا تھا جبکہ میں نے سمرینا کے گھر سے یہ لباس لے کر خود اس سوٹ کیس میں رکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ اصلی لوئیس ویٹن برانڈ ہے۔ اس کے علاوہ فراسٹ اس کی مسلسل نگرانی کرتا رہا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ سے دیکھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ نقلی لباس ہے لیکن اس وقت اور اس جگہ یہ بات ظاہر نہیں کی جا سکتی تھی۔

اس نے سوٹ کیس کھولا۔ ہیروں سے مزین لباس کمرے کی روشنیوں میں جگمگانے لگا۔ اس نے ایک بار پھر رائیڈر سے مشروب کی فرمائش کی۔ میں نے قریب ہو کر سوٹ کیس پر نظر ڈالی۔ وہ یقیناً نقلی لباس تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہمارے سامنے اصلی ہیرے تھے یا مکعب زرقون؟

''میرا ٹیگ؟'' سمرینا نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ شاید وہ لیموزین کی ڈکی میں رہ گیا ہے۔ رائیڈر بولا۔ ''فراسٹ اسے تلاش کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سمرینا نے کہا۔ ''میں غسل کروں گی۔ تم جانتے ہو کہ یہ مجھے کتنا پسند ہے۔ ایک حصہ پانی، دو حصے دودھ اور تھوڑا سا لیونڈر۔ پھر مجھے تیاری بھی کرنی ہے۔''

رائیڈر پاؤں زمین پر مارتا ہوا بیڈروم میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میری طرف مڑی اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔ ''معافی چاہتی ہوں کہ تمہیں یہ سب دیکھنا پڑ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کی عادی ہوں۔''

رائیڈر نے واپس آ کر کہا۔ ''ٹب بھر رہا ہے۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ پانی کتنا گرم ہونا چاہیے۔''

اس کے جانے کے بعد رائیڈر نے فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولا۔ ''کمرا نمبر 1855 سے جے رائیڈر بول رہا ہوں۔ میں نے کچھ دیر پہلے جو آرڈر دیا تھا، وہ کینسل کر دو۔ کیا؟ اچھا کوئی بات نہیں۔ اسے پھینک دو اور ایک دوسرا مشروب لے کر آؤ لیکن وہ الکحل نہ ہو۔ سمجھ گئے؟''

اس نے فون رکھا اور میری طرف دیکھنے لگا پھر میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔ ''او کے مس ڈیشا۔ تمہیں یہ سب نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ تم ایک رازداری کا معاہدہ کر لو۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اگر تمہیں معاوضہ چاہیے تو یہ ضروری ہے۔'' یہ کہہ

بیرکوئسٹ کے نام پر کمرا بک ہے۔ تقریباً تیس سیکنڈ پر مطلوبہ معلومات مل گئیں۔

''جواب مثبت ہے۔ وہ کمرا نمبر 1444 میں ٹھہرا ہوا ہے۔''

''وہاں جا کر چیک کرو۔'' مائرز نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ہم مزید دو افراد کو بھی تلاش کر رہے ہیں۔ ان میں ایک سفید فام مرد ریمنڈ فراسٹ ہے جو سمرینا رین کے محافظ کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ دوسرا اس کا سابق سیاہ فام شوہر ڈیوین ولیمز ہے۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ شاید اس بارے میں مجھ سے کچھ مزید جاننا چاہ رہا تھا۔ اسی وقت سمرینا باتھ روم سے باہر آئی۔ اس نے نہانے کا گاؤن پہن رکھا تھا اور سر کے بال بھی تولیا میں لپٹے ہوئے تھے۔ مائرز ریڈیو چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''جے، یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' سمرینا نے پوچھا۔

''گستاپو والے آئے ہیں۔'' رائیڈر نے کہا۔ ''اور تمہاری فیشن کنسلٹنٹ اسے سب کچھ تفصیل سے بتا رہی ہے۔''

''کیا؟'' سمرینا مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

''مس رین، میں بتاتا ہوں۔'' مائرز بولا۔ ''میرا تعلق لاس ویگاس میٹرو پولیس سے ہے۔ میں تم سے ابھی بات کرتا ہوں لیکن یہ بتا دوں کہ میں تمہارا آٹوگراف لینے نہیں آیا۔'' اس نے دوبارہ ان دونوں آدمیوں کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال یہ سمجھ لو کہ یہ دونوں ہمارے لیے بہت اہم ہیں لیکن بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''

سمرینا نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے اور رونا شروع کر دیا۔ ''اوہ میرے خدا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔''

رائیڈر نے غصے میں آ کر مائرز سے کہا۔ ''دیکھ لیا، تم نے کیا کر دیا؟''

مائرز نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے ریڈیو پر اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہوٹل میں کسی کو آنے اور جانے مت دو۔''

''آفیسر، تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' رائیڈر نے کہا۔ ''آج رات کے لیے ہمارا ہاؤس فل ہے۔ تمام ٹکٹ فروخت ہو چکے ہیں۔ وہ سب لوگ سمرینا کا گانا سننے کے لیے آ رہے ہیں۔ تم انہیں آنے سے نہیں روک سکتے۔''

''میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔'' مائرز نے کہا۔ ''یاد رہے کہ میں آفیسر نہیں سراغ رساں ہوں۔''

''اسی لیے اتنا اچھل رہے ہو۔'' رائیڈر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں اپنے وکیل کو فون کرتا ہوں۔ وہ میئر سے

ناراضی

میٹرنٹی وارڈ کے باہر ایک صاحب بے تابی سے ٹہل رہے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ آخر لیڈی ڈاکٹر باہر آئی اور ان صاحب کو بتایا۔

لیڈی ڈاکٹر۔ ''آپ ایک خوب صورت اور صحت مند بچے کے باپ بن گئے ہیں۔''

ان صاحب نے گہرا سانس لے کر شکریہ ادا کیا اور وہاں سے رخصت ہونے لگے تو لیڈی ڈاکٹر نے انہیں واپس بلایا اور حیرت سے پوچھا۔ ''کیا آپ خوشی کے اس موقع پر اپنی بیوی سے دو چار باتیں نہیں کریں گے؟''

وہ صاحب رکھائی سے بولے۔ ''جی نہیں، پچھلے دو سال سے اپنی بیوی سے میری بول چال بند ہے۔''

لیڈی ڈاکٹر کی حیرت بڑھ گئی۔ ''بول چال بند ہے اور آپ بچے کے باپ بن گئے!''

وہ صاحب گویا برا منا کر بولے۔ ''اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟ اب اتنی بھی ناراضی نہیں ہے۔''

بات کرے گا اور وہ شیرف کو فون کرے گا۔ پھر تم اپنے پرانے دھندے پر واپس آ جاؤ گے اور فرنٹیئر کیسینو کے باہر پارکنگ ٹکٹ بیچو گے۔''

''فرنٹیئر کئی سال پہلے بند ہو چکا ہے۔'' مائرز نے کہا۔ ''لیکن میں تمہارا پوائنٹ سمجھ گیا۔ پورے ہوٹل کو بند کرنا زیادتی ہوگی۔ فی الحال میں صرف اس فلور کو بند کر رہا ہوں۔''

اس نے پہلے رائیڈر اور پھر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔ سمجھ گئے؟'' اس کا ریڈیو ایک بار پھر بول پڑا۔ اس نے اسے ہولڈر سے نکالا اور کہا۔ ''مائرز بول رہا ہوں۔''

''ہم نے سابق شوہر کو تلاش کر لیا ہے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''لیکن ہمیں ایک اور مسئلہ درپیش ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ایک اور لاش۔ بیرکوئسٹ چودھویں منزل پر اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ڈیوین بڑی جلدی میں باہر آ رہا تھا۔''

مائرز نے سمرینا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہتے ہیں کہ جب بارش ہوتی ہے تو پانی بھی برستا ہے یہ محض مذاق نہیں ہوتا۔ بہرحال اگر کوئی مشتبہ شخص جائے واردات سے پکڑا

جائے تو کیس کو حل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔"

سبرینا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "اتنی جلدی رائے قائم کرنا ٹھیک نہیں۔ ڈیوین کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

مائرز نے رائیڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں اب بھی فراسٹ سے بات کرنا چاہوں گا۔ تم اسے بلاؤ۔"

"میں پہلے ہی یہ انتظام کر چکا ہوں۔" رائیڈر نے کہا۔ "وہ پہلی منزل پر لفٹ کے ساتھ کھڑا ہوا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

مائرز نے اسے دیکھ کر سر ہلایا اور باوردی پولیس آفیسر سے بولا۔ "تم نیچے جاؤ اور دیکھو۔ اگر وہ تمہیں مل جائے تو اسے روک کر رکھو۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کہیں مت جانا، میں واپس آ رہا ہوں۔"

ان کے جانے کے بعد سبرینا کرسی پر ڈھے گئی۔ "ایسی صورت میں جبکہ ڈیوین پر قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے میں پرفارم نہیں کر سکتی۔"

"ہم ابھی یہ بات نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔

اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ "کچھ بھی ہو، میں نہیں کر سکتی۔"

"بہت خوب، شاندار۔" رائیڈر نے کہا۔ "تم نے بحالی کے مرکز میں آٹھ مہینے گزارے۔ میں ایک سال سے اخبار والوں کو تمہاری واپسی کا یقین دلا رہا ہوں۔ اور اب تم کہہ رہی ہو کہ پرفارم نہیں کر سکتیں۔"

"تم اس پر چلا کر ٹھیک نہیں کر رہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ وہ کتنی پریشان ہے۔"

"پریشان؟ میں تمہیں بتاؤں گا کہ پریشانی کیا ہوتی ہے۔" وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ "تم مجھے حکم دے رہی ہو۔ بھول جاؤ کہ تم یہاں کس لیے آئی تھیں۔ اپنے آپ کو فارغ سمجھو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

"تم نے سراغ رساں کی بات سنی تھی؟" میں نے کہا۔ "یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں چاہوں گی کہ تم مجھے معاوضے کے علاوہ ملازمت سے برطرف کرنے کا تاوان بھی ادا کرو۔"

"ہم تمہیں ڈاک سے چیک بھیج دیں گے۔" رائیڈر نے کہا۔

"اگر تم برا نہ مانو۔" میں نے کہا۔ "مجھے ابھی چیک چاہیے۔"

"جہنم میں جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے کچھ برے الفاظ بھی ادا کیے۔

میں اسے کوئی سخت جواب دینے والی تھی کہ سبرینا بول پڑی۔ "جے، اسے چیک دے دو۔"

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔ میں بھی پیچھے چلتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی گئی۔ رائیڈر نے چابی نکالی لیکن صرف تھوڑا سا ہی دروازہ کھولا۔ "تم یہاں ایک منٹ انتظار کرو۔"

پھر وہ اس تنگ راستے سے اندر چلا گیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ایسی کیا چیز ہے جو وہ مجھے دکھانا نہیں چاہتا۔ لیکن اس وقت میں صرف اپنا معاوضہ لے کر یہاں سے جانا چاہ رہی تھی۔ پھر مجھے لگا جیسے کوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہو۔ میں حیران تھی کہ یہاں اور کون ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ رائیڈر کا کوئی دوست اس سے ملنے آیا ہو۔ پھر دروازہ پورا کھل گیا اور اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"اندر آ جاؤ۔" اس نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ کوئی تمہیں یہاں کھڑا ہوا دیکھ لے۔"

میں تھوڑا سا ہچکچا رہی تھی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کاش میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا پھر میں نے سوچا کہ اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو اس سے نمٹ لوں گی۔

باتھ روم کا دروازہ بند تھا جس سے میں یہی سمجھی کہ اندر رائیڈر کا دوست ہے۔ رائیڈر نے اپنا بریف کیس اٹھا کر میز پر رکھا اور اس میں سے چیک بک نکالنے لگا۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ کونے میں ایک اور لوئیس ووٹین کا سوٹ کیس رکھا ہوا ہے۔ میں جان گئی کہ یہ اصلی ہے۔ اس کے علاوہ جو چیز مجھے پریشان کر رہی تھی، وہ ہینڈل میں لگا ہوا چمڑے کا ٹیگ تھا۔ یہی وہ سوٹ کیس تھا جو میں لاس اینجلس سے لائی تھی۔ وہ نہیں جو ہم نے سبرینا کے کمرے میں پہنچایا تھا۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس سوٹ کیس میں سبرینا کا اصلی لباس تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ فرانسس اور فراسٹ نے لیموزین میں سوٹ کیس تبدیل کر دیے تھے۔

رائیڈر نے مجھے سوٹ کیس پر نظریں جمائے دیکھ لیا۔ اس نے زور سے بریف کیس بند کیا اور غصے سے بولا۔ ''احمق، بے وقوف۔''

''اے، یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''یہ تو سمرینا کا اصلی سوٹ کیس ہے۔''

رائیڈر کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں اور وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں آؤ۔''

میرے عقب میں باتھ روم کا دروازہ کھلا اور فراسٹ کمرے میں آ گیا۔ اس نے مجھے اندر کی جانب مزید دھکیلا اور میرے پرس سے آئی فون نکالتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس کی دوبارہ ضرورت پیش آ گئی۔''

رائیڈ نے سوٹ کیس سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''یہ اس بارے میں کتنا جانتی ہے۔''

فراسٹ نے کندھے اچکا دیے۔ ''ہمیں معلوم کرنا ہو گا۔'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم کوئی ڈھیلا سرا برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے مطابق ہی منصوبہ ترتیب دینا ہو گا۔''

میں نے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن فراسٹ نے بڑی مضبوطی سے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ ''جب تک ہم نہ کہیں، تم یہاں سے نہیں جا سکتیں۔'' اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

رائیڈر نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے یہاں کیوں لے آئے؟''

''برینی بی۔'' فراسٹ نے دوبارہ کندھے اچکائے۔ ''اس نے ایسی باتیں شروع کر دیں جیسے ہم اس کے ہاتھ کوئی ایسی چیز فروخت کر رہے ہیں جو ہماری نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈیوین نے اسے بتا دیا تھا کہ طلاق کا فیصلہ ہونے تک یہ ہیروں سے جڑا ہوا لباس مشترکہ ملکیت ہے اور ہم اسے فروخت نہیں کر سکتے۔ وہ اتنا غصے میں تھا کہ اس نے مجھ پر پستول نکال لیا۔''

''فرانسس کی طرح۔'' رائیڈر نے کہا۔

''وہ بھی تمہارا ہی آئیڈیا تھا۔'' فراسٹ نے کہا۔ ''یاد ہے تم نے ہی کہا تھا کہ کوئی سرا ڈھیلا نہیں چھوڑنا۔''

رائیڈر نے کہا۔ ''تمہاری وجہ سے یہ معاملہ ایک بڑی تباہی کی طرف جا رہا ہے۔''

فراسٹ نے اسے گھورا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''ممکن ہے کہ اب بھی ہم اس مصیبت سے بچ جائیں۔'' رائیڈر بولا۔ ''اگر پولیس والوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا جائے کہ ڈیوین اور سمرینا لباس تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور برینی کو یہ بات معلوم ہو گئی۔ پولیس والے ڈیوین کو برینی کے کمرے سے نکلتا ہوا دیکھ چکے ہیں۔''

''وہ یقیناً میرے نکلنے کے بعد وہاں آیا ہو گا۔''

وہ جس بے دھڑک انداز میں میرے سامنے باتیں کر رہے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ مجھے اس کمرے سے زندہ باہر نہیں جانے دیں گے۔ میں نے یہاں سے نکلنے کے امکانات کا جائزہ لیا لیکن میرے بازو پر فراسٹ کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ میں نے مجبوری کے عالم میں کہا۔ ''چیک رہنے دو۔ میں سب کچھ بھول کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

رائیڈر نے میری بات پر غور کیا پھر کہنے لگا۔ ''پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ تم کیا جانتی ہو اور تم نے کن لوگوں کو اس بارے میں بتایا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے صوفے پر رکھا ہوا ایک اور چھوٹا سوٹ کیس کھولا اور اس میں ایک پلاسٹک بیگ اور دستانے نکالے پھر بولا۔ ''ہمیں اب اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہے۔ میں سمرینا کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ہم تم سے نمٹ لیں گے۔''

اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور بیگ میں سے کچھ سامان نکالا جس میں ایک کاغذ کا پیکٹ، ایک آئی ڈراپر، ایک چمچہ اور ایک سرنج شامل تھی۔ اس نے احتیاط سے پیکٹ کھولا اور اس میں سے تھوڑا سا سفید پاؤڈر چمچے میں انڈیلا اور اس میں تھوڑا سا پانی ڈال دیا۔ وہ سمرینا کے لیے انجکشن کے ذریعے دی جانے والی کوئی دوا تیار کر رہا تھا اور میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''یقین کرو اسے اس کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے بعد اس کی آواز پہلے جیسی ہو جائے گی۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے لائٹر سے چمچے کو گرم کرنا شروع کر دیا۔ فراسٹ نے کہا۔ ''کیا میں اسے یہیں روک کر رکھوں۔''

''تم اسے لے کر سترھویں منزل پر اس کمرے میں لے جاؤ جو ہم نے برینی سے سودا ہونے کے بعد اپنے لیے بک کروایا تھا۔ اس طرح جب پولیس یہاں آ کر سمرینا کی لاش دیکھے گی تو تم ایک منزل نیچے ہو گے۔''

فراسٹ مجھے دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے سیڑھیوں کے ذریعے لے جاؤں گا۔''

''نہیں، اس کے لیے تمہیں راہداری سے گزر کر جانا ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم لفٹ استعمال کرو۔''

دروازے کے قریب پہنچ کر اس کا ہینڈل پکڑنے کے لیے فراسٹ نے میرا دایاں بازو چھوڑ دیا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اپنے پرس میں اس امید پر ہاتھ ڈالا شاید مجھے کوئی ایسی چیز مل جائے جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکوں۔ میری انگلیاں ایک دھاتی سلنڈر سے ٹکرائیں اور میں نے اسے نکال لیا۔ وہ ایک اسپرے تھا۔ میں نے اس کا رخ فراسٹ کی جانب کیا اور اس کی آنکھوں میں اسپرے کر دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔

میں نے دروازے سے نکل کر بھاگنا شروع کر دیا لیکن اونچی ایڑی کی وجہ سے مشکل پیش آرہی تھی۔ میں نے دونوں سینڈل اتارے اور سیڑھی کا دروازہ کھول کر وہاں رکھ دیے پھر میں پوری رفتار سے راہداری میں دوڑتی ہوئی کونے کی طرف جانے لگی۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیوار کا سہارا لیا اور اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

فراسٹ لنگڑاتا ہوا راہداری میں آیا اور سیڑھیوں کے دروازے کے پاس آکر رک گیا۔ اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں پونچھیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ واپس راہداری میں نہ آجائے لیکن اس نے دروازے کو دھکا دیا اور سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا کہ اب وہ میری تلاش میں اٹھارہ منزلیں اتر کر نیچے جائے گا اس کے جانے کے بعد میں نے سینڈل اٹھا کر پہن لیے۔

اب مجھے رائیڈر کو کسی طرح روکنا تھا۔ میں نے اسے راہداری میں آتے ہوئے دیکھا۔ وہ شاید فراسٹ کو تلاش کر رہا تھا، جب وہ نظر نہیں آیا تو اس نے اپنا سیل فون نکال کر اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا واپس کمرے میں چلا گیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی تھی۔ میرے لیے زیادہ بہتر یہ تھا کہ لفٹ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تاکہ مائرز کو تلاش کرسکوں۔ وہ چودھویں منزل پر گیا تھا۔

پھر میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور رائیڈر ہاتھ میں ایک چھوٹا بیگ پکڑے کمرے سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا جب میں نے اسے سمرینا کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا۔ اب میرے لیے اسے روکنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ ورنہ سمرینا کی زندگی خطرے میں پڑجاتی۔ میں نے اس طرف دوڑ لگادی۔

رائیڈر دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا لیکن میں اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے ایڑی کا نکیلا سرا اس کے ماتھے میں گھونپ دیا جس سے وہاں ایک چھوٹا سا سوراخ بن گیا۔ اس نے مجھے دھکا دیا اور گھونسا مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ ہم لڑکھڑاتے ہوئے کمرے کے فرش پر جا گرے۔ سمرینا کمرے کے دوسرے کونے میں کھڑی ہوئی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''نو گیارہ کو فون کرو۔'' میں چلائی۔ ''یہ تمہیں مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

اس کے چہرے پر شکنیں نمودار ہوئیں لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ میں نے غصے میں آکر رائیڈر کے سر پر ایک اور وار کیا اور اس کی دائیں کنپٹی پر ایک سوراخ ہوگیا۔

میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی اور سمرینا سے ایک بار پھر فون کرنے کے لیے کہا۔ اس بار اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور فون تک چلی گئی۔ پھر میں نے اسے چلاتے ہوئے سنا۔ ''مدد۔ میں سمرینا رین بول رہی ہوں۔ میرے کمرے میں ایک پاگل عورت آگئی ہے۔ فوراً پولیس بھیجو۔''

میں نے رائیڈر پر حملہ کرنے کے لیے ایک بار پھر اپنا بازو اوپر اٹھایا لیکن وہ کسی گیند کی طرح بل کھاتے ہوئے کراہنے لگا۔ میں نے لات مار کر اس کے ہاتھ سے بیگ گرا دیا اور پیچھے ہٹ کر سمرینا کو بتانے لگی کہ اس میں کیا ہے۔

''اگر میری بات کا یقین نہ آئے تو خود دیکھ لو۔'' میں نے کہا۔

وہ محتاط انداز میں ہماری طرف بڑھی اور جھک کر بیگ اٹھالیا۔ جب اس نے اندر جھانک کر دیکھا تو اس کے چہرے پر افسردگی چھاگئی۔ وہ آہستہ سے بولی۔ ''جے، تم یہ کیسے کرسکتے ہو؟''

پھر میں نے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے زور سے کہا۔ ''پولیس، دروازہ کھولو۔'' میں نے دروازہ کھولا تو وہاں دو پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سراغ رساں مائرز چودھویں منزل پر ہوگا۔ اسے بتا دو کہ اسٹیسی ڈیٹا نے اوپر بلایا ہے۔ قاتل ہوٹل کی سیڑھیوں میں پھنسا ہوا ہے اور میں نے اس کا ایک اور کیس حل کرلیا ہے۔''

سرورق کی پہلی کہانی

دوسری شرط

اعتزاز سلیم وصلی

وقت کرتا ہے پرورش برسوں... حادثہ یکدم نہیں ہوتا... اس کی زندگی بھی اسی کی مرہون منت تھی۔ وہ پُرعزم... پُرجوش ...جوشیلا نوجوان تھا۔ اس کا مقصد وطن کی حفاظت کرنا تھا... ایسا دلیر محافظ بننا ...جو وطن کے لیے کٹ جاتے ہیں... اپنی جان نچھاور کر دیتے ہیں... مگر ٹوٹی کہاں کمند... دو چار ہاتھ جب لب بام رہ گیا... متواتر رنگ بدلتی زندگی کی تند و تیز موجوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا...

جیل میں سر جھکائے بیٹھے اس شخص کی سوچیں کہاں کہاں سفر کر رہی تھیں، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اسے یہاں آئے تین دن ہو چکے تھے مگر اس کی زبان سے ان تین دنوں میں ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ گرفتاری کے وقت سے لے کر آج تک چپ تھا۔ اس کی موت کی سزا پر عمل ہونے میں کچھ ہی دن باقی تھے۔ وہ کسی معجزے کے انتظار میں نہیں تھا۔ اس کی موت کا وقت قریب ہے۔ جیل میں موجود باقی قیدی اس کی موجودگی میں آپس میں سرگوشیوں

میں بات کرتے۔ کبھی ہوا کے سنگ کوئی سرگوشی اس تک بھی پہنچ جاتی تھی۔
"لگتا ہے کوئی بڑا مجرم ہے جو زبان نہیں کھولتا۔" ایک قیدی بولا۔
"نہیں یار، شکل سے تو نہیں لگتا اور پھر بڑے مجرم تو یہاں پر عیاشی کرتے ہیں۔" اس نے سر نہیں اٹھایا اس لیے وہ بے خبر تھا کہ جواب دینے والے نے ایک آنکھ بھی دبائی ہے۔ ان میں سے ایک جو ہوشیار دکھائی دیتا تھا، اس کے پاس کھسک آیا۔
"کیوں اُستاد کتنے قتل کیے؟ یا پھر جرم بے گناہی کی سزا بھگتنے آیا ہے؟" اس نے نظر اٹھائی۔ حسبِ معمول زبان خاموش رہی۔ "بولتا کیوں نہیں؟" وہ اس کی خاموشی سے تنگ آ گیا تھا۔ "گونگا ہے کیا؟" اس بار اس نے اشارے کیے۔ زبان پر ہاتھ رکھ کر ہاتھ سے ہوا میں سوالیہ نشان بنایا۔ "ابے بول ناں۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اور یہ حرکت اس کو کافی مہنگی پڑی۔ اسے سمجھ نہیں آئی تھی کہ خاموش قیدی کا ہاتھ اتنی تیزی سے کیسے حرکت میں آیا۔ گال پر پڑنے والا ہاتھ اتنا سخت تھا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔
"ابے تیری تو۔" وہ گالیاں دیتا ہوا دوبارہ اس کی جانب لپکا۔ غصے میں وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ سامنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جیسے بچے کو غصے میں وار کرتا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر آ گئی ہو۔ اب کی بار اسے چھونے کی حسرت ہی رہی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے دونوں پیر آگے کیے اور اچانک ہوا میں اچھل گیا۔ حملہ آور اڑتا ہوا دوسری جانب جا گرا۔ جیل میں شور مچ گیا تھا۔ "اے کوئی ہے؟" حملہ آور کا ساتھی اپنے دوست کی حالت دیکھ کر اب چلا رہا تھا۔
چار پانچ سپاہی بھاگتے ہوئے آئے اور ڈنڈوں سے خوب ان دونوں کی مرمت کی۔ خاموش رہنے والا قیدی اب بھی چپ تھا۔ وہ ایسے مار کھا رہا تھا جیسے اسے کچھ اثر ہی نہیں ہو رہا ہے۔ جتنی تیزی سے یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا اتنی ہی جلدی سست گیا۔ حملہ آور اب کراہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اور گردن پر سخت چوٹیں آئی تھیں۔ اس کا ساتھی پاس بیٹھ گیا۔
"تجھے کہا تھا ناں شکیل، نہ چھیڑ، شکل سے ہی چھٹا ہوا لگتا ہے۔" اس نے دانت پیسے۔ البتہ آواز اتنی ہی تھی کہ سامنے والا بمشکل سن سکا۔
"مجھے یہ ٹرینڈ فائٹر لگتا ہے۔" شکیل کی آواز میں پہلے والا دم نہ تھا۔
"کیا خبر، یہاں آنے والوں کے پیچھے کیا کیا کہانیاں ہوتی ہیں، ہم کیا جانیں؟" اس نے کندھے اچکا دیے۔ شکیل نے دوبارہ خاموش قیدی کی طرف دیکھا جو اپنی سابقہ پوزیشن میں آ چکا تھا۔ اب بھی اس کے بارے میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں مگر وہ بے خبر دکھائی دیا۔
اگلے چند دن پوری جیل میں اس قیدی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں لیکن وہ ہمیشہ کی طرح خاموش دکھائی دیا۔ اس دن جمعہ تھا۔ سب قیدی نہانے کی تیاری کر رہے تھے۔ سپاہی کی آمد ہوئی۔ "علی شیر، تمہارا ملاقاتی آیا ہے۔" تو اس خاموش قیدی کا نام علی شیر تھا۔
وہ کھڑا ہو گیا۔ بولا تو لہجہ خوبصورت اور آواز بھاری تھی۔
"کون؟"
"صاحب ہیں کوئی، یہیں آ رہے ہیں۔" پانچ منٹ بعد صاحب کی آمد ہوئی۔ سادہ لباس میں بھی اس کی چال ڈھال اور سامنے موجود بندے کا ایکسرے کرتی آنکھیں، چیخ چیخ کے اس کے خاص ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ علی شیر کے ہونٹ انہیں دیکھ کر مسکرانے کے انداز میں کھنچ گئے۔
"آئیں جناب ایس ایچ او سہیل خان صاحب، میں حیران ہوں آپ جناب ایک پھانسی کے مجرم سے کیوں ملنے آئے ہیں؟" اور سہیل خان اس کی بات کو نظرانداز کر گیا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ علی شیر نے ہاتھ تھاما۔ علی شیر کے ہاتھ کی سخت گرفت محسوس کر کے وہ مسکرائے۔
"علی شیر، اگر تمہاری طرف سے کوئی خطرہ نہ ہو تو ہم کسی پُرسکون جگہ بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"
"ہاتھ میں ہتھکڑی ہو گی، پھر بھی خطرے کی بات؟"
نہیں سر جی، علی شیر کی زبان کا آپ کو پتا ہے، ایسا کچھ نہیں ہو گا تسلی رکھیں۔" اس کا لہجہ یقین دلانے کے لیے کافی تھا۔
تھوڑی دیر بعد دونوں ایک الگ کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ علی شیر کے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔
"اب سسپنس ختم کر دیں جناب، بتا ہی دیں اپنے آنے کا مقصد؟" اس نے سہیل خان کی آنکھوں میں جھانکا۔
"علی شیر، میں نے بہت سے کیس حل کیے، اپنی ساری زندگی ایمانداری سے گزاری، نوکری میں کبھی ایک روپیہ بھی حرام کا نہیں کھایا۔"

''یہ باتیں میں جانتا ہوں سہیل خان صاحب، آپ اپنے آنے کا مقصد بتائیں۔'' اس نے ان کی بات کاٹی اور اپنا سوال دہرایا۔

''اسی طرف آ رہا ہوں، مجھے پولیس میں کام کرتے دس سال بیت گئے ہیں لیکن آج تک، کبھی کسی ایک کیس کے فیصلے پر بھی میں پچھتایا نہیں لیکن تمہارا کیس واحد کیس ہے اس کا جب سے فیصلہ ہوا ہے، مجھے ایک لمحہ بھی سکون کا نصیب نہیں ہوا، میں نے ہر منٹ تمہیں سوچا ہے، تمہاری خاموشی مجھے ڈستی رہی ہے اور میں آج تمہیں اس طرح بولتے دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔'' سہیل خان کے لہجے میں افسردگی تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سرخی شاید ان کی نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔

''تو اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''سب کچھ سچ سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''کہانی لمبی ہے، وقت ہے آپ کے پاس؟''

''ہاں کافی ہے۔''

''میں سنا دیتا ہوں مگر میری دو شرائط ہیں، اگر منظور ہیں تو بولیں۔''

''شرائط بتاؤ۔'' سہیل خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ایک شرط تو یہ کہ یہ ساری کہانی میرے اور آپ کے بیچ رہے گی، آپ یہاں سے نکلتے ہی سب بھول جائیں گے اور دوسری شرط میں کہانی ختم ہونے کے بعد بتاؤں گا۔'' آخری بات کہہ کر وہ ہنسا۔

''چلو، ہو جاؤ شروع۔'' سہیل خان بے چینی سے بولے۔ وہ آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

☆☆☆

دو کمروں کے اس چھوٹے سے گھر میں دس سال کا وہ بچہ، علی شیر...... اپنے کھیل میں مگن تھا۔ اس نے ہاتھ میں کھلونا پستول پکڑا ہوا تھا اور بار بار ٹی وی کی طرف اشارہ کر کے منہ سے ''ٹھاہ'' کر رہا تھا۔

''علی، سردی ہے باہر، اندر آ جاؤ۔'' ماں نے پکارا۔ وہ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور بیڈ پر بیٹھی ماں کی گود میں گھس گیا۔ اس کے باپ کی چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی مگر علی شیر کے معاملے میں دونوں میاں بیوی کے سپنے بڑے بڑے تھے۔

''میرا بیٹا بڑا ہو کے کیا بنے گا؟'' ماں نے علی شیر کا منہ چوما۔

''مما میں فوجی بنوں گا۔'' ماں اس کا جواب سن کر حیران ہوئی۔

''کس نے سکھایا تمہیں یہ؟''

''مما میں نے ٹی وی میں دیکھا ہے، دشمنوں کو مارتے ہیں فوجی، ہوا میں اڑتے ہیں، پانی میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔'' وہ جوش سے بتانے لگا۔

''مگر میرا بیٹا تو اتنا ذہین ہے وہ ہر کلاس میں فرسٹ آتا ہے، وہ ڈاکٹر بنے گا۔'' ماں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر علی شیر نے منہ پھلایا۔

''مجھے نہیں پتا مما...... میں فوجی ہی بنوں گا۔'' اور اس کی یہ ضد روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس کا شوق دیکھ کر ماں باپ حیران بھی ہوتے اور پریشان بھی۔ لیکن وقت نے کچھ اور فیصلہ کیا تھا۔

علی شیر کی دنیا اس وقت اندھیر ہو گئی جب وہ صرف بارہ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا۔ روڈ ایکسیڈنٹ اس کے ماں باپ کو نگل گیا تھا۔ تیز رفتار ٹرک نے موٹر سائیکل پر جاتے ان دو غریبوں پر رحم نہ کیا اور یوں ایک ہنستا بستا گھر اجڑ گیا۔ علی شیر اسکول سے واپس آیا تو اس کے لیے دعائیں کرنے والے خدا کو پیارے ہو چکے تھے مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ماموں نے اسے ہاسٹل میں پڑھنے بھیج دیا اور وہ جان لگا کر پڑھنے لگا۔ کبھی تین چار ماہ میں ایک بار گھر آتا جہاں مامی کے ماتھے پر آتے بل اس کے دل کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے آنا بالکل بند کر دیا۔ اسے فوج میں جانے کا شوق تھا۔ وہ کمانڈو بننا چاہتا تھا۔ بچپن میں ہی شہید فوجیوں اور ملک پر جان نچھاور کرنے والے لوگوں کے قصے پڑھ پڑھ کر اس کے دل میں بھی وطن کی محبت ڈیرے ڈال چکی تھی۔ پاکستان اس کا پہلا پیار تھا۔ انٹر کرتے ہی اس نے فوج میں اپلائی کیا اور سلیکٹ ہو گیا۔ یوں اس کا خواب پورا ہو گیا۔ فوج میں اس کا شوق دیکھ کر اسے اسپیشل یونٹ میں شامل کیا گیا اور وہ ایس ایس جی کمانڈو ٹریننگ کے لیے منتخب ہو گیا۔ یہ نو ماہ کا عرصہ بہت سخت تھا۔ ایس ایس جی کی ٹریننگ دنیا کی ہر قسم کی کمانڈو ٹریننگ سے زیادہ مشکل سمجھی جاتی ہے۔ ان کا ٹرینر کوئی ایک نہیں تھا، بہت سے لوگ تھے جو مختلف فیلڈ میں ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ انہی میں ایک آفتاب خان تھے۔ پچاس کے لگ بھگ ان کی عمر تھی مگر سُپر فٹ دکھائی دیتے تھے۔ ان دنوں ان کی ٹریننگ کے آخری دن چل رہے تھے جب وہ واقعہ پیش آیا جس نے علی شیر کی زندگی بدل

دی۔ آفتاب خان نظم وضبط کے سخت پابند تھے مگر علی شیر سے ان کی دوستی تھی۔ وہ اس کے جذبے کو پسند کرتے تھے۔ وہ اسے اکثر اپنے گھر بھی لے جاتے تھے جو محکمے کی طرف سے انہیں ملا ہوا تھا۔ ان کی بیوی ملکہ ان سے پندرہ سال چھوٹی تھی اور دیکھنے میں بالکل جوان لگتی تھی۔ علی شیر اس کی کمپنی کو انجوائے کرتا تھا۔ اس دن وہ سب ایک ہال میں اکٹھے تھے جب آفتاب خان نے اعلان کیا۔ ''بس ایک ہفتہ اور...... پھر آپ کی ٹریننگ مکمل ہو جائے گی اور میں چاہوں گا تم سب کامیاب ہو اور ملک کی خدمت کرو۔'' ان کی بات سن کر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جب وہ واپس جارہے تھے تب انہوں نے علی شیر کو اشارہ کیا۔ ''یس سر'' وہ پاس آکر بولا۔

''یار تمہارا آخری ہفتہ ہے، آج ملکہ نے تمہیں ڈنر پر بلایا ہے۔'' وہ اس سے بے تکلف تھے۔

''یس سر، میں ضرور آؤں گا۔''

''ہاں تم آنا، میں شاید تم دونوں کو جوائن نہ کرسکوں، آج ایک اپوائنٹمنٹ میٹنگ ہے۔'' انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور آگے چل دیے۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آیا اور مخصوص یونیفارم اتار کر سادہ کپڑے پہننے لگا۔ رات ہوتے ہی وہ رہائشی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ آفتاب صاحب گھر پر نہیں تھے۔ ملکہ نے اس کا استقبال کیا۔ آج خلافِ معمول وہ میک اپ میں اور خوبصورت کپڑوں میں ملبوس نظر آرہی تھی۔

''آیئے جناب، اتنا انتظار؟'' علی شیر اور وہ آپس میں بے تکلف تھے۔

''جی بس ایسے ہی۔'' آج وہ پہلی بار آفتاب خان کی غیر موجودگی میں آیا تھا۔ اس لیے جھجک رہا تھا۔

''آؤ اندر۔'' وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ واپس آکر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے صاحب آج شاید نہ آسکیں، بہرحال میں نے سوچا تم کو چلے جانا ہے پھر شاید وقت ملے یا نہ ملے اس لیے آج بلا لیا۔''

''بہت شکریہ یہ آپ کا۔''

''اپنوں سے شکریہ نہیں بولتے علی۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا اور گہری سانس لے کر بولی۔ ''تم جب پہلے دن اپنے سر کے ساتھ آئے تھے یہاں، میں نے تمہیں بہت پسند کیا تھا علی، بہت اچھے لگے تھے تم مجھے۔''

وہ جانتا تھا ملکہ اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے مگر وہ یوں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرے گی، یہ اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔

''آج وقت ہے علی، یوں ضائع مت کرنا اسے، میں جانتی تھی آج وہ نہیں ہوں گے اس لیے بلایا ہے تمہیں۔''

علی اس کی بے باکی پر حیران رہ گیا۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا مگر ملکہ اپنے صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔

''نہیں علی، جاؤ مت، پلیز میری بات مان لو۔'' علی خاموش تھا مگر اسے یہ بات قطعی منظور نہ تھی۔ اس نے ہاتھ چھڑایا اور کھڑا ہو گیا۔ ملکہ اس سے لپٹ گئی۔ وہ خود کو چھڑوا کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر وہ ہوا جو دونوں نے سوچا نہ تھا۔ ملکہ کی نظر سامنے پڑی۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹی۔ آفتاب خان سرخ چہرہ لیے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''میں نہیں جانتا تھا میرے گھر میں، میری غیر موجودگی میں یہ کھیل رچایا جارہا ہے۔'' ان کی بارعب آواز نے علی شیر کے جسم میں سنسناہٹ پیدا کردی۔ ''علی شیر، تم نے میرا اعتبار توڑا ہے۔'' وہ تھوڑا آگے آئے۔

''مگر سر......'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروادیا۔

''نکل جاؤ یہاں سے۔'' انہوں نے باہر کی جانب اشارہ کیا۔

''میری بات سنیں سر۔'' وہ ان کے پاس آیا۔ آفتاب خان کا ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے کی ایک سائڈ سرخ کر گیا۔

''علی شیر...... نکل جاؤ یہاں سے۔'' جذبات کی شدت سے ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔ وہ باہر نکلتا چلا گیا۔ اسے خبر نہیں تھی بعد میں ملکہ کے ساتھ کیا ہوا۔ کمرے میں آکر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ وہ رات سخت پریشانی لیے ہوئے تھی۔ وہ اپنے مستقبل کے لیے فکرمند تھا جو ایک ناکردہ جرم کی سزا میں تباہ ہوسکتا تھا۔

اگلے دو دن اسے آفتاب خان دکھائی نہیں دیے۔ یہ خاموشی کسی طوفان کی آمد کی خبر سنا رہی تھی...اور طوفان آیا۔ دو دن بعد وہ رات کو ٹریننگ سے تھکا ہارا سورہا تھا۔ اس کے ساتھ کمرے میں ایک اور نوجوان بھی موجود تھا۔ اچانک باہر دستک ہوئی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا اور خود تیزی سے ایک سائڈ پر ہو گیا۔ یہی حرکت اسے سامنے سے پڑنے والی لات سے بچا گئی۔ اس نے دروازے کو زوردار جھٹکا دیا اور سامنے سے آنے والا پیچھے جاگرا۔ مگر وہ ایک دو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہیں تھے، بہت سے تھے۔ تین چار ایک ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ علی شیر ٹرینڈ فائٹر تھا مگر سامنے والے بھی اناڑی نہ تھے۔ انہوں نے چند منٹوں میں اسے بے بس کر دیا اور وہ رات علی شیر پر بھاری تھی۔ ہاکی کے کئی وار اس کے سر پر پڑے اور خون بہہ نکلا۔ ایک نقاب پوش نے کچھ اس انداز میں اس کی ٹانگ پر وار کیے کہ درد سے وہ بلبلا اٹھا۔ پیر کے بالکل اوپر ماہرانہ انداز میں ہاکی سے وار کیے گئے۔ وہ جانتا تھا یہ اس کا مستقبل ختم کرنے کی سازش ہے۔ مگر وہ بے بس تھا۔ اسے حیرانی اس بات کی تھی کہ اس کے ساتھی کیوں خاموش ہیں مگر یہ راز تب کھلا جب ایک شخص کا نقاب اتر گیا اور علی شیر اسے پہچان چکا تھا۔ یہ اسی کے ساتھیوں میں سے تھا۔ آفتاب خان کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوما اور وہ اپنے ہی خون میں لت پت قالین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

اگرچہ زخموں سے مکمل نجات مل چکی تھی مگر ہلکی لنگڑاہٹ خطرے کی علامت تھی۔ اس نے بہت کوشش کی مگر یہ لنگڑاہٹ ختم نہ ہو سکی۔ آرمی کے ڈاکٹرز اور سرجن نے اسے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ اب یہ لنگڑاہٹ پوری عمر اس کے ساتھ رہے گی۔ فوج اور اسپیشل یونٹ سے اسے ریٹائر کر دیا گیا۔ مستقبل کا خواب اس طرح برباد ہو گا، یہ اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو ماموں نے اسے الگ کمرے میں بٹھا کر سمجھایا۔

''علی بیٹا، تمہاری مامی کو بالکل یہ پسند نہیں کہ تم اس گھر میں رہو۔ جوان اولاد ہے۔ میری جوان بیٹی ہے اس لیے تم اپنا بندوبست کہیں اور کر لو۔'' علی بھی رہنے نہیں آیا تھا۔ اسے ماموں کی سیدھی اور سچی باتیں اچھی لگیں اور وہ مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

''ماموں میں یہاں رہنے نہیں آیا، میں دوسرے شہر جا رہا ہوں، جاب کی تلاش میں۔'' ماموں نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ وہ خود مجبور تھے۔ یوں علی شیر کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا۔

☆☆☆

سہیل خان نے گہری سانس لی۔ ''تو یہ تھا تمہارا بیک گراؤنڈ، اس رات تم پر حملہ کرنے والوں کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں، سب جانتے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں مگر آفتاب خان کی وجہ سے چپ رہے، وہ انچارج تھے ہمارے یونٹ کے اس لیے کوئی کچھ نہیں کر سکا۔'' وہ افسردگی سے مسکرایا۔

''تو پھر آگے کیا ہوا؟''

''میں سمجھتا تھا ہمیں خطرہ صرف سرحدوں پر ہوتا ہے مگر میں غلط تھا۔ ہم اپنے ملک کی جڑیں خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ رہے ہیں اور کھوکھلا کر رہے ہیں اسے، یہی میرے ساتھ ہوا۔ مجھ پر حقیقت کھلنے میں دیر لگی۔'' علی شیر کی آنکھوں میں کرب تھا۔

☆☆☆

اس کی ساری زندگی فوج اور اسپیشل یونٹ میں ڈسپلن کے ساتھ گزری تھی اس لیے عام زندگی اب اس کے لیے مشکل تھی۔ دوسرے شہر میں آ کر وہ ایک دوست کے پاس ٹھہرا۔ تین دن ادھر اُدھر آفس کی نوکری کے لیے بھٹکتا رہا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ ایک دن وہ پریشان بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ دوست کی آمد ہوئی۔ عدیل اس کا کلاس فیلو تھا اور یہاں بینک میں نوکری کرتا تھا۔

''کیوں پریشان ہے شہزادے؟'' اس نے بیٹھتے ہی کہا۔

''یار کوئی جاب مل ہی نہیں رہی۔'' اس نے اداس لہجے میں کہا۔

''تو اس میں اداس ہونے کی کیا بات؟'' وہ ہنسا۔

''مل جائے گی نوکری، ویسے بھی یہ بڑا شہر ہے یہاں نوکری اور چھوکری اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔''

''یار ہر جگہ اپلائی کیا ہے، کہیں ڈھنگ کی جاب ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو فوج سے نکالے گئے شخص کو اس لیے نوکری نہیں دیتے کہ ان کے خیال میں فوجی کریک ہوتے ہیں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''تم ایک کام کرو۔''

''کیا؟''

''تم اپنی ہی فیلڈ میں چلے جاؤ جہاں لڑائی بھڑائی والا کام ہو، کیا خیال ہے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوا۔

''یار تم ٹرینڈ کمانڈو ہو، شہر کے حالات تمہارے سامنے ہیں، تم ایسا کرو، سیکیورٹی ایجنسی بنا لو۔ اب تو کونے کونے میں ایسی ایجنسیز پائی جاتی ہیں اور گارڈ بھی وہ ایسے رکھتے ہیں جو اسلحہ کی نمائش کرتے ہیں، حقیقت میں انہیں گولی چلانا بھی نہیں آتی۔'' اس نے حقیقت بیان کی۔

''یار سیکیورٹی ایجنسی بنانے کے لیے سرمائے کی ضرورت ہو گی، میرے پاس اتنے پیسے نہیں۔'' وہ منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔

''فکر نہ کر، کام تو شروع کرتے ہیں۔ ایسا کر اخبار

www.urdusoftbooks.com

اٹھا۔''علی شیر نے ٹیبل پر پڑا اخبار اٹھایا۔عدیل دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی اس نے سر اٹھایا۔''ابویں پریشان ہو رہا ہے پاگل، یہ دیکھ۔'' اس نے ایک اشتہار سامنے لہرایا۔ ''باڈی گارڈ کی ضرورت ہے۔ پُرکشش تنخواہ۔'' اور اس کے ساتھ تفصیل درج تھی۔عدیل نے ایڈریس نوٹ کیا۔ ''اب کل اس جگہ جا اور دیکھ ذرا، کتنی ضرورت ہے وہاں تیرے جیسے لوگوں کی۔''علی شیر نے سر کھجایا۔

''اسے بھی آزما لیتے ہیں۔''

دوسرے دن وہ چار بجے اس ایڈریس پر جا پہنچا۔ مسافروں سے بھری بس میں وہ سارے راستے کھڑا ہو کر آیا تھا۔یہ ایک خوبصورت بنگلا تھا جس کے باہر تختی لگی ہوئی تھی۔

''رانا اشفاق،ایڈووکیٹ۔''

''اس وکیل کو کیا ضرورت ہے باڈی گارڈ کی؟'' اس نے خود سے پوچھا۔چوکیدار نے گیٹ پر اسے روکا۔

''جی فرمائیں؟''

''علی شیر نام ہے میرا، اشتہار دیکھا تھا اخبار میں باڈی گارڈ کے لیے۔''اس نے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''اچھا اچھا، پانچ منٹ ٹھہرو، صاحب لان میں آنے والے ہیں۔''

اس نے باہر پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔علی شیر بیٹھ گیا۔سوچ نے پھر دماغ کے دروازے پر دستک دی۔

''کسی بڑے باپ کی اولاد ہوگا ورنہ ایک وکیل کے پاس اتنا پیسہ؟''

کچھ دیر بعد اسے اندر بلایا گیا۔رانا اشفاق چالیس سے کچھ اوپر دکھائی دیتا تھا۔چہرے پر مسکراہٹ مگر آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی۔ علی شیر کو دیکھتے ہی وہ بڑبڑایا ''پرفیکٹ'' سبزے سے بھرے لان میں پلاسٹک کا ٹیبل پڑا تھا جس کے گرد اسی رنگ کی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔علی شیر، اشفاق کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔رسمی کلمات کے بعد اشفاق نے اس سے تفصیل مانگی جسے علی شیر نے بلا جھجک بتا دیا۔

''اسپیشل یونٹ سے کیوں نکالے گئے تھے تم؟'' آخر میں اس نے پوچھا۔

''سر، مسئلہ بن گیا تھا، لڑائی میں چوٹ لگی تھی جو مستقل لنگڑاہٹ دے گئی، اگرچہ زیادہ نہیں مگر آرمی اور اسپیشل یونٹ کے حساب سے یہ کافی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔واقعے کی تفصیل وہ پہلے بتا چکا تھا۔

''اسپیشل یونٹ میں ایسا ہوتا نہیں کیونکہ ڈسپلن کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے، تمہاری بدقسمتی ہے۔ خیر مجھے تمہارے جیسے نوجوان کی ضرورت ہے، فیس وغیرہ کے تمام معاملات سیکریٹری طے کرے گا،تم کل شام سے جوائن کرلو۔ یاد رکھنا گھر میں سیکیورٹی موجود ہونے کے باوجود تمہیں ہر لمحہ میرے ساتھ رہنا ہے۔''اس نے مزید ہدایات دیں جسے علی شیر نے خاموشی سے سن لیا۔

''سر ایک سوال؟''

''پوچھو......''

''آپ کی کسی سے دشمنی ہے؟ یا شہر کے حالات کی وجہ سے باڈی گارڈ کی ضرورت ہے؟''

''دونوں......'' وہ مسکرایا۔''یہ ملک اب شریف لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں رہا۔آئے دن کوئی دھمکی دے دیتا ہے تو کوئی کیس ہارنے کا کہتا ہے اس لیے مجھے ضرورت ہے سیکیورٹی کی۔'' اگرچہ ایک فوجی ہونے کے ناتے پاکستان کے خلاف کی گئی اس کی بات سخت تھی مگر علی شیر نے خود پہ کنٹرول رکھا۔

''میں کل سے جوائن کرلوں گا آپ کو۔'' وہ کھڑا ہوا اور رانا اشفاق سے ہاتھ ملا کر واپس چل دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کے وقت مخصوص یونیفارم پہنے وہ رانا اشفاق کے ساتھ کھڑا تھا۔یہ ایک پرائیویٹ اسکول تھا جس میں رانا اشفاق بطور مہمانِ خصوصی ایک تقریب میں شرکت کرنے آیا تھا''پیرنٹس ڈے۔'' آخر میں اسے اسٹیج پر بولنے کی دعوت دی گئی۔وہ اپنے مخصوص انداز میں چلتا ہوا اسٹیج پر پہنچا اور مسکرا کر بولا۔''گڈ ایوننگ ایوری ون۔'' ساتھ ہی اس نے گہری سانس لی اور شروع ہوگیا۔''جب میں یہاں آرہا تھا تب میں نے دیکھا کہ ایک سات سال کی عمر کا بچہ سڑک پر بھیک مانگتا پھر رہا تھا، مجھے دیکھ کر ہوا اتنا دکھ ہوا کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا،جس عمر میں اس کے ہاتھ میں کھلونے ہونے تھے اور اسے اے بی سی پڑھنا شروع کرنی تھی اس عمر میں وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھر رہا ہے، آپ سب کی طرح وہ بھی کسی کا بچہ ہے، اس کا بھی حق ہے پڑھنے کا۔ مجھے جب یہاں مہمانِ خصوصی کا دعوت نامہ ملا تب میں نے سوچا بجائے یہاں کے لوگوں کی تعریف کرنے کے، میں آپ سب لوگوں کو یہ احساس دلوا دوں کہ ہمارے معاشرے میں تعلیم کتنی ضروری ہے۔اس بچے کے ماں باپ کبھی پڑھے لکھے نہیں ہو سکتے،شعور کی کمی ہی ایسے بچوں کو جنم دیتی ہے، آج رانا اشفاق یہاں کھڑا ہے

تو اس کی وجہ اس کے ماں باپ ہیں۔ ماں باپ ہی ہیں جو ایک بچے کو قاتل، ڈاکو، چور کے بجائے ڈاکٹر، ٹیچر، انجینئر بناتے ہیں۔ آپ پر فرض ہے، اس وطن کا، اس مٹی کا، آپ کو اپنا مستقبل محفوظ بنانا ہے۔"

پانچ منٹ کی تقریر میں رانا اشفاق کی وطن سے محبت ظاہر ہو رہی تھی۔ جب وہ اسٹیج سے اُترا تب پورا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ واپسی پر گاڑی ایک سگنل پر رکی۔ وہ ایک معذور بچہ تھا جو پیر گھسیٹتا ہوا ان کے پاس آیا۔ "صاحب، صبح سے کھانا نہیں کھایا، کچھ دے دو، خدا کے نام پر۔" اور رانا اشفاق کے ڈرائیور نے اسے جھڑک دیا۔ علی شیر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ بچہ واپس نہیں گیا بلکہ پچھلی طرف آیا اور رانا اشفاق والی سائڈ سے کار کا شیشہ بجانے لگا۔ علی شیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رانا اشفاق نے اسے جھڑکا تھا مگر بچہ نہیں گیا۔ اچانک رانا اشفاق نے کار کا دروازہ کھولا اور ایک جھٹکے سے بچے کے منہ پر مارا "ایک بار کہا ناں، معاف کر۔ کتے، دفع ہو۔" اس کے ساتھ ہی سگنل کھل گیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ علی شیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بچے کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ سڑک پر گرا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک گھنٹا پہلے کی گئی رانا اشفاق کی تقریر گونج رہی تھی۔

☆☆☆

اپنے چیمبر میں بیٹھے رانا اشفاق کے سامنے اس وقت چودھری دلاور بیٹھے تھے۔ علی شیر پاس ہی ایکٹو کھڑا تھا۔
"رانا صاحب، اس کیس میں جان دکھائی نہیں دیتی، شامیر کو سزا ہو جاتی ہے۔" چودھری مایوسی سے کہہ رہا تھا۔
"چودھری صاحب، اتنی جلدی ہمت نہیں ہارتے، کیس میں جان ڈالنی پڑتی ہے۔" رانا آگے جھکا۔ "مخالف پارٹی کمزور ہے، تھوڑا دباؤ ڈالیں، مان جائے گی۔"
"نہیں مان رہی، وہ بڈھا کچھ زیادہ اچھل رہا ہے، کہتا ہے میرا بڑا بیٹا مر گیا، مستقبل کا سہارا تھا اور پتا نہیں کیا کیا بکواس کرتا رہتا ہے۔" چودھری جھنجلایا ہوا تھا۔ چودھری دلاور کے بیٹے شامیر کی گاڑی نے پچھلے دنوں ایک غریب مزدور کے بیٹے کو کچل دیا تھا۔ شامیر شراب کے نشے میں دھت تھا۔ پولیس پاس ہی موجود تھی اور وہ موقع پر گرفتار ہوا تھا۔ اس لیے امید کی جا سکتی تھی کہ اسے کم از کم دس سال کی سزا ہوتی۔ چودھری اپنے اکلوتے بیٹے کو جیل میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے بہترین وکیل کا بندوبست کیا۔ اشفاق نے ابتدائی پیشیوں سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کیس میں جان نہیں مگر وہ فیس بنانے کے لیے جان بوجھ کر مسئلہ بڑھا رہا تھا۔

"میں نے سنا ہے بڈھے کی ایک بیٹی ہے، خوبصورت ہے اور پڑھنے بھی جاتی ہے، کیا خیال ہے؟" علی شیر، اشفاق کی بات سن کر دنگ رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وکیل اس حد تک جا سکتا ہے۔
"میں نے بھی چھان بین کی ہے رانا صاحب، مگر اب ایسا کوئی مسئلہ بنا تو پولیس سیدھا میرے گھر آئے گی کیونکہ انہوں نے میرے خلاف کیس کیا ہوا ہے۔" چودھری پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔
"آپ نہیں کریں گے تو کوئی اور کر دے گا، کیس تو جیتنا ہے، رانا اشفاق کیس ہار جائے یہ کیسے ممکن ہے۔" اس کے لہجے میں غرور تھا۔ چودھری دلاور کے جاتے ہی اس نے فون اٹھایا۔ "فراز کو بھیجنا ذرا۔"

تھوڑی دیر بعد فراز سامنے موجود تھا۔ ہلکی شیو بڑھی ہوئی، چہرے پر زخم کا نشان اور درمیانے قد کے فراز کو دیکھ کر علی شیر کی حس نے الارم بجایا۔ "یہ اچھا بندہ نہیں ہو سکتا۔" فراز کو دیکھ کر یہی خیال اس کے دماغ میں آیا تھا۔
"فراز، ایک کام ہے تم سے۔"
"حکم کریں جناب۔" اس کے انداز میں فرمانبرداری تھی۔
"ایک ایڈریس نوٹ کرو، بیس بائیس سال کی ایک لڑکی ہے، اٹھا کر کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جانی ہے۔ کچھ دن رکھیں گے، پھر چھوڑ دیں گے۔" فراز کون تھا۔ وکلا کے ان چیمبرز میں اس کا کیا کام تھا، علی شیر لاعلم تھا مگر رانا اشفاق کی ہر حرکت اسے حیران کر رہی تھی۔ "تو یہ راز ہے رانا کی شاہانہ زندگی کا، کیس جیتنے کے لیے یہ ہر حد کراس کر سکتا ہے۔" اس نے کچھ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

دوسرے دن شام کے وقت رانا اشفاق نے بجائے گھر جانے کے ڈرائیور کو گاڑی شہر سے باہر لے جانے کا حکم دیا۔ وہ شہر سے تقریباً پانچ کلومیٹر کی دوری پر تھے۔ یہاں اردگرد آبادی کم تھی۔ سڑک پر بھی زیادہ رش نہیں تھا۔ گرمی کی شام تھی اور سورج اپنی تمام تپش لیے مغرب کی وادیوں میں گم ہو چکا تھا۔ اچانک ایک موٹر سائیکل نے انہیں کراس کیا اور تھوڑا آگے آ کر ان کے سامنے رک گئی۔ "سر یہ تو وہی لڑکا ہے۔" ڈرائیور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
"کون؟" اشفاق نے اسے نہیں دیکھا تھا۔
"جس سے پہلے بھی جھگڑا ہوا تھا آپ کا، عدالت میں اسے وکلا پارٹی نے کافی مارا تھا۔"

"اوہ، اچھا۔ اس کے باپ کو سزا دلوائی تھی میں نے مگر آج کیوں رستہ روک کے کھڑا ہے۔" اشفاق نیچے اترنے لگا۔
علی شیر بول پڑا۔ "سر، اس کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔ آپ رک جائیں اسے پاس آلینے دیں۔" موٹر سائیکل سوار اب نیچے اتر کر ان کی طرف آرہا تھا۔
"آج صاحب جی کے دیدار ہو گئے۔ کہاں جارہے ہیں وکیل صاحب۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ اشفاق نے شیشہ نیچے کیا۔
"تم سے مطلب؟ اور یہ رستہ کیوں روکا ہے، پچھلی مار بھول گیا غلام رسول؟" اشفاق ہنسا۔
"تمہیں جو خود پہ غرور ہے ناں، کسی دن یہی تمہیں لے ڈوبے گا اور سن، میرے بے گناہ باپ کو سزا دلوا کر، جھوٹی گواہی اور جھوٹے ثبوت دکھا کر تو نے جو کیا ہے اس کی سزا بھگتے گا تو، حرام کی کمائی ہے تیری۔" وہ ابل پڑا۔ علی شیر ایکٹو بیٹھا تھا۔
"ہاہاہا۔" اشفاق کا قہقہہ گونجا۔ "وکیل کی کمائی حرام کی نہیں ہوتی، ہمارا پیشہ ہے، یہ سب کرنا پڑتا ہے، ویسے میرا ارادہ تو تیرے باپ کو پندرہ بیس سال کے لیے اندر بھجوانے کا تھا مگر جج کو رحم آگیا۔" اس نے سامنے والے کو تاؤ دلایا۔
"تیری میں......" غلام رسول نے گالیاں دیتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر جو وہ کرنا چاہتا تھا، اس کی حسرت دل میں رہی۔ علی شیر تیزی سے نیچے اترا۔ جیب سے چاقو نکال کر غلام رسول نے، اشفاق کے بجائے علی شیر پر حملہ کر دیا۔ اس نے آرام سے وار بچایا اور گھوم کر دائیں ہاتھ کا پنچ اس کے منہ مارا۔ یہ ٹرینڈ فائٹر کا وار تھا۔ اس کے سامنے کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون ابل پڑا۔ اس نے چلاتے ہوئے دوبارہ وار کرنے کی کوشش کی لیکن یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ علی شیر نے ایک منٹ کے اندر ہی اسے دھنک کر رکھ دیا۔ وہ نیچے گرا کراہ رہا تھا۔
"چھوڑ اسے علی شیر، ابھی بچہ ہے، جذباتی ہو جاتا ہے، چل بیٹھ گاڑی میں۔" اشفاق نے علی شیر کے کندھے کو تھپتھپایا۔ سڑک پر پانچ چھ لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ علی شیر اور اشفاق گاڑی میں بیٹھ کر آگے روانہ ہو گئے۔ "مجھے خوشی ہوئی کہ میرا انتخاب درست نکلا۔" اشفاق نے مسرت بھرے لہجے میں اس کی تعریف کی۔
علی شیر کے ذہن پر بوجھ تھا۔ نجانے کیوں اسے لگا جیسے وہ آج ایک بے گناہ کو مار کر آیا ہے۔ شہر سے باہر آکر گاڑی ایک کچے رستے پر مڑ گئی۔ تھوڑا آگے جا کر علی شیر کو ایک گھر دکھائی دیا۔ یہ آبادی سے کافی ہٹ کر تھا۔ یہی ان کی منزل تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ اندر داخل ہوئے۔ سامنے فراز دکھائی دیا۔
"کام ہو گیا جناب۔" اس نے رانا اشفاق سے ہاتھ ملایا۔ کمرے میں چارپائی پر ایک سہمی ہوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا لباس عام تھا اور کندھے سے پھٹا ہوا تھا۔ بیس سال کی اس لڑکی کے چہرے پر معصومیت دکھائی دی۔
"مجھے گھر جانا ہے صاحب۔" وہ رانا اشفاق کی طرف دیکھ کر بولی۔ وہ معصوم بے خبر تھی کہ اسی کے حکم پر وہ یہاں ہے۔
"بھیج دیں گے، بھیج دیں گے۔ جلدی کس بات کی ہے۔ تیرے باپ کی اکڑ ٹوٹ لے پھر بھیج دیں گے۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "نمبر ملا اس کے باپ کا۔" فراز نے کال ملائی۔ کال ملتے ہی اشفاق نے سیل پکڑ لیا۔ "ہاں جناب، ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ آپ کی بیٹی اغوا ہو گئی ہے، افسوس ہوا سن کر، پہلے بیٹا گیا اور اب بیٹی کی عزت بھی خطرے میں ہے۔" لڑکی نے چلا کر باپ کو مخاطب کرنا چاہا لیکن فراز نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "یہ جو ضد ہوتی ہے ناں جناب، بڑی بری چیز ہے، کہیں کا نہیں چھوڑتی بندے کو۔" اس کے لہجے میں پوشیدہ دھمکی یقینا سامنے والا محسوس کر رہا تھا۔ "بڑے لوگ ہیں چودھری دلاور وغیرہ، آپ معاف کر دیں انہیں، مالی مدد بھی ملے گی اور عزت بھی، ورنہ یہ پولیس اور یہ عدالتیں تو ان کی مٹھی میں ہیں۔"
دو تین جملے مزید بول کر اس نے کال بند کر دی۔
تین دن بعد اگلی پیشی پر لڑکی کے باپ، عبداللہ نے کیس واپس لے لیا تھا۔ چودھری دلاور کا بیٹا رہا ہو گیا۔ چیمبر میں چودھری دلاور کے سامنے بیٹھے اشفاق کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ "میں نے کہا تھا ناں چودھری صاحب، جان ڈالنی پڑتی ہے کیس میں۔"
"آپ نے تو کمال کر دیا جناب۔" چودھری نے جیب سے چیک نکال کر اسے پکڑایا۔ یہ بڑی رقم تھی۔ اشفاق نے چیک دیکھتے ہی واپس پھینک دیا۔
"رقم آدھی ہے، سوری، میں نے کام کیا ہے بھیک نہیں مانگی آپ سے۔" اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔
"ارے وکیل صاحب، ناراض کیوں ہوتے ہیں، لائیں ڈبل کر دیتا ہوں۔" چودھری نے پیچھے کھڑے منشی سے چیک بک لی۔ ایک اور چیک سائن کر کے دے دیا۔
"لے جناب خوش ہو جائیں۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''شکریہ......'' اشفاق خوشگوار لہجے میں بولا۔
چودھری کے جاتے ہی اس نے سیل نکالا اور نمبر ملا کر کان سے لگا لیا۔ کال ریسیو ہوتے ہی بولا۔ ''ہاں فراز، کام ہو گیا؟''
''جی جناب، مکمل کر دیا۔''
''گڈ!'' جواب دے کر اس نے آنکھیں بند کیں اور کرسی سے ٹیک لگا لی۔

☆☆☆

منظر بیڈ روم کا تھا۔ رانا اشفاق کا بیڈ روم۔ کمرے میں موجود تمام سامان بکھرا پڑا تھا۔ وال کلاک زمین پر گرا پڑا تھا اور بیڈ شیٹ پر خون جم رہا تھا۔ آسیہ بیگم آج گھر پر نہیں تھی اور خوش قسمت تھی کیونکہ اسی وجہ سے اس کی جان بچ گئی تھی۔ رانا اشفاق کی گردن آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے کسی نے ذبح کیا ہے۔ گرا ہوا وال کلاک ٹھیک بارہ بج کر تین منٹ پر رکا ہوا تھا۔ کمرے کے باہر علی شیر بے ہوش پڑا تھا۔ چوکیدار بھی گہری نیند...... سو رہا تھا۔

رانا اشفاق کے بنگلے سے کافی دور فراز ایک فلیٹ میں مردہ پڑا تھا۔ اس کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔ شہر میں ایک ساتھ ہونے والی قتل کی ان وارداتوں میں کس کا ہاتھ ہے، کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں مگر دوسرے دن میڈیا پر ہنگامہ ضرور برپا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

''ہم......'' سہیل خان کے منہ سے نکلا۔ ''تو یہ تھی رانا اشفاق کی کہانی، پرفیکٹ کرائم، اس کے بعد تمہارا کہاں جانا ہوا؟'' علی شیر خاموش بیٹھا رہا۔
''اس کے بعد......'' اس نے کچھ سوچا۔ ''اس کے بعد، ایک سیاست داں کے پاس، جسے بس یہ پتا تھا میں فائٹر ہوں اور لڑ سکتا ہوں۔'' علی شیر مسکرایا۔

☆☆☆

پولیس کی سخت انویسٹی گیشن کے بعد وہ تھکا ہارا عدیل کے فلیٹ پر لوٹ آیا۔ اسے واپس آئے تین دن ہوئے تھے۔ عدیل نے ابھی تک اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ چوتھے دن جب وہ ناشتا کر رہا تھا تب عدیل نے پوچھا۔ ''تو اب مستقبل کے لیے کیا سوچا؟''
''کچھ نہیں، کہیں اور باڈی گارڈ کی نوکری تلاش کروں گا۔''
''ہوں، کہیں اشتہار وغیرہ دیکھو، ویسے ایک اور کام ہے میرے پاس...... اگر کرنا چاہو تو؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
''کیسا کام؟ ویسے مجھے لڑائی بھڑائی کے سوا کوئی خاص کام نہیں آتا۔'' وہ الجھ گیا۔
''یار میں جانتا ہوں، خیر میں تجھے بتانا چاہتا ہوں تیرے جیسے بہترین فائٹر کی ضرورت ہے ایک جگہ۔''
''سسپنس مت پھیلا سیدھی سیدھی بات کر۔'' وہ بیزاری سے بولا۔
''داراب خان کو جانتے ہو؟''
''ہاں، سیاست میں تھے پہلے، آج کل ذرا آرام فرما رہے ہیں مگر زوردار قسم کے بندے ہیں، کروڑوں کی جائداد کے مالک اور صوبے کے چند بااثر ترین افراد میں سے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''ہاں وہی داراب خان۔ اس کے فارم ہاؤس پر ہر سال عید کے دوسرے دن ایک فائٹ ہوتی ہے، اسٹریٹ فائٹرز کی لڑائی سمجھ لو۔ ہر فائٹر کو کافی بڑی رقم دی جاتی ہے۔ تم اگر لڑنا چاہو تو ضرور جاؤ اس سال، کچھ ہی دن باقی ہیں۔''
''یار یہ کوئی مستقل ذریعہ تو نہیں کمائی کا۔ پھر ہماری جان پہچان کہاں ہے اس جاگیردار سے جو ایسے منہ اٹھا کر جائیں گے اور لڑ کر واپس آ جائیں گے۔'' وہ جھنجلا گیا۔
''پاگل انسان، تجھے پیسے درکار ہیں اپنی سیکیورٹی ایجنسی بنانے کے لیے، وہاں لڑائی ہار بھی گیا تو اتنی رقم ہاتھ آئے گی کہ آرام سے تیرا کام ہو جائے گا۔''
''پر یار، اسٹریٹ فائٹرز کی لڑائی میں ایک ٹرینڈ بندے کا کیا کام؟'' اس نے دوبارہ سوال اٹھایا۔
''ہم وہاں یہ شو تھوڑی کریں گے کہ تم ٹرینڈ ہو؟ اور جان پہچان کی فکر نہ کر، ہمارے بینک میں اکاؤنٹ ہے اس کا، میں جانتا ہوں اسے اور وہ بھی مجھے جانتا ہے۔ اس کا سیکریٹری میرا اچھا دوست ہے۔'' اس نے ہاتھ تھپتھپایا۔
''تم تیار ہو تو میں بات کروں؟''
''چل کر، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' ایک ہفتے بعد عدیل نے اسے خوشخبری سنائی۔
''ہو گیا تیرا کام، کافی بڑا شو ہے اس بار۔ سیاست داں ہوں گے اور جوا بھی کروڑوں کے حساب سے لگے گا۔''
''یقین نہیں آتا یہ پاکستان ہے، یورپ جیسا ماحول بنایا ہوا ہے۔'' وہ افسوس سے سر ہلانے لگا۔
''ہاہاہا...... پاکستان تو ہم جیسے مڈل کلاس لوگوں کے لیے ہے، یہ سیاستداں اور یہ جاگیردار شروع سے لے کر اب

تک یورپ جیسا ماحول رکھتے ہیں، وہاں دیکھنا، شراب اور شباب کا انتظام یورپ سے بڑھ کر ہوگا۔‘‘ اس نے آنکھ دبائی۔

’’یہ سب تو ٹھیک، مجھے تھوڑی پریکٹس کی ضرورت ہے، کافی دنوں سے آرام میں ہوں۔‘‘ اس نے مسئلہ بیان کیا۔

’’اس کا بندوبست بھی کر لیتے ہیں شہزادے، بس ذرا اپنے یہ مسلز مضبوط کر لے۔‘‘ وہ ہنسا۔

دوسرے دن سے علی شیر نے قریب ہی ایک جم میں جانا شروع کر دیا۔ سات آٹھ دن جم کر پریکٹس کی۔ اور آخر وہ دن آ ہی گیا۔ عید عدیل کے ساتھ ہی منانے کے بعد وہ داراب خان کے فارم ہاؤس روانہ ہو گئے۔ شہر سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر ایک گاؤں کے پاس ہی یہ فارم ہاؤس تھا جو ان کی توقع سے زیادہ شاندار ثابت ہوا۔ سوئمنگ پول، انتہائی خوبصورتی سے تعمیر کیے گئے کمرے، ایک درختوں کی قطار اور لان میں کھلے خوبصورت پھول دیکھنے کے لائق تھے۔ فارم ہاؤس کے عقب میں ایک جنگلا لگا ہوا تھا جس کے پیچھے طرح طرح کے نایاب نسل کے ہرن اور خرگوش موجود تھے۔ خلافِ توقع یہاں رش زیادہ تھا۔ لمبی لمبی قطاروں میں آنے والے سیاستداں اور وڈیروں میں کئی ایم این اے، ایم پی اے اور وزیر شامل تھے جن کے پیچھے پھرنے والے سیکیورٹی گارڈز کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی۔ لوگ ابھی آرہے تھے۔ مقابلہ دوسرے دن ہونا تھا۔ فائٹر کی حیثیت سے علی شیر کو سب پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ داراب خان نے اس سے ہاتھ ملایا۔ پچپن سال کی عمر کا داراب ابھی جوان نظر آتا تھا۔ کنپٹی سے بال سفید تھے مگر جسم ان سفید بالوں کے برعکس مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ رات کا کھانا انہیں کمرے میں دیا گیا۔ ’’علی، میں نے پچھلے مقابلوں کی ویڈیوز دیکھی ہیں، خونی لڑائی ہوتی ہے۔‘‘ عدیل بولا رات کے بارہ بج چکے تھے مگر فارم ہاؤس پر دن کا سماں تھا۔ لوگ باہر گھوم پھر رہے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ علی شیر کمرے میں موجود کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ’’تو کیا ہوا؟ جب آ ہی گئے ہیں تو ڈرنا کیسا؟‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’پھر بھی یار، جان کا خطرہ ہے۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’پچھلے سال یہاں ایک فائٹر کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’اوہ......‘‘ اس نے ہونٹ سکیڑے۔ ’’مطلب فری اسٹائل فائٹ ہے۔ چل دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔‘‘ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا اور گہری سانس لے کر پوچھا۔ ’’ویسے یہ سارا کام غیر قانونی ہے؟‘‘

’’ہاہا...... ہا......‘‘ عدیل ہنس پڑا۔ ’’شہزادے، یہاں کیا قانون اور کیسا قانون، پولیس کے چند افسران خود یہاں موجود ہیں۔‘‘

’’یار فوج میں ہم سمجھتے تھے ہمیں صرف بیرونی دشمنوں سے خطرہ ہے مگر ہماری بہت بڑی غلط فہمی تھی یہ، رانا اشفاق کے بعد یہ داراب خان جیسے لوگ مل رہے ہیں، پورا معاشرہ اور سسٹم ہی خراب ہے۔‘‘ وہ تلخ ہو گیا۔ ’’یار یہاں نیچے سے لے کر اوپر تک سب ہی ایسے ہیں، کوئی اس پورے سسٹم کے خلاف جا ہی نہیں سکتا، ایماندار لوگوں کی کمی نہیں لیکن مقابلے میں رشوت خور اور سفارشی زیادہ ہیں۔‘‘

عدیل نے کہا۔ ’’خیر، یہ تو چلتا رہے گا، تم سو جاؤ کل فائٹ ہے، نیند پوری لو اور تازہ دم ہو جاؤ۔‘‘ وہ اٹھ کر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

دوسرے دن صبح انہیں وہ جگہ دکھائی گئی جہاں لڑائی ہونی تھی۔ یہ جگہ فارم ہاؤس کے عقب میں چار دیواری کے درمیان تقریباً ریسلنگ کے میدان کی طرز پر تعمیر کی گئی تھی۔ میدان کے چاروں طرف رسے لگے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ٹریننگ کے دوران اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کبھی اسے یوں پیسے کے لیے لڑنا پڑے گا۔ اس کے مقابلے سے پہلے تین مقابلے ہوئے۔ پہلے دو بالکل عام مقابلے تھے جس طرح سڑکوں پر گھومنے والے چھوٹے موٹے بدمعاش لڑتے ہیں۔ تیسرا مقابلہ شاندار تھا۔ دونوں فائٹرز تجربے کار تھے۔ آخر ایک کا بازو ٹوٹنے کے بعد یہ لڑائی انجام کو پہنچی۔ علی شیر دیکھ رہا تھا لڑائی کے دوران کوئی ریفری نہیں تھا۔ مقابلے کی ہار جیت کا فیصلہ صرف ہار مان لینے یا مقابل کی کوئی ہڈی توڑ دینے سے ہوتا تھا۔ چوتھے مقابلے کا اعلان ہوا۔ علی شیر کا مقابلہ دوسرے شہر سے آئے ’’ٹائیگر‘‘ سے تھا۔ ٹائیگر کا اصل نام کچھ اور تھا مگر اسٹریٹ فائٹنگ کی دنیا میں اسے ٹائیگر کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ جب وہ میدان میں آیا تو علی شیر نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ قد میں اس سے تھوڑا کم تھا مگر اس کا جسم زیادہ مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ اس کی حرکات سے لگ رہا تھا کہ وہ لڑائی کے گر جانتا ہے۔ علی شیر نے شرٹ اتاری اور میدان میں داخل ہو گیا۔ شور

سے کان کے پردے پھٹ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا اس کے مقابلے میں ٹائیگر پر لگنے والا جوا کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہ ایک مشہور نام تھا۔ داراب خان کی چیئر ان سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس کی آواز علی شیر کو سنائی دی۔ وہ ٹائیگر سے مخاطب تھا۔ ''زیادہ دیر مت لگانا، آج تجھ پہ لاکھوں لگا رکھے ہیں، تین چار منٹ میں باہر پھینک اس کو۔''

علی شیر نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ''فائٹ'' کی آواز آتے ہی دونوں پوزیشن میں آگئے۔ پہلا حملہ ٹائیگر نے کیا۔ اس نے گھوم کر دایاں پیر اس کے منہ پر مارنے کی کوشش کی مگر علی شیر جھکائی دے گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹائیگر ہوا میں اچھلا اور اس کا بایاں پیر حرکت میں آگیا۔ علی شیر اچھل کر پیچھے گرا۔ اسے سنبھلنے میں ایک دو سیکنڈ سے زیادہ کا وقت نہیں لگا۔ ٹائیگر نے اشارے سے اسے پاس بلایا۔ وہ فلموں سے کچھ زیادہ متاثر دکھائی دیتا تھا اور تکبر بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہی غرور اس کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ علی شیر تیزی سے اس کی جانب بھاگا۔ تھوڑے فاصلے سے ہوا میں اچھلا اور سر کی بھرپور ٹکر اس کی چوڑی چھاتی پر دے ماری۔ اس سارے کھیل میں علی شیر کی تیزی کمال کی تھی۔ ٹائیگر کو سنبھلنے میں دیر لگی۔ وہ سرخ چہرہ لیے چلاتا ہوا علی شیر کی جانب بڑھا مگر کوئی وار کرنا تو دور کی بات وہ اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ علی شیر نیچے جھکا اور گھوم کر اس کی کمر پکڑی۔ ہوا میں اچھال کر اس نے ٹائیگر کو کسی کھلونے کی طرح دور پھینکا۔ اب کی بار ٹائیگر کے حلق سے نکلنے والی چیخیں زیادہ خوفناک تھیں۔ وہ زمین پر گرا پڑا تھا جب علی شیر اس کے سر پر پہنچا اور بوٹ کی ضرب اس کے منہ پر ماری۔ خون ابل پڑا۔ تماشائی خاموش ہو چکے تھے۔ علی شیر نے دونوں ہاتھوں سے ٹائیگر کو تھام کر کندھوں پر لادلیا اور گھما کر رنگ سے باہر پھینک دیا۔ وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ علی شیر کی جیت کا اعلان ہو گیا۔

''وقت دیکھ لیں داراب صاحب، تین چار منٹ سے زیادہ نہیں لگا ہوگا۔'' وہ یہی کہتا ہوا باہر نکل آیا جہاں عدیل اس سے لپٹ گیا۔

''شہزادہ ہے تو، تیرا مقابلہ ہی نہیں۔'' یہ آخری لڑائی تھی جو اس رات ہوئی تھی۔ دونوں اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔ علی شیر پسینے سے شرابور تھا۔ کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک سے اسے آرام پہنچا۔ وہ صوفے پر لیٹ گیا۔

''یار میں نے تجھے پہلی بار لڑتے دیکھا ہے، ایکشن موویز کے ہیرو کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔'' عدیل بہت خوش دکھائی دیا۔

''میری ٹریننگ کا حصہ تھا یہ سب، کہاں ملک دشمنوں سے لڑنا اور کہاں یہ معمولی غنڈے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''داراب تیری وجہ سے لاکھوں ہارا ہے، بڑی خاص نظروں سے دیکھ رہا تھا تجھے۔''

''ہاں میں نے بھی نوٹ کیا ہے، خیر۔'' اس نے آنکھیں موندی۔ انہیں آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' عدیل نے پوچھا۔

''ہم ہیں داراب خان۔'' باہر داراب خان کی آواز سنتے ہی دونوں نے الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ علی شیر نے کندھے اچکا دیے۔ عدیل نے دروازہ کھولا۔

''داراب صاحب، آپ نے کیوں زحمت کی، ہمیں بلا لیا ہوتا۔'' اس نے خوشامدی لہجے میں داراب کو ویلکم کیا۔

''ارے ایسی کوئی بات نہیں۔'' داراب کے ساتھ ایک چوبیس سال کا نوجوان بھی کھڑا تھا۔ داراب خان اندر داخل ہوا۔

''یہ میرا بیٹا ہے شہیر خان۔'' اس نے نوجوان کا تعارف کروایا۔ علی شیر نے کھڑے ہو کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔ دونوں ایک ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ رسمی باتوں کے بعد داراب خان مقصد کی بات پر آیا۔

''علی شیر، مجھے تم اسٹریٹ فائٹر نہیں لگے۔ تم بالکل کسی ٹرینڈ فائٹر کی طرح لڑتے ہو اور مجھے تمہارا انداز بہت اچھا لگا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا اور قدرے توقف سے دوبارہ بولنے لگا۔ ''تم لڑائی کے دوران ایک پیر کا استعمال کم کرتے ہو۔ مجھے محسوس ہوا ہے، اس پیر میں کوئی پرابلم ہے کوئی انجری وغیرہ؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ علی شیر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

''جی ایک لڑائی کے دوران چوٹ لگی تھی۔''

''خیر۔ میرے ساتھ ساتھ شہیر بھی تمہاری لڑائی سے متاثر ہوا ہے اور یہ چاہتا ہے تم ہمارے ساتھ رہو۔ اس کے باڈی گارڈ بن کر۔'' اس نے آنے کا مقصد بیان کیا۔ ''تم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں۔ اگر یہ کام کرنا چاہو تو تمہیں مناسب سے بڑھ کر تنخواہ ملے گی اور ساتھ میں دیگر سہولیات بھی۔'' بات کے اختتام پر دونوں علی شیر کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میں سوچ کر بتاؤں گا۔'' اس کا جواب سن کر شہیر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے چہرے پر مایوسی دکھائی دی۔ شاید وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ علی شیر مان جائے گا۔

”ہمیں خوشی ہوگی اگر تم ہماری بات مانو گے تو۔“ داراب خان اٹھتے ہوئے بولا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ دروازہ بند کر کے عدیل اس کی جانب واپس آیا۔

”کیا خیال ہے شہزادے، آفر بُری نہیں ویسے۔“

”یار آفر بری نہیں مگر رانا اشفاق کی طرح یہ بھی نکلا تو؟ اور اس طرح منہ اٹھا کر باڈی گارڈ نہیں بنائیں گے، پہلے میرے بارے مکمل تفصیل جمع کریں گے اور بہت سی باتیں کھلیں گی۔“ اس کی بات میں سچائی تھی۔ عدیل کچھ سوچنے لگا۔

”ٹرائی مارنے میں کیا حرج ہے؟ دو تین ماہ کر لو پھر چھوڑ دینا اور لازمی نہیں جیسا تم سوچ رہے ہو ویسا ہی سب کچھ ہو۔“

”پھر کیسا ہوگا؟ تم خود سوچو، میں تو لگا سونے۔“ وہ اٹھ کر اپنے بستر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن دونوں داراب خان کے سامنے موجود تھے۔ چائے کا کپ میز پر پڑا تھا اور داراب خان کچھ سوچ رہا تھا۔ ”علی شیر۔“ اس نے سر اٹھایا۔ ”کیا فیصلہ کیا تم نے؟“

”جی میں تیار ہوں، شہیر صاحب کے ساتھ رہوں گا۔“ عدیل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کل رات تک تو وہ بالکل نہیں مان رہا تھا۔

”تم نے پہلے یہ شو کیوں نہیں کیا کہ تم ٹرینڈ ہو؟ فوج سے نکالے ہوئے ہو اور پچھلے دنوں قتل ہونے والے رانا اشفاق کے باڈی گارڈ تھے؟“ اب چونکنے کی باری دونوں کی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ داراب خان معلومات حاصل کر لے گا مگر اتنی جلدی، یہ اندازہ نہ تھا۔

”میں فائٹ میں حصہ لینا چاہتا تھا اس لیے یہ سب کچھ چھپانا ضروری تھا۔“ اس نے سچ بتا دیا۔

”ہم......“ داراب کچھ سوچنے لگا۔ ”بہرحال، شہیر تمہیں پسند کرنے لگا ہے، اس لیے تم آج سے اس کے باڈی گارڈ ہو بلکہ یوں سمجھ لو، تم اس کے رائٹ ہینڈ ہو اور میری بات غور سے سن لو، سمجھ لو۔ شہیر خان کے ہر حکم کی تعمیل تمہارا فرض ہے چاہے وہ جو کہے جب کہے۔“ اس کی بات سن کر علی شیر نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولا۔

”جی سر ایسا ہی ہوگا۔“

”اب تم جا سکتے ہو۔ شام تک تمہیں تمام ضروری سامان مل جائے گا۔“ اس کا اشارہ ہتھیار اور لباس کے بارے میں تھا۔ کمرے میں واپس آ کر عدیل نے کہا۔

”یہ فیصلہ کیوں کیا؟ کل تک تو تم مان ہی نہیں رہے تھے؟“

”بس یونہی۔ دل کر رہا تھا۔“ اس نے کا جواب واضح نہیں تھا۔ عدیل نے اسے گھورا۔

”مرضی تیری، میں تو آج واپس جا رہا ہوں۔“ ناشتے کے بعد عدیل نے اپنا سامان باندھا اور واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے علی شیر نے انعام میں ملنے والی رقم میں سے کچھ حصہ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا۔ شام کے وقت اس کے کمرے میں شہیر کی آمد ہوئی۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار دکھائی دیتا تھا۔

”تم ریڈی ہو تو باہر آؤ ہمیں کہیں جانا ہے، سوچا تمہیں بھی ساتھ لیتے چلیں۔“

”جی ریڈی ہوں۔“ وہ کھڑا ہوا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کار تک آئے۔ نئے ماڈل کی اس مہنگی کار کا رخ شہر کی طرف تھا۔ شہر میں ان کی منزل ایک فلیٹ تھا جہاں پر شہیر اپنے دوست کے پاس رات گیارہ بجے تک بیٹھا رہا۔ گیارہ بجتے ہی دوست کو لے کر وہ ایک بنگلے پر پہنچا۔ کار سے اترتے ہی شہیر نے کہا۔ ”علی شیر تم بھی میرے ساتھ آؤ گے۔“ وہ سر ہلا کر پیچھے چل پڑا۔ شہیر کے دوست کا نام احتشام تھا۔ اس نے ناپسندیدہ نظروں سے علی شیر کی طرف دیکھا۔ ”شہیر، اسے ساتھ لیے پھرنے کی کیا ضرورت ہے، تجھے کس سے خطرہ ہے؟“

”یہ تو بس ویسے ہی۔“ شہیر نے آنکھ دبائی۔ ”داراب خان کے بیٹے کے ساتھ باڈی گارڈ نہ ہوگا تو پھر کس کے ساتھ ہوگا۔“

بنگلے کے اندر کمرے میں درمیانی عمر کی ایک عورت موجود تھی۔ اس نے جدید تراش خراش کا ڈریس پہن رکھا تھا۔ ”آئیں آئیں شہیر صاحب، کافی دنوں بعد آنا ہوا۔“ وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس آئی۔

”ہاں بس کچھ مصروفیت تھی۔“ شہیر...ٹھاٹ سے صوفے پر براجمان ہوا۔

”سنا ہے کچھ نیا مال آیا ہے؟“

”ہاں، آیا تو ہے مگر جناب کی پسند بہت اونچی ہوتی ہے، آپ کو پسند آئے گا بھی یا نہیں؟“ عورت خالص بازاری انداز میں بات کر رہی تھی۔

"دکھائیں تو سہی۔" احتشام بے صبری سے بولا۔

"ابھی لائی۔" وہ اٹھ کر اندر گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی چار لڑکیوں کے ساتھ ہوئی۔ ان سب کی عمر بیس سے چوبیس سال کے درمیان تھی۔ احتشام نے دلچسپی سے سب کو دیکھا۔ البتہ شہیر نے پہلی نظر کے بعد دوبارہ انہیں نہیں دیکھا تھا۔

"لگتا ہے شہیر صاحب کے دل کو نہیں چھو رہا کوئی۔" عورت نے بھانپ لیا تھا۔

"عشق کے بیماروں کا یہی حال ہوتا ہے۔" احتشام نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ شہیر نے اسے گھورا۔

"یہاں عشق کا کیا ذکر۔" یہ کہہ کر شہیر اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر چل پڑا۔ علی شیر اس کے پیچھے تھا۔ احتشام نے اسے پکارا مگر وہ نہیں رکا۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر وہ ایک سیکنڈ کے لیے رکا۔ احتشام بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

"کیا کمی ہے ان لڑکیوں میں؟ رات گزارنی ہے تو ایک سے بڑھ کر ایک ہے پھر کیوں کر رہا ہے ایسا۔" وہ قریب آ کر پھٹ پڑا۔

"احتشام میرا موڈ اب ایسے کاموں کے لیے بالکل نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے موڈ؟ پہلے بھی تو ہماری راتیں یہیں گزرتی تھیں، اب کیا انوکھا ہو گیا؟ وہ یونیورسٹی والی لڑکی ہم جیسوں کو پسند نہیں کرتی، تو سمجھتا کیوں نہیں اس بات کو۔" احتشام کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"اب یہاں حسنہ کا ذکر کہاں سے آ گیا؟ تجھے مسئلہ کیا ہے احتشام، میرا دل نہیں کر رہا ہے تو مجبور کیوں کر رہا ہے۔" ... وہ جھنجلائے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے تیرا دل کن باتوں کے لیے کر رہا ہے، جا بول اپنے باپ سے، لے جائے گا اس پولیس والے کے گھر تیرا رشتہ مجنوں کی اولاد۔"

"احتشام تم حد کراس کر رہے ہو۔" اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

"مجھے نہیں پتا میں حد کراس کر رہا ہوں یا نہیں لیکن کل حسنہ کو اپنے فلیٹ پر لے آؤں گا اور وہاں تو اس کے ساتھ اپنی مرضی کرے گا۔ جسے جو کرنا ہے کر لے۔ تم ڈرتے ہو گے مگر میں اس کے باپ سے نہیں ڈرتا۔" احتشام گیٹ کی جانب بڑھا۔ شہیر نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ میں ڈرتا نہیں مگر حسنہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گا۔" دونوں کی... بحث بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر شہیر اسے گھسیٹ کر کار تک لے آیا اور وہ فلیٹ پر واپس آ گئے۔ فلیٹ میں دو گھنٹے دونوں کے درمیان خوب بحث ہوئی۔ آخر کسی نتیجے پر پہنچ کر شہیر وہاں سے اٹھا تھا۔ ان کی واپسی تین بجے کے قریب ہوئی۔ واپسی کا سفر بالکل خاموشی سے طے ہوا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد شہیر حویلی کے ایک کمرے میں داراب کے سامنے موجود تھا۔ علی شیر کمرے کے باہر تھا مگر اس کے کانوں میں داراب کی آواز گونج رہی تھی۔ "شہیر خان، تم نے اس لڑکی کو کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"بابا، میں اس سے محبت کرتا ہوں، جہاں ہے محفوظ ہے، کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا اسے۔" شہیر کی آواز مدھم تھی مگر اس کی بات پوری طرح سمجھ آ رہی تھی۔

"دکھ اس بات کا نہیں تم نے ایسی حرکت کی، دکھ تو اس بات کا ہے تم نے ہمیں بتایا تک نہیں۔ وہ پولیس والے کی بیٹی ہے۔ ایسی حرکت کرنے سے پہلے مجھے بتایا تو ہوتا، میں خود اسے تمہارے پیروں میں لا پھینکتا۔" آواز دوبارہ گونجی۔

"بابا احتشام نے پلاننگ کی تھی۔ میں نے اپنے جذبات حسنہ کے سامنے بیان کیے مگر اس نے قدر نہیں کی، الٹا میرے منہ پر تھوک دیا۔"

"یونیورسٹی میں کسے پتا ہے اس بات کا؟" داراب خان نے پوچھا۔

"کسی کو نہیں سوائے احتشام کے۔ حسنہ ابھی اس کے فلیٹ پر ہے، میں نے فیصلہ کیا ہے اس سے نکاح کروں گا۔"

علی شیر کا خیال تھا شہیر کی بات سن کر داراب اسے سختی سے منع کرے گا اور حسنہ کو چھوڑ دینے کا حکم دے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ داراب جب بولا تو علی شیر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ ایک باپ تھا جو اپنے بیٹے کو ایسی نصیحت کر رہا تھا۔

"شہیر، ایسی دو ٹکے کی لڑکی کو ہماری بہو بنانے کی ضرورت نہیں، کچھ دن استعمال کرو اور پھینک دو، اس پولیس والے کو میں دیکھ لوں گا۔"

"مگر بابا میں اس سے۔" شہیر کی بات مکمل ہونے سے پہلے داراب کی آواز گونجی۔

"تم مرد ہو شہیر، مرد ایک عورت کے پیچھے پاگل ہوتے اچھے نہیں لگتے۔ ٹھیک ہے وہ تمہیں پسند آئی۔ حاصل کرو اور پھینک دو، یہ عشق وشق اور محبت کی باتیں سنانے کی ضرورت نہیں۔ عقل سے کام لو۔" کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے شہیر قائل ہو گیا۔ دس منٹ بعد وہ

کمرے سے باہر نکلا تو ریلیکس تھا۔
''علی شیر۔'' اس نے اسے آواز دی۔
''یس سر!''
''بابا نے تمہیں یہ تو بتایا ہوگا کہ ہمارے کسی بھی حکم سے انکار نہیں کرنا۔'' اس کا لہجہ علی شیر کو سخت ناگوار گزرا مگر وہ اس وقت اس کا ملازم تھا۔
''جی سر، میں پوری کوشش کروں گا آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کی۔''
''آج ایک کام کرنا ہے، ہوسکتا ہے تم پسند نہ کرو مگر تمہیں کرنا ہوگا۔''
''میں کوشش کروں گا سر۔''
''کوشش نہیں کرنی، کرنا ہے تمہیں۔ چلو میرے ساتھ......'' ان کی منزل آج پھر احتشام کا فلیٹ تھا مگر آج یہاں ایک اور فرد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ حمنہ جو بیڈ پر پڑی سسک رہی تھی۔ علی شیر دروازے کے باہر رک گیا۔ شہیر اندر داخل ہوا۔
''مجھے یہاں کیوں لائے ہو شہیر؟'' حمنہ کی آواز گونجی۔
''میں تمہیں پسند کرتا تھا حمنہ، اور اس بات کا اظہار بھی کیا مگر تم نے میرے منہ پر تھوک دیا۔'' شہیر گرجا۔
''ہاں ہاں، تھوک دیا۔ اب بھی تھوکوں گی۔ تم کتے ہو ذلیل ہو۔ یونیورسٹی میں اس سے پہلے کتنی ہی لڑکیوں کو ذلیل کر چکے ہو۔ تمہارے اور احتشام کی وجہ سے صفیہ نے خودکشی کی تھی، تم قاتل ہو۔'' وہ چیخ رہی تھی۔
''چیخ مت۔'' زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تھا۔ شہیر کے منہ سے گالیاں نکلنے لگیں۔
''میرے پاپا چھوڑیں گے نہیں تمہیں، شہیر، تباہ کر دیں گے تمہارے خاندان کو۔''
''دھمکی کس کو دیتی ہے۔'' شہیر نے اسے جکڑ لیا۔ اور وہ بے بس ہوگئی۔ اس کی دبی دبی سسکیاں علی شیر کے دل کو ٹکڑوں میں تقسیم کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد شہیر نے علی شیر کو اندر بلایا۔ حمنہ اوندھی پڑی تھی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا ناں علی شیر، ایک کام کرنا ہے تمہیں میرا۔''
''جی سر۔'' اس نے سر جھکایا۔
''یہ آج رات کے لیے تمہاری ہے۔ مزے کرو۔ میرے منہ پر تھوکنے کی سزا اسے ملنی چاہیے۔'' شہیر کے لہجے میں سفاکی تھی۔ علی شیر لرز کر رہ گیا۔
''سوری سر، میں یہ نہیں کر سکتا۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اسی لمحے احتشام اندر داخل ہوا۔
''کر لیا عیش، اب اس حرافہ کو حوالے کر دے علی شیر کے۔''
''یہ انکار کر رہا ہے۔'' شہیر غصے میں تھا۔
''اوئے تیری تو۔'' احتشام اس کی جانب بڑھا۔ اسی لمحے حمنہ کی ہچکی سنائی دی۔ وہ جنون کی حالت میں اپنے دوپٹے سے اپنی ہی گردن دبا رہی تھی۔ وہ تینوں اس کی جانب لپکے مگر دیر ہو چکی تھی۔ حمنہ تڑپی اور عزت کے ساتھ ساتھ اس کی جان بھی چلی گئی۔
اچانک کمرے میں طوفان آگیا۔ احتشام اور شہیر سمجھ نہیں سکے کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ علی شیر کا ہاتھ احتشام کی گردن پر پڑا۔ اس نے اسے اٹھا کر پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ شہیر نے بھاگنا چاہا مگر وہ اس سے چار گنا تیز بھی ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا۔ علی شیر نے ٹانگ اڑا کر اسے نیچے گرا لیا اور مارنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد فلیٹ میں تین لاشیں پڑی تھیں۔ احتشام، شہیر اور حمنہ۔ شہیر کی گردن بالکل ایسے کٹی ہوئی تھی جیسے کچھ دن پہلے رانا اشفاق کی کاٹی گئی تھی۔ مگر اب کی بار پولیس نے قاتل کو گرفتار کر لیا تھا۔ وہ شاید حمنہ کو بازیاب کروانے فلیٹ پر آئے تھے مگر یہاں انہیں قاتل مل گیا وہ بھی تین افراد کا۔ رانا اشفاق کے قتل کا معما بھی حل ہو گیا تھا۔ علی شیر پکڑا جا چکا تھا مگر اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہا، نہ اعتراف کیا۔ بس خاموشی سے سب ہوتا دیکھتا رہا۔ آج وہ پھانسی کا مجرم بنا سہیل خان کے سامنے موجود تھا۔
ساری کہانی سننے کے بعد سہیل خان نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''اشفاق کو قتل کرنے کی وجہ؟''
''اس نے مزدور کی لڑکی کو قتل کروا دیا تھا۔ اس لیے میں نے فراز اور اسے دونوں کو مار دیا۔ لڑکی بے قصور تھی اور پھر مزدور نے کیس بھی واپس لے لیا تھا۔'' علی شیر عام سے انداز میں بات کر رہا تھا۔
''مگر اس رات تو تم بے ہوش پائے گئے تھے۔ تمہارے سر پر پیچھے سے کسی نے وار کیا تھا۔'' سہیل حیران ہوا۔
''وہ ایسے۔'' علی شیر نے ہولے سے اپنے سر کا پچھلا حصہ دیوار سے ٹکرایا اور ہنس پڑا۔ ''یہ معمولی کام تو ٹریننگ کا حصہ تھے۔''
''اب اپنی دوسری اور آخری شرط بتاؤ۔'' سہیل نے

کہا اور علی شیر کا جواب سن کر وہ حیرت سے بولا۔ ''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ اور کیوں کرنا چاہتے ہو؟''

''آخری کام باقی ہے۔ شہیر کا باپ داراب زندہ ہے۔'' علی شیر نے جواب دیا۔

''اس کا قصور؟''

''حسنہ کے قتل کا مرکزی کردار وہی ہے۔ شہیر نے تو صرف اپنا کردار ادا کیا تھا۔'' علی شیر کے لہجے میں نفرت تھی۔

''اس کے بعد شاید میری نوکری ختم ہو جائے۔'' سہیل خان نے گہری سانس لی۔

''ایسی نوکری کا کیا فائدہ جو مجرم کو سزا نہ دے سکے۔'' وہ سنجیدہ تھا مگر نجانے کیوں سہیل کو محسوس ہوا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔

''شرط پوری ہوگی یا نہیں؟'' علی شیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کچھ دیر بعد اس کی ہتھکڑی کھل چکی تھی۔ سہیل کی گردن اس کے بازو میں جکڑی ہوئی تھی اور دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔

''اگر کسی نے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔'' اس کے لہجے کی سفاکیت نے سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سہیل کی گاڑی پارکنگ میں تھی۔ علی شیر کامیاب ہو چکا تھا۔ دوسرے دن کے اخباروں میں خبر موجود تھی۔

''داراب خان کے اکلوتے بیٹے شہیر خان سمیت تین افراد کا قاتل جیل سے فرار۔'' سہیل خان کے دو دن برے گزرے کیونکہ علی شیر اس کی وجہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ اب سہیل خان کے پاس جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ علی شیر کی گرفتاری۔ زندہ یا مردہ۔ وہ شہیر خان کا قاتل تھا۔ شہیر خان، داراب خان کا اکلوتا بیٹا۔

☆☆☆

شہر سے ہٹ کا غریبوں کی اس بستی میں شہر سے کم ہی لوگ آتے تھے۔ اس وقت اسی بستی کے ایک کچے مکان میں علی شیر کے سامنے عدیل موجود تھا۔

''اب کیا فیصلہ کیا تم نے؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''فیصلہ بتا چکا ہوں تمہیں۔ داراب کی موت میری زندگی کا مقصد ہے، اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اس نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔

''دیکھ علی، تم نے اس معاشرے کو سدھارنے کا ٹھیکا نہیں لے رکھا، پھر تمہیں سزائے موت سنائی گئی تھی، پولیس تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دے گی۔''

''یہی تو معاشرے کے بگاڑ کی بڑی وجہ ہے۔ ہم معجزوں کے انتظار میں اپنا فرض بھی بھول جاتے ہیں۔ کون سنوارے گا اس معاشرے کو۔ بھائی میرے میں نے ٹریننگ لی تھی ملک دشمنوں سے لڑنے کی اور میں لڑ رہا ہوں۔ رہی بات پولیس کی تو مار دے گولی، مجھے پروا نہیں۔''

''مجھے تیرا یہ لیکچر نہیں سننا، میری بات مان، بھاگ جا یہاں سے۔ میں انتظام کرتا ہوں، غیر قانونی طور پر کسی دوسرے ملک کی طرف نکل جانا۔'' عدیل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''عدیل، داراب خان مرے گا تو میں کہیں جاؤں گا ورنہ نہیں۔'' وہ ضد پر اڑ گیا۔

''پر کیسے مارے گا اسے؟ سخت سیکیورٹی میں رہتا ہے وہ۔''

''میں کرلوں گا کچھ، تجھے جس کام کے لیے بلایا ہے وہ بتا مجھے؟'' علی شیر نے پاس پڑی نوٹ بک اور پنسل اٹھائی۔ عدیل نے بولنا شروع کر دیا۔

''داراب خان اس بار الیکشن میں ایک پارٹی کو سپورٹ کر رہا ہے اور لگتا ہے وہی جیتے گی کیونکہ داراب کا اثر اس حلقے کی عوام پر بہت زیادہ ہے۔ اس ہفتے کی شام کو ایک پارٹی لیڈر سے ملنے وہ ایک ہوٹل میں جائے گا۔ یہ اطلاع پکی ہے اور اس کے سیکریٹری سے حاصل ہوئی ہے۔'' علی شیر نے نوٹ بک پر کچھ لکھا۔ ''اور سن، یہ ملاقات اس ہوٹل میں ہوگی جو اسی لیڈر کی ملکیت ہے۔ سیکیورٹی کے انتظام سخت ہیں۔'' عدیل نے مزید تفصیل بتا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اب بتا تیرے پاس کوئی پلان ہے؟''

''جس ہوٹل کا تم بتا رہے ہو ذرا اس کی لوکیشن نکالو۔'' علی شیر کے کہنے پر عدیل نے اپنا سیل نکالا۔ تھوڑی چھیڑ خانی کے بعد ہوٹل کی تفصیل سامنے لے آیا۔

''ہم، ہوٹل کے سامنے دو منزلہ عمارت کی چھت سے چلائی گئی گولی، کار سے اترنے والے داراب خان کے سر میں لگ سکتی ہے۔''

''ہاں مگر اس کے لیے تمہارے پاس ایک عدد اسنائپر رائفل کا ہونا ضروری ہے پھر رائفل کے ساتھ تجھے بلڈنگ میں کون داخل ہونے دے گا؟'' عدیل نے اعتراض اٹھایا۔

''ٹریننگ کے دوران میں ایسے بہت سے کام سیکھ چکا ہوں۔ پی ایس آر ناکٹی اس کام کے لیے بہترین ہے اور

میں وہ حاصل کر چکا ہوں۔ اس کی رینج ہزار میٹر تک ہے۔ بلڈنگ سے ہوٹل کے گیٹ تک کا فاصلہ ہوگا پانچ سو میٹر کے لگ بھگ، اس رائفل کی خاص بات یہ ہے کہ ٹکڑوں میں بھی تقسیم ہوسکتی ہے۔'' علی شیر اٹھ کر اندر گیا اور ایک بیگ اٹھا لایا۔ اس میں رائفل کا تمام سامان تھا۔

''اس کا بندوبست کہاں سے کیا؟'' عدیل نے پوچھا۔

''مجھے خبر تھی اس کام کے لیے ایسی ہی کسی چیز کی ضرورت پڑے گی اس لیے کسی نہ کسی طرح انتظام کر ہی لیا۔'' علی شیر مسکرایا۔ ''چلو باقی کا کام تمہاری پلاننگ پر ہے۔ میں تمہیں کل اس کے ہوٹل جانے کا وقت بتا دوں گا اور سامنے والی بلڈنگ کی تفصیل بھی۔'' عدیل کھڑا ہوا۔ ''اور ہاں، وہاں تمہارے بچنے کے چانسز ہیں۔ داراب کو مار کر یہیں آجانا پھر تمہارے پاکستان سے فرار کا انتظام کریں گے۔'' دونوں گلے ملے۔ عدیل نم آنکھوں سے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

فلیٹ میں کسی کی موجودگی کا احساس اسے اندر داخل ہوتے ہی ہوگیا تھا۔ عدیل تیزی سے پیچھے ہٹا اور سوئچ پر ہاتھ مارا۔ روشنی ہوتے ہی صوفے پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر حیران ہوا۔ ''آ......آپ یہاں؟''

''ہاں، ضروری کام ہے تم سے۔'' سامنے والے شخص کی آواز میں رعب تھا۔ عدیل مرعوب ہوا۔

''جج جی سر، کیسا کام؟''

''کیا پلان ہے اس کا؟'' عدیل بات کا مطلب جانتا تھا مگر جواب دینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

''کس کا؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو عدیل، جواب دو ورنہ تمہاری فیملی مشکل میں پڑسکتی ہے۔''

''سس......سر۔''

''میرے پاس اتنا وقت نہیں۔'' سامنے والا شخص چلایا۔ ''جلدی بھونک ورنہ ابھی تیری ماں اور بہن کو اٹھوا لوں گا۔'' عدیل پسینے میں تر ہو چکا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے ساری پلاننگ بتادی۔

''تو ہفتے کی شام کو محترم علی شیر، بلڈنگ کی چھت سے فائر کریں گے۔'' سامنے والے نے سر ہلایا۔ ''اوکے، گڈ، اسے ساری تفصیل بھیج دینا لیکن اگر اس ملاقات کی بھنک بھی اسے پڑی تو عدیل اس کی جگہ تم مروگے۔'' سامنے والا شخص اٹھ کر باہر چلا گیا۔ عدیل بے دم صوفے پر گر گیا۔

☆☆☆

ہفتے کی شام شہر میں رونق زیادہ تھی۔ ویک اینڈ تھا اور لوگ سڑکوں پر انجوائے کر رہے تھے۔ ٹیکسی سے اتر کر علی شیر بلڈنگ کی جانب بڑھا۔ سیاہ رنگ کا چشمہ اس کی آنکھوں پر تھا۔ موسم کی مناسبت سے اس کے لباس کا انتخاب شاندار تھا۔ ہاتھ میں پکڑے بریف کیس کے ساتھ وہ کوئی امیر بزنس مین لگتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی جو بلڈنگ کے سیکیورٹی گارڈ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ آسانی سے دوسری منزل پر آگیا۔ بلڈنگ کی چھت پر پانی والی ٹینکی کے ساتھ چھپنے کی جگہ تھی۔ کسی نے علی شیر کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے بریف کیس میں سے رائفل کے ٹکڑے نکال کر جوڑے اور انتظار کرنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد داراب خان کی گاڑیوں کا قافلہ ہوٹل کے سامنے رکا۔ یہاں سے ہوٹل کا گیٹ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ داراب خان نیچے اترا۔ آج اس کی سیکیورٹی معمول سے زیادہ تھی کیونکہ اس کے بیٹے کا قاتل آزاد گھوم رہا تھا۔ علی شیر نے نشانہ باندھا۔ اس کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔ داراب گیٹ پر بس ایک یا دو سیکنڈ کے لیے رکا تھا اور یہ وقت علی شیر کے لیے کافی تھا۔ ''دھائیں'' کی آواز گونجی۔ گولی گردن سے تھوڑا اوپر لگی تھی۔ داراب نیچے گر گیا۔ گرنے سے پہلے وہ مر چکا تھا۔ علی شیر نے جلدی جلدی رائفل کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ ابھی وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک اور فائر ہوا۔ اس بار یہ ریوالور کا فائر تھا جو علی شیر کے کندھے پر لگا۔ وہ تڑپ کر نیچے گرا۔ دوسرا فائر اس کے بائیں کندھے میں انگارے بھر گیا۔ سامنے موجود شخص کو دیکھ کر اس کو اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں رہا تھا۔

''کک......کیوں؟'' اس کے منہ سے بس اتنا نکلا۔

''تم نے میرا بدلہ لیا علی شیر۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے مگر مجھے خود کو بچانا بھی ہے، حمنہ میری بیٹی تھی۔ ظالموں نے اسے مار دیا۔ میں بے بس تھا کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ داراب خان طاقتور تھا۔ تم نے شہیر اور احتشام کو تو مار دیا مگر داراب بچ گیا۔ اسے مارنے کے لیے تمہارا جیل سے باہر آنا ضروری تھا۔ تم سے ملنا، تمہیں فرار کروانا۔ سب میرا پلان تھا اور تمہارے اس پلان کی خبر مجھے عدیل سے مل گئی۔ تمہیں مار کر افسوس تو ہو رہا ہے مگر مجبوری ہے۔'' سہیل خان نے آخری گولی اس کے سر میں ماری۔ علی شیر کا قصہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے نیچے اترنے لگا۔

جس طرح خشک لکڑی آگ کی غذا ہے... اسی طرح انسانی جذبات کی شدت صلاحیت کو ہوا دیتی ہے... وہ چاہے محبت کے جذبات ہوں یا نفرت کے... زندگی میٹھی مسکراہٹوں اور تلخ آنسوئوں کا مجموعہ ہے... کبھی کسی کسی پل خوشیوں کی زیادتی ہوتی ہے تو کبھی اذیت و غمگین پل طویل تر ہوتے چلے جاتے ہیں... محبت اور نفرت کے ایسے ہی مدّوجزر میں ڈوبتے ابھرتے نوجوان کی دل گداز داستاں... جب جب وہ محبت کا متقاضی ہوا... اسے صرف نفرت کے جزیرے ملتے رہے... اس تلاطم خیزی نے اسے وقت سے پہلے سمجھ دار بنا دیا... سوچوں اور الجھنوں نے ایسے ایسے راستے سمجھا دیے جن پر وہ چلنا نہیں چاہتا تھا... سطر سطر تجسس میں لپٹی کہانی کے پیچ و خم...

باصلاحیت...... باوفا...... مسیحا کو پیش آنے والے بے وفا لمحات کی بے وفائی......

میرا ایک بہت ہی عجیب سا مشغلہ ہے، میرے لیے تو خیر یہ مشغلہ عجیب نہیں، بلکہ خوشی اور اطمینان حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، البتہ دوسروں کے لیے میرا یہ شوق بہت عجیب ہے۔ یہ شوق ہے دوسروں کی زندگیاں بدل دینے کا۔ مدثر کی زندگی بھی میں نے ہی بدلی تھی۔ جب وہ میرے پاس آیا تھا، بہت سے مسائل سے دوچار تھا۔ ان مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ مفلسی تھا۔ جس کا اس کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ میرے پاس اس کے تمام مسائل کا حل تھا اس لیے اب ہم دونوں میں خوب نبھ رہی تھی۔

مدثر سے میری پہلی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ وہ اس پارٹی میں ویٹر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس کی عمر انیس بیس سال ہی لگ رہی تھی۔ پہلی نظر میں جانے کیوں وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ بہت ذمے داری سے اپنا کام کر رہا تھا۔ میں اس کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اس کا چہرہ اتنا سپاٹ تھا جیسے پتھر کی سل پر کسی نے نقوش تراش دیے ہوں، شاید اسی تاثر نے مجھے اس کی جانب متوجہ کیا تھا۔

جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے اسے روک کر اس کی ٹرے سے ایک مشروب اٹھایا۔ اس لمحے میری نظریں اس سے ملی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں، دور کہیں گہری اداسی چھپی تھی۔ مجھے اس پر بے انتہا ترس آیا۔ وہ بہت وجیہہ تھا۔ اس پر ویٹر کی وردی جچتی نہیں تھی۔

میں نے مسکرا کے اس کا شکریہ ادا کیا تو ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت کی رمق نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً چھپالیا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا تاہم بولا کچھ نہیں۔

میں پھر سے اسے ٹیبلز کے درمیان لوگوں کو مشروب سرو کرتے دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اس کی آنکھوں میں حیرت جاگنے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ لوگ اسے ایسے ٹریٹ کر رہے تھے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ روبوٹ ہو۔ شاید اسی لیے میرا شکریہ کہنا اُسے حیران کر گیا تھا۔

میں اسے نظروں کے حصار میں رکھے ہوئے تھا کہ وہ واقعہ رونما ہوا جس نے اس کے چہرے پر جمی برف پگھلا

دی۔ اس کے سپاٹ چہرے پر پہلے شرمندگی کا تاثر جاگا جو کچھ ہی دیر میں گہرے دکھ میں بدل گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ہوا دراصل یہ تھا کہ چلتے ہوئے اس کا پاؤں جانے کس چیز میں اُلجھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رکھی ٹرے ایک شخص پر الٹ گئی۔ اس کے کپڑے داغدار ہو گئے۔ مدثر کے چہرے پر شرمساری نمودار ہوئی۔ اس نے دھیمی آواز میں شاید معذرتی الفاظ کہے لیکن جس شخص کے کپڑے خراب ہوئے تھے، وہ دہاڑا۔ ''تمیز نہیں تمہیں، اندھے ہو۔ میرے سارے کپڑے خراب کر دیے۔''

یکدم مدثر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے.... کسی مرد کی آنکھوں میں آنسو بہت عجیب لگتے ہیں اور یوں سب کے سامنے رو دینے والا مرد تو انتہائی حساس طبیعت کا مالک ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ اس شخص نے اسی پر بس نہیں کی۔ سب کے سامنے اس کی ماں بہن ایک کر کے رکھ دی تھی۔

منیجر شور کی آواز سن کے بھاگا آیا۔ اس نے مدثر کو سرد نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم اندر چلو۔''

اب وہ اس شخص سے معذرت کر رہا تھا لیکن میری ساری توجہ مدثر کی طرف تھی۔ وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ پلٹا۔ اس کی آنکھوں میں غم کے ساتھ طیش بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے پاس سے گزرنے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔

''بیٹا، آپ کا نام کیا ہے؟'' اس نے ایک پل کے لیے حیران سے نظروں سے مجھے دیکھا اور سپاٹ سے انداز میں بولا۔ ''مدثر۔''

''مدثر، اگر منیجر نے تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کی یا نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی تو فکر مت کرنا، یہ میرا کارڈ رکھو، مجھ سے رابطہ کر لینا، تمہیں اس سے اچھی نوکری مل جائے گی۔''

اردگرد..... موجود لوگ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے لیکن مجھے کسی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ مدثر نے بھی مجھے حیرانی سے ہی دیکھا تاہم اس نے کارڈ رکھ لیا۔

اس نے مجھے اس واقعے کے تین ماہ بعد کال کی تھی۔

میں نے اسے اپنے آفس بلالیا۔ نچلے کیا اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی میرا شاندار آفس دیکھ کر مرعوب ہو جاتے تھے لیکن اس نے تو کسی چیز کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ مضطرب لگ رہا تھا۔

''ریلیکس مدثر۔ مجھے بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ کیا تمہیں نوکری چاہیے؟'' میں نرمی سے بولا۔

''جی، میں کوئی بھی کام کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ نظریں جھکا کے بولا۔

''سمجھو تمہیں نوکری مل گئی۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ، اپنی تعلیم اور فیملی کے بارے میں، تاکہ اس کے مطابق تمہیں نوکری دی جاسکے۔''

اس کی آنکھوں میں خوشی کے بجائے حیرت جاگی۔

''میں بی ایس سی ایس کر رہا تھا، میرا تیسرا سمسٹر چل رہا تھا لیکن اب میں تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہو چکا ہوں۔ میرے ابو ایک ایکسیڈنٹ میں معذور ہو گئے ہیں۔ میری چار بہنیں ہیں اور اب میں اپنے گھرانے کا واحد کفیل ہوں۔'' وہ سپاٹ انداز میں بولا۔ اس کی بات سن کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ انتہائی خوددار ہے۔ مجبوری اُسے میرے پاس لے تو آئی تھی لیکن وہ مجھ سے ہمدردی نہیں چاہتا تھا۔

''تم تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہو؟''

''نہیں، کیونکہ یہ ممکن نہیں رہا۔'' اس نے اٹل انداز میں جواب دیا۔

''تم پہلے بھی تو پارٹ ٹائم جاب کرتے رہے ہو؟''

''جی لیکن اُس وقت جاب میں.... محض اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے کرتا تھا۔ اب پورے گھر کی ذمے داری مجھ پر ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ اتنی سی عمر میں اس پر ذمے داریوں کا پہاڑ آن گرا تھا۔ مجھے اس سے گہری ہمدردی محسوس ہوئی۔

''ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں۔ اچھا، اس دن منیجر نے تمہیں زیادہ ڈانٹ ڈپٹ تو نہیں کی تھی؟'' میں اس کا اعتبار جیتنا چاہتا تھا اس لیے بات بدلی۔

وہ اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں بولا۔ ''اس نے مجھے نوکری سے نکال دیا تھا۔''

''اوہ، تو تم نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟''

''مجھے آپ پر اعتبار نہیں تھا۔'' وہ اسی سپاٹ انداز میں بولا۔

میں مسکرا دیا۔ ''اب کیا اعتبار آگیا ہے؟''

''نہیں لیکن اب مجبوری ہے۔ اب میں ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں چاہے وہ ناجائز ہی کیوں نہ ہو۔'' وہ ضرورت سے زیادہ صاف گو لگ رہا تھا۔ اس کا ہمارے معاشرے میں ''سروائیو'' کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے سوچا۔

''تم فکر مت کرو، مجھے تم سے کوئی ناجائز کام نہیں کروانا اور رہی بات اعتبار کی تو وہ بھی تمہیں آہی جائے گا۔'' میں مسکرا کے بولا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے طنزیہ سا تاثر جاگا۔

آج اس واقعے کو کم و بیش چار سال گزر چکے تھے۔ وہ اپنا بی ایس سی ایس مکمل کر چکا تھا۔ اس کے ابو کا علاج میں نے ہی کرایا۔ اب وہ میرے ایک ریستوران میں منیجر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ مدثر کے تمام مسائل حل ہو چکے تھے۔

اس وقت ہم ایک کام کی غرض سے کاغان آئے ہوئے تھے۔ مدثر کے بقول وہ بچپن میں ایک بار کاغان آیا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں خواہش جاگی تھی کہ کاش وہ ساری زندگی وہاں رہ پاتا۔ میں اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے ہی اسے یہاں لایا تھا۔

یہاں ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ راولپنڈی سے ہم نے ایک گاڑی بک کی اور اسی میں یہاں تک آئے۔ طویل اور موڑ در موڑ سفر نے ہمارے بدن کی چولیں ہلا دی تھیں۔ پہنچتے ہی ہم سو گئے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اس وقت ہم اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ اچانک مدثر بولا۔

''روشان بھائی، آپ بہت عجیب ہیں۔''

''کیوں بھئی، میرے کیا سینگ ہیں؟'' میں مسکرا کے مزاحیہ انداز میں بولا۔

''آپ پریشان لوگوں کے لیے مسیحا کا کردار ادا کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ایسے تو کوئی نہیں کرتا۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس کے لیے تو تمہیں میری کہانی جاننا پڑے گی۔'' میں مسکرا کے بولا۔

''تو سنائیں ناں، میں کب سے آپ کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا لیکن آپ اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہی نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''میں پہلے تم پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اس لیے کبھی اپنے بارے میں تمہیں زیادہ نہیں بتایا۔'' اپنے جملے کے منفی تاثر کو ہلکا کرنے کے لیے میں ہنسا۔

"مطلب اب اعتبار کرتے ہیں؟"

"ہاں، اب میں تمہیں اپنی کہانی سنا سکتا ہوں۔"

"تو شروع ہو جائیں۔ آج ویسے بھی نیند پوری ہو چکی ہے۔ کوئی مووی دیکھنے سے بہتر ہے آپ کی کہانی سن لی جائے۔" وہ جوش سے بولا۔ وہ ویسے خاصا میچور قسم کا انسان تھا لیکن میرے سامنے اس کا انداز بچکانا ہی ہوتا تھا۔ مجھے اس کا یہ بچپنا اور معصومیت بہت پسند تھی۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور پہاڑوں پر گھروں کی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ منظر بہت خوبصورت تھا لیکن میری زندگی کی کہانی اتنی خوبصورت نہ تھی۔ اس میں ایسے خطرناک راز تھے جو میں کسی کے سامنے آشکار نہیں کرسکتا تھا لیکن دوسری طرف میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ایک عرصے سے مجھے قابل اعتبار دوست کی ضرورت تھی۔ اب مجھے یہ دوست مل گیا تھا اس لیے میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد میں اس سے بولا۔

"کچھ سمجھ نہیں آرہی کہاں سے شروع کروں۔"

"آپ وہاں سے شروع کریں جہاں سے آپ کی زندگی تبدیل ہونا شروع ہوئی۔" اس کی فرمائش سن کر میں ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میری زندگی میں ایسے بہت سے موڑ آئے تھے جہاں میری زندگی کا رخ بدلا تھا لیکن ایک ایسا موڑ آیا تھا جس کے بعد میری زندگی یکسر ہی بدل گئی تھی۔ آج میرے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اگر وہ واقعہ نہ ہوتا تو میں شاید آج زندہ ہی نہ ہوتا۔ میں نے وہیں سے اپنی کہانی سنانے کا فیصلہ کیا۔ مدثر مجھے منتظر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولا۔

"میری زندگی ایک فون کال نے بدلی تھی۔"

"صرف ایک فون کال نے...... کس کی کال تھی وہ؟" وہ حیرت سے بولا۔

میں مسکرایا۔ "سیلولر کمپنی کی۔"

"مطلب آپ کا انعام نکلا تھا۔" اس نے فوری اندازہ لگایا۔

"نہیں، وہ تو عام سی ریکارڈڈ کال تھی جو لوگ سننے کے بجائے کاٹ دیا کرتے ہیں۔ میں بھی ایسی کالز کاٹ دیا کرتا تھا لیکن اس وقت میں جس صورت حال سے دوچار تھا، میں نے وہ فون سننے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے بعد نہ صرف میری بلکہ بہت سے لوگوں کی زندگی بدلتی چلی گئی۔"

"ریکارڈڈ کال سننے سے زندگی بدل گئی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس کے لہجے میں دلچسپی کی شدت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پوری طرح ٹرانس میں آچکا ہے۔

"میرے خیال میں ایسے تمہیں الجھن ہوگی۔ میں تمہیں شروع سے اپنی کہانی سناتا ہوں۔" میں مسکرا کے بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" وہ فوراً بولا۔

میں نے کرسی سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ کچھ لمحوں بعد میں ایسے روانی سے اپنی کہانی سنا رہا تھا جیسے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ چل رہا ہو۔

☆☆☆

میری پیدائش ایک وسیع وعریض محل میں ہوئی تھی۔ یہ محل ملک کے ایک معروف بزنس مین سفیان علی کا تھا اور سفید محل کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سفیان علی کا کوئی ایک بزنس نہ تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ، بینکنگ، اسٹاک ایکسچینج، ہوٹلنگ غرض کوئی بھی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں اس نے سرمایہ کاری نہ کر رکھی ہو۔ اس کی تین اولادیں تھیں۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ اس کے بڑے بیٹے ارمغان کی شادی ہو چکی تھی جبکہ ذیشان اور شائلہ بیرون ملک تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

جس دن میں پیدا ہوا، اس دن محل کو روشنیوں سے بقعۂ نور بنا دیا گیا تھا، صدقہ وخیرات کی مد میں کئی دیگیں پکوا کے غریبوں میں بانٹ دی گئی تھیں لیکن میری بدقسمتی یہ تھی کہ یہ سارا اہتمام میرے لیے نہیں کیا گیا تھا۔ اس سارے اہتمام کی وجہ نیہا تھی جس نے سفیان علی کے سب سے بڑے بیٹے ارمغان کی بیوی ماریہ کے بطن سے ٹھیک اس دن جنم لیا تھا جس دن بدقسمتی سے میں اس دنیا میں تشریف لایا تھا۔

میری بدقسمتی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس وسیع وعریض محل کے پچھواڑے میں بنے سرونٹ کوارٹر کے ایک سیلن زدہ کمرے میں جنم لیا تھا، جبکہ نیہا نے ملک کے ایک معروف اور انتہائی مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں آنکھ کھولی تھی۔

نیہا کی پیدائش پر اس کی ماں کو معروف اور اپنے پیشے میں ماہر گائنیز کے علاوہ تجربہ کار نرسز کا تعاون بھی حاصل ہوا تھا جبکہ میری ماں کے پاس صرف ایک عورت تھی، ایک ناتجربہ کار.... یہ عورت میری ماں کی بہن تھی جسے ماں نے ایک دن قبل ہی گاؤں سے بلوایا تھا۔

نیہا کی پیدائش میرے لیے بڑی منحوس ثابت ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش کی وجہ سے سارے مالکان اسپتال

میں تھے۔ حتیٰ کہ میرا باپ بھی اسپتال میں ہی موجود تھا۔ وہ سفیان علی کا ڈرائیور تھا، اور اس مشکل گھڑی میں اپنی بیوی کے پاس موجود ہونے کے بجائے سفیان علی کو لے کے اسپتال چلا گیا تھا۔

جس گھڑی اس کا بلاوا آیا، میری ماں دردِزہ کی تکلیف میں مبتلا تھی۔ میں اس کی پہلی اولاد تھی۔ کیا ہوا وہ غریب تھے۔ غریبوں کے گھر بھی اولاد کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ میرے والدین بھی اس دنیا میں میری آمد کے بے چینی سے منتظر تھے مگر بُرا ہو نیہا کا... جسے دنیا میں آنے کے لیے وہی دن ملا تھا جس دن مجھے اس دنیا میں تشریف لانا تھا۔

محل کے چند ملازمین کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے اور باقیوں کو کاموں کی لمبی فہرست پکڑا گئے تھے۔ اس مصروفیت میں کسی ملازمہ کو بھی میری ماں کا خیال نہ رہا تھا، جو انہی کی کلاس سے تعلق رکھتی تھیں جو انہی کے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں رہائش پذیر تھی۔

شام کو جب نیہا کو اسپتال سے لایا گیا تو پورے محل میں آتش بازی کی گئی۔ میری ماں کے بقول میں آتش بازی کے شور کی وجہ سے اپنی پیدائش کے چند گھنٹوں بعد پہلی بار رویا تھا۔ اس سے پہلے میں آنکھیں بند کیے سوتا ہی رہا تھا۔

میرا باپ سفیان کو گھر چھوڑنے کے بعد چند لمحوں کے لیے اپنی بیوی کے پاس آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کا چہرہ خوشی سے کِھل اٹھا تھا۔ اس نے میرے کان میں اذان دی۔

وہ میرے اور اپنی بیوی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا لیکن ایک بار پھر اس کا بلاوا آگیا۔ سفیان علی کے گھر مہمانوں کی آمدورفت جاری تھی۔

مہمانوں کی آمدورفت کے علاوہ محل میں چراغاں کیا جا رہا تھا جس کے لیے الیکٹریشن اپنا کام کر رہے تھے۔ ایسے میں جتنے بھی ملازمین تھے کم تھے۔ اس وجہ سے میرے باپ کو بھی بلا لیا گیا۔ وہ سیدھا سادہ شخص تھا اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ اس کی ضرورت محل سے زیادہ کوارٹر میں ہے...... سفیان سے زیادہ اس کی اپنی بیوی کو اس کی ضرورت ہے۔ کاموں سے زیادہ اس کی بیوی اور بیٹا اس کے لیے زیادہ اہم ہیں۔

وہ یہ سب کہنا چاہتا تھا لیکن کیسے کہتا۔ وہ تو سفیان کو اپنا اَن داتا، اپنا مالک، اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ اس کے آگے نہ کرنے کی اس کی مجال ہی نہ تھی۔

اس دن پہلی بار میری ماں کا اپنے خاوند کی طرف سے دل کھٹا ہوا تھا۔ دل تو اس کا سفیان اور اس کی فیملی سے بھی کھٹا ہوا تھا جنہوں نے سب جانتے ہوئے بھی اس کا پتا تک نہ کیا تھا۔

خیر انہوں نے کیا پتا کرنا تھا۔ اپنی خوشی میں وہ اپنی ایک ادنیٰ درجے کی ملازمہ کی خوشی کو کیا خاک یاد رکھتے، لیکن انہوں نے اس کے خاوند کو بھی اپنے پاس، اپنے کاموں کے لیے بلا لیا تھا۔ یہ بات اس کے دل میں برچھی کی طرح اتر گئی تھی۔

میری ماں کے ذہن میں یہ چیز بیٹھ گئی۔ وہ اپنے مالکوں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے ان کے بدلے کا غصہ بھی اپنے خاوند سے لیا۔ وہ ہر وقت میرے باپ کو یہ طعنہ دیتی رہتی کہ میری پیدائش سے زیادہ خوشی اسے نیہا کی پیدائش کی ہوئی تھی۔ اسے اس وقت اپنی بیوی اور اپنے بچے کو وقت دینا تھا مگر وہ وقت اس نے نیہا اور اس کے گھرانے کو دیا تھا۔ اسے یہ خوشی اپنے کوارٹر میں اپنی بیوی کے ساتھ منانا تھی لیکن وہ سفیان کا محل آراستہ کرتا رہا تھا۔

میرا باپ جب بھی مجھ سے لاڈ پیار کرتا۔ میری ماں اسے طعنے دینے لگ جاتی۔ میرا باپ اپنی کم گو اور سیدھی سادی طبیعت کے باعث اپنی بیوی کو بھی کچھ نہ کہتا۔ سارے کوسنے خاموشی سے سہہ لیتا۔ میری ماں کے طعنوں کی بدولت اس نے مجھ سے لاڈ پیار کرنا ہی چھوڑ دیا۔ میں اپنی ماں کے یہ کوسنے سنتا ہوا بڑا ہوا۔ بچپن میں جانے مجھے ان باتوں کی سمجھ تھی یا نہیں لیکن شاید لاشعور میں نیہا کے خلاف میرے دل میں نفرت جڑ پکڑنے لگی تھی۔ یہ نفرت جانے آگے جا کے کیا رنگ دکھانے والی تھی۔ اُس وقت نہ میری ماں جانتی تھی اور نہ میں۔

☆☆☆

نیہا سے میری نفرت کا پہلا اظہار آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میری عمر اُس وقت چار سال کے لگ بھگ تھی۔ میری ماں سفیان علی کے گھر میں برتن اور کپڑے دھویا کرتی تھی۔ اسے بچے کو محل میں لانا منع تھا لیکن اس دن مجھے بخار تھا۔ میں نے ضد کی تو وہ مجھے بھی ساتھ لے گئی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی ایک عورت بیزاری سے بولی۔ ''اسے کہاں لے آئی ہو، اسے سنبھالو گی یا کام کرو گی۔'' وہ عورت دیکھنے میں بہت پیاری لگ رہی تھی، لیکن وہ جس انداز میں بولی تھی، پہلی ہی نظر میں میرے لیے ناپسندیدہ ہو چکی تھی۔

''بیگم صاحبہ، یہ بیمار ہے اس لیے لے آئی۔ یہ مجھے یا آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔ میرے پاس کھڑا رہے گا۔''

میری ماں نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے پھر اسے سنبھال کے رکھنا اور آئندہ اسے اندر مت لانا۔" وہ عورت اسی لہجے میں کہتے ہوئے صوفے پر جاکے بیٹھ گئی۔ میں نفرت سے اسے گھورتا رہ گیا۔
میری ماں نے مجھے کچن کے دروازے میں کھڑا کیا اور بولی۔ "ادھر کھڑا رہ، ادھر سے ہلنا مت۔"
میں خاموشی سے ادھر ہی کھڑا ہو گیا۔
میں کچن کے دروازے میں کھڑا خاموشی سے اسے برتن دھوتے دیکھ رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔
"ماما، میری گڑیا کہاں ہے؟" میں نے گردن گھما کے دیکھا۔ وہ ایک ننھی سی پری تھی جو صوفے پر ٹی وی کے آگے بیٹھی اپنی ماں سے اپنی گڑیا کی بابت پوچھ رہی تھی۔
میں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔
"ایک منٹ بیٹا، میں دیکھتی ہوں۔" اس کی ماں ٹی وی پر نظریں لگائے بولی۔
وہ مایوسی سے پلٹی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ننھے ننھے قدم اٹھاتی میری طرف آ گئی۔
"سو کیوٹ۔" وہ میری طرف دیکھ کے معصومیت سے بولی۔ میں شرما گیا۔
"آپ کا نام کیا ہے؟" وہ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بولی۔
میں خاموشی سے اُسے گھورتا رہا۔
اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "میرا نام نیہا ہے۔"
یہ نام جانے کب سے میرے ذہن میں پڑتا رہا تھا۔ میرے لاشعور میں اس نام سے نفرت پکی ہو چکی تھی۔ آج مجھے اس نفرت کے اظہار کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
وہ حیرت سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔ "مجھ سے کھیلو گے نہیں۔ آؤ میں تمہیں اپنے کھلونے دکھاؤں۔" وہ میری نفرت کو سمجھ ہی نہ سکی، اسی طرح معصومیت سے بولی۔
میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ میری ماں برتن دھونے اور اس کی ماں ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھی۔ انہوں نے ہمیں اندر جاتے دیکھا ہی نہیں۔
وہ میرا ہاتھ پکڑے اپنے کمرے میں لے گئی۔ میں دروازے میں ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے چھوڑ کے اپنے کھلونوں کی طرف لپکی۔ اس نے ایک کھلونا کار اٹھائی اور میری طرف دیکھ کے بولی۔
"یہ دیکھو۔ میری کار۔" میں چلتا ہوا اس کے پاس گیا۔ کار اٹھائی اور زور سے دیوار پر دے ماری۔ اس کے بعد میں رکا نہیں تھا۔ بھاگتا ہوا اپنی ماں کے پاس پہنچا تو وہ اسی طرح برتن دھونے میں مصروف تھی۔ میں خاموشی سے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ ابھی نیہا روتی ہوئی آئے گی لیکن نہ وہ آئی نہ اس کے رونے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ تو شاید اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے کی کرچیاں چننے میں مصروف تھی۔

☆☆☆

کمرے کی کھڑکی کھلی تھی، جس سے اندر آنے والی ہوا پہلے خوشگوار سی خنکی کا احساس دلا رہی تھی، اب ہڈیوں میں اترتی محسوس ہونے لگی۔ مئی کے مہینے میں بھی ادھر اچھی خاصی سردی تھی۔
"مجھے تو ٹھنڈ لگنے لگی ہے۔" میں اپنی کہانی روک کے مدثر سے بولا۔
"اوہ۔" وہ ایک دم چونکا۔ "واقعی کافی سردی ہو گئی ہے۔ مجھے تو آپ کی کہانی سنتے ہوئے سردی کا احساس ہی نہیں ہوا۔" وہ اٹھا اور بیڈ سے کمبل اٹھا لایا۔ میں نے کھڑکی بند کی۔ کھڑکی کے شفاف شیشوں سے اب بھی باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم نے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ایک ہی کمبل لپیٹ لیا۔ اب سکون کا احساس ہو رہا تھا۔
"ویسے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ کسی سے نفرت بھی کر سکتے ہیں۔" میں مسکرایا۔
"ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی میری ماں بے خبری میں میرے دل میں نیہا کی نفرت انڈیلتی رہی تھی، میں اس سے نفرت نہ کرتا تو کیا کرتا۔"
"یہ بھی صحیح ہے۔ بچپن میں چھوٹے چھوٹے واقعات بھی انسان کے ذہن پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو پوری زندگی انسان ان کے اثرات سے باہر نہیں نکل پاتا اسی لیے اچھی تربیت پر زور دیا جاتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
بات تو اس نے درست کی تھی۔ معاشرے میں اس قدر بگاڑ کی یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ والدین کے غلط رویے بچوں کی شخصیت کو بگاڑ دیتے ہیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ والدین کی تربیت کون کرتا۔ حکومتوں کے پاس حل کرنے کے لیے اور مسئلے تھوڑے تھے جو اس طرف وہ توجہ دیتیں۔
"ہم ایسا ادارہ بنائیں گے۔" میں مسکرا کے بولا تو

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''انشاء اللہ، آپ یقیناً ایسا کر سکتے ہیں لیکن پہلے آپ اپنی کہانی تو مکمل کریں۔ نیہا نے ضرور اپنی ماں سے آپ کی شکایت لگائی ہوگی۔ پھر اس کی ماں نے آپ کو خوب مار لگائی ہوگی۔'' وہ شریر انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہارا اندازہ غلط ہے۔ جانے کیوں، نیہا نے میری اس حرکت کے متعلق کسی کو بتایا ہی نہیں تھا۔''

میں ایک بار پھر آنکھیں موند کے شروع ہو گیا۔

☆☆☆

نیہا کی کار توڑ کے مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ میں اس کے سارے کھلونے توڑ دینا چاہتا تھا لیکن میری ماں اس کے بعد مجھے محل میں لے کے گئی ہی نہیں۔ میں نے بہت ضد کی لیکن وہ شاید مجھ سے بھی زیادہ ضدی واقع ہوئی تھی۔

کچھ وقت گزرا تو مجھے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں میرا ہم عمر لڑکا نعمان رہتا تھا۔ ہمیں اکٹھے ہی ایک سرکاری اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ نعمان کا باپ ہمیں موٹر سائیکل پر اسکول چھوڑنے جاتا۔

میں جب ناشتا کر رہا ہوتا تو میرا باپ جلدی جلدی تیار ہو کے باہر نکل جاتا۔ ایک دن میں نے اپنی ماں سے پوچھا۔

''امی، ابو صبح صبح کدھر جاتے ہیں؟''

میری ماں میرے بالوں میں کنگھی کرتے نفرت سے بولی۔ ''اپنی چہیتی کو اسکول چھوڑنے جاتے ہیں۔''

''چہیتی کون ہوتی ہے؟'' میں نے معصومیت سے اگلا سوال کیا۔

''چہیتی وہ ہوتی ہے جو اپنی اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہو۔'' وہ نفرت سے بولی۔ اپنی ماں کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی تو میں نے اگلا سوال پوچھ ڈالا۔

''چہیتی کا نام کیا ہے؟''

''نیہا نام ہے تمہارے باپ کی چہیتی کا۔'' اس نے نفرت سے کہتے ہوئے کنگھی رکھی اور مجھے بیگ پہنانے لگی۔

میرے ذہن میں نیہا کے متعلق نفرت کو مزید ہوا مل گئی۔ میرا باپ مجھے اسکول چھوڑنے نہیں جاتا تھا لیکن اپنی چہیتی نیہا کو اسکول چھوڑنے جاتا ہے۔ یہ جملہ میرے ذہن میں بچھو کی طرح ڈنک مارنے لگا۔

اگلے دن میرا باپ تیار ہو کے باہر نکلا ہی تھا کہ میں بھی اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔ وہ جا کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں گاڑی کے پاس ہی جا کے کھڑا ہو گیا۔

''تم بھی اسکول جا رہے ہو؟'' میرے کانوں میں آواز پڑی تو میں نے پلٹ کے دیکھا۔ یہ نیہا تھی۔ میں اس وقت یونیفارم میں تھا جس کی وجہ سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ میں بھی اسکول جا رہا ہوں۔ میں خاموشی سے اسے گھورنے لگا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے بولی۔ ''آؤ ناں، چلیں۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔''

''میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔'' میں تمہارے ساتھ اسکول نہیں جاؤں گا۔'' میں حقارت سے بولا۔

میرا باپ مجھے دیکھ کے گاڑی سے اتر آیا۔ ''نیہا بیٹا، آجاؤ۔'' وہ پچھلا دروازہ کھول کے بولا۔ اس نے مجھے یکسر ہی نظر انداز کر دیا تھا جیسے میرا وجود کہیں نہ ہو۔ میں غم و غصے کی کیفیت میں اسے گھورنے لگا۔ میری ماں درست کہتی تھی کہ میرا باپ مجھ سے زیادہ نیہا کو چاہتا ہے۔

''انکل، آج یہ بھی ہمارے ساتھ اسکول جائے گا۔''

نیہا نے ایک بار پھر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرے انکار کو تو جیسے کوئی اہمیت دی ہی نہ تھی۔ میں نے پھر اپنا ہاتھ چھڑوالیا۔

''بیٹا، یہ ہمارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ یہ دوسرے اسکول میں پڑھتا ہے۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''یہ میرے اسکول میں کیوں نہیں پڑھتا؟'' نیہا معصومیت سے بولی۔

''کیونکہ تم بھی گندی ہو اور تمہارا اسکول بھی گندہ ہے۔'' میں چیخا۔ وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔ میرا باپ غصے سے چلتے ہوئے میرے پاس آیا اور ایک زوردار طمانچہ میرے چہرے پر رسید کیا۔ میں لڑکھڑا کے گر گیا۔

''بدتمیز۔ ایسے بات کرتے ہیں مالکوں سے۔'' وہ دہاڑا۔ نیہا بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ ''انکل، آپ بہت گندے ہیں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا ہاتھ غصے سے جھٹک دیا اور کھڑا ہو گیا۔ میرے باپ کی دہاڑ کی آواز سن کے نیہا کی ماں بھی باہر نکل آئی تھی۔

''کیا ہوا، نیہا تم رو رہی کیوں ہو؟'' وہ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے نیہا سے بولی۔

''انکل نے اِسے مارا ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا اور ہچکی لی۔ آنسو اب بھی اس کے رخساروں سے تواتر سے بہہ رہے تھے۔

''مارا اسے ہے، رو تم کیوں رہی ہو؟'' وہ عجیب سے

انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

اتنے میں میری ماں مجھے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ گئی۔ ''روشان، تم ادھر کہاں چلے آئے؟ جلدی سے آؤ، ناشتا کر لو۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔'' وہ میری طرف بڑھتے ہوئے تیزی سے بولی۔

نیہا کی ماں نے اسے گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ نیہا مڑ مڑ کے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میرے دل میں اس کے لیے جمع نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

ماں صحیح کہتی ہے کہ میرا باپ مجھ سے زیادہ نیہا کو اہمیت دیتا ہے۔ اس نے نیہا کے لیے مجھے، اپنے بیٹے کو تھپڑ مارا ہے۔ اس واقعے سے میں نے یہی نتیجہ نکالا تھا۔

☆☆☆

وقت کا کام ہے گزرنا سو وہ تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں کلاس دہم میں پہنچ چکا تھا۔ اس دوران نیہا سے میری... مڈبھیڑ ہوتی رہی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتی لیکن میں یا تو اسے نظر انداز کر دیتا یا بات کرتا بھی تو بدتمیزی سے کرتا، لیکن جانے وہ کس مٹی سے بنی تھی کہ اس پر میرے رویے کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ نیہا کا ایک بھائی ارمان بھی تھا۔ وہ اس سے تین سال چھوٹا تھا۔ وہ مجھ سے خار کھاتا تھا، اس کے نزدیک میں ایک معمولی ملازم کا بیٹا تھا، اس لیے میری اتنی اوقات نہ تھی کہ وہ مجھے منہ لگاتا۔ اس کے سامنے اگر نیہا کبھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ اسے جھڑک دیتا لیکن اس کے باوجود میرے دل میں ارمان کے لیے اتنی نفرت نہ تھی جتنی نیہا کے لیے تھی۔

مجھ سے چھوٹے ایک بھائی اور ایک بہن تھے۔ بھائی کا نام عثمان تھا جبکہ بہن کا نام انعم تھا۔ نیہا ان سے بھی اچھے طریقے سے بات کرتی تھی۔ وہ ہر وقت اس کے گن گاتے رہتے اور میں چڑتا رہتا۔

وہ دن ہمارے خاندان کے لیے انتہائی بھیانک تھا۔ میں اسکول سے واپس گھر پہنچا ہی تھا کہ ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں رہنے والی ایک عورت بھاگتی ہوئی آئی۔

''نسرین، کریم بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ اسپتال میں ہیں۔'' اس نے آتے ہی بم پھوڑا۔ امی یہ سن کے تو چند لمحات تک سکتے میں رہ گئیں پھر وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگیں۔ میں ہکا بکا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

''کون سے اسپتال میں ہیں ابو، وہ ٹھیک تو ہیں ناں؟'' میں نے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اس سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ ابھی ابھی فون آیا ہے کہ وہ نیہا اور ارمان کو اسکول سے لا رہے تھے کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔''

''پھر تو نیہا اور ارمان بھی ہسپتال میں ہوں گے۔'' میں عجیب سے لہجے میں بولا۔

''نہیں، وہ تو گھر واپس پہنچ چکے ہیں۔'' عجیب بات کر رہی تھی وہ۔ اگر میرا باپ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اسپتال پہنچ چکا تھا تو اس کے ساتھ موجود نیہا اور ارمان کیسے بچ گئے تھے۔ کیا مصیبت بھی صرف غریبوں کے لیے بنی ہے۔ میں نے تلخی سے سوچا۔

امی اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکی تھیں۔ وہ چادر اٹھا کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔ ''چلو روشان، ہم ان کا پتا کرتے ہیں۔''

میں اسکول یونیفارم میں ہی ان کے پیچھے چل پڑا۔ عثمان اور انعم رونے لگے۔

ہم لوگ ابھی دروازے میں ہی تھے کہ ایمبولینس کے سائرن کی آواز آنے لگی۔ میرا دل بے طرح دھڑکا۔ امی نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں انجانے خدشے لرز رہے تھے۔

''چلیں امی۔'' میں ان سے نظریں چرا کے آگے بڑھ گیا۔ ہم لوگ پورچ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ گیٹ کھلا اور ایمبولینس داخل ہوئی۔ اب ایمبولینس طویل ڈرائیو وے پر چل رہی تھی۔ میں اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پورچ میں پہنچ کے گاڑی رکی۔

ڈرائیور نے اتر کے پچھلا دروازہ کھولا۔ میں ہراساں نظروں سے اس کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ کاش میں انکل کو کیک لانے کا نہ کہتی۔'' میرے قریب ایک سسکتی ہوئی آواز ابھری تو میں نے مڑ کے اسے دیکھا۔ وہ نیہا تھی جو ہچکیاں لے لے کے رو رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے انکل کو کیک لانے کا کہا تھا۔ وہ گاڑی روک کے سڑک کراس کرنے ہی لگے تھے کہ ایک گاڑی انہیں روندتے ہوئے گزر گئی۔'' وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

اتنے میں ابو کی میت کو اسٹریچر پر ایمبولینس سے اتارا جا چکا تھا۔ میری امی ان کا چہرہ دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کے رونے لگیں۔ عثمان اور انعم بھی ہمارے ساتھ ادھر پہنچ چکے

تھے۔ وہ بھی بلند آواز میں رو رہے تھے۔ رو تو نیہا بھی رہی تھی لیکن میں اسے نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ آج اس نے میرے باپ کو بھی کھا لیا تھا، میں اسے نفرت سے نہ دیکھتا تو کیا کرتا؟

☆☆☆

میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا، اس سے قبل میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا لیکن ابو کے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ تو میری بدقسمتی تھی۔ اب گھر کی ذمے داری میرے کندھوں پر تھی۔ امی تو اس دکھ سے بالکل ٹوٹ کے رہ گئی تھیں۔ مجھے اب انہیں بھی سنبھالنا تھا اور اپنے بہن بھائی کو بھی۔ چالیسویں کے بعد امی نے واپس کام پر جانا شروع کر دیا حالانکہ ابھی ان کی عدت بھی پوری نہ ہوئی تھی۔

ابھی امی کام پر جانا نہیں چاہتی تھیں لیکن بقول ''مالکوں'' کے ایک ماہ کی انہوں نے مفت تنخواہ دے دی تھی... بہت تھی۔ اب انہیں کام کے بغیر تنخواہ دینا گوارا نہ تھا۔

امی اور ابو دونوں کام کرتے تھے تب بھی ہمارے گھر کا خرچ بمشکل ہی چلتا تھا، اب تو صرف امی کی تنخواہ تھی، اس سے گزارا ممکن نہیں تھا۔ میں نے بھی سودا سلف لانے اور چند باہر کے کام کرنے کی ذمے داری لے لی۔ ''مالکوں'' نے اتنا احسان کیا کہ مجھے اس کام پر رکھ لیا۔ وہ اتنا نہ بھی کرتے تو ہم بھلا کیا کر سکتے تھے۔''

میں نے آنکھیں کھول کے مدثر کو دیکھا۔ میری طرح وہ بھی اداس لگ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کے وہ بولا۔

''گویا، آپ بھی میرے جیسے حالات سے گزرے ہیں۔''

''ہاں مگر تمہاری طرح مجھے کوئی مسیحا نہیں ملا۔'' میں اداسی سے بولا۔

''آپ تو خود مسیحا ہیں، آپ کو کسی مسیحا کی کیا ضرورت۔ آپ نے تو اپنے مسائل خود حل کر لیے۔''

''ہاں، لیکن اس کے لیے مجھے بہت بھاری قیمت چکانا پڑی۔ یہ بھاری بوجھ مجھے گھن کی طرح کھا رہا ہے۔'' میرے لہجے میں عجیب سی کسک تھی۔

''میں آپ کا بوجھ بانٹ لوں گا۔ آپ مجھ سے شیئر تو کریں۔'' وہ ہمدردانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ میں ایک بار پھر اس سے اپنا بوجھ شیئر کرنے لگا۔

☆☆☆

ایک دن میں کچن میں سودا رکھ کے باہر نکل رہا تھا کہ سیڑھیوں سے اترتی نیہا دکھائی دی۔ ابو کی وفات کے بعد آج پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس کے ''اسٹیپس'' میں کٹے بال جھٹکے کھا رہے تھے۔ اس نے آف وائٹ کیپری پہن رکھا تھا جس کے پائنچوں پر نیلے اور گلابی رنگ کے بیل بوٹم بنے تھے۔ اوپر اس نے سلیو لیس آف وائٹ کلرئی شرٹ پہن رکھی تھی، ٹی شرٹ کے گلے اور بارڈر پر گلابی اور نیلے رنگ کا کام کیا ہوا تھا۔ اس کے گدرائے ہوئے سرخ و سپید بازو بہت پُرکشش لگ رہے تھے۔ اس نے سیڑھیوں سے اتر کے ایک ادا سے اپنے بالوں کو پیچھے کیا۔ اس کی لمبی انگلیوں کے ناخن گلابی رنگ کی نیل پالش سے دمک رہے تھے۔ میک اپ سے بے نیاز تر و تازہ چہرہ انوکھی کشش لیے ہوئے تھا۔ وہ میری ہم عمر تھی، اور میری طرح عمر کے سولہویں سال میں داخل ہو چکی تھی۔ جوانی کے آثار اس میں نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ آج اسے دیکھ کے پہلی بار مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ میں اسے ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا رہ گیا۔ وہ چلتے ہوئے میرے پاس پہنچی ہی تھی کہ میں پلٹا۔

''روشان، رکو مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' میں ادھر ہی رک گیا۔

وہ میرے پاس آ کے بولی۔ ''آئی ایم سوری، روشان۔ تمہارے ابو کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں تم لوگوں کے گھر آ کے تم سے تعزیت کرنا چاہتی تھی لیکن امی نے مجھے منع کر دیا۔'' وہ نظریں جھکا کے بولی۔

''نیہا بی بی، آپ آسمان ہو، ہم زمین۔ آپ مالک ہو، ہم نوکر۔ ہم میں یہ سوری اور تعزیت جیسے تکلفات کی گنجائش کہاں ہے۔'' میں تلخی سے بولا۔

''تم مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟'' وہ نظریں اٹھا کے دلگیر لہجے میں بولی۔

''معاف کرنا نیہا بی بی، ہمارے بیچ اتنا تفاوت ہے کہ ہم میں نفرت کے رشتے کی گنجائش بھی نہیں نکل سکتی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آج پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے مجھے تکلیف کا احساس ہو۔ میں شاید زیادہ ہی تلخ ہو گیا تھا۔

''تمہیں مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''آپ کو مجھ سے کسی لہجے میں بھی بات نہیں کرنی چاہیے، آئندہ مجھے اس طرح مت روکیے گا۔'' میں سخت

لہجے میں کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ میرا دل مجھے ملامت کرنے لگا لیکن میں نے نفرت کی تھپکی دے کے اُسے سلا دیا۔

☆☆☆

اس وقت تو میں نے اپنے دل کو قابو میں کر لیا تھا لیکن رات کو میں سونے کے لیے لیٹا تو چھم سے نیہا کی روتی صورت میرے سامنے آگئی۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں اس کی صورت بُھلا کے سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی صورت تھی کہ نگاہوں سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ میں جھنجلا کے اٹھ بیٹھا۔

نیہا وہ لڑکی ہے جس کی وجہ سے میری ماں اور باپ کے درمیان دوری پیدا ہوئی۔ نیہا وہ لڑکی ہے جس کی پیدائش کی وجہ سے میرے باپ نے میرے حصے کا وقت بھی اسے دیا۔ نیہا وہ لڑکی ہے جس کی وجہ سے میرے باپ نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ یہ نیہا ہی ہے جس کی وجہ سے میرا باپ اپنی جان سے گزر گیا۔ میرے ذہن نے نیہا کے خلاف دلائل کی پٹاری کھول لی لیکن دل بھی کب سمجھنے والا تھا۔ وہ اپنے دلائل دینے لگا۔

اس سب میں نیہا کا کیا قصور۔ اس نے تو ہمیشہ تمہارا خیال رکھنے کی کوشش کی۔ تمہارے باپ نے تمہیں تھپڑ مارا تو وہ روئی۔ تمہارے اتنے بُرے رویے کے باوجود اس نے ہمیشہ تم سے اچھے طریقے سے بات کی۔ تم اس سے محبت نہیں کرتے نہ کرو، کم ازکم اس سے نفرت تو نہ کرو۔

دل اور ذہن میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔ میرا سکون برباد ہو کے رہ گیا۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

باوجود سونے کی کوشش کے جب مجھے نیند نہ آئی تو میں باہر نکل آیا۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ اردگرد کا منظر چاندی کی سفیدی سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ انتہائی خوبصورت منظر تھا۔ میں اس منظر کے فسوں میں کھو کے رہ گیا۔ میری نظر دور سفید محل کی کھڑکی پر پڑی۔ ٹیرس پر نیہا جنگلے پر بازو ٹکائے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ اپنا چہرہ اس نے ہاتھوں کے پیالے میں لے رکھا تھا۔ ٹیرس کے اوپر سفید دودھیا رنگ کی لائٹ جل رہی تھی، اس روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ میں نے ایک نظر چاند کو دیکھا۔ چند لمحات قبل جو چاند مجھے انتہائی خوبصورت دکھ رہا تھا۔ اب پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ میں جو اپنے اندر جاری جنگ سے تنگ آ کے باہر نکلا تھا، یہ منظر دیکھ کے دل ہار گیا۔

☆☆☆

مدثر ہنسا تو میں نے چونک کے اُسے دیکھا۔ ''بچپن کی نفرت جوانی شروع ہوتے ہی، محبت میں بدل گئی۔ یہ ہوئی نا بات۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

بات ہی تو نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا۔

''میں کافی منگوا لیتا ہوں۔ آپ پھر اپنی کہانی شروع کرنا۔'' وہ روم سروس کو کال کرنے لگا۔ مجھے بھی کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ ہم کافی کا انتظار کرنے لگے۔

''میرا تو خیال تھا آپ کی کہانی محنت وجدوجہد سے عبارت ہوگی مگر یہ تو لو اسٹوری لگ رہی ہے۔'' وہ شریر سے انداز میں بولا۔

''لو کا تڑکا تو تقریباً ہر کہانی میں ہوتا ہی ہے۔ ویسے میری کہانی جرم وسزا پر مبنی ہے بلکہ ایسے کہو کہ سزا، جرم اور پھر بس سزا ہی سزا پر مشتمل ہے۔'' میں اداسی سے بولا۔

اس کی آنکھوں میں حیرانی نظر آنے لگی۔ ''سزا اور جرم؟ گویا پہلے آپ کو سزا ملی، پھر آپ نے جرم کیا؟''

اس سے قبل میں اسے جواب دیتا، دروازے پر دستک ہوئی۔ توقع کے مطابق ویٹر کافی لے کر آیا تھا۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں.... تہوں میں لپٹی اپنی کہانی اس کے سامنے کھولنے لگا۔

☆☆☆

اپنے اندر کی جنگ سے تنگ آ کے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جب بھی نیہا نے مجھ سے بات کی، میں اس سے اچھے طریقے سے بات کروں گا۔ میں اس امید کے ساتھ جب بھی وہ کہیں نظر آتی اس کی طرف دیکھتا کہ وہ مجھ سے بات کرے گی لیکن لگتا تھا کہ اس نے میری آخری بار کی جانے والی بات دل پر لے لی ہے۔ اس واقعے کے بعد اس نے مجھے مخاطب ہی نہ کیا۔

میں اپنے رویے کی اس سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں خود میں اتنی ہمت مجتمع ہی نہ کر سکا۔ میری حالت عجیب ہو گئی تھی۔ کسی کام میں میرا دل نہ لگتا۔ پڑھائی سے بھی ان دنوں میرا جی اچاٹ سا تھا۔ ایک لمحے نے ہی میری عمر بھر کی نفرت، جو میں نے قطرہ قطرہ کر کے اپنے دل میں جمع کی تھی، کو محبت میں بدل دیا۔ کہتے ہیں کہ نفرت کی آگ انسان کو اندر سے جلا کے بھسم کر دیتی ہے۔ نفرت میں انسان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا لیکن میرے ساتھ یہ سب محبت میں ہو رہا تھا۔ مجھے محبت کی آگ جلا رہی تھی، ستا رہی تھی۔ مجھے نیہا کے سوا اب کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

انہی دنوں میٹرک کے امتحانات شروع ہو گئے۔ میں نے ہر صورت اتنے نمبر لینے تھے کہ آگے پڑھائی کے لیے

مجھے اسکالرشپ مل سکے۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو پڑھائی کی طرف راغب کیا اور دل و جان سے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ نیہا کے بھی امتحانات ہو رہے تھے۔ اس نے بھی خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا۔ اب بس صبح اسکول جاتے ہوئے میری نظر اس پر پڑ جاتی۔ وہ بھی مجھے دیکھتی تھی لیکن اب اس کی آنکھوں میں اجنبیت ہوتی۔ یہ اجنبیت کی دیوار میری اپنی تعمیر کردہ تھی لیکن اسے ڈھانا میرے بس میں نہ تھا۔

امتحانات کے بعد چھٹیاں تھیں۔ نیہا چھٹیوں میں اپنے کسی عزیز کے ہاں چلی گئی۔ میرے پاس اب ڈھیر سارا وقت ہوتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں یہ وقت نیہا کی سوچوں میں گزار دیتا۔ اس کی سوچوں سے تنگ آ کے میں نے کمپیوٹر کلاس میں داخلہ لے لیا۔ باقی وقت میں محل کے کاموں میں گزار دیتا۔ مجھے نیہا کی واپسی کا انتظار تھا لیکن وہ رزلٹ سے دو دن قبل ہی لوٹی۔ اسے دیکھ کے میں کھل اٹھا تھا لیکن اس کی بے نیازی ہنوز قائم تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے اس کی نگاہوں میں اپنے لیے نفرت دہکتی دکھائی دیتی۔ کچھ عرصہ قبل اس کی نگاہوں میں میرے لیے والہانہ پن ہوتا تھا جبکہ میری نظروں میں اس کے لیے نفرت مگر اب ہمارے جذبات الٹ رخ اختیار کر چکے تھے۔

رزلٹ والے دن میں بہت بے چین تھا۔ اس دن کو میرے مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس دن قدرت نے میرے لیے کتنا بھیانک فیصلہ کیا ہے۔

☆☆☆

مجھے رزلٹ کا پتا چلا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میرے چھیاسی فیصد نمبر تھے۔ میں یہ خوشی کی خبر کسی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا... میری ماں کے لیے میری کامیابی ہی اہم تھی، میرے چھیاسی فیصد نمبر اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ میری بہن اور بھائی بھی اس خوشی میں میرے ساتھ اس طرح شریک نہیں ہو سکتے تھے جیسی میری خواہش تھی۔ لے دے کے ایک نیہا ہی بچتی تھی جسے میں اپنی کامیابی کی خبر سنا کے خوشی محسوس کر سکتا تھا۔ وہ بھی رزلٹ کا پتا کرنے اپنے اسکول گئی ہوئی تھی۔ ان دنوں رزلٹ گزٹ پر یا اخبارات میں آتا تھا۔ اسکولز والے گزٹ کی کاپی یا اخبار خرید لیتے تھے اور طلبا کو نمبر ادھر سے ہی بتائے جاتے تھے۔ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ یہ خوشی شیئر کرنے کے لیے نیہا اسکول چلی گئی تھی ورنہ رزلٹ تو وہ گھر میں بھی چیک کر سکتی تھی جیسے میں نے چیک کیا تھا۔

میں گیٹ کے پاس کھڑا ہو کے بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ آج میرے پاس اس سے بات کرنے کا بہانہ تھا۔ آخر وہ لمحہ آ ہی گیا جب گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجا۔ میں طویل ڈرائیو وے پر اس رخ چلنے لگا جہاں نیہا کی گاڑی کو جا کے رکنا تھا۔ میں ایسے ظاہر کر رہا تھا جیسے میں بھی ابھی لوٹا ہوں۔ اس کی گاڑی میرے پاس سے گزری تو میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ گاڑی رکنے تک میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نیہا گاڑی سے نیچے اتری۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ وہ اندر کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ میں نے ہمت کر کے اسے پکارا۔

''نیہا!'' اس نے میری طرف دیکھا۔ اُف! کتنی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں۔ میری ساری ہمت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ہی نظر مجھ پر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ میں ایک ٹک کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔

امتحان میں کامیابی کی خوشی میں اس نے شام کو گھر پر ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا تھا، جس میں اس نے اپنی کلاس فیلوز اور کچھ عزیزوں کو مدعو کیا تھا۔ اس پارٹی کے اہتمام میں، میں بھی دوسرے ملازمین کے ساتھ شریک تھا۔ اس کے بچاسی فیصد نمبر تھے، یعنی مجھ سے کچھ کم۔ اس کی کامیابی پر سب خوش تھے، جبکہ مجھ سے کسی نے میرے رزلٹ کا پوچھا تک نہیں تھا۔ اس کے پاس دولت تھی، وہ یہ خوشی منا سکتی تھی۔ اپنی خوشی میں سب کو شریک کر سکتی تھی۔ میں غریب تھا۔ میں تو اپنی کامیابی کے متعلق کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مہنگے اسکولز اور اکیڈمیز میں پڑھنے کے باوجود مجھ سے پیچھے رہ گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ سب سے مبارکبادیں اور تحائف وصول کر رہی تھی۔ میرے لیے کسی کے پاس کہنے کو ایک لفظ تک نہ تھا۔ جس طرح نیہا نے اپنی پیدائش والے دن سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی تھی، اسی طرح آج کے دن پھر اس نے مجھے اور میری کامیابی کو اندھیرے میں دھکیل دیا تھا۔ آج کافی عرصے کے بعد میرے دل میں دوبارہ اس کے لیے نفرت جاگ گئی تھی۔ میں سارے کام چھوڑ کے اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ دروازہ بند کر کے میں اپنی چارپائی پر اندھیرے میں لیٹ گیا۔ میرے آنسو میرا تکیہ بھگونے لگے مگر کسی کو میری خبر تک نہ تھی۔ سب لوگ تو نیہا کی کامیابی کی خوشی منا رہے تھے۔

☆☆☆

''روشان، کدھر ہو؟'' میری امی کی آواز میرے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

کانوں میں پڑی تو میں نے تیزی سے اپنے آنسو صاف کیے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ دروازے سے اندر آنے والی روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے چہرے کے آگے اپنا ہاتھ رکھ لیا۔

''تم اِدھر چھپے بیٹھے ہو، اُدھر نیہا تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔'' ان کا جملہ میں نے حیرت سے سنا۔

''مجھے، کیوں ڈھونڈ رہی ہے وہ؟'' میں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ میرا دل بے طرح دھڑکا تھا۔

''میں نے اُسے بتایا کہ آج تمہارا بھی رزلٹ آیا ہے تو اس نے مجھے تمہیں بلانے کا کہا ہے۔ چلو اٹھو، اس کے سب مہمان بھی پہنچ گئے ہیں۔''

میں کچھ سوچ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ نیہا اور اس کی دوستیں لیونگ روم میں جمع تھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''روشان، مجھے ابھی پتا چلا کہ تم نے بھی میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ کیا ہوا تمہارے رزلٹ کا؟'' اس کے لہجے میں مجھے طنز کی رمق محسوس ہوئی۔

میں بلند آواز سے بولا۔ ''گورنمنٹ اسکول میں پڑھنے کے باوجود میں آپ سے ایک فیصد زیادہ نمبر لے گیا ہوں۔'' میرا طنزیہ لہجہ سن کے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

''واؤ۔'' کمرے میں کچھ ستائشی آوازیں ابھریں۔ اس کے تاثرات دیکھ کے مجھے کمینی سی خوشی محسوس ہوئی۔ اس نے لمحوں میں ہی خود کو سنبھال لیا۔

''اچھا، اپنا رول نمبر تو بتاؤ۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ میں نے اپنا رول نمبر اسے بتایا۔ اس نے پاس پڑا اخبار اٹھا لیا۔ اس کی دوستیں بھی اس کے اوپر جھک کے میرا رول نمبر تلاش کرنے لگیں۔

''یہ رہا، واہ...... اس کے تو تم سے آٹھ نمبر زیادہ ہیں۔'' اس کی ایک دوست چلا کے بولی۔

''مبارک ہو۔'' وہ مسکرا کے بولی۔ مجھے اس کی مسکراہٹ پھیکی اور مصنوعی لگی۔ میں بغیر کچھ کہے پلٹ آیا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کے اپنی چارپائی پر لیٹا ہی تھا کہ باہر سے شور کی آواز آئی۔

''روشان، دروازہ کھولو۔'' یہ نیہا کے بھائی ارمان کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میں نے حیرانی کے تاثرات لیے دروازہ کھولا۔ میری نظر ارمان اور اس کے پیچھے کچھ ملازمین پر پڑی۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ ارمان مجھے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ سیدھا میری چارپائی کی طرف گیا۔ میں حیرانی کے باعث کچھ بول ہی نہ پایا۔ اس نے چارپائی کے پاس پہنچ کے تکیہ اٹھا کے دور پھینکا۔ پھر اس نے چادر اور رلائی ایک جھٹکے سے اٹھائی۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ رلائی اٹھاتے ہی وہ چلایا۔

''یہ ہے موبائل۔'' وہ پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موبائل فون تھا۔ میں حیرانی سے اس کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھنے لگا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور ایک دم ہی میرے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔

''چور، تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہمارے گھر سے چوری کرنے کی۔'' وہ چلا رہا تھا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ میرے حواس جیسے مختل ہو کے رہ گئے تھے۔

''میں ابھی جا کے پاپا کو بتاتا ہوں۔ وہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ پھر تمہیں پتا چلے گا کہ چوری کی سزا کیا ہوتی ہے۔'' وہ چیخنے لگا۔ اتنے میں میری امی بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ وہ اس کے پاؤں پڑ گئیں۔

''معاف کر دو میرے بیٹے کو۔ اسے پولیس کے حوالے نہ کرنا۔'' وہ اس کے پاؤں پکڑ کے گڑگڑانے لگیں، تو ایک دم جیسے مجھے ہوش آ گیا۔

''امی، یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔ میں نے چوری نہیں کی۔'' میں دکھ سے بولا۔

''تو چپ رہ...... ذلیل، کمینے......'' وہ میری طرف دیکھ کے نفرت سے بولیں۔ ارمان ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں چھڑا کے آگے بڑھا۔ امی اس کی ٹھوکر سے پیچھے جا کے گریں۔

''یہ مجھے اب اِدھر نظر نہ آئے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ میری نظر باہر کھڑے ملازمین پر پڑی۔ ان کی آنکھوں میں بھی میرے لیے نفرت تھی۔ کل تک جو لوگ میری سچائی اور فرمانبرداری کے گن گاتے تھے، آج مجھے نفرت سے گھور رہے تھے۔ اس سب کی ذمے دار نیہا تھی۔ اسے میری کامیابی ہضم نہ ہوئی تھی۔ اس نے اتنے بھیانک طریقے سے مجھ سے اپنا انتقام لیا تھا۔ میں نے پل بھر میں ہی ساری کڑیاں جوڑ لیں۔

''یہ...... یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ میں نے تو یہ موبائل دیکھا ہی اب ہے۔'' میں

بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''موبائل تمہارے پاس سے برآمد ہوا، تب بھی تم کہہ رہے ہو تم نے چوری نہیں کی۔'' ایک ملازم طنزیہ انداز میں بولا۔

''چاچا، آپ تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں چوری جیسی گھٹیا حرکت بھلا کیسے کرسکتا ہوں۔'' میرا سینہ غم سے جیسے پھٹنے لگا تھا۔

''تم صفائیاں دینے سے بہتر ہے، مالکوں سے معافی مانگ لو۔ ہوسکتا ہے تمہیں معافی مل جائے۔'' اس نے میری بات کا یقین کرنے کے بجائے مشورہ دے دیا۔

''کس چیز کی معافی ...... میں جو کہہ رہا ہوں۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی۔'' میں چلّایا، مگر امیروں کے مقابلے میں بھلا مجھ جیسے غریب کی کوئی کیا سنتا۔ وہ مجھے برا بھلا کہتے رخصت ہوگئے۔

میرا بھائی اور بہن امی کو اٹھا رہے تھے۔ میں اُن کی طرف بڑھا۔ ''چلیں امی، ہم یہاں نہیں رہیں گے۔'' میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

انہوں نے میری طرف اتنے تنفر سے دیکھا کہ میرا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔

''امی، آپ کو بھی میری بات کا یقین نہیں ہے۔ یہ اس نیہا کی سازش ہے۔ میں نے اس سے زیادہ نمبر لیے، اسے یہ بات ہضم نہیں ہوئی۔ اس لیے اس نے اپنے بھائی کو ادھر بھیج دیا۔ مجھے یقین ہے موبائل وہ خود ساتھ لایا تھا۔ وہ تو ویسے بھی مجھ سے خار کھاتا ہے۔''

امی جن کی وجہ سے نیہا کے لیے میرے دل میں نفرت کی جڑ پیدا ہوئی تھی۔ آج نیہا کے خلاف بھی میری بات برداشت نہ کرسکیں۔ وہ چلّائیں۔ ''دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔ چوری کرکے اب بہانے بناتا ہے۔ تم نے ہمارے بارے میں بھی نہ سوچا کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔''

''انہوں نے تو جو کرنا تھا کرلیا اور کیا کریں گے۔ آپ چلیں، ہم ادھر نہیں رہیں گے۔''

''ابھی تو انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ بہتر ہے تو یہاں سے چلا جا، میں اپنے بچوں کو لے کے یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔ معافی مانگ لوں گی مالکوں کے پیر پکڑ کے۔'' ان کی بات سن کے میرے دل میں ہوک اٹھی۔ انہوں نے تو مجھے اپنے بچوں کی لسٹ سے بھی خارج کردیا تھا۔

''آپ کسی کے پیر نہیں پڑیں گی۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں میں نے چوری نہیں کی۔'' اس بار میں بھی خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔ میں زور سے چلایا۔

''یہ تو کہہ رہا ہے ناں، اتنے سارے لوگوں نے ارمان کو تیرے تکیے کے نیچے سے موبائل اٹھاتے دیکھا۔ اب بہتر ہے یہاں سے چلا جا۔ نہیں تو میں تجھے دھکے دے کے اس گھر سے نکال دوں گی۔''

میں نے ہر طرح سے امی کو یقین دلانے کی کوشش کی لیکن نہ انہیں میری بات کا یقین آیا نہ میرے بہن اور بھائی کو۔ آخرکار مجبور ہو کے میں اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ سب لوگ نیہا کی پارٹی میں معروف تھے۔ میں سرونٹ کوارٹرز کے ساتھ بنے چھوٹے گیٹ سے باہر آگیا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک میرے دل میں نیہا کی محبت کا جو پودا لگا ہوا تھا، نفرت کے زہر سے ایک لمحے میں مرجھا گیا۔ نفرت کا درخت میرے دل میں پھر سے ہرا بھرا ہوگیا۔ میں نے سفید محل پر آخری نظر ڈالی۔

نیہا بی بی ...... زندگی رہی تو میں اپنی اس بے عزتی کا بدل لوں گا تم سے۔ میں نے دل ہی دل میں عزم کیا اور ٹوٹے دل اور تھکے قدموں کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

میں رک کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مدثر ہمدردانہ انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

''تو آپ کی لو اسٹوری شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔'' وہ تاسف سے بولا۔ میں اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

''لگتا نہیں تھا کہ نیہا اتنی سازشی اور حاسد طبیعت کی بھی ہوسکتی ہے۔ میرے ذہن میں تو اس کا بہت معصوم اور سوفٹ سا امیج بن چکا تھا مگر اس کمینی نے تو آپ کے گھر والوں کی نظروں سے گرا کے آپ کو بھری دنیا میں تنہا کر دیا۔'' وہ نفرت سے بولا۔

''انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔'' میرا لہجہ فلسفیانہ تھا۔

''وہ آپ کا اتنا خیال رکھتی تھی پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''میرا اُسے کہنا کہ آئندہ مجھے مخاطب نہ کرے، بہت بری طرح کھلا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے بھی بات نہ کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔''

''تو کیا اس نے آپ سے اپنی توہین کا بدلہ لیا تھا یا حسد کی وجہ سے اس نے آپ کو پھنسایا۔''

''یہ تمہیں آخر میں ہی پتا چل سکتا ہے۔'' میں کرسی سے اٹھتے ہوئے مسکرا کے بولا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے میں تھک چکا تھا۔ اس لیے کمبل سمیٹتے ہوئے بیڈ کی طرف بڑھا۔

''آپ سونے لگے ہیں؟'' مدثر متحیر سے انداز میں بولا۔

اس کا انداز دیکھ کے میں مسکرایا۔ ''ہاں یار، اب نیند آنے لگی ہے۔''

''یہ نہیں ہوسکتا، میں پوری کہانی سنے بغیر آپ کو سونے نہیں دوں گا۔'' وہ بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

میں بیڈ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کے بولا۔ ''تو پھر بتائیں، آپ گھر سے نکلنے کے بعد کہاں گئے؟ مجھے تو لگتا ہے، آپ کسی غلط راہ پر چل پڑے تھے، تبھی آپ کے پاس اتنی دولت آئی۔'' اس کا انداز میرے لبوں پر مسکراہٹ لے آیا۔

☆☆☆

میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا تھا؟ کیا اس لیے کہ میں نے نیہا سے نفرت کا جرم کیا تھا یا اس لیے کہ میں نے ایک معمولی گورنمنٹ اسکول میں پڑھ کے بھی ایک امیر زادی سے زیادہ نمبر لے لیے تھے؟

میرا یقین کسی نے کیوں نہیں کیا؟ کیا اس لیے کہ میں غریب ہوں، ایک معمولی ملازم کا بیٹا ہوں؟ اور میرا... مدمقابل سفیان علی کا بیٹا تھا، ایک امیر شخص کا بیٹا؟ میرے قدم خودکار طریقے سے اٹھتے جارہے تھے اور میرا ذہن اسی اُدھیڑبن میں لگا تھا۔ نیہا اور میرے بیچ جو تفاوت تھا، مجھے وہ بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ میں ایسا سوچ رہا تھا۔ میری سوچ میری عمر کے عین مطابق تھی۔

میں آخر کار اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ نیہا سے نفرت ہی میرا واحد جرم ہے، جس کی مجھے یہ سزا ملی۔ یہ انکشاف تو مجھ پر ایک عرصے کے بعد ہوا تھا کہ مجھے نیہا سے نفرت کی نہیں محبت کی سزا ملی تھی۔

مدثر چونکا۔ اس نے کچھ بولنے کا فیصلہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ وہ شاید کہانی کی روانی متاثر ہونے کی وجہ سے خاموش ہوگیا تھا۔

☆☆☆

زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر رواں ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا، میں نے اسے اپنی کمزوری نہیں بننے دیا بلکہ اسے اپنی طاقت بنالیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھے اپنا مقام بنانا ہے۔ ایسا مقام کہ پھر سے کسی امیر کے مقابلے میں میری بات صرف اس لیے رد نہ کردی جائے کہ میں غریب ہوں۔ یہ مقام میں اپنی محنت سے، جائز راستے پر چل کے بنانا چاہ رہا تھا۔ یہ کام مشکل ضرور لیکن ناممکن نہیں تھا۔

اُس دن میرے ایک دوست نے میری مدد کی تھی۔ اس کا ایک معمولی درجے کا چھپر ہوٹل تھا۔ مجھے وہاں بطور ویٹر ملازمت بھی مل گئی اور رہنے کی جگہ بھی۔ میں چند دن ادھر ہی رہا اور پھر کالج کے ہاسٹل شفٹ ہوگیا۔ کالج میں داخلہ مجھے اسکالرشپ پر ملا تھا۔ ہاسٹل میں رہائش فری تھی۔ میں کلاس کے بعد ہوٹل چلا جاتا۔ رات دس بجے تک وہاں مصروف رہتا اور رات کو آ کے پڑھائی کرتا۔ میری زندگی انتہائی مصروف ہوچکی تھی، اور یہ مصروفیت ہی تھی جس نے میرے دل پر لگے زخموں کو مندمل کرنے میں مدد دی۔

میں چند دن بعد اپنے بھائی سے اس کے اسکول میں ملنے گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ امی نے بیگم سفیان علی کے پاؤں پکڑ کے معافی مانگ لی تھی، لیکن اس کے بقول امی میری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہ تھیں۔ ''مالکوں'' نے بھی انہیں کہہ دیا تھا کہ اگر انہوں نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی تو ان کا بوریا بستر وہاں سے گول کردیا جائے گا۔ میں ان کے مسائل میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے فی الحال انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

وقت کا پہیا چلتا گیا۔ کچھ عرصہ ہوٹل کی ملازمت کے بعد میں نے ہوم ٹیوشنز پڑھانا شروع کردی تھیں۔ یہ ٹیوشنز مجھے اپنے ایک پروفیسر کے توسط سے... ملی تھیں۔ چار سال بعد آخر وہ دن آ ہی گیا، جس کے لیے میں نے اتنی تگ و دو کی تھی۔ میں نے بی کام میں بورڈ میں ٹاپ کیا تھا۔ میرا نام اور تصویر اخبارات کی زینت بنی۔ اس دن میں انتہائی خوش تھا۔ میں نے نیہا سے متعلق معلومات حاصل کی ہوئی تھیں وہ بھی بی کام ہی کررہی تھی۔ میرے ٹاپ کرنے کی خبر یقیناً اس تک بھی پہنچی تھی --- میں نے ایک بار پھر اسے شکستِ فاش سے دوچار کیا تھا، لیکن اس بار میں اس کی پہنچ سے دور تھا۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ وہ تو یہاں تک بھی میرے پیچھے آگئی تھی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ میں ہاسٹل میں اپنے کمرے میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو میرا

روم میٹ سجاد کھڑا تھا۔ ''کامن روم میں آئیں۔ آپ کی ملاقات آئی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''یار، میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں اور مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔'' وہ اکثر ایسے مذاق کرتا رہتا تھا، اس لیے میں بیزاری سے بولا۔

''قسم لے لے یار، بڑی پٹاخا قسم کی لڑکی ہے۔'' وہ آنکھ میچ کے بولا۔

''مطلب پکا مذاق ہے۔'' میں بیزاری سے بیڈ پر جا کے بیٹھ گیا۔

''نہ مان، ابھی کوئی ملازم آ کے اطلاع دے دے گا۔'' وہ کندھے اچکا کے بولا۔

''جب ملازم اطلاع دینے آئے گا تو چلا جاؤں گا۔'' میں نے لیٹ کے تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

''گویا مجھ سے زیادہ تجھے ملازم کی بات پر اعتبار ہے؟'' وہ مصنوعی تاسف سے بولا۔

''ہاں۔'' میں نے مختصر جواب دینے میں ہی عافیت جانی۔

''ٹھیک ہے بھائی نہ کر میرا اعتبار مگر اتنے حسین مہمان کو انتظار نہیں کراتے۔ میری ایسی ملاقات آئے تو میں تو سر کے بل اچھلتا کودتا چلا جاؤں۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارے حسین مہمان۔ ٹھرکی نہ ہو تو......'' میں جھلّا کے بولا۔

اتنے میں ملازم نے مجھے مہمان کی آمد اطلاع دی۔ سجاد مجھے معنی خیز انداز میں دیکھنے لگا۔ میں اسے غصے سے گھورتا چلا گیا۔

وہ واقعی کوئی لڑکی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کے لمبے بال آبشار کی طرح اس کی کمر پر پھیلے تھے۔

میں گھوم کے اس کے سامنے پہنچا تو میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یہ وہ لڑکی تھی...... جس سے میں نے زندگی میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی، اور یہ وہ لڑکی بھی تھی، جس سے میں نے سب سے زیادہ محبت کی تھی۔ جی ہاں، وہ نیہا تھی۔

میں اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا جسم تھوڑا سا بھر گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ آج بھی اسی طرح تر و تازہ تھی جیسے میں اسے چھوڑ کے آیا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیسے ہو روشان؟''

''لگتا ہے، میری کامیابی تمہیں اس بار بھی ہضم نہیں ہوئی لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ اِدھر تمہارا کوئی ڈراما نہیں چلے گا۔'' میں بلند آواز میں بولا۔

''میں...... میں تو بس تمہیں مبارکباد دینے آئی تھی اور معذرت کرنے...... اُس دن جو کچھ بھی ہوا تھا، اس پر میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تم نے موبائل نہیں چرایا تھا۔'' وہ نظریں جھکا کے بولی۔

''بڑی جلدی یاد آئی تمہیں مبارکباد کی۔'' میں نے طنز کیا۔

''میں نے تمہاری امی سے بارہا تمہارا پتا پوچھا لیکن انہوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ وہ تو مجھے اخبار سے تمہارے کالج کا پتا چلا تو......''

''تو تم ایک بار پھر مجھ پر کوئی جھوٹا الزام لگانے چلی آئیں۔'' میں اس کی بات کاٹ کے تلخی سے بولا۔

اس نے نظریں اٹھا کے مجھے دیکھا۔ ''کتنے بدگمان ہو تم......'' اس نے شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''میں نے تم پر کوئی جھوٹا الزام نہیں لگایا تھا۔ مجھے تو خود کافی عرصے بعد پتا چلا تھا کہ تم نے چوری نہیں کی تھی۔''

''نیہا بی بی، بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تمہاری وجہ سے میں اپنی ماں سے، اپنے بھائی اور بہن سے دور ہوا۔ تمہاری معذرت سے اب سب کچھ پہلے جیسا نہیں ہوسکتا۔ نہ میری ماں کا دل صاف ہوسکتا ہے، نہ وہ چار سال لوٹ کے آسکتے ہیں جو میں نے اُن کے بنا کاٹے۔''

''اُن کا دل میں نے صاف کر دیا ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں لیکن وہ تمہارا پتا ہی نہیں جانتیں۔ میں آج انہیں تمہارے بارے میں جا کے بتا دوں گی۔ وہ تم سے ملنے...... آجائیں گی۔''

''ہم...... تو تمہارے ذہن میں مجھے پھنسانے کے لیے اس بار کوئی نیا منصوبہ چل رہا ہے۔'' میں لفظوں کو چباتے ہوئے بولا۔

اس نے تڑپ کے مجھے دیکھا۔ ''خدا کے لیے میرے حوالے سے بدگمانی چھوڑ دو۔ تم جانے کیوں بچپن سے ہی مجھ سے بدگمان ہو، حالانکہ میں نے تو ہمیشہ تمہارا خیال رکھنے کی کوشش کی۔ تم پر چوری کا جو جھوٹا الزام آیا، میں اس کے لیے بھی ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ میں مانتی ہوں، اس سے تمہیں جو نقصان ہوا، تمہیں جو تکلیف پہنچی، اس کی تلافی نہیں ہوسکتی لیکن اس کا ازالہ تو ہوسکتا ہے۔''

''مثلاً، کیسے اس سب کا ازالہ ہوسکتا ہے؟'' میں طنز

سے بولا۔

''میں تمہیں پاپا سے کہہ کے اپنی ہی کسی فرم میں اچھی سے اچھی جاب دلاسکتی ہوں۔ تمہارے گھر والوں سے مل سکتی ہوں، تم ابھی میرے ساتھ چلو، میں تمہارے سامنے اُن سے معافی مانگوں گی۔''

''نہیں نیہا، تم مجھے دوسری دفعہ نہیں ڈس سکتیں۔ تم نے مجھے ایک بار ڈسا تھا، اس کا زہر ابھی تک میری زندگی میں بھرا ہے۔ میں تم پر مر کر بھی اب اعتبار نہیں کرسکتا۔'' میں سختی سے بولا۔

اس نے مجھے اپنے دام میں لانے کی بھرپور کوشش کی لیکن میں نے اس کا ہر حربہ ناکام بنا دیا۔ وہ مایوس ہو کے چلی گئی۔ میں خوش تھا کہ اس بار میں اس کے دام میں نہیں آیا۔ اس کا ادراک مجھے ایک عرصے کے بعد ہوا کہ میں نے اس کی پیشکش ٹھکرا کے غلطی کی تھی۔

☆☆☆

اس کے جانے کے بعد میں اس کے رویّے پر غور کرتا رہا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ہوسکتا ہے وہ سچ کہہ رہی ہو۔ میں اپنے گھر والوں سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ ان سے مل کر کسی حد تک حقیقت کا اندازہ ہو جائے گا لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس پر کسی طرح اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ زیادہ چانس یہی تھا کہ وہ میری بورڈ میں پوزیشن لینے سے حسد کا شکار ہوگئی ہے اور مجھے کسی مشکل میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس سے نفرت تھی یا اس پر بے اعتباری، میں گھر والوں سے ملنے گیا ہی نہیں۔

کالج کے ہاسٹل میں رہنا اب ممکن نہیں تھا میں نے ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں کمرا لے لیا اور جاب کے حصول میں جت گیا۔ بہت سی جگہوں پر میں نے سی وی جمع کرائی ہوئی تھی۔ بعض جگہوں پر انٹرویو بھی دیے تھے لیکن بات بنتی نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک ماہ کی سرتوڑ کوشش کے بعد بھی نتیجہ صفر ہی تھا۔ میری بی کام میں پوزیشن بھی اتنی اہم نہیں تھی جتنی اہم سفارش اور رشوت تھی۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ٹھیک جگہ پر ٹھیک لوگ نہیں ہوتے جس کی وجہ سے مسائل ہیں کہ روز بروز بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

اس سے قبل کہ میں مایوس ہو جاتا، مجھے ایک کال آگئی۔ اس کال کے بعد میں پیسوں میں کھیلنے لگا۔ مجھے وہ مقام مل گیا جس کی مجھے آرزو تھی۔ لوگ اب مجھ پر اعتبار کرتے تھے۔ اب کوئی نیہا یا ارمان مجھے اپنے گندے منصوبے سے نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے لیکن یہ میری بھول تھی۔ ایک واقعہ ایسا رونما ہوا کہ میں سب کی نظروں سے گر گیا۔ اس بار بھی مجھے پھنسانے میں اہم کردار نیہا کا ہی تھا۔ اس بار میں بُرا پھنسا تھا، معافی کی کوئی گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔

☆☆☆

اس دن میں شہر کے ایک مہنگے اور معروف ریستوران میں بیٹھا تھا۔ میری نظریں بار بار بے چینی سے دروازے کی طرف اُٹھتیں لیکن جس کا مجھے انتظار تھا، وہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ وہ میری کال بھی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میں مایوس ہو کر اٹھنے ہی لگا تھا کہ چونک گیا۔

دروازے سے نیہا اور ارمان اندر داخل ہو رہے تھے۔ نیہا کو دیکھ کے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ آج بھی اسی طرح حسین نظر آرہی تھی۔ میرا دل اسے دیکھ کے عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔

وہ میرے پاس ہی ایک ٹیبل پر آکے بیٹھ گئے۔ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ نیہا کی میری طرف پشت تھی۔ ارمان اس کے سامنے بیٹھا تھا لیکن سامنے نیہا کے ہونے کی وجہ سے وہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں اس وقت جس کام کے پیشِ نظر یہاں موجود تھا، ان دونوں کی موجودگی مجھے بُری طرح کھلی تھی۔

میں نے ریستوران کا جائزہ لیا۔ دروازے کے سامنے اور کوئی ٹیبل خالی نہیں تھی۔ مجبوراً میں اِدھر ہی بیٹھ کر اپنے ملاقاتی کا انتظار کرنے لگا۔ میں کن انکھیوں سے نیہا کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کے میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اس سے میرا رشتہ عجیب تھا۔ میں جب اس سے نفرت کرتا تھا تو وہ میرے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ اسے میری توجہ چاہیے تھی لیکن جب میرے دل میں اس کے لیے محبت جاگی تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگ گئی۔ اس کی نفرت نے مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ ابھی بھی اسے دیکھ کے جانے کیوں میرا دل اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنے دل پر اپنا کنٹرول کھو بیٹھتا، دروازے سے وہ ہستی اندر داخل ہوئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ یہ میرا ایک کلائنٹ ظفر تھا۔

وہ مجھے دیکھتے ہی تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں نے کھڑے ہو کے اس کا استقبال کیا۔ اس نے دیر سے آنے پر معذرت کی۔ اس کے بقول اس کا سیل فون سائلنٹ پر لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ میری کال نہیں سن سکا۔ یہ وہ معروف بہانہ ہے جو ہم میں سے اکثر لوگ ایسے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

موقعوں پر کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگلے بندے کو ہمارا اعتبار نہیں کرنا۔ میں بھی جانتا تھا کہ اس نے بہانہ ہی گھڑا ہے لیکن میں نے اسے جتلانا ضروری نہیں سمجھا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں اصل موضوع کی طرف آگیا۔ اب میرا سارا دھیان اسی کی طرف تھا، نیہا کی وہاں موجودگی میں مکمل طور پر فراموش کر چکا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب وہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔ میری نظر تو اس کی ٹیبل پر اس وقت پڑی جب میں ظفر کے ساتھ وہاں سے اٹھا تھا۔

میں اس وقت سرشاری کی کیفیت میں تھا، ظفر سے میری ملاقات کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اصل مقصد تو ظفر نے اس ملاقات سے حاصل کیا تھا۔

☆☆☆

''اُف، آپ نے تو بہت زیادہ سسپنس پیدا کر دیا۔'' میرے رکتے ہی مدثر بولا۔

''مجھے لگا تمہیں بوریت ہونے لگی ہے اس لیے سسپنس پیدا کر دیا۔'' میں ہنسا۔

''ارے نہیں، میں تو پوری دلچسپی سے آپ کی کہانی سن رہا ہوں۔ سب کچھ تو ہے اس کہانی میں، محبتیں، نفرتیں، عداوتیں، سازشیں، دکھ، خوشی...... اور سسپنس۔ میں بھلا کیوں بور ہوں گا۔''

''چلو، اچھا ہے پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیسے میں جیل گیا۔''

''کیا؟ آپ کو جیل ہو گئی؟'' وہ بھونچکا رہ گیا۔

''کیوں، کیا مجھے جیل نہیں ہو سکتی؟ جیل تو بنی ہی غریبوں کے لیے ہے۔'' میں تلخی سے بولا۔

''آپ غریب کہاں رہے تھے، آپ تو پیسوں میں کھیل رہے تھے؟'' وہ اچنبھے سے بولا۔

''پیسوں میں تو کھیل رہا تھا مگر بدقسمتی سے وہ پیسے میرے نہیں تھے۔''

''تو وہ فون کال...... اوہ ہاں، شروع میں تو آپ نے بتایا تھا کہ سیلولر کمپنی سے آنے والی کال نے آپ کی زندگی بدل دی تھی۔ ابھی آپ اسی فون کال کا ذکر کر رہے تھے ناں۔'' وہ خیالات کے تانے بانے جوڑتے ہوئے بولا۔

''نہیں، یہ وہ فون کال نہیں تھی۔'' میں مسکرا کے بولا۔

''اُف، آپ نے زیادہ ہی اُلجھا دیا ہے۔ میرے خیال میں یہاں تک آپ ساری کہانی کلیئر کر دیں پھر آگے چلیں۔''

''چلو، تمہاری فرمائش پوری کر دیتے ہیں۔'' میں ایک بار پھر اپنی کہانی کی اُلجھی گرہیں کھولنے لگا۔

☆☆☆

یہ فون کال جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا، ایک بینک کی طرف سے تھی۔ اس بینک میں، میں نے نوکری کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ مجھے کیشئر کی نوکری مل گئی تھی۔ میں پیسوں سے کھیلنے لگا۔ تین سال بعد ہی میری ترقی آپریشن منیجر کے طور پر ہوگئی۔ مزید دو سال بعد مجھے برانچ منیجر بنا دیا گیا۔ لوگ کروڑوں کی رقوم میرے پاس رکھنے کے لیے لاتے تھے۔ گویا وہ مجھ پر اعتبار کرتے تھے۔ مجھے وہ مقام مل گیا تھا جس کی میں نے کبھی خواہش کی تھی۔ بینک کی روٹین انتہائی ٹف تھی۔ اس ٹف روٹین میں، میں اپنی ماں اور بہن بھائی کو بھی بھول چکا تھا۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میری نظر لائن میں لگے ایک نوجوان پر پڑی۔ اس کا سائڈ پوز مجھے نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنا رخ میری طرف پھیرا تو میرے دل کی دھڑکن اعتدال سے تجاوز کر گئی۔ وہ میرا بھائی عثمان تھا۔

میں نے اسے اندر بلا لیا۔ مجھے دیکھ کے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''روشان بھائی، آپ؟'' وہ ٹکر ٹکر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ آج دس سال بعد میں اپنے ماں جائے سے مل رہا تھا۔

''امی کیسی ہیں اور انعم؟ اب تو وہ بھی کافی بڑی ہو گئی ہوگی؟'' میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ بولا۔

''امی ٹھیک ہیں، بس ہر وقت آپ کو یاد کرتی رہتی ہیں۔ نیہا نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اس دن آپ نے چوری نہیں کی تھی۔ اس نے ان سے معذرت کی۔ وہ ہمیں آپ سے ملانے آپ کے ہاسٹل بھی لے گئی تھیں لیکن آپ تب تک ہاسٹل چھوڑ چکے تھے۔ اس کے بعد میں نے آپ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی، مگر......'' وہ انکشاف پر انکشاف کیے جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا نیہا نے سچ کہا تھا لیکن اپنی آنکھوں پر لگی بدگمانی کی پٹی کی وجہ سے مجھے اس کا سچ بھی جھوٹ ہی لگا تھا۔ عثمان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اس سے پہلے امی اگر آپ کو یاد بھی کرتی تھیں تو اظہار نہیں کرتی تھیں لیکن نیہا کے بتانے کے بعد وہ دن رات آپ کو یاد کرتے ہوئے روتی رہتی ہیں۔ آپ کیوں نہیں ہم سے ملنے آئے، آخر اتنی بھی کیا بے اعتنائی؟'' آخر اس نے شکوہ کر ہی دیا تھا۔

''کیسے آتا، تم جانتے تو ہو میں نے کتنی بار امی سے ملنے کی کوشش کی مگر وہ میری شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ انہیں کم از کم ایک بار مجھے بھی تو سب بتانے کا موقع دینا چاہیے تھا۔ میں چلّا چلّا کے کہتا رہا تھا کہ میں چور نہیں ہوں لیکن انہوں نے میری بات کا اعتبار نہیں کیا تھا۔ وہ ابو سے شکوہ کناں رہتی تھیں کہ وہ نیہا کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن انہوں نے بھی میرے مقابلے میں اسی کو زیادہ اہمیت دی۔ انہیں بھی اپنے بیٹے سے زیادہ نیہا پر ہی اعتبار ہے۔ مجھے افسوس ہوا ہے یہ جان کر......'' میں تلخی سے بولا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز رندھ گئی تھی۔

''ایسا نہیں ہے۔ انہیں آپ پر اعتبار تھا لیکن شاید نصیب میں یہی سب لکھا تھا۔ خیر جو ہوا سو ہوا، اب آپ کو امی سے مل کے سارے شکوے شکایات دور کر لینے چاہئیں۔''

میں اس کی بات سے متفق تھا۔ کچھ دن بعد ہی، میں نے امی، عثمان اور انعم کو اپنے پاس بلا لیا۔ انعم پرائیویٹ گریجویشن کر رہی تھی۔ عثمان اس دن اس کی فیس جمع کرانے ہی بینک آیا تھا، جبکہ عثمان گریجویشن کرنے کے بعد سفیان صاحب کی کمپنی میں سپروائزر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس سے وہ نوکری چھڑوا دی۔ اب وہ ایک اور فرم میں بطور اسسٹنٹ منیجر کام کر رہا تھا۔ دس سال کے بعد ایک بار پھر ہم سب اکٹھے تھے۔ اب میری زندگی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن تھا مگر نیہا کے نظر آتے ہی میری زندگی پھر بھنور میں پھنس گئی۔

☆☆☆

بینک جاب میں، میں انشورنس بھی ڈیل کرتا تھا، انشورنس کا اضافی کمیشن بھی ملتا تھا۔ لیکن بینک کی طرف سے کسی کی انشورنس کرنے کی صورت میں کمیشن کم ملتا تھا۔ کچھ ماہ پہلے ہی میں ایک اور انشورنس کمپنی کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا گو کہ یہ بینکنگ قوانین کے خلاف تھا لیکن دوسری کمپنی سے کمیشن بہت اچھا ملتا تھا، اس لیے پارٹ ٹائم میں اس کے لیے کام کرتا تھا۔ برانچ منیجر ہونے کی وجہ سے مجھے تمام لوگوں کے اکاؤنٹس کے متعلق آگاہی تھی۔ میں لوگوں کو پالیسیز بیچنے کے لیے ان معلومات سے استفادہ کرتا تھا۔ دوسری کمپنی سے میں کمیشن کی مد میں اتنا کما لیتا کہ بعض

اوقات تو یہ کمیشن میری تنخواہ سے بھی بڑھ جاتا۔ اس لیے میں انشورنس کو خصوصی توجہ دیتا تھا۔

ظفر تگڑی پارٹی تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں کئی کروڑ کی رقم کافی عرصے سے محفوظ تھی۔ میں اسے ایک پالیسی لینے پر تیار کر رہا تھا۔ وہ نیم رضامند تھا۔ بینک میں بات کرتے ہوئے خلل پڑتا رہتا تھا۔ علاوہ ازیں وہاں دوسری کمپنی کے کاغذات رکھنے میں بھی خطرہ تھا۔ اس لیے میں نے اسے باہر مدعو کیا تھا۔ وہ پالیسی لینے پر تیار ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے ڈاکومینٹس سائن کرا لیے۔ میں بہت خوش تھا۔ اس نے ایک بڑی پالیسی کے لیے رضامندی دی تھی۔ اس پالیسی کا کمیشن میری بینک کی ماہانہ تنخواہ سے بھی زیادہ تھا۔

کھانا کھانے کے بعد آئس کریم کا دور چل رہا تھا۔

''میں امریکا رہ کر آیا ہوں، وہاں بینکوں میں بہت سیکیورٹی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ڈاکا زنی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں، جبکہ یہاں میں نے دیکھا ہے کہ ایک نمائشی گارڈ کے علاوہ سیکیورٹی کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود یہاں ڈکیتیوں کا ریشو وہاں سے کم ہے۔'' ظفر آئس کریم کھاتے ہوئے بولا۔ اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔

''سیکیورٹی تو یہاں بھی ہے۔ بس وہ نظر نہیں آتی۔'' میں مسکرا کے بولا۔

''اچھا...... اِدھر تو بس سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوتے ہیں، اور میرے خیال میں وہ ڈاکوؤں کے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں کھڑا کرتے ہوں گے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

''صرف کیمرے نہیں ہوتے، کچھ اور بھی بندوبست ہوتا ہے۔'' میں ایک بار پھر مسکرایا۔

''مثلاً بہت ہوا تو کوئی خفیہ بٹن لگا ہوگا، جو دبانے سے کہیں پولیس چوکی میں الارم بجتا ہوگا، مگر اس روڈ پر تو اتنا رش ہوتا ہے کہ پولیس کے پہنچتے پہنچتے ڈاکو سکون سے پیدل چل کر بھی جا سکتے ہیں۔'' اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

مجھے غصہ آنے لگا۔ اس گھامڑ کو پتا ہی نہیں تھا کہ ہمارا ملک امریکی بینکس سے سیکیورٹی میں بیشک پیچھے سہی، لیکن یہاں بھی بینکوں میں ڈاکا ڈالنا اتنا آسان نہ تھا۔ میں نے اپنا غصہ کنٹرول کیا۔ وہ میرا کلائنٹ تھا۔ اس سے مجھے بہت بڑے فائدے کی توقع تھی، اس لیے اس سے تلخی نہیں کر سکتا تھا۔ میں زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کے اسے سیکیورٹی کے خفیہ انتظامات کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ بے پروائی سے سننے لگا۔ بیچ میں وہ کوئی استہزائیہ کمنٹ بھی کر دیتا۔ میں اسے جوش میں سب بتاتا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ یہ ساری باتیں وہ عمومی طور پر نہیں کر رہا بلکہ اس نے بڑے طریقے سے مجھ سے یہ ساری معلومات اگلوائی تھیں۔

☆☆☆

ظفر سے میری ملاقات کو تین دن ہو گئے تھے۔ اس دوران روزانہ ہی میں اسے کال کرتا۔ کہ پالیسی سے متعلق دیگر امور طے کر لیے جائیں لیکن وہ مصروفیت کا عذر پیش کر کے ہر بار ٹال دیتا۔

تیسرے دن میں آفس میں بیٹھا لنچ کر رہا تھا کہ مجھے کمرے سے باہر ہلچل نظر آئی۔ تین افراد تیزی سے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کا حلیہ مشکوک تھا۔ سب سے پیچھے نظر آنے والے فرد نے گارڈ کو ایک طرف ڈالا۔ جانے وہ بے ہوش تھا یا مر چکا تھا۔ میرا دورانِ خون تیز ہو گیا۔ گارڈ کو ایک طرف ڈالنے کے بعد اس نے دروازے پر لگی اوپن کلوز کی تختی کا رخ موڑا اور دروازے کے ساتھ لگا پردہ کھینچ دیا۔ اس کی اس حرکت سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لوگ بینک لوٹنے کی نیت سے اندر داخل ہوئے ہیں۔

میں تیزی سے اٹھا ہی تھا کہ تیز سیٹی کی آواز آئی۔ یہ آواز ایک چھوٹے سے بکس نما چیز میں سے آ رہی تھی۔ تینوں افراد کے چہروں پر اب ماسک نظر آ رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بینک میں موجود افراد گرنے لگے۔ بکس نما چیز سے شاید بے ہوش کرنے والی کوئی گیس خارج ہو رہی تھی۔ دو افراد کاؤنٹرز کی طرف بڑھ گئے جبکہ تیسرا تیزی سے میرے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر آ گیا۔

اس کے ہاتھ میں گن تھی، جبکہ دوسرے ہاتھ میں اس نے ایک گیس ماسک اٹھا رکھا تھا۔

اس نے نیلے رنگ کی شرٹ اور کالی پینٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے پر اس نے گیس ماسک پہن رکھا تھا۔ میں ہراساں نظروں سے اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ میرا دماغ سنسنانے لگا۔ کمرا کھولنے سے شاید کچھ گیس اندر بھی داخل ہو گئی تھی۔ وہ سیدھا تیزی سے میری طرف آیا تھا۔

اس نے ..... گیس ماسک میرے سر پر چڑھا دیا۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ پتا نہیں یہ گیس کے اثرات تھے، یا اس صورتِ حال کے جس کا مجھے سامنا تھا۔

''تجوری کی چابی نکالو۔'' وہ گن لہراتے ہوئے بولا۔

میں نے تھوک نگلا۔

''بہرے ہو تم، جلدی کرو۔'' وہ گن لہرا کے طیش سے بولا۔ میں نے ماؤف ذہن کے ساتھ دراز کھولا۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ دراز میں سے میں نے چابیوں کا گچھا نکالا۔ میں چابیاں ہاتھ میں لے کے اسے دیکھنے لگا۔

''دیکھ کیا رہے ہو؟ لاکر کھول کے چابی نکالو۔'' اس کا جملہ سن کے میں ششدر رہ گیا۔ اس کے پاس تو مکمل معلومات تھیں۔ میں کمرے کے ایک طرف بنے لاکرز کی جانب بڑھا۔ وہ میرے پیچھے تھا۔ میں نے لاکر کھولا۔ اس کے اندر ایک اور خفیہ خانہ بنا تھا۔ جو بظاہر دیکھنے سے نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے اس خانے سے تجوری کی چابیاں نکال کے اس کی طرف بڑھائیں۔

''چلو، تم خود ہی تجوری کھولو گے۔'' اس نے گن سے مجھے ٹھوکا دیا۔ گن کی نال کی چبھن اپنی پسلیوں میں محسوس کر کے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ میں مرے ہوئے قدموں سے تجوری والے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس دروازے کا لاک کھول کے ہم اندر داخل ہو گئے۔ باقی دونوں افراد تب تک کاؤنٹرز کے درازوں میں موجود سارا کیش نکال چکے تھے، لیکن اصل مال تو تجوری میں پڑا ہوا تھا۔ ان دو افراد میں سے بھی ایک فرد ہمارے پیچھے کمرے میں آ گیا۔ تجوری میں حفاظت کا دہرا انتظام تھا۔ اس پر ایک الیکٹرونک پاس ورڈ بھی لگا تھا۔ پاس ورڈ لگانے کے بعد چابی سے تجوری کھلتی تھی۔

میں نے پیشانی پر آیا پسینہ صاف کیا، اور تجوری کا پاس ورڈ ملانے لگا۔ میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ ایسی کسی صورتِ حال کا میں زندگی میں پہلی بار سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

پاس ورڈ اینٹر کرنے کے بعد میں نے چابیوں کے گچھے سے ایک چابی منتخب کر کے تجوری میں گھمائی۔ کلک کی آواز آتے ہی میری کنپٹی جھنجھنا اٹھی۔ ایک شخص نے گن میری کنپٹی پر بجائی تھی، میں لہرا کے گرا... میری آنکھوں کے آگے نیلے پیلے تارے ناچ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں میں ہوش و حواس سے مکمل بیگانہ ہو گیا۔ آخری منظر میں نے یہی دیکھا تھا کہ وہ تجوری سے نوٹوں کی گڈیاں نکال نکال کے ایک بریف کیس میں بھر رہے تھے۔

☆☆☆

مجھے ہوش اسپتال میں ہی آیا تھا۔ میرا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میں ابھی تک سوٹ میں ہی ملبوس تھا، مجھے ٹائی کی وجہ سے گھٹن ہو رہی تھی۔ میں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا، ایک نرس تیزی سے میری طرف لپکی۔

''پلیز، ابھی اٹھنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''کیسا فیل کر رہے ہیں آپ؟''

میں نے اسے سر میں ہونے والی تکلیف کے متعلق بتایا۔

''میں ابھی ڈاکٹر کو بلا کے لاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ میرے ذہن میں ڈکیتی کے سارے مناظر گھومنے لگے۔ میرے اندازے کے مطابق ڈاکو کم و بیش چار کروڑ کی رقم لے اُڑے تھے۔

اچانک دروازہ کھلا اور دو پولیس والے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا۔ پولیس والے مجھ سے بیان لینے لگے۔ میں نحیف آواز میں بولتے ہوئے اپنا بیان ریکارڈ کرانے لگا۔ میں نے بلا کم و کاست سارا واقعہ بیان کر دیا۔

پولیس انسپکٹر نے چند سوالات کیے۔ میں نے ان کے جوابات بھی دے دیے۔ اس کا رویّہ معقول تھا۔ میں بیان دینے کے بعد مطمئن ہو گیا۔

انسپکٹر سے مجھے پتا چلا کہ ڈاکو بھاری رقم لوٹ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ پولیس کو عملے کے ایک رکن نے ہی کال کر کے خبر دے دی تھی۔ پولیس کے پہنچنے تک زیادہ تر لوگ بشمول گارڈ کے ہوش میں آ چکے تھے۔ بس میں ہی بے ہوش تھا۔ پولیس نے مجھے اسپتال منتقل کیا۔ ہر طرف ناکا بندی کرنے کے باوجود ابھی تک ڈاکوؤں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

پولیس والوں کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے مجھے سکون آور انجکشن لگا دیا۔ میں سو گیا۔ رات کو میری آنکھ کھلی تو پولیس والے مجھے گرفتار کرنے موجود تھے۔ میں انہیں ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ شام کو جب میں نے بیان دیا تھا تو پولیس انسپکٹر میری طرف سے مطمئن لگ رہا تھا۔ اب اچانک ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ مجھے گرفتار کرنے آ گیا تھا۔

مجھ سے جس انسپکٹر نے بیان لیا تھا، اس نے مجھے ہتھکڑی پہنائی اور بولا۔ ''آپ کو بینک ڈکیتی میں ڈاکوؤں کی اعانت کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔''

''میں نے ڈاکوؤں کی کوئی مدد نہیں کی۔ گن پوائنٹ پر مجھے بے بس کر کے انہوں نے مجھ سے تجوری کھلوائی۔ ہمیں ایسی صورت میں بینک کی طرف سے بھی یہی ہدایت ہے کہ ڈاکوؤں کی بات بلا چون و چرا مان لی جائے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

"آپ نے ڈاکوؤں کو بینک سیکیورٹی کے متعلق معلومات دی تھیں۔ اس کا گواہ ہمارے پاس موجود ہے۔" پولیس انسپکٹر متانت سے بولا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کسی کو سیکیورٹی سے متعلق معلومات فراہم نہیں کی۔" میں چلّایا۔

"یہ آپ عدالت میں بتایئے گا۔" انسپکٹر کا انداز اب بھی شائستہ ہی تھا۔

"اتنا تو بتا دیں میرے خلاف گواہی کس نے دی ہے؟" میں ہار مانتے ہوئے بولا۔

"یہ بھی آپ عدالت میں جان لیں گے۔" وہ شائستگی سے بولا۔ میں مجبوراً ان کے ساتھ چل پڑا۔ اسپتال کے کوریڈورز سے گزرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ایسا کون سا میرا دشمن ہے جس نے میرے خلاف جھوٹی گواہی دی ہے۔ مجھے ابھی تک ظفر سے ہونے والی ملاقات یاد ہی نہ آئی تھی۔ وہ مجھے یاد بھی کیسے آسکتا تھا۔ میرے خیال میں تو اس سے میری ساری گفتگو عمومی نوعیت کی تھی۔

کوریڈورز سے گزرتے ہوئے لوگ مجھے طنزیہ یا نفرت بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ چلّا چلّا کے ان سے کہوں کہ میں بےقصور ہوں۔ میں نے کوئی گناہ، کوئی جرم نہیں کیا لیکن یہ خواہش بھی میری بہت سی خواہشوں کی طرح ناآسودہ رہ گئی۔

☆☆☆

پولیس کی گاڑی اس ریستوران کے پاس سے جب گزری، جس میں، میں نے ظفر کے ساتھ ملاقات کی تھی تو ایک دم جیسے میرے دماغ میں جھماکا ہوا۔ بینک کی سیکیورٹی کے متعلق تو میں نے اسے ہی بتایا تھا۔ اس وقت نیہا اور ارمان میری ساتھ والی ٹیبل پر موجود تھے۔ ایسا عین ممکن تھا کہ نیہا نے اس سے ہونے والی میری گفتگو سن لی ہو۔

اس کا خیال آتے ہی، مجھے یقین ہو گیا کہ پولیس کو میرے خلاف گواہی ہو نہ ہو اسی نے دی ہے۔ بینک میں ڈکیتی کی خبر یقیناً میڈیا پر چلی ہوگی۔ نیہا جانتی ہوگی کہ میں اسی بینک میں کام کرتا ہوں۔ ڈکیتی کی خبر سن کے اسے میری ظفر سے ہونے والی گفتگو یاد آئی ہوگی۔ وہ کب مجھے کامیاب دیکھ کے خوش ہو سکتی تھی۔ وہ ایک دولت مند لڑکی تھی۔ ایک بااثر شخص کی بیٹی۔ اس کی بات لازمی سنی گئی ہو گی۔ اب میں لاکھ چلّا چلّا کے اپنی بےگناہی کا ماتم کرتا۔ اس کے مقابلے میں میری کوئی نہیں سنتا..... میں نے تمام کڑیاں جوڑ لیں۔

مجھے قسمت کی ستم ظریفی پر حیرت ہو رہی تھی۔ آج دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ نیہا کے مقابلے میں میری نہیں سنی جا رہی تھی۔ گویا آج بھی وہ مجھ سے اوپر ہی تھی۔ ہر لحاظ سے لوگوں کے لیے قابلِ اعتبار...... اور میں دوسری بار بھی بےگناہ ہونے کے باوجود ناقابلِ اعتبار قرار پا چکا تھا۔

انہی خیالات میں گم، کب سفر تمام ہوا، مجھے پتا ہی نہ چلا۔ گاڑی رکی تو میں چونکا۔

میرا اندازہ تھا کہ مجھے حوالات میں ڈال دیا جائے گا لیکن پولیس والا مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ دفتر معلوم ہو رہا تھا۔

یہاں وہی پولیس انسپکٹر براجمان تھا جس نے میرا بیان ریکارڈ کیا تھا اور بعدازاں ہتھکڑی پہنائی تھی۔ وہ شاید دوسری گاڑی سے ہم سے پہلے ہی دفتر پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک معقول آفیسر تھا اور ابھی تک اس کا رویّہ میرے ساتھ اچھا ہی تھا۔ اسے دیکھ کے مجھے قدرے سکون کا احساس ہوا۔

"تشریف رکھیے۔" وہ ایک فائل سے سر اٹھا کے مہذب انداز میں بولا۔ میں اس کے سامنے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ظفر گوہر کو جانتے ہیں آپ؟" میرے بیٹھتے ہی ایک دم وہ بولا۔

"جی، وہ ہمارا کسٹمر ہے۔" میرے حلق میں گلٹی سی محسوس ہوئی۔ گویا میرا شک صحیح تھا۔

"صرف کسٹمر یا اس سے آپ کا کوئی اور تعلق بھی ہے؟" وہ چبھتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"صرف کسٹمر۔ اس کا اکاؤنٹ دو سال پہلے میں نے ہی کھولا تھا۔ وہ اکثر بینک آتا رہتا تھا، اس لیے میری اس سے اچھی علیک سلیک ہو گئی تھی۔" میں نے تفصیل سے جواب دیا۔ پالیسی کے متعلق بتاتے ہوئے میں شش و پنج کا شکار تھا۔

"آپ کبھی اس سے باہر ملے؟" اس کا لہجہ سپاٹ ہی تھا مگر اس کی نظریں مجھے برمے کی طرح اپنے بدن میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میری پشت بھیگنے لگی۔

"جی، صرف ایک بار۔ تین دن پہلے ہی میں اس سے ایک ریستوران میں ملا تھا۔" میں نے اسے ریستوران کا نام بتایا۔

"اس ملاقات کا مقصد؟" اب اسے پالیسی کے بارے میں بتانا میری مجبوری بن چکا تھا۔ دوسری کمپنی میں پارٹ ٹائم جاب بہرحال ڈکیتی میں اعانت سے بہت چھوٹا

جرم تھا۔ اس جرم میں مجھے زیادہ سے زیادہ بھی سزا مل سکتی تھی کہ مجھے بینک کی نوکری سے برطرف کر دیا جاتا جبکہ دوسری صورت میں کڑی سزا یقینی تھی۔ میں نے اسے پالیسی کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں اسے ایک انشورنس پالیسی لینے پر قائل کر رہا تھا۔ اسی مقصد کے لیے میں نے اسے ریستوران میں بلایا تھا۔'' میں جھکے جھکے انداز میں بولا۔

''یعنی چھٹی والے دن بھی آپ کام کر رہے تھے؟''

اس نے کام پر زور دیا۔

''انشورنس کا ہمیں کمیشن ملتا ہے۔ بینک میں مصروفیت کے باعث بات کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے میں نے اسے باہر بلایا تھا۔''

''پھر، اس نے پالیسی خریدی؟''

''جی، اس نے ایگریمنٹ پر سائن کر دیے تھے تاہم پیمنٹ کے لیے اس نے وقت مانگا تھا۔''

''وہ ایگریمنٹ کہاں ہے جس پر اس نے سائن کیے تھے؟''

''وہ میری گاڑی میں رکھا ہے، ضرورت پڑنے پر میں آپ کو دکھا دوں گا۔'' میں پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ وہ میری ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ ایگریمنٹ دیکھنے کے بعد، میری بینک سے چھٹی یقینی ہو جائے گی، جبکہ وہ میرے اضطراب سے کچھ اور ہی مفہوم نکال رہا تھا۔

''پالیسی فروخت کرتے ہوئے کیا بینک کی سیکیورٹی کے متعلق بتانا بھی ضروری ہوتا ہے۔'' وہ چبھتے ہوئے انداز میں بولا۔

''وہ امریکی بینکس کی سیکیورٹی کا موازنہ ہمارے ہاں کے بینکوں سے کر رہا تھا۔ وہ عمومی نوعیت کی گفتگو تھی۔ میں نے اسے اپنے بینک کی سیکیورٹی کے متعلق کوئی معلومات نہیں دیں۔'' میں نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ وہ طنز سے مسکرایا۔

''آپ نے آج ڈکیتی سے ٹھیک آدھا گھنٹا پہلے ظفر کو کال کیوں کی تھی؟'' اس کا جملہ سن کے میں ششدر رہ گیا۔ وہ تو تفصیلی تفتیش کر چکا تھا۔ پتا نہیں لوگ پاکستانی پولیس کو اتنا سست اور نااہل کیوں سمجھتے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''اس نے پالیسی کی پیمنٹ نہیں کی تھی اسی لیے میں اسے تین دن میں بارہا کال کر چکا تھا۔''

''تو کیا کہتا تھا وہ پیمنٹ کے بارے میں؟'' میرے انداز سے اس نے کوئی اثر ہی نہیں لیا۔

''ٹال مٹول کر رہا تھا۔'' میں بیزاری سے بولا۔

''اس نے دو دن پہلے ہی اپنے اکاؤنٹ سے ساری رقم نکال لی تھی۔ آپ یہ بات جانتے ہیں؟'' میں چونکا۔ یہ بات تو میرے علم میں بھی نہیں تھی۔

''نہیں، یہ بات میرے علم میں نہیں۔''

اس نے بینک کی دوسری شاخوں سے ساری رقم نکلوائی تھی اور وہ بھی قسطوں میں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''ہو سکتا ہے۔ میں نے اس کا اکاؤنٹ چیک نہیں کیا۔''

''ظفر گوہر کا سارا ریکارڈ ہمارے پاس ہے۔ آپ وہ چیک کر کے اس کے گھر چھاپا ماریں، اگر آپ کو اس پر شک ہے تو، آپ نے اسے گرفتار کرنے کے بجائے خواہ مخواہ مجھے پکڑ لیا۔'' میں قدرے تیزی سے بولا۔

''ہم یہ سب کر چکے۔ بینک کے ریکارڈ میں اس کا جتنا ڈیٹا ہے اس سے کوئی معلومات نہیں ملیں۔ اس کا نمبر بھی بند ہے، اور آپ کو ہم نے خواہ مخواہ گرفتار نہیں کیا۔ آپ کے خلاف جو گواہی ملی ہے۔ وہ آپ کے خلاف ٹھوس ثبوت ہے۔ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں تو آپ کی سزا میں کمی ہو سکتی ہے، ورنہ ایک لمبے عرصے کے لیے آپ جیل چلے جائیں گے۔'' اس کی دھمکی سن کے میں بالکل ہی ڈھے گیا۔

''پانی۔'' میرے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔

☆☆☆

میں سر جھکائے حوالات میں بیٹھا تھا کہ عثمان مجھ سے ملنے آیا۔ وہ میری گرفتاری سے پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے انسپکٹر سے اجازت لے کر اسے کال کی تھی۔

میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ نیہا کے متعلق بھی اسے اپنے شک کے بارے میں بتا دیا۔

اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ سیدھا سادہ شخص تھا۔ پہلی بار اسے اس طرح کی صورتِ حال سے واسطہ پڑا تھا۔ اس کی پریشانی فطری تھی۔

''یار، تم تو مجھ سے بھی زیادہ پریشان لگ رہے ہو۔ کچھ نہیں ہو گا مجھے۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں باعزت بری ہو جاؤں گا۔'' میں پھیکی سی مسکان لبوں پر سجا کے بولا۔

''انشاء اللہ!'' اس کی آنکھوں میں امید جھلکی۔

''تم منصور صاحب کو کل لے کے آنا۔ وہ چوٹی کے وکیل ہیں۔'' میں اسے منصور صاحب کے بارے میں تفصیل

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بتانے لگا۔

جب وہ گیا تو کسی قدر پُرسکون لگ رہا تھا۔ میں نے اسے فی الحال امی اور انعم کو اپنے بارے میں بتانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہی ہوتیں۔

میں حوالات میں اکیلا تھا۔ فی الحال حوالات میں توقع کے خلاف مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

میں ایک کونے میں لیٹ کر اس سارے قصے کے متعلق سوچنے لگا۔ نیہا کو دیکھنے کے بعد میرے دل میں چھپی محبت نے ایک بار پھر انگڑائی لی تھی لیکن اس کے میرے خلاف بیان نے اس محبت کو پھر سے سونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب پھر میں اس کے متعلق نفرت سے ہی سوچ رہا تھا۔ عجیب بات تھی، جب بھی میرے دل میں اس کے لیے محبت جاگتی، کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا کہ میں اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

میں رات دیر تک خیالات کے جنگل میں گم رہا۔ اجنبی جگہ اور ماحول اور پریشان کن حالات، بڑی مشکل سے مجھے نیند آئی تھی۔

عثمان اگلے دن منصور صاحب کو لے آیا۔ انہوں نے میرا بیان سننے کے بعد مجھ سے وکالت نامے پر سائن کرا لیے۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ میرے خلاف کیس زیادہ مضبوط نہیں لیکن ان کی ساری تسلی رائگاں گئی تھی۔ مجھے عدالت نے تین سال کی سزا سنا دی تھی۔ عدالت میں میرے خلاف گواہی دینے ارمان آیا تھا۔ جس دن مجھے سزا ہوئی تھی، اس دن بھی وہ عدالت میں موجود تھا۔ میری سزا کا سنتے ہی اس کے چہرے پر فاتحانہ تاثرات نمودار ہوئے تھے۔

☆☆☆

میں بولتے بولتے تھک چکا تھا۔ میری آواز بھی بیٹھ چکی تھی۔ میں نے موبائل میں وقت دیکھا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ مدثر نے مجھے پانی پلایا۔ پانی پینے کے بعد میں اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ظفر اور اس کے ساتھی گرفتار نہیں ہوئے تھے؟'' وہ گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں، انہوں نے بڑی پلاننگ سے سارا کام کیا تھا۔ وہ تو بچ کے نکل گئے تھے لیکن مجھے پھنسا گئے۔'' میرے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔

''پولیس کو یہ یقین کیسے آیا کہ ڈکیتی کی واردات ظفر نے ہی کی تھی؟''

''وہ اس دن کے بعد سے کہیں نظر نہ آیا تھا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں جو تین لوگ تھے۔ انہوں نے اپنے حلیے تو تبدیل کیے ہوئے تھے لیکن ایک شخص ان میں سے قد کاٹھ کے حساب سے ظفر کے ہی مشابہ تھا۔ اس کے علاوہ ظفر نے بینک میں اکاؤنٹ کھلواتے وقت اپنے کاروبار کے متعلق جو کاغذات جمع کرائے تھے، وہ بھی سب جھوٹے تھے۔ حتیٰ کہ شناختی کارڈ پر درج پتا بھی غلط تھا۔ اسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ وارداتی قسم کا شخص تھا۔ اس کے پاس پیسے تھے، بھاگ گیا ہوگا بیرونِ ملک اپنے ساتھیوں سمیت۔'' میں تھکے تھکے انداز میں بولا۔

''گویا آپ کے ساتھ وہ والا معاملہ ہو گیا کہ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے۔'' وہ اپنے لہجے میں بشاشت بھر کے بولا۔ میں افسردگی سے مسکرا دیا۔

''بس اپنی قسمت ہی ایسی تھی۔''

''آپ کو ہمیشہ نیہا پر شک رہا، مجھے تو لگتا ہے یہ ساری کارستانی ارمان کی تھی۔''

''نیہا کے پاؤں میں امی نے اپنا دوپٹا ڈال دیا تھا۔ اس لیے وہ گواہی دینے نہیں آئی تھی مگر ارمان کو وہ بھی رام نہ کر سکیں۔'' میں افسردگی سے بولا۔

''مطلب سارا قصور ارمان ہی کا تھا۔ نیہا کے متعلق آپ خواہ مخواہ بدگمان ہوتے رہے۔'' اس کا اندازہ سن کے میں نے بس افسردگی سے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''اچھا آگے بتائیں ناں، جیل سے رہائی کے بعد ایسا کیا کیا کہ دولت آپ کے گھر کی باندی بن گئی؟''

''آگے کی کہانی بہت تلخ ہے۔ وہ سنانے کے بعد میرے لیے سونا ناممکن ہو جائے گا۔ سو بہتر ہے ابھی سو لیں باقی کہانی پھر سہی۔'' میں جماہی لیتے ہوئے بولا۔

وہ باقی کی کہانی بھی ابھی سننا چاہ رہا تھا لیکن میں بول بول کے تھک چکا تھا۔ اس نے میری تھکن کے پیشِ نظر میری بات مان لی۔

☆☆☆

میری آنکھ فون کی گھنٹی سے کھلی۔ میں نے سائڈ ٹیبل سے سیل اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر ''مائی وائف کالنگ'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

میں نے سیل کان سے لگا کے کہا۔ ''ہیلو، نیہا۔''

کمبل سے یکدم مدثر کا سر برآمد ہوا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیسا چل رہا ہے، آپ کا ٹور؟ آئی مسنگ یو۔" وہ ٹھنکتے ہوئے بولی۔

"ابھی تو سو کے اٹھا ہوں۔ اب کہیں باہر نکلیں گے۔" میں جماہی لیتے ہوئے بولا۔

"اتنا لیٹ...... کیوں رات کو سوئے نہیں؟" وہ مشکوک سے انداز میں بولی۔

"کل دن کے وقت سوتا رہا اس لیے رات کو نیند ہی نہیں آئی۔"

"مدثر آپ کے ساتھ ہے نا؟" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"ہاں، امید ہے جلد کام مکمل ہو جائے گا۔" میں کن انکھیوں سے مدثر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیسٹ آف لک۔ اینڈ آئی لو یو۔" اس نے سیل کو شاید چوما تھا۔ میں مسکرا دیا۔

"تھینک یو۔ میں تمہیں بعد میں کال کروں گا۔" میں نے کال کاٹ دی۔

مدثر مجھے آنکھیں پھاڑ کے دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

"یہ نیہا کی کال تھی؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ بولا۔

"ہاں۔" میں نے مسکراتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"آپ نے نیہا سے شادی کر لی تھی؟" اسے اندازے لگانے کی عادت تھی سو وہ اس بار بھی اندازہ لگانے سے باز نہیں رہ سکا۔

"ہاں۔" میں نے اس بار بھی مختصر جواب دیا۔

"آپ تو نیہا سے بے انتہا نفرت کرتے تھے پھر یہ انقلاب کیسے؟" وہ حیرت زدہ انداز میں بولا۔

"بس یہ نفرت کا ہی نتیجہ ہے یا شاید محبت کا......" میں کہتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔

غسل کر کے میں باہر نکلا تو مدثر واش روم کے دروازے پر نگاہیں لگائے بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بے چینی سے بولا۔

"آپ کی نیہا سے شادی کیسے ہوئی؟"

"یہ تو تمہیں اگلی قسط میں ہی پتا چلے گا۔" میں ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولا۔

"نہیں، آپ کو آج ہی کہانی مکمل کرنا ہوگی۔" وہ ضدی انداز میں بولا۔

"چلو تم فریش ہو جاؤ۔ کرتے ہیں پھر کچھ۔" وہ میرا مثبت جواب سنتے ہی چھلانگ لگا کے بستر سے اترا اور واش روم میں گھس گیا۔

دن کا ایک بج رہا تھا۔ ہم ہوٹل کے ڈائننگ روم میں آ گئے۔ وہ بیٹھتے ہی بولا۔

"میرا خیال ہے نیہا آپ سے جیل میں ملنے آتی رہی ہوگی۔ مجھے یقین ہے وہ آپ سے محبت کرتی ہوگی۔ اس نے آپ سے معافی مانگ لی ہوگی، آپ نے جیل سے رہائی کے بعد اس سے شادی کر لی ہوگی۔ اس طرح آپ کو اپنی محبوبہ کے ساتھ ساتھ ڈھیر ساری دولت بھی مل گئی ہوگی، کیوں میرا اندازہ درست ہے نا؟" وہ شاید اتنی دیر سے مسلسل میری کہانی کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

"کاش، ایسا ہوتا لیکن میرے پاس جتنی دولت ہے، یہ میری اپنی محنت کا نتیجہ ہے۔" میرے لہجے میں افسردگی تھی۔

"یہ تو زیادہ اچھی بات ہے لیکن یہ کہتے ہوئے آپ کی افسردگی سمجھ سے بالاتر ہے۔" وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری زندگی کے باقی واقعات انتہائی تلخ ہیں لیکن تم شاید بھول ہی گئے۔"

"اوہ ہاں، ابھی تو اس سیلولر کمپنی والی فون کال کا ذکر بھی نہیں آیا جس نے آپ کی زندگی تبدیل کی۔"

"ہاں، تم ابھی سکون سے ناشتے پر توجہ دو۔ یہ سب میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" وہ جلدی جلدی ناشتا کرنے لگا۔

☆☆☆

میں کاغان میں اپنے ریسٹوران کی ایک شاخ کھولنا چاہتا تھا۔ دریائے کنہار کے کنارے میرے ایک نمائندے نے جگہ دیکھ رکھی تھی۔ مجھے آج وہ زمین دیکھ کر اس کا سودا فائنل کرنا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے ڈرائیور کو لیا اور ادھر آ گئے۔ جگہ مجھے پسند آ گئی تھی۔ دو تین گھنٹے میں ہم نے ضروری کارروائی مکمل کر لی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ جلد ہی عمارت کی تعمیر شروع کر دی جائے، تعمیر کے بعد ریسٹوران کا سارا انتظام و انصرام میں مدثر کے حوالے کرنا چاہ رہا تھا۔ اس طرح اس کی کاغان میں رہنے کی خواہش بھی پوری ہو جاتی اور میرا مقصد بھی پورا ہو جاتا۔

کام سے فارغ ہو کر ہم جھیل سیف الملوک آ گئے۔ جھیل کے خوبصورت نظاروں نے ہماری ساری کلفت دور کر دی۔ مدثر یہاں بھی میری کہانی سننا چاہتا تھا لیکن اتنی خوبصورت جگہ تلخ واقعات سنانے کے لیے ہرگز موزوں نہ تھی۔ میں نے اسے ٹال دیا۔ رات کو کھانے کے بعد ہم پھر

سے اسی نشست پر براجمان تھے۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں اپنے زخم نہاں، اس کے سامنے عیاں کرنے لگا۔

☆☆☆

جیل کی زندگی عجیب تھی۔ میرے جیل کے زیادہ تر ساتھی اَن پڑھ یا کم پڑھے لکھے تھے۔ میرے اور ان کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ شروع شروع میں، میں ان سے الگ ہی رہا لیکن لوگوں سے کٹ کے جیل میں وقت گزارنا انتہائی مشکل تھا۔ آہستہ آہستہ میں ان کے ساتھ گھل مل گیا۔

جب میں جیل سے رہا ہوا تو جیل میں میرے بہت سے دوست بن چکے تھے۔ ان میں ایک شخص عبدالجبار تھا۔ جیل میں ایک طرح سے اسے سردار کی سی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ایک تیم شحیم شخص تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح سینے تک پھیلی داڑھی اور لمبی زلفوں کے ساتھ وہ دیکھنے میں ایک خوفناک شخص لگتا تھا مگر دل کا بہت اچھا تھا۔ وہ بالکل اَن پڑھ شخص تھا مگر اس میں لیڈرشپ کی خصوصیات قدرتی طور پر موجود تھیں۔ قیدیوں کا کوئی بھی مسئلہ ہوتا، وہی پولیس والوں سے بات کرتا۔ میں نے اسے بہت ٹٹولا تھا لیکن اس نے کبھی بتایا نہیں تھا کہ وہ کس جرم میں جیل کی سزا کاٹ رہا ہے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بورژوائی طبقے کے سخت خلاف ہے۔

میں سب سے ملنے کے بعد اس کی طرف بڑھا۔ اس نے مجھے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"باؤ جی، جیل سے جانے والوں کے لیے دنیا جینا بہت اوکھا کردیتی ہے۔ کبھی کوئی مشکل پیش آئے تو سلیم سے رابطہ کرنا۔ میرا حوالہ دینا، وہ ہر طرح سے آپ کی مدد کرے گا۔"

میں نے مسکرا کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ایک الوداعی نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی۔ وہ سب بظاہر ہنس رہے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ میں بھی نم آنکھوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

میرا اندازہ تھا کہ عثمان مجھے لینے آئے گا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ پچھلے تین ماہ سے مجھے اپنے گھر کا کوئی فرد ملنے نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے مہینے میں کم از کم ایک بار عثمان امی کو مجھ سے ملانے ضرور لاتا تھا۔

ہوگی کوئی مصروفیت جس کی وجہ سے وہ مجھ سے ملنے نہیں آسکا۔ میں نے خود کو تسلی دی۔

جیل کے باہر سے مجھے ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ٹیکسی والے کو اپنے گھر کا پتا بتایا اور خود پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ آج تین سال بعد میں باہر کی دنیا دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف افراتفری کا سماں تھا لیکن یہ سب بھی مجھے بھلا لگ رہا تھا۔ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تین سال جیل کی سزا کاٹنے کے بعد باہر اس سے بڑی سزا میری منتظر ہے۔

ٹیکسی والے نے میرے گھر کے سامنے ٹیکسی روکی تو میں چونک گیا۔ میں نے اسے کرایہ دے کر فارغ کیا اور باہر آگیا۔ میں نے کال بیل بجائی تو ایک اجنبی شخص نے دروازہ کھولا۔ "جی؟" وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میں روشان ہوں، عثمان کا بڑا بھائی۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔

اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر جاگا۔ "اوہ، آپ اندر آجائیں۔" وہ مجھے راستہ دیتے ہوئے بولا۔ میں اُلجھن زدہ انداز میں اندر کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور میرے لیے پانی لے آیا۔ میں پانی پی کے بولا۔

"عثمان کہاں ہے؟"

"ہم نے یہ گھر ایک ماہ پہلے ہی کرائے پر لیا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"تو میرے گھر والے کہاں گئے، آپ جانتے ہیں؟" میں نے اُلجھن زدہ انداز میں سوال کیا۔

"آپ کے لیے اچھی خبر نہیں۔ عثمان اپنی والدہ کے ساتھ آپ سے ملنے جا رہا تھا کہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں دونوں ماں بیٹا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔" وہ مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

"کیا؟" میں چیخا۔ "اتنا بڑا سانحہ میرے گھر والوں پر گزر گیا اور کسی نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"آئی ایم سوری۔ مجھے یہ سب اس گھر میں منتقل ہونے کے بعد معلوم ہوا۔" وہ دھیمے سے بولا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "اور میری بہن انعم؟" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اس نے مجھ سے نظریں چرالیں۔

"آپ پلیز خود کو پُرسکون کریں۔ میں آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔ اس کا انداز دیکھ کے میرا دل اندیشوں سے لرزنے لگا۔

"پلیز، آپ پہلے مجھے انعم کے بارے میں بتائیں۔" میں اسے اٹھتے دیکھ کر جلدی سے بولا لیکن وہ میری بات سنے بغیر باہر نکل گیا۔ میں خود پر قابو پانے کی

کوشش کرنے لگا۔

وہ کچھ دیر میں ہی چائے لے کے آ گیا۔ اس نے چائے اور بسکٹ میرے آگے رکھے۔ میں انہیں نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"آپ انجم کے بارے میں بتانے لگے تھے؟"

"آپ چائے لیں نا۔" وہ نظریں چُراتے ہوئے بولا۔

"اگر اس کے متعلق بھی کوئی بری خبر ہے تو پلیز مجھے بتا دیں جہاں اتنی بری خبر میں نے برداشت کی وہاں یہ بھی برداشت کرلوں گا۔" میں ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ بولا۔ اس کے انداز نے میرے اضطراب میں اضافہ کر دیا تھا۔

"اپنی امی اور بھائی کی وفات کے بعد وہ تنہا رہ گئی تھی۔ مجھے اس گھر میں آنے کے بعد ہی یہ سب پتا چلا۔" اس نے پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ مسلسل نظریں چرا رہا تھا۔

"آپ پلیز، ایک ہی بار میں سب بتا دیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ اس نے شاکی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "ایک رات ڈاکو اس گھر میں گھس آئے۔ وہ آپ کی گاڑی سمیت بہت سا سامان لوٹ کر چلے گئے۔ اگلے دن پڑوسیوں نے دیکھا کہ انجم کی لاش ایک پھندے کے ساتھ جھول رہی تھی۔" اس نے ایک جھٹکے میں سب کہہ دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے سب کچھ منہدم ہو گیا ہو اور سارا ملبا مجھ پر آن گرا ہو۔ اس کے انکشاف نے جیسے میری روح میں سوراخ کر دیا تھا۔ اب کمرے میں پُراسرار سا سکوت پھیلا ہوا تھا۔ اس سکوت کا پردہ میری چیخ نے تار تار کر دیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"آئی ایم سوری، خدا کی منشا یہی تھی۔" وہ ہمدردی سے بولا۔

میں بالکل ہی ڈھے گیا۔ آنسوؤں کا نمکین ذائقہ میری زبان پر پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے پانی کا ایک گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس پکڑا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی چڑھا گیا۔

کچھ دیر میں میری حالت کسی قدر سنبھلی تو میں اس سے بولا۔ "میں اب اجازت چاہوں گا۔ معذرت کہ میری طرف سے آپ کو زحمت اٹھانا پڑی۔" وہ ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کا سامان میں نے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ آپ جب چاہیں لے جا سکتے ہیں۔" سامان میں ابھی لے کے کہاں جاتا، لیکن اس میں میری اور میرے گھر والوں کی کچھ ذاتی چیزیں ہو سکتی تھیں۔ میں وہ چیزیں لینا چاہتا تھا۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے آیا جہاں اس نے میرا سامان رکھا تھا۔

سامان کو دیکھ کے میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ فرنیچر اور دیگر سامان ایک دوسرے کے اوپر دھرا تھا۔ یہ ساری چیزیں میری ماں نے میرے ساتھ بڑی چاہ سے خریدی تھیں۔ انہوں نے ساری زندگی ایک سرونٹ کوارٹر میں گزاری تھی۔ وہ جن چیزوں کو دوسروں کی دسترس میں دیکھ کے ترستی رہی تھیں۔ میں نے وہ سب چیزیں انہیں خرید کر دی تھیں لیکن انہیں بہت کم عرصہ یہ چیزیں استعمال کرنا نصیب ہوئی تھیں۔

میں نے وارڈروب کھولی۔ اس میں میرے کپڑے اسی طرح ٹنگے تھے، جس طرح میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اپنا موبائل فون اور ڈیبٹ کارڈ عثمان کو دے دیا تھا۔ الماری سے مجھے ڈیبٹ کارڈ اور اپنی چیک بک مل گئی لیکن موبائل غائب تھا۔

ایک اور الماری میں ایک ہینڈ بیگ رکھا تھا۔ اس میں سے مجھے ایک موبائل فون ملا۔ میں نے اسے آن کیا، سیل آن ہوتے ہی اس پر انجم کی مسکراتی ہوئی تصویر چمکنے لگی۔ اس تصویر کو دیکھ کے میرے دل سے ہوک اٹھی۔ میں نے وہ فون بھی جیب میں ڈال لیا۔ پتا نہیں یہ کیسے ڈاکوؤں کی نظر سے بچ گیا تھا۔ باقی تمام چیزیں کھنگالنے کے بعد بھی میں کوئی کام کی چیز تلاش نہ کر سکا، حتیٰ کے میں اپنے ڈاکومینٹس بھی تلاش نہ کر سکا۔ ڈاکومینٹس میں نے ایک بریف کیس میں رکھے تھے، ڈاکو شاید رقم اور زیورات کے ساتھ بریف کیس بھی لے گئے تھے۔

"ابھی تو میں بے ٹھکانا ہوں، پھر کسی دن آ کے میں یہ سامان لے جاؤں گا۔" میں اپنے میزبان سے بولا۔

"یہ سب آپ کی امانت ہے۔ آپ جب چاہیں لے جا سکتے ہیں۔" وہ بھلا مانس شخص ہمدردی سے بولا۔

میں اس سے اجازت لے کے باہر نکل آیا۔ میری نہ کوئی منزل تھی اور نہ ٹھکانا۔ میں ایک پارک میں آ گیا۔ لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے لیکن میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میرے پردۂ تصور میں بار بار اپنے خاندان کے افراد کے نقوش ابھر رہے تھے۔ میرے رگ و پے میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انتقام کی چنگاری سلگی۔ لمحوں میں ہی یہ چنگاری بلند و بالا شعلوں میں تبدیل ہوگئی۔ جن لوگوں نے مجھے زندہ درگور کیا تھا، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ خود ہنستے کھیلتے زندگی گزار لیتے۔ میں تم لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں، مجھے زندہ درگور کرنے والو، میں تم سب کو زندہ درگور کردوں گا۔ میں دل ہی دل میں چلایا۔

☆☆☆

وہ رات میں نے ایک دربار میں گزاری تھی۔ رات کو سونے کے بجائے میں نے اپنی آئندہ زندگی کا ایک لائحہ عمل وضع کیا تھا۔ اس لائحہ عمل پر چل کے یا تو مجھے موت مل جاتی، یا کامیابی۔ نتیجہ میں نے خدا پر چھوڑ دیا تھا۔

اگلے دن میں نے اپنے منصوبے کے مطابق کام شروع کردیا۔ منصوبے کی تکمیل کے لیے مجھے جو چیزیں اور معلومات درکار تھیں، وہ اکٹھی کیں۔ چند دن اس میں صرف ہوگئے۔ اب اصل منصوبے پر عمل کرنے کی باری تھی۔

میں نے نیہا کو کال کی۔ نیہا کا نمبر مجھے اپنے دوست نعمان سے ملا تھا جو اُن ہی کے محل میں رہائش پذیر تھا۔ نیہا کے ہیلو کے جواب میں، میں بولا۔۔۔ ''نیہا، میں روشان بات کررہا ہوں۔''

''روشان، کیسے ہو تم۔ جیل سے کب رہا ہوئے؟'' اس کے لہجے میں ہیجان تھا۔

''چند دن ہی ہوئے ہیں۔''

''تم کہاں ہو؟ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں، پھر کسی جرم میں پھنسانے کا ارادہ ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی گھل گئی۔

''تم ابھی تک مجھ سے بدگمان ہو؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''کیا نہیں ہونا چاہیے؟'' میں طنز سے بولا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''تمہارے ساتھ بہت بُرا ہوا۔ میں تو بس تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تم سے ملنے کو تیار ہوں۔''

چند گھنٹوں بعد وہ میرے گھر کے گیٹ پر میرے سامنے کھڑی تھی۔ میری ہدایت کے مطابق وہ خود گاڑی ڈرائیو کرکے آئی تھی۔ اس کی گاڑی اس کے عقب میں کھڑی تھی۔ میں آج اسے تین سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہ تازگی بھی نہ تھی جو اس کے چہرے کا لازمی جزو تھی۔

''اندر آجاؤ۔'' میں نے اس کے لیے جگہ چھوڑی۔ وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔

''کافی ویران جگہ پر تم نے گھر لیا ہے۔'' وہ اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

''میری زندگی ہی ویران ہوچکی۔ اب کیا فائدہ آباد جگہ رہنے کا۔'' میں تلخ لہجے میں کہتا ہوا اندر کی جانب بڑھا۔

''آئی ایم سوری۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، تم ہرگز وہ سب ڈیزرو نہیں کرتے تھے۔'' وہ میرے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔

''اب افسوس کرنے کا فائدہ؟'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس نے نظریں چرالیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے عقب میں دروازہ بند کیا۔ اس نے چونک کے مجھے دیکھا۔ میرے تاثرات دیکھ کر یکدم ہراساں نظر آنے لگی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کلوروفارم سے بھیگا ہوا رومال برآمد کیا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا۔ ''تم نے میری زندگی برباد کی۔ اب اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔'' ساتھ ہی میں بھنچی ہوئی آواز میں بولا تھا۔

وہ لمحوں میں ہی میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ اس کے وجود سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی، جو میرے حواس مختل کیے جارہی تھی۔ میں نے بمشکل اس سے نظریں چراتے ہوئے اس کے بے ہوش وجود کو ایک طرف ڈالا۔

ایک رسی سے میں نے اس کے بازوؤں اور پاؤں کو بندشوں میں کس دیا۔ اس کے منہ پر ایک چوڑا ٹیپ لگانے کے بعد میں نے اسے ایک صوفے کے عقب میں ڈال دیا۔ اس کا بیگ نیچے گر چکا تھا، میں اس کی تلاشی لینے لگا۔ گاڑی کی چابیاں اور سیل فون نکال کے بیگ میں نے ایک طرف ڈال دیا۔

اس کے موبائل سے میں نے اس کی ویڈیو بنائی۔ کچھ دیر میں، میں اس کی گاڑی میں باہر جارہا تھا۔ مخصوص جگہ پہنچ کر میں نے اس کا سیل نکالا اور اس کے ڈیڈی کے سیل پر اس کی ویڈیو واٹس ایپ کردی۔ ساتھ میں نے ایک میسج ٹائپ کیا تھا۔

''تمہارے پاس ایک گھنٹا ہے۔ ایک گھنٹے بعد میں تمہیں کال کروں گا، یہ سننے کے لیے کہ دس کروڑ کا بندوبست ہوگیا ہے۔ اگر مجھے یہ جواب نہ ملا تو اگلے پانچ منٹ بعد ہی تمہیں ایک اور ویڈیو ملے گی۔ اس ویڈیو میں نیہا اکیلی نہیں ہوگی۔ وہ اور دوسرا فرد جس حال میں تمہیں نظر آئیں گے، وہ یقیناً تم دیکھنا نہیں چاہو گے۔'' میسج سینڈ

کرنے کے بعد میں نے اس کا نمبر ملایا۔ اس کے فون اٹھاتے ہی، میں بولا۔

’’فوراً واٹس ایپ چیک کرو۔ اٹس ویری ارجنٹ۔‘‘

’’تم کون؟‘‘ اس کی اُلجھن زدہ آواز ابھری۔ میں نے جواب دینے کے بجائے کال کاٹ دی۔ میں واٹس ایپ کھول کے میسج دیکھے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے واٹس ایپ میسج چیک کرلیا۔ میں نے نیہا کا سیل آف کیا۔ گاڑی سے اپنے فنگر پرنٹس صاف کیے اور تھوڑے فاصلے پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

دس کروڑ ارمغان کے لیے معمولی رقم تھی۔ اتنی رقم تو اس کے گھر تجوری میں پڑی رہتی تھی۔ ٹیکس بچانے کے لیے وہ زیادہ رقم گھر ہی رکھتا تھا۔ یہ میں جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک گھنٹے میں رقم تیار کرلے گا۔

سفیان علی مختلف مزاج کا مالک تھا۔ اس کا دو برس پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد سارا کاروبار ارمغان نے سنبھال لیا تھا۔ اس کا دوسرا بیٹا، ذیشان بیرون ملک جاب کر رہا تھا۔ یہ ساری معلومات میں نے پچھلے چند دن میں حاصل کی تھیں۔ ارمغان نیہا سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک بزدل شخص تھا۔ ویسے بھی معاملہ اس کی بیٹی کی عزت اور جان کا تھا۔ جب معاملہ بیٹی کا ہو تو بڑے بڑے بہادر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس خبر کو خود تک ہی محدود رکھے گا۔

واپس اپنے مکان میں پہنچنے کے بعد میں نے اپنے کپڑے اتارے۔ اب میرے بدن پر بس ایک بنیان اور انڈر ویئر تھا۔ اب مجھے ایک ایسا کام کرنا تھا جو میں نے زندگی میں کبھی نہ کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کام میرے لیے بہت دشوار ثابت ہوگا۔ لیکن میری توقع کے مطابق یہ کام بہت آسان ثابت ہوا۔

ایک گھنٹے بعد میں پھر اپنے مکان سے دور پہنچ چکا تھا۔ ایسا میں احتیاطاً کر رہا تھا کہ اگر ارمغان ابھی یا بعد میں پولیس کو خبر کر بھی دیتا ہے تو میری کال سے مکان کی لوکیشن ٹریس نہ کی جاسکے۔

میں نے اس بار بھی نیہا کے سیل سے ہی ارمغان کو کال کی تھی۔ اس کے کال ریسیو کرتے ہی میں بولا۔

’’بولو، کیا جواب ہے تمہارا؟‘‘

وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’تمہاری مطلوبہ رقم کا بندوبست ہوگیا ہے۔‘‘

’’گڈ! تم ابھی کہاں ہو؟‘‘

’’میں اپنے گھر میں ہی ہوں۔ رقم میں نے ایک بریف کیس میں ڈال لی ہے۔‘‘ وہ لرزاں آواز میں بولا۔

’’ٹھیک ہے۔ میں تمہیں جس جگہ کا بتاتا ہوں۔ وہاں پہنچو اور یاد رکھو۔ تم اکیلے آؤ گے ورنہ.....‘‘ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’نہیں نہیں، میں اکیلا ہی آؤں گا۔ پلیز، میری بیٹی کو کچھ نہ کہنا۔‘‘ وہ تیزی سے بولا۔

میں اسے ایڈریس بتانے لگا۔ ایڈریس بتانے کے بعد میں نے کال کاٹی، سیل آف کیا اور اس جانب روانہ ہوگیا جہاں میں نے ارمغان کو پہنچنے کا کہا تھا۔

جب میں اس جگہ سے گزرا تو میری توقع کے مطابق ارمغان کی گاڑی اس جگہ موجود تھی جہاں میں نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا۔ یہ ویران علاقہ تھا۔ جہاں اِکا دُکا گاڑیوں کی آمدورفت ہی ہوتی تھی۔ میں اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ کچھ دور جا کے میں نے اسے دوبارہ کال کی اور آگے چلنے کا کہا۔ سیل میں نے دوبارہ آف کردیا تھا۔

کچھ دور جا کے میں نے یوٹرن لیا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ میری ہدایت کے مطابق سیدھا چلتا جا رہا تھا۔ میں خاصا فاصلہ رکھ کے اس کے پیچھے چلنے لگا۔ میں اپنے اطراف کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ مجھے کوئی مشکوک گاڑی نظر نہ آئی۔

میں نے اُسے دوبارہ کال کی۔

’’اپنی گاڑی روکو۔‘‘ اس نے میری ہدایت کے مطابق گاڑی روک لی۔ اسے رکتے دیکھ کے میں نے بھی اپنی گاڑی روک لی۔ اس کی گاڑی ڈھلوان میں کھڑی تھی۔ وہاں سے میں تو اسے دیکھ سکتا تھا مگر وہ میری گاڑی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ روڈ کے اطراف میں جھاڑیاں تھیں۔ میں اسے گاڑی روکتے دیکھ کر اس سے گویا ہوا۔

’’اب بریف کیس جھاڑیوں کے پیچھے رکھو اور سیدھے روانہ ہو جاؤ۔ جب تک میں تمہیں کال نہ کروں، دوبارہ پیچھے نہ مڑنا۔‘‘

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ گاڑی اس نے دوبارہ اسٹارٹ کی ہی تھی کہ اس کی گاڑی کی ڈکی کھلی۔

میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شخص ڈکی میں سے چھلانگ لگا کے اترا اور جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہوگیا۔

ارمغان میری ہدایات کے مطابق گاڑی آگے بڑھا کے لے گیا تھا۔ میرے چہرے پر تفکر کی لکیریں پھیلتی چلی گئیں۔

یہ پورا خاندان ہی ناقابلِ اعتبار تھا۔ ایک بار پھر میں دھوکا کھا گیا تھا۔

میں نے ارمغان کو کال کی۔ اس کے کال ریسیو کرتے ہی بولا۔

''تم نے میری ہدایات پر عمل نہیں کیا۔ پانچ منٹ بعد واٹس ایپ پر اپنی بیٹی کی ویڈیو دیکھنا۔'' میرے لہجے میں سفاکی تھی۔

''کک...... کیا مطلب؟'' میں اب تک ویسا ہی کر رہا ہوں، جیسا تم نے کہا تھا۔'' وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔

''مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔ یہ اپنے ساتھ ڈکی میں کس باپ کو بٹھا کے لائے ہو؟'' میں دہاڑا۔

''خدا کی قسم میں کسی کو ساتھ نہیں لایا۔ میرا یقین کرو۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''تمہاری گاڑی کی ڈکی سے ایک شخص چھلانگ لگا کے اترا ہے۔ اس کا نتیجہ تمہاری بیٹی کو بھگتنا ہوگا۔''

''خدا کے لیے میرا یقین کرو۔ میں اپنے ساتھ کسی کو نہیں لایا۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔

میں اپنے اطراف پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اپنے اردگرد مجھے کوئی مشکوک سرگرمی نظر نہیں آرہی تھی۔

''مجھے تم پر یقین تھا لیکن تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے تمہاری گاڑی کی ڈکی سے ایک شخص اتر کے جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہوا ہے۔'' میں تیزی سے بولا۔

میری قمیص پشت سے بھیگ چکی تھی۔ جس کام کو میں آسان سمجھا تھا، وہ اتنا بھی آسان نہ تھا۔ اتنی لمبی کال بھی خطرے سے خالی نہ تھی لیکن اس کے علاوہ فی الحال مجھے کوئی چارہ بھی نظر نہ آرہا تھا۔

''ایک منٹ...... ہوسکتا ہے وہ میرا بیٹا ارمان ہو۔ وہ میری تم سے ہونے والی گفتگو شاید سن چکا تھا۔ اس نے مجھے پریشان دیکھ کر کریدنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے ٹال دیا تھا لیکن اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے جب اسے بتایا تھا کہ میں کہیں جارہا ہوں، تو وہ مجھ سے پہلے ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ میں اسے کال کر کے بلاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے اگر واقعی کوئی ڈکی میں تھا تو وہی ہوگا۔'' وہ تیزی سے بولا۔ اس کی بات کا مجھے یقین نہیں آیا تھا، لیکن فی الوقت میں اس سے تفتیش نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے کال کاٹی اور گاڑی سے اتر آیا۔ گاڑی سے اتر کے ایک بار پھر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اگر میرے لیے کوئی جال پھیلایا گیا تھا تو...... وہ میرے لیے نادیدہ ہی تھا۔ میں جھاڑیوں کو سرکاتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ میں چوکنی نظروں سے اطراف میں دیکھتے ہوئے اس سمت بڑھنے لگا جدھر اس نے نوٹوں سے بھرا بریف کیس چھپایا تھا۔

کچھ لمحوں بعد ہی میری جیب میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے موبائل نکال کے دیکھا۔ ارمغان کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔

''ارمان کا نمبر بند جارہا ہے۔ تم کہو تو میں واپس بریف کیس لے لیتا ہوں اور تمہاری بتائی ہوئی کسی اور جگہ پر رکھ دوں گا۔'' اس کی پیشکش سن کے میں سوچ میں پڑ گیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم واپس آجاؤ۔'' کچھ سوچ کے میں بولا۔

سیل جیب میں رکھنے کے بعد میں آہستگی سے اس سمت بڑھنے لگا، جہاں بریف کیس رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے گاڑی کی آواز آئی۔ ارمغان شاید واپس پہنچ چکا تھا۔ گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو میرا یقین پختہ ہو گیا۔ میں چوکنے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ معاً میری نظر جھاڑیوں کے بیچ رکھے بریف کیس پر پڑی۔ اسی لمحے جھاڑیوں میں سے ایک سر نمودار ہوا۔ وہ جھکا، بریف کیس اٹھایا اور چل دیا۔ یہ ارمغان ہی تھا۔ اس کے جھاڑیوں میں غائب ہوتے ہی، ایک طرف جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ کوئی تیزی سے جھاڑیوں سے نکل کے اس طرف بھاگا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ میں نے پستول سیدھا کیا اور اندھادھند اس کی طرف فائر کرنے لگا۔ پستول سے ٹرچ ٹرچ کی آوازیں ابھریں۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسا نہیں تھا لیکن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسے گرتے دیکھا۔ میں بھاگ کے اس کے پاس پہنچا۔ پاس پہنچ کے میں نے اسے سیدھا کیا۔ وہ ارمان ہی تھا۔ گولی اس کی گردن کے پار ہوگئی تھی۔ اس کی گردن سے بھل بھل بہتا خون دیکھ کے مجھے عجیب سا احساس ہوا۔

وہ جاں کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساکت ہوگیا۔ میں اسے حیران نظروں سے دیکھنے لگا۔ اچانک میرے سر پر ایک پتھر لگا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں لہرا کے گرا۔ پستول میرے ہاتھ سے دور جا گرا۔ میرے سر سے نکلتا خون میرے چہرے کو بھگونے لگا۔ میں خود کو ہوش میں رکھنے کے جتن کرنے لگا۔

''ارمان۔'' کوئی تیزی سے چیختا ہوا، ارمان کی لاش

کی طرف بڑھا۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ یہ ارمغان تھا۔

ارمان کی لاش دیکھتے ہی وہ اٹھا۔ اس کے چہرے پر جنونی سے تاثرات تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے میرا دماغ جھرجھری لے کے بیدار ہو گیا۔ میں پستول کی طرف لپکا لیکن مجھ سے پہلے ہی وہ پستول اٹھا چکا تھا۔ اس نے.... میری جانب فائر کیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

پستول سے ٹرچ کی آواز ابھری۔ میرا جسم خوف سے سمٹا لیکن یہ کیا۔ میرے جسم کے کسی حصے میں تکلیف کا احساس نہیں جاگا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

ارمغان جھنجلائے ہوئے انداز میں خالی پستول کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کے اس نے پستول مجھ پر کھینچ مارا۔ میں نے تیزی سے کروٹ لی۔ پستول میرے بائیں بازو سے ٹکرایا۔ میرا بازو سن ہو کے رہ گیا۔

میں اٹھنے لگا تو میرا ہاتھ ایک پتھر پر پڑا۔ یہ وہی پتھر تھا جو اس نے مجھے مارا تھا۔ پتھر ہاتھ میں آتے ہی میں نے تیزی سے اس کی طرف پھینکا۔ میرا نشانہ تو ہرگز اچھا نہیں تھا لیکن اس وقت قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ پتھر اس کی پیشانی پر لگا۔ اس کی پیشانی سے نکلتا خون اس کے چہرے کو داغدار کرنے لگا۔

اس کے گھٹنے مڑے اور وہ دھڑام سے میرے سامنے گرا۔ میں نے پستول اٹھا کے دستے سے اس کے سر پر وار کیا۔ کھوپڑی چٹخنے کی آواز آئی۔ مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ میں.... پستول کے دستے سے اس کا سر تب تک بجاتا رہا جب تک کہ میرے بازو بے دم نہ ہو گئے۔

میں نے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میرے تاثرات عجیب سے تھے۔ میں اس کی لاش کو اسی طرح چھوڑ کے جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے باہر نکلا۔ نوٹوں سے بھرا بریف کیس گاڑی کے قریب رکھا تھا۔

میں بھاگ کے بریف کیس تک پہنچا۔ بریف کیس کھولتے ہی میری نظر نوٹوں کی گڈیوں پر پڑی۔ یہ سارے بڑے نوٹ تھے۔ رقم پوری ہی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا۔ میرے چہرے پر خون جما ہوا تھا۔ میرے کپڑے ارمغان کے خون سے آلودہ تھے، لیکن مجھے جیسے کسی چیز کی پروا ہی نہ تھی۔ میرے احساسات مر چکے تھے۔

ارمان میری بربادی کا ذمے دار تھا۔ میں نے اس کے لیے بھی ایک منصوبہ سوچ رکھا تھا لیکن میری خوش قسمتی سے وہ خود ہی میرے دام میں آن پھنسا تھا۔ اس کا شکار میرے لیے بطور بونس تھا۔ ارمغان کو بھی دھوکا دہی کی سزا مل چکی تھی۔

مجھے خوش ہونا چاہیے تھا مگر مجھے اپنے احساسات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ توقع کے برخلاف ارمان کا شکار اور دس کروڑ کی رقم حاصل کرنے کے بعد بھی مجھے طمانیت یا خوشی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

مکان میں پہنچ کے میں نے صوفہ ہٹایا۔ نیہا ہوش میں آ چکی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے کھینچ کے اس کے لبوں سے ٹیپ اتاری۔ وہ تکلیف سے چیخی۔ میں اسے سرد نظروں سے دیکھنے لگا۔ اب وہ ہراساں نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

اس کی حالت سنبھلی تو وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ ''تم ایسا کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ؟''

''تم نے میرے ساتھ ''ویسا'' کیوں کیا تھا؟'' میں نے ویسا پر زور دیا۔

''تمہارا اشارہ اگر گواہی کی طرف ہے تو گواہی ارمان نے دی تھی۔ میں نے تو مجبوراً اس کے بیان کی تصدیق کی تھی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''چلو مان لیا تم مجبور تھیں لیکن مجھ پر موبائل چوری کا جو جھوٹا الزام لگایا تھا؟'' میں زہرخند لہجے میں بولا۔

''وہ بھی ارمان ہی کی چال تھی۔ میں تو تم سے محبت کرتی تھی۔ میں کیسے تم پر جھوٹا الزام لگا سکتی تھی۔'' میں بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے اعترافِ محبت نے میرے دل کی حالت عجیب کر دی تھی۔

''اس نے ایسا کیوں کیا؟'' میں اچنبھے سے بولا۔

''میں تم سے محبت کرتی تھی۔ اسے یہ بات پسند نہیں تھی۔ اس نے تمہیں گھر سے نکالنے کے لیے یہ سارا ڈراما کیا تھا۔''

''اور تم تماشا دیکھتی رہی تھیں؟'' میرے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔

''مجھے اس وقت پتا ہوتا تو میں اس کے خلاف ڈٹ کے کھڑی ہو جاتی۔ مجھے تو اس نے کافی عرصے بعد بتایا تھا کہ اس نے تم پر جھوٹا الزام دھرا تھا۔ یہ علم ہونے کے بعد ہی

میں نے تمہارے گھر والوں سے معذرت کر لی تھی۔ میں تم سے ملنے ہاسٹل بھی گئی تھی مگر تم نے میری بات کا یقین ہی نہیں کیا تھا۔'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ یہ سب جان بچانے کے لیے ڈراما کر رہی ہے۔ میں نے خود کو یقین دلایا۔

''چلو، وہ تو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اب تمہاری باری ہے۔'' میں سفاکی سے بولا۔

''کک...... کیا مطلب، تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' وہ ہکلائی۔ میں نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ میں ہاتھ میں ٹیپ لے کے اس کی طرف بڑھا۔

''خدا کے لیے روشان، تم جانتے نہیں میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ تمہارا یہ روپ دیکھ کر بھی میں تم سے نفرت نہیں کر پا رہی۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔ میری دھڑکن کی لے بدلی۔ وہ آج ادا اپنی محبت کا اعتراف کر بھی رہی تھی تو کس موقع پر۔

''محبت تو میرے دل میں بھی تمہارے لیے جاگی تھی مگر وہ میری غلطی تھی۔ تم اس قابل نہ تھیں۔'' اس کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ خوشی کا تاثر بھی مجھے نظر آیا۔

''میں تمہیں کیسے محبت کے قابل نظر آتی۔ تمہاری آنکھوں پر تو بدگمانی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ تم اس پٹی کو ہٹا کے دیکھو، تم مجھے بے قصور پاؤ گے۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میرے دل کی حالت عجیب ہوگئی۔

نہیں، نہیں یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے ڈراما کر رہی ہے۔ اس وقت اگر تم نے اس کی بات مان لی، تو تم کہیں کے نہیں رہو گے۔ میرا ذہن دل کو سمجھانے لگا۔

میں نے اپنے دل کو سخت کیا اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دی۔ وہ گہرے دکھ سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔ میں نے اس سے نظر ہٹالی۔

اب میں اسے پاؤں کی بندشوں سے آزاد کر رہا تھا۔

''چلو، تمہیں رہائی دلواتا ہوں۔'' میں سفاکی سے بولا۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ اس کے بازو ابھی تک پشت پر بندھے تھے۔

''چلو باہر۔'' میرے کہتے ہی وہ باہر کی طرف بڑھی۔

''ادھر نہیں، اس طرف۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کے مکان کی عقبی سمت میں دھکیلا۔ وہ مجھے حیرانی سے

دیکھنے لگی۔

''تمہارا ٹھکانا میں نے اس طرف بنایا ہے۔'' میں عجیب سے انداز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ میں نے اسے دھکیلا تو وہ آگے بڑھنے لگی۔ مکان کے عقب میں پہنچتے ہی اس کی نظر اپنے ٹھکانے پر پڑی۔ وہ حلق سے غوں غوں کی آوازیں نکالنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کا خوف سمٹ آیا تھا۔

میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ گڑھے میں گر گئی جو کچھ دیر قبل ہی میں نے کھودا تھا۔ اس کے گڑھے میں گرتے ہی میں اس پر مٹی ڈالنے لگا۔ وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جما کے اسے واپس گرادیا۔

''تم نے مجھے زندہ درگور کیا تھا۔ میں بھی تمہیں زندہ درگور کروں گا۔'' اپنی آواز مجھے خود اجنبی لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی، خوف تھا، التجا تھی، شکوہ تھا...... غرض کیا کچھ نہیں تھا اس کی آنکھوں میں، جاتے سے اس کی آنکھیں ہر تاثر سے بھرپور تھیں لیکن میں شاید اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جمایا ہوا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی، لیکن میری طاقت کے سامنے بے بس تھی۔ دفعتاً اس نے تڑپنا بند کر دیا، اب وہ بالکل ساکت تھی، لاش کی طرح...... میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اچانک اس کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی، اس نے ہاتھ کی مٹھی میں ریت بھر کے میری طرف اچھالی۔ مٹی میری آنکھوں میں پڑی۔ بے اختیار میں نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ میں نے دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس نے مجھے دھکا دیا۔ میں پشت کے بل گر گیا۔ میرا سر پتھروں پر لگا۔ میرے دماغ میں جیسے شرارے سے چھوٹے۔ میرا غصہ سوا ہو گیا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ وہ ہراساں نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر اس نے ہاتھ سے اپنے منہ پر لگی ٹیپ کھینچ کے اتاری اور تیزی سے ایک طرف بھاگنے لگی۔ ساتھ ہی وہ مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں نے پشت پر باندھ دیے تھے لیکن شاید مزاحمت کے دوران رسی کی گرفت اس کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ رسی سے آزاد کرالیے تھے۔

اسے بھاگتے دیکھ کے میں نے جیب سے پستول نکالا جو میں نے واپس لوڈ کر لیا تھا۔ میری نظر دھندلا رہی تھی۔ مجھے اس کا بھاگتا ہوا ہیولا سا نظر آرہا تھا۔ میں نے پستول والا ہاتھ بلند کیا اور گولی چلا دی۔ آج قسمت پوری طرح میرے ساتھ یاوری کر رہی تھی۔ گولی سیدھی اس کے سر میں لگی۔ خون کا ایک فوارہ سا چھوٹا۔ وہ لڑکھڑائی۔ اس کے حلق سے تکلیف دہ سی آواز برآمد ہوئی۔ اگلے ہی پل وہ لہرا کے چت زمین پر گری۔ زمین پر گرتے ہی اس نے ہچکی لی۔ اس کا جسم اوپر کی طرف اٹھا۔ اگلے ہی پل وہ ساکت ہو گئی۔

میری آنکھیں مٹی سے بھری تھیں۔ مٹی سے لتھڑی ان آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا، یا شاید وہ آنسو تھے۔ مجھے احساس نہ ہوا۔

میرے احساسات پر تو جیسے برف جمی تھی۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ وہ زمین پر چت لیٹی تھی۔ اس کے سر سے رستا خون اس کے نیچے جمع ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالا اور بے رحمی سے اسے گھسیٹتے ہوئے گڑھے میں لے جا کے ڈال دیا۔ میں جلدی جلدی اس پر مٹی ڈالنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا وجود مٹی میں دفن ہو چکا تھا۔ میں بے دم ہو کر ادھر ہی مٹی پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''میں اُسے زندہ درگور کرنا چاہتا تھا لیکن میں خود زندہ درگور ہو گیا تھا۔'' کچھ دیر توقف کے بعد... بمشکل میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

میرے چہرے پر گرم گرم پانی پھیلا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں ...... ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ مجھے مدثر کا بس ہیولا ہی نظر آیا۔ اتنے دھندلے سے ہیولے کی آنکھوں میں بھی مجھے اپنے لیے بے پناہ نفرت نظر آئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

یہ سب سناتے ہوئے، میرا دل کس کرب سے گزر رہا تھا، یہ بس میں ہی جانتا تھا۔ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یکایک مجھے کھانسی کا دورہ پڑا۔ میں کھانس کھانس کے بے حال ہو گیا۔ مدثر نے میری طرف پانی کا گلاس بڑھایا۔ بمشکل گلاس تھام کے میں پانی پینے لگا۔ اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا اس پل میری نظریں اس سے ملیں۔ اس نے مجھ سے نظریں پھیر لیں۔

''تمہیں اس پل مجھ سے شدید نفرت ہو رہی ہے نا؟'' میرے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔ منمناتی ہوئی باریک سی آواز......

وہ کچھ نہ بولا۔ ''نظریں نہ چراؤ، مجھے بھی خود سے نفرت ہو رہی ہے۔'' اس نے ترحم آمیز نظروں سے میری

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

طرف دیکھا۔ مجھے ڈھارس سی محسوس ہوئی۔ میں نے بات آگے بڑھائی۔

''اس وقت تو میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اپنے منصوبے کے مطابق میں دس کروڑ کی رقم لے کر دوسرے شہر آ گیا تھا۔ اس شہر میں، میں نے چند دن پہلے ہی ایک مکان کرائے پر لیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد مجھے ادراک ہوا تھا کہ میں کتنی بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔ مجھ جیسا شقی القلب بھی کوئی ہوگا، جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کو زندہ درگور کر دیا تھا۔'' میں تھک کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''شاید اس میں آپ کا قصور نہیں تھا۔ یہ سب آپ کے مقدر میں لکھا تھا۔'' وہ مجھے تسلی دینے لگا۔ مجھے اس وقت تسلی کی نہیں، نشتر کی ضرورت تھی، جس سے وہ میرے زخم کو کریدتا۔ میں چلّایا۔

''نہیں...... یہ سب میرے مقدر میں نہیں لکھا تھا۔ اس کے لیے گڑھا میں نے اپنے ان ہاتھوں سے کھودا تھا۔ اُس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ گڑھا، ساری زندگی کے لیے میرے لیے آزار بننے والا ہے۔ اس میں لاش نیہا کے بدن کی لیکن روح میری دفن ہوگی۔''

وہ میرا کندھا تھپکنے لگا۔ میں نے اس کے کندھے پر سر رکھ لیا۔ میرے آنسو اس کا کندھا بھگونے لگے۔

''کتنا قابلِ نفرت ہوں میں؟'' میں بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔

''نہیں، آپ تو سراپا محبت ہیں۔ آپ کے حالات نے آپ کو ایسا بنا دیا تھا۔ میں آپ کو قصوروار نہیں مانتا۔'' وہ میری ڈھارس بندھانے لگا۔

''نہیں، میرا قصور تھا اسی لیے میں نے خود کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ سانسیں جو انسان کو زندگی دیتی ہیں، مجھے تکلیف دینے لگی تھیں۔ میں انہیں روک لینا چاہتا تھا لیکن یہ میرے بس میں نہ تھا۔ میں تین دن تک ایک ہی کمرے میں پڑا اپنے بال نوچتا رہا تھا۔ میرے اندر انتقام کی چنگاریاں جانے کب کی بجھ چکی تھیں۔ میں ظفر کو بھی بھول چکا تھا اور اس زیادتی کو بھی، جو اس نے میرے ساتھ کی تھی۔ میں اپنے گھر والوں کو اور ان کی موت کو بھی بھول چکا تھا۔ مجھے یاد تھا تو بس نیہا کا مٹی میں لتھڑا چہرہ، مجھے یاد تھیں تو بس اس کی وہ آنکھیں، جو جاتے سمے، اس نے مجھ پر مرکوز کی تھیں۔ اس نے مجھے اسی وقت ان نظروں سے مار دیا تھا۔ اب اس بدن کو گھسیٹنے کا کیا فائدہ تھا۔ میں نے اس بدن کو روح سے رہائی دینے کا فیصلہ کر لیا۔

خودکشی کا سب سے آسان طریقہ یہی تھا کہ میں کسی ٹرین کے آگے لیٹ جاؤں۔ یوں پل بھر میں ہی میرا وجود، میری ذات، میری پہچان اور میری پہچان کی ہر نشانی دنیا سے معدوم ہو جاتی۔ ٹرین کی پٹری میرے مکان کے قریب سے ہی گزرتی تھی۔ ہر روز سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد ہی میں ٹرین کے گزرنے کی آواز سنا کرتا تھا۔ اس شام سورج جب ڈوبنے لگا تو میں اپنے قدموں کو گھسیٹتے گھر سے باہر نکل آیا۔

جب میں ریل کی پٹری پر پہنچا تو رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔ میں پٹری پر لیٹ کے بے چینی سے ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، بلکہ جب میں اپنی موت کے بارے میں سوچتا تو مجھے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوتا۔

میں نے کان ٹرین کی پٹری کے ساتھ لگائے ہوئے تھے۔ پٹری کی لرزش سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ٹرین قریب پہنچنے والی ہے۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ اسی لمحے میری جیب میں سیل فون بجا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے، سیل جیب سے نکالا۔ یہ سیلولر کمپنی کی کال تھی۔ میں کال ریجیکٹ کرنے ہی لگا تھا کہ کچھ سوچتے ہوئے میرا ہاتھ گرین سائڈ پر سلائڈ ہو گیا۔ میں نے سیل کان کے ساتھ لگا لیا۔ میرے کانوں میں ریکارڈڈ آواز گونجنے لگی۔

''اے دل تجھے قسم ہے، ہمت نہ ہارنا، دن زندگی کے جیسے بھی گزریں گزارنا...... اس کونٹینٹ کو اپنی ڈائل ٹون بنانے کے لیے اسٹار کا بٹن دبائیں۔'' اس وقت گانے کے یہ بول مجھ پر عجیب ہی انداز میں اثرانداز ہوئے تھے۔ میں جو اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا، ایک دم سے سوچ میں پڑ گیا۔ کیا تھا اگر میرے لیے جینے کی کوئی وجہ نہیں بچی تھی؟ کیا تھا، اگر میرے لیے بس پچھتاوے ہی بچے تھے؟ کیا تھا اگر میرا دل زخموں سے چُور چُور تھا؟ مجھ سے زیادہ مجبور لوگ دنیا میں موجود تھے۔ میں اپنے لیے نہ سہی ان کے لیے جی سکتا تھا۔

ٹرین کی آواز لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ٹرین اور میرے درمیان اب محض چند میٹر کا فاصلہ حائل تھا۔ اس فاصلے کو طے ہونے میں چند لمحے ہی لگتے۔ اسی پل یکدم میرے دل میں جینے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ ٹرین مجھے چھونے ہی لگی تھی کہ میں

نے پٹری سے نیچے ایک جست لگائی۔ میرے گھٹنے میں درد کی ٹیس اٹھی۔ میں ادھر ہی بے دم ہو کے لیٹ گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میری جان ایک فون کال نے بچائی تھی۔

☆☆☆

"تھینکس گاڈ، آپ حرام موت مرنے سے بچ گئے۔" وہ گہری سانس لے کے بولا۔ میں نے چونک کے اسے دیکھا۔

"آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ مرنا تو بہت آسان تھا لیکن اصل کام تو جینا ہے اور وہ بھی دوسروں کے لیے جینا۔ آپ دوسروں کے لیے جیتے ہیں، مجھے آپ پر فخر ہے۔" وہ میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔ مجھے عجیب سے اطمینان کا احساس ہوا۔ میں نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

"تم کو مجھ سے اور کچھ پوچھنا ہے؟" کچھ دیر کے بعد میں نے سر اٹھا کے اس سے سوال کیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم لگ رہا تھا۔ وہ چونک کے بولا۔

"نہیں، آپ نے سب تفصیل سے بتا تو دیا ہے۔"

"نیہا کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کر دیا تھا۔ پھر میری بیوی نیہا کون ہے۔ تم یہ نہیں جاننا چاہو گے؟"

"ہو گی کوئی مجبور و بے کس لڑکی۔ جس کا نام نیہا ہونا اس کے لیے خوش قسمتی کا پروانہ ثابت ہوا ہو گا۔ آپ نے دیگر بہت سے لوگوں کی طرح اسے بھی اپنی زندگی میں شامل کر کے، اس کی زندگی بدل دی ہو گی۔" وہ ہنسا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔ میں نے کچھ اور چیزیں بھی تشنہ چھوڑ دی تھیں۔ تم ان کے بارے میں نہیں جاننا چاہو گے؟"

"نہیں، میرے پاس دماغ ہے۔ میں ان کے بارے میں خود سوچ لوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"تم تو واقعی بہت ذہین ہو۔" میں ہنسا۔ "اچھا یہ بتاؤ تم نے میری زندگی سے کیا سبق حاصل کیا؟"

"یہی کہ بدگمانی نہ پالو۔"

"بس؟" میرے لہجے میں مایوسی تھی۔

"اور بدلہ نہ لو...... بلکہ معاف کر دو۔"

"یہ تو چند ثانوی نتائج ہیں۔ میری کہانی کا اصل سبق تو کچھ اور ہے۔" میں اسے امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ گویا ہوا۔

"میں جب ابو کی معذوری کے بعد چاروں طرف سے مسائل میں گھر گیا تھا تو ہر شخص کو اس امید کے ساتھ دیکھتا تھا کہ وہ میرا سہارا بنے گا۔ میں کسی کا کندھا چاہتا تھا، جس پر میں سر رکھ کر کچھ دیر رو سکوں۔ میں کسی کے محبت بھرے دو بول سننے کو ترس جاتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی تو مسیحا میرے لیے زمین پر اترے جو میرے تمام مسائل حل کر دے۔ لیکن نہ کسی نے کچھ پل کے لیے ہی مجھے اپنا کندھا فراہم کیا، نہ کسی نے تسلی کے دو بول، بول کے میری ڈھارس بندھائی۔ میں نے اپنے مسائل ناجائز طریقے سے حل کرنے کی ٹھان لی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اگر میری مدد کریں گے تو مجھے بھی آپ کے لیے کوئی ناجائز کام ہی کرنا ہو گا۔ میں یہی سوچ کے آپ سے ملنے گیا تھا لیکن آپ تو میرے لیے آسمان سے مسیحا بن کے اترے تھے۔ آپ نے میرے تمام مسائل حل کر دیے۔ آپ نے یہ دولت چاہے کسی بھی طرح سے حاصل کی ہو، لیکن اس دولت سے آپ لوگوں کے مسائل حل کر رہے ہیں۔ ان کی زندگیاں تبدیل کر رہے ہیں۔ اس سے بڑا زندگی کا مقصد کیا ہو گا؟ تمام لوگوں کے پاس دولت نہیں ہوتی، لیکن وقت سب کے پاس ہوتا ہے۔ دلاسا ہر کوئی دے سکتا ہے۔ بڑے مسئلے نہ سہی ہم سب ہی دوسروں کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، لیکن ہمارے پاس کسی کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس دوسروں کو دینے کے لیے محبت نہیں ہوتی، تسلی یا دلاسا نہیں ہوتا۔ ہاں نفرت ضرور ہوتی ہے۔ حسد ضرور ہوتا ہے۔ اگر ہم سب ان منفی جذبوں سے چھٹکارا پا کے دوسروں کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہی حل کرنے لگیں تو بہت سے لوگ جرم کی دنیا میں قدم رکھنے سے بچ جائیں۔ جرم کے جراثیم انسان کے اندر بھی پنپتے ہیں جب اسے دوسرے انسانوں سے محبت کے بجائے نفرت ملتی ہے۔ ایسا ہی آپ کے ساتھ ہوا، ایسا ہی میرے ساتھ ہونے والا تھا، ایسا ہی اور بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ کی زندگی سے میں نے یہی سبق سیکھا ہے کہ دوسروں کی زندگیاں تبدیل کر کے جیو۔" وہ آخری جملہ کہہ کے ہنسا۔

اس نے میری زندگی سے بالکل درست سبق سیکھا تھا۔ میرا اسے اپنی کہانی سنانے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ بہت عرصے کے بعد کسی کے سامنے مجھے اپنے زخم نہاں عیاں کر کے عجیب سی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی طمانیت کے احساس کے ساتھ میں نے آنکھیں موند لیں۔ اب میں سکون کے ساتھ سو سکتا تھا۔

ختم

کر وہ میز تک گیا۔ بریف کیس کھول کر اس میں سے لیپ ٹاپ نکالا اور بولا۔ ''اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

میں صوفے پر بیٹھ کر سوٹ کیس کا غلاف دیکھنے لگی جو فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں کس طرح اس فرق کو نظر انداز کر سکتی تھی جو یہاں آنے کے بعد مجھے محسوس ہوا۔ اس کا چمڑا چھلا ہوا لگ رہا تھا جبکہ عام طور پر یہ نسبتاً گہرا ہوتا ہے۔ گویا یہ مصنوعی چمڑا تھا۔

رائیڈر کے فون پر آنے والی تین کالوں کی وجہ سے اس کے کام میں تاخیر ہوئی۔ جب روم سروس والا ڈرنک لے کر آیا تو رائیڈر نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اسے وصول کر کے بل پر دستخط کر دوں۔ میں نے اس میں ٹپ کی رقم بھی جمع کر دی اور دستخط کر کے ویٹر کو بل واپس کر دیا۔

''یہ اسے پہنچا دو۔'' رائیڈر نے ٹیلی فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اب میں واقعی تھکن محسوس کر رہی تھی لیکن اپنے مطلب کے لیے مجھے یہ ڈرنک اس کے بیڈ روم میں لے جانا پڑا۔ اس کے کپڑے بے ہنگم طریقے سے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے آہستہ سے باتھ روم کے دروازے پر دستک دے دی تو اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ وہ ٹب میں لیٹی ہوئی تھی اور اس کا پورا جسم پانی کے اندر تھا۔ البتہ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ خشک رکھا ہوا تھا اور اس میں ایک سگریٹ پکڑ رکھی تھی۔ میں نے اسے ڈرنک دیا۔ وہ گلاس ہونٹوں تک لے گئی۔ ایک گھونٹ لیا اور منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا مذاق ہے؟ یہ تو ورجن کولا ہے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ وہ تمہاری بھلائی کی کوشش کر رہا ہو۔''

اس نے مسکراتے ہوئے گلاس ٹب کے کنارے پر رکھ دیا اور بولی۔ ''وہ صرف اپنی بھلائی کے لیے ہر کام کرتا ہے۔ بہر حال ممکن ہے کہ وہ اپنی جگہ ٹھیک ہو۔ واقعی مجھے اس وقت الکحل سے دور رہنا چاہیے۔''

اس نے مجھے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔

''مجھے امید ہے کہ ڈیوین خیریت سے ہوگا۔''

میں نے کہا کہ اسے دیکھ کر آتی ہوں لیکن اس نے منع کر دیا اور بولی۔ ''مجھے ابھی تیار بھی ہونا ہے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا موقع ہے۔ اس سے میری واپسی ہو رہی ہے۔''

میں نے اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن جب دوسرے کمرے میں پہنچی تو مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت، شہرت اور صلاحیت لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ اسے اس کے علاوہ بھی کچھ چاہیے تھا۔ وہ خوشی کی تلاش میں تھی۔

میں نے اپنے فون کی گھنٹی سنی اور پرس سے نکال کر جواب دیا۔ ''اسٹیسی ڈیشا بول رہی ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ میں اس نمبر کو پہچانتا ہوں۔'' ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

وہ سراغ رساں مائرز تھا۔ اس کا شمار لاس ویگاس کے بہترین سراغ رسانوں میں ہوتا تھا۔

''مائرز، تم کیا چاہتے ہو؟ میں مصروف ہوں۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ایکیلون ہوٹل میں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کیا عجیب اتفاق ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں بھی یہیں پر ہوں۔ تم اپنی لوکیشن بتاؤ۔''

میں تھوڑا سا ہچکچائی پھر بتا دیا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ کہیں مت جانا۔ میں اوپر آ رہا ہوں۔''

''لیکن میں ایک کلائنٹ کے ساتھ ہوں۔''

''اور میرے ساتھ ایک لاش ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ کہیں مت جانا۔''

اس سے پہلے بھی مائرز سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا اور ہر بار میں بمشکل قتل کے الزام سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ میں فی الوقت اس نئے مسئلے میں الجھنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن میرے لیے معاوضہ وصول کیے بغیر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میرے بغیر سمرینا اور رائیڈر کو بہت سے ناخوشگوار سوالات کا جواب دینا پڑتا۔

''کون تھا؟'' رائیڈر نے پوچھا۔

میں سوچنے لگی کہ اسے بتایا جائے یا نہیں لیکن تھوڑی دیر بعد تو اسے معلوم ہو ہی جاتا۔

''ایک پولیس سراغ رساں۔ میں اسے جانتی ہوں۔''

''پولیس......'' اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے۔ ''وہ کیا چاہتا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔''

رائیڈر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور اپنے فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ اسی دوران دروازے پر دستک

ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہاں مائرز کھڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک باوردی پولیس آفیسر بھی تھا۔

جب وہ کمرے میں آ گیا تو میں نے پوچھا۔ ”کیا تم بتانا چاہو گے کہ یہ سب کیا ہے؟“

مائرز نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ رائیڈر بھی فون بند کر کے میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ہاں۔“ رائیڈر نے کہا۔ ”اس مداخلت کا مطلب کیا ہے؟“

مائرز نے اسے گھور کر دیکھا پھر اپنا سیل فون ہمارے سامنے کر دیا جس میں ایک آدمی کا چہرہ نمایاں تھا۔ ”تم اسے جانتے ہو؟“

میں نے اس تصویر کو دیکھا اور فوراً ہی پہچان گئی۔ وہ لیموزین کا ڈرائیور تھا۔

مائرز نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے فون سے پتا چلتا ہے کہ تم نے گزشتہ ایک گھنٹے کے دوران اسے دو مرتبہ فون کیا۔ آخری فون اس کی موت سے کچھ دیر پہلے کیا گیا تھا۔“

”اوہ میرے خدا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ مر گیا ہے؟“

”ہاں، تم جانتی ہو کہ یہ کون ہے؟“

رائیڈر نے اپنی ناک سکیڑی اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔“

”اس کا نام فرانسس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ اپنی لیموزین میں ہمیں ائرپورٹ سے لے کر آیا تھا۔ میرا مطلب ہے مجھے اور باڈی گارڈ کو۔“

”وہ باڈی گارڈ کہاں ہے؟“ مائرز نے پوچھا۔

رائیڈر نے اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس وقت وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ تین گھنٹے بعد مس سمرینا کا شو شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے اگر تم مجھے فارغ کر سکو۔“

”سنو۔“ مائرز نے کہا۔ ”ابھی میرا انٹرویو ختم نہیں ہوا۔“

رائیڈر نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت مصروف ہوں۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ شو شروع ہونے والا ہے۔ تم اگر چاہو تو اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔“ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں بھی بہت مصروف ہوں۔“ مائرز میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”فراسٹ کہاں ہے؟“

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک میں جانتی ہوں۔ وہ لیموزین کی ڈکی میں سامان کا ٹیگ تلاش کرنے گیا تھا۔“

”جو اسے نہیں ملا۔“ رائیڈر بولا۔ ”اس نے مجھے فون کر کے بتا دیا تھا۔“

”تمہارے پاس اس کا نمبر ہے؟“ مائرز نے کہا۔

”اسے فون کر کے کہو کہ وہ یہاں آ جائے، میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“ رائیڈر نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ”وہ شو کے لیے ہونے والے حفاظتی اقدامات دیکھ رہا ہے۔“

مائرز نے سختی سے کہا۔ ”میں ابھی اور اسی وقت اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ رائیڈر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا اور اپنا فون نکال لیا۔ ”دیکھتا ہوں کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

مائرز میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا وجہ ہے کہ ہر بار میری تم سے ملاقات ایسی جگہ پر ہوتی ہے جس کے قرب و جوار میں کوئی لاش پڑی ہو؟“

”میرا خیال ہے کہ آج قسمت مجھ پر مہربان نہیں ہے۔“

اس نے میرے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس کمرے میں اور کون تھا؟“

میں نے کہا۔ ”سمرینا باتھ روم میں ہے۔ ریمنڈ فراسٹ اس کے سابق شوہر کو باہر لے گیا تھا جو اس شو کو خراب کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔“

”اس کا سابق شوہر؟“

”ڈیوین ولیمز۔“ میں نے کہا۔ ”وہ یہاں شور شرابا کرنے آیا تھا۔ فراسٹ اسے باہر لے گیا۔“

”وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟“

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اسے پوری کہانی سنا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ اس کی برینی بی سے بھی بات ہو گئی ہے جو سمرینا کا قیمتی لباس خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

”برینی بی؟“ مائرز نے کہا۔ ”کیا ہم اس جوہری کی بات کر رہے ہیں؟“

”میرا بھی خیال ہے۔ وہ اسی لباس کے بارے میں بات کر رہے تھے۔“

”کیا؟“ مائرز نے کہا پھر اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ایک منٹ رکو۔“ پھر اس نے اپنا ریڈیو نکالا اور کسی کو ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ کیا اس ہوٹل میں برنارڈ